لب اللباب

فی

تعلیم فقہ الإمام الشافعی للأحباب

(تعلیم فقہِ شافعی)

جلد اول

تالیف:
علامہ شیخ محمد علی سلطان العلماء

تخریج:
ڈاکٹر محمد عبدالرحیم بن محمد علی سلطان العلماء

ترجمہ
ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی

ناشر
معہد امام حسن البنا شہید۔ بھٹکل

پہلا ایڈیشن (سلسلہ اشاعت نمبر:۳۳)

نام کتاب: لب اللباب فی تعلیم فقہ الإمام الشافعی للأحباب
تعلیم فقہِ شافعی
تصنیف: علامہ شیخ محمد علی سلطان العلماء
تخریج: ڈاکٹر محمد عبدالرحیم بن محمد علی سلطان العلماء
ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی
صفحات: ۵۲۸
تاریخ اشاعت: شعبان ۱۴۳۵ ہجری مطابق جون ۲۰۱۴ء
کمپوزنگ: ندوی پرنٹرس بھٹکل
تعداد اشاعت: ۱۱۰۰
قیمت: ۳۰۰ روپئے

ملنے کے پتے:
شباب ایجوکیشن بک ہاؤس، ندوہ روڈ لکھنؤ۔ یوپی
مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر:۳۰، بھٹکل، کرناٹک ۵۸۱۳۲۰

ناشر
معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل
پوسٹ بکس نمبر ۱۳ بھٹکل ۵۸۱۳۲۰، کرناٹک۔ انڈیا

فہرست کتاب

کچھ اپنی باتیں

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه وبارك وسلم، أما بعد.

اس امت پر ائمہ کرام کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس دین متین کے مسائل قرآن وحدیث کی روشنی میں استنباط کرنے میں لگا دیئے اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی کھپا دی، جب کہ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں اپنا ابدی پیغام سنا دیا ہے کہ **انا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون** کہ اس قرآن پاک کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس دین متین کی حفاظت کی ذمے داری اللہ تعالی نے اپنے ذمے لے لی ہے، قیامت تک اس کے اندر کمی بیشی کی گنجایش نہیں ہوگی، تو ائمہ حضرات کی یہ کاوشیں اور یہ فقہی مسائل انشاء اللہ قیامت تک باقی رہیں گی، اور قیامت تک علماء کرام اس طرح کی کاوشیں پیش کرتے رہیں گے۔

زیر نظر کتاب مشہور عالم شیخ محمد علی سلطان العلماء کی ہے، جو دراصل فارسی میں تحریر کی گئی ہے اور فارسی میں کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، پھر مصنف نے خود اس کو عربی میں منتقل کیا، شیخ اصلاً ایران کے ہیں، عرصے سے دبی میں مقیم ہیں اور وہاں یکسوئی کے ساتھ دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، شیخ کے تلامذہ اور محبت وعقیدت رکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے جو شیخ کو تعظیم وتکریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے، بھٹکلی احباب میں جناب قاضیا ابراہیم اور جناب محتشم عبدالباری صاحب اور مولانا محمد فاروق ندوی صاحب سے اچھی طرح متعارف ہیں جو شیخ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے ہیں۔ مذکورہ کتاب شیخ نے مولانا فاروق صاحب کو اردو میں ترجمہ کے لیے دی تھی، مولانا مذکور نے معہد حسن البنا کی طرف سے ترجمہ کرنے کے لیے راقم

السطور کو مرحمت فرمائی، اس طرح اس کے ترجمے کی ذمے داری ہمارے مشاق مترجم مولانا ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی کو سونپ دی گئی، مولانا مذکور نے دونوں ضخیم جلدوں کا ترجمہ چند ہی ماہ کے اندر کرڈالا، اس کے بعد کئی سال تک یوں ہی رکھی رہی، طباعت کے لیے خطیر رقم درکار تھی، شیخ کی خدمت میں کئی بار اس کو پیش کیا گیا لیکن آج کل میں کئی سال بیت گئے، لیکن وہی بات ''کل شیئ مرھون بأوقاته''۔ کہ اللہ تعالی کے پاس ہر چیز کا ایک مقرر وقت ہے، انسان کے جلدی کرنے سے وہ چیز وقوع پذیر نہیں ہوسکتی۔ مولانا فاروق ندوی کی کوشش سے اور جناب قاضیا ابراہیم صاحب اور جناب عبدالباری محتشم کی توجہ سے کچھ رقم مل گئی جس سے کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تعالی اس کتاب کے مؤلف کو اور دیگر احباب کو خصوصاً مترجم اور ناشر کو اور جس نے بھی اس کے لیے کوشش کی ہے سب کو اجر جزیل سے نوازے اور دنیا وآخرت کی سعادتوں سے مالا مال کرے۔

مولانا محمد فاروق صاحب ندوی ایک عرصہ سے دبئی میں مقیم ہیں اور وہاں ایک مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ دعوت وتبلیغ کے کام سے جڑے ہوئے ہیں، مولانا موصوف جس مسجد میں امامت کرتے ہیں وہاں زیادہ تر مزدور طبقہ آباد ہے جس کی وجہ سے پوری مسجد نمازیوں سے بھری رہتی ہے، مولانا ان لوگوں کو دین کی تعلیم اور صحیح عقیدے کی تعلیم دیتے ہیں، آپ کی موجودگی سے وہاں دین کا اچھا کام بھی ہورہا ہے۔ اللہ تعالی مولانا کو اس کا بھرپور اجر دے، مولانا ایک فعال اور متحرک شخصیت کے حامل ہیں، امت کا درد رکھتے ہیں اور اس کے لیے کڑھتے ہیں چاہے وہ ملک شام کے حالات ہوں یا مصر کے، پاکستانی مسلمانوں کے حالات ہوں یا بنگلہ دیش یا ہندوستان کے، پورے عالم اسلام کے ناگفتہ بہ حالات سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں، بے چین اور بے کل رہتے ہیں، فون سے اور خطوط کے ذریعے اپنے متعلقین کو آگاہ اور دعاؤں کی درخواست کرتے رہتے ہیں، اسی طرح آپ کی خوبی یہ بھی ہے کہ قوم و ملت کی اصلاح کی غرض سے اچھی اور دینی کتابیں چھپوا کر اس کو عام کرنے کی ترغیب دیتے

رہتے ہیں، ایسی کئی کتابیں مولانا کی ترغیب اور ایما پر چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں، اللہ تعالی مولانا کو اس کا بھرپور اجر اور آپ کا سایہ امت پر تادیر سلامت رکھے، اور مزید مفید کام آپ کی ذات سے انجام پائے۔

فقہِ شافعی کے موضوع پر عربی زبان میں بے شمار کتابیں موجود ہیں، متقدمین اور متاخرین کی کتابوں کا ایک سلسلہ ہے، جس کی ابتدا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الأم سے ہوتی ہے اور ابھی تک الگ الگ انداز، اسلوب اور نہج سے کتابیں لکھی جارہی ہیں، الحمد للہ معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل سے فقہِ شافعی کے موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں سے ایک موجودہ عہد کے مصنفین کی ایک اہم کتاب ''**الفقه المنهجی**'' کا اردو ترجمہ ہے جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، الحمد للہ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اور اہلِ علم نے اس کو بڑی پسند کی نظر سے دیکھا ہے۔

خواتین کے مسائل سے مخصوص ایک کتاب ''تحفۃ الأخوات'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کا اس سال دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، یہ کتاب عورتوں کے بہت سے مدارس کے نصاب میں شامل ہے، اور اللہ کے فضل سے اس کتاب کو بھی مقبولیت ملی ہے۔

تیسری کتاب ''المبسوط'' (دو جلدیں) ہے، جو بہادر جنگ کی ہے اور یہ کتاب کئی مرتبہ منظر عام پر آچکی ہے اور اس کو بڑی مقبولیت ملی ہے، لیکن ادھر کئی سالوں سے یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں تھی اور اس کی آخری اشاعت پر تقریباً چالیس سال گزر گئے تھے، اس کو ترتیب جدید کے ساتھ معہد سے شائع کیا گیا ہے۔

اب فقہ شافعی کے موضوع پر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا، آپ لوگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

محمد ناصر سعید اکرمی

ناظم معہد امام حسن البنا شہید۔ بھٹکل

۳۔ ذوالقعدہ ۱۴۳۵ ہجری

عرضِ مترجم

اللہ تبارک وتعالی کا لاکھ لاکھ احسان وکرم ہے کہ اس کی ذاتِ لاشریک نے فقہ شافعی کے موضوع پر اس ضخیم کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی سعادت بخشی، یہ کام تو تقریباً دو سال قبل پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا، لیکن اپنی دیگر مصروفیتوں اور طباعت کے لیے رقم کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے نظر ثانی کا کام باقی تھا، جو الحمد للہ اب پورا ہوگیا ہے۔

میں اپنے استاذ مولانا فاروق صاحب قاضی ندوی اور مولانا محمد ناصر صاحب اکرمی کا بڑا احسان مند ہوں کہ ان دونوں نے مجھے اس اہم کام کی ذمہ داری سونپنی، اللہ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کا نفع زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

ڈاکٹر عبد الحمید اطہر ندوی

۳ ذو القعدہ ۱۴۳۵ ہجری

امام شافعی کے بارے میں ائمہ ومحدثین کے اقوال

☆ امام شافعی دنیا کے لیے سورج کے مانند تھے، کیا ان دونوں کا جانشین یا بدل ہوسکتا ہے؟

☆ اگر شافعی نہ ہوتے تو ہم حدیث کی فقہ کو نہیں جانتے۔

☆ میں مسلسل تیس سالوں سے ہر دن شافعی کے لیے دعا کر رہا ہوں۔

☆ جس نے بھی دوات اور قلم کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تو اس کی گردن پر شافعی کا احسان ہے۔

(امام احمد بن حنبل)

☆ میں نے شافعی سے زیادہ عقل مند کسی کو نہیں دیکھا، اگر پوری امت کو جمع کیا جائے اور اس کو شافعی کی عقل سے موازنہ کیا جائے تو ان سبھوں پر شافعی کی عقل بڑھ جائے گی۔

(یونس بن عبد الاعلی)

☆ شافعی کے زمانے میں ان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا اور زیادہ متقی اور آپ سے زیادہ قرآن کو خوبصورت آواز میں پڑھنے والا میں نے نہ کسی کو دیکھا ہے اور نہ کسی کے بارے میں سنا ہے۔

(بحر بن نصر)

☆ میں کسی کو بھی نہیں جانتا کہ شافعی سے بڑھ کر اہل اسلام پر اس کا احسان ہو۔

(ابو زرعہ رازی)

پیش لفظ محقق

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله على جميع آلائه وجزيل نعمائه، والصلاة والسلام على خير خلقه وإمام أنبيائه، سيدنا ومولانا محمد ﷺ وعلى آله وصحبه أجمعين، والتابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين. بعد،

یہ کتاب ''لب اللباب فی تعلیم فقه الإمام الشافعی للأحباب'' میرے والد ماجد علامہ فقیہ محمد علی بن شیخ عبد الرحمٰن سلطان العلماء حفظہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے، جو پہلی مرتبہ عربی زبان میں شائع ہورہی ہے، اس کے فارسی ایڈیشن کئی مرتبہ شائع ہوچکے ہیں۔

اللہ عزوجل نے مجھے اس کی نشر واشاعت کرنے اور اس کی خدمت کی نگرانی کرنے کی توفیق عطا فرمائی، میں نے اس کی تصحیح اور مراجعت میں والد حفظہ اللہ کے ساتھ بہتر وقت گزارا، جس کے نتیجہ میں یہ کتاب اس بہترین قالب میں سامنے آئی، اس پر اللہ ہی کا فضل واحسان اور تعریف ہے، میں نے شروع کتاب میں والد ماجد کا مختصر تعارف پیش کیا ہے اور آپ کی پاکیزہ زندگی کا تھوڑے سے حصہ اور آپ کی چند تالیفات کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ وہ اس مفید کتاب پر میری توجہ کو اپنی رضامندی کا ذریعہ بنائے، اس کو مسلمانوں کے لیے مفید بنائے اور والد حفظہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہتر سلوک میں شمار فرمائے، کیوں کہ میں آپ ہی کا نتیجہ ہوں اور آپ کی برکات میں سے ہوں، اللہ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کے ذریعہ فائدہ پہنچائے۔

ہمارے آقا وسردار رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے تو وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا ہے''۔ اسی حدیث مبارک پر عمل کرتے ہوئے میں مندرجہ ذیل

بھائیوں اور احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں:

بھائی سید عبد القادر بن سید عقیل ہاشمی کا مشکور ہوں جنہوں نے کمپوز کردہ کتاب کا موازنہ اصل کتاب سے کیا اور اس کی تصحیح کا کام کیا۔

میرے عزیز برادر سید احمد بن سید جمال نورائی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے کتاب کی تصحیح اور مراجعت میں میرا تعاون کیا۔

موسسة دار الفتح للدراسات عمان۔ اردن کے مالک شیخ ایاز احمد غوج کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی علمی خدمت میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور اس کو اتنے خوبصورت پیرایہ میں شائع کیا، اللہ ان سبھوں کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، درود وسلام ہو ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ پر۔

وصلى الله على خاتم النبيين وإمام المرسلين سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

ڈاکٹر محمد عبد الرحیم سلطان العلماء

دبئ

۱۸ر رجب المعظم ۱۴۳۱ ہجری

مطابق یکم جولائی ۲۰۱۰ء

مختصر سوانح حیات مولف کتاب

شیخ محمد علی بن شیخ عبدالرحمٰن سلطان العلماء

شیخ محمد علی حفظہ اللہ کی پیدائش ۱۳۴۰ہجری مطابق ۱۹۲۰ء کو ہوئی، آپ نے مکتب میں قرآن کریم مکمل کیا، پھر اپنے والد ماجد عالم ربانی امام وشیخ عبدالرحمٰن بن یوسف الخالدی شافعی ملقب بہ سلطان العلماء کے پاس تعلیم حاصل کی اور آپ کے پاس شرعی علوم اور عربی فنون میں ماہر عالم بن کر فارغ ہوئے، پھر تعلیم کی تکمیل کے لیے ہندوستان پھر جامع ازہر کا رخ کیا، یہاں سے واپس ہونے کے بعد اپنے والد کے مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمات شروع کی، جس کو آپ کے والد نے ''لنجہ'' میں قائم کیا تھا۔

پھر آپ کے والد ۱۹۶۰ء کو وفات پا گئے، آپ اپنے والد کے بہترین جانشین بنے، اور مدرسہ رحمانیہ کی ذمے داری سنبھالی، نئے سرے سے مدرسہ میں جان ڈالی اور اس کو ''**مدرسة سلطان العلماء للعلوم الدينية**'' کا نام دیا، آپ وہاں تنہا چالیس سال تک سبھی علومِ شرعیہ پڑھاتے رہے اور آپ کے پاس سینکڑوں علماء اور فضلاء فارغ ہوئے اور ہزاروں طلباء نے استفادہ کیا، پھر انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں علم کو پھیلانے کا کام کیا، اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ ایران میں آج کوئی بھی خطیب اور امام ایسا نہیں ہے جس نے والد ماجد کی شاگردی اختیار نہ کی ہو یا آپ کے تلامذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا ہو۔

والد ماجد کی ان کوششوں اور جدوجہد کی وجہ سے مدرسہ مشہور زمانہ بن گیا اور بہت ہی زیادہ مقبول ہوا، یہاں ہر سال سینکڑوں طلباء علوم شرعیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، مدرسہ کی طرف سے طلباء کی تمام ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور مدرسہ ان کی کفالت کرتا ہے۔

''لنجہ'' میں اپنے قیام کے دوران چالیس سالوں تک والد ماجد ہر دن عوام کے لیے اپنی مجلس لگاتے تھے اور ان کے مسائل کو حل کرتے تھے، ان کے سوالوں کا جواب دیتے تھے، آپ کی مجلس ہمیشہ لوگوں سے معمور رہتی تھی۔

پھر آپ نے دبئی ہجرت کی اور یہیں سے مدرسہ کی نگرانی کر رہے ہیں، وہ مدرسہ کے امور مرتب کرتے ہیں اور اہلِ خیر حضرات کے تعاون سے مدرسہ کے اخراجات کو پورا کرتے ہیں، اب بھی مدرسہ طلباء کے لیے کھلا ہوا ہے اور مدرسہ میں تدریس کے فرائض والد ماجد کے چند شاگرد انجام دے رہے ہیں۔

شیخ محمد علی نے ملکِ ایران اور دوسرے ممالک میں بہت سے خیراتی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں حصہ لیا ہے، آپ کی کوششوں سے بہت سی مسجدیں، مدرسے، کالجس، ہاسپٹلس اور مکاتب تعمیر ہوئے ہیں، آپ نے بہت سے راستوں کو کشادہ کرنے میں حصہ لیا ہے، ایران میں عوام کے لیے مفید بہت سے منصوبوں میں آپ کا ہاتھ ہے، ان منصوبوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے، یہ منصوبے صرف ''لنجہ'' تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ اس کا دائرہ پورے ملک تک وسیع ہے بلکہ ملک سے باہر بھی آپ نے ان منصوبوں میں حصہ لیا ہے۔

دبئی ہجرت کرنے کے بعد آپ نے اپنی عادت کے مطابق اپنی مجلس شروع کی، جو آباد رہتی ہے اور آپ اس میں لوگوں کا استقبال کرتے ہیں، اور ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں، جس کی وجہ سے آپ کی مجلس اس ملک میں علم کے میناروں میں سے ایک مینار بن گئی ہے، شیخ کی مسجد میں شیخ ہی کے منظّم علمی حلقے لگتے ہیں، ان آخری سالوں میں شیخ نے دبئی میں ''**كلية سلطان العلماء للعلوم الشرعية**'' (سلطان العلماء کالج برائے علومِ شرعیہ) قائم کیا ہے، یہ ایک ایسی کالج ہے جس میں علومِ شرعیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، خصوصاً فقہ اور قضاء کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے، ہم اللہ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ اپنی مشیئت سے عنقریب اس کے افتتاح کو آسان فرمائے۔

شیخ نے ستر سے زائد قیمتی کتابیں تصنیف کی ہے، جن میں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی،

بعض شائع ہوئی ہیں اور بعض زیرِ طبع ہیں، بعض تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔صفوة العرفان فی تفسیر القرآن (یہ کتاب کئی مرتبہ دبی اور دوحہ وغیرہ سے شائع ہوئی ہے۔اس کی دس جلدیں ہیں)

۲۔شـرح الأربعين النووية (اس کے بیس سے زائد ایڈیشن دبی، بیروت، ہندوستان اور دوحہ سے نکل چکے ہیں)

۳۔غاية المأمول فی سيرة الحبيب الرسول (متعدد ایڈیشن)

٤۔شرح رياض الصالحين

٥۔طريق السعادة والسداد فی إصلاح المجتمع بالوعظ والإرشاد (اس کے ہندوستان اور دوحہ سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں)

٦۔الخطب المنبرية (چار جلدیں؛ دبی اور دوحہ سے شائع ہوئی ہے)

۷۔شرح متن الغاية والتقريب المشهور بمتن أبی شجاع (متعدد ایڈیشن)

۸۔لب اللباب فی تعليم فقه الإمام الشافعی للأحباب (عربی وفارسی، اس کے فارسی میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، عربی کا پہلا ایڈیشن ہے)

۹۔رياض السالكين (متعدد ایڈیشن)

۱۰۔شكر النعم المتوالية فی شرح العقيدة الطحاوية

۱۱۔الاحتفاء والابتهاج بالإسراء والمعراج

۱۲۔شرح بلوغ المرام فی أدلة الأحكام

۱۳۔شرح كتاب الأذكار للإمام النووی رحمه الله

۱٤۔الخلفاء الراشدون رضی الله عنهم

۱٥۔الاعتكاف؛ آداب وشروط

۱٦۔آداب تلاوة القرآن

۱۷۔الرياضة فی الإسلام

۱۸۔احفظوا الشباب من داء المخدرات

۱۹۔عقوبة تارك الصلاة

۲۰۔فلسفة الزكاة فی الإسلام

۲۱۔الشـرعيـات (اس کی تین جلدیں ہیں، جو مختلف مراحل کے طلبہ کے لیے تحریر کی گئی ہے، اس میں اختصار کے ساتھ شرعی احکام کا تذکرہ ہے)

آپ کی تالیفات کو بڑی قبولیت ملی ہے اور آپ کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، اور بہت سے ملکوں میں عام ہوئی ہیں اور بعض کتابیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں، آپ کے بعض طلبہ نے آپ کی کتابوں کو انٹرنیٹ پر ڈاؤن لوڈ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا فائدہ عمومی ہو گیا ہے۔

آپ اپنے وقت کی حفاظت کرنے اور تالیف وتدریس اور لوگوں کی طرف سے پیش کیے جانے والے مشکل مسائل کا جواب دینے میں وقت سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں، اس کے ساتھ آپ معاشرتی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں، ان سب کاموں میں آپ کا مقصد صرف اللہ کی رضامندی ہے، آپ شہرت کی طلب سے اور دنیا کا مال ومتاع حاصل کرنے سے کوسوں دور ہیں، اگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی آپ کی کرامات اور اللہ تعالی پر حقیقی معنی میں توکل اور بھروسہ وغیرہ کا تذکرہ کرنا چاہوں تو بات بڑی طویل ہو جائے گی۔

اللہ تعالی والد ماجد کو محفوظ رکھے اور آپ کی عمر میں صحت وعافیت اور بھلائی کے ساتھ درازی عطا فرمائے، آپ کے ذریعہ اور آپ کے علوم کے ذریعہ فائدہ پہنچائے، آپ کے اہل واولاد میں برکت عطا فرمائے، ان سبھوں سے اسی طرح امت کو فائدہ پہنچائے جس طرح آپ سے، آپ کے والد اور اجداد سے فائدہ پہنچایا ہے، آپ جن خیراتی منصوبوں کی نگرانی کر رہے ہیں ان کو آگے بڑھائے اور ترقی دے، یہ بات اللہ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں ہے اور تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہی ہیں۔

پیش لفظ

الحمد لله الكريم الوهاب، الهادى التواب، الذى أنزل آياته البينات وجعلها عبرة لأولى الألباب، أحمده حمد عبد منيب أواب، وأصلى وأسلم على نبيه الكريم الجناب، الرؤوف الرحيم الموقر المجاب، وعلى آله الكرام الأطياب، وصحبه الغر الأنجاب، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم المآب. وبعد،

مطلبی امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کی تعلیم میں یہ بہت ہی آسان کتاب ہے، میں نے اس میں مسلکِ شافعی کے اہم اہم مسائل کو جمع کیا ہے اور فقہ کے سبھی ابواب کو تحریر کیا ہے، میں نے اس میں آسان عبارت کو اختیار کیا ہے جو بالکل واضح ہے، اور میں نے اس کا نام رکھا ہے:

لب اللباب

فی تعليم فقه الإمام الشافعی للأحباب

میں اللہ جل جلالہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو فائدہ پہنچائے اور اس کے لیے برکت اور سمجھنے کا ذریعہ بنائے اور اپنے پاس ثواب کا سبب بنائے، اس دن جب نہ کوئی مال فائدہ پہنچائے گا اور نہ اولاد، بس فائدہ اسی کو ہوگا جو اللہ کے پاس صحیح سالم دل لے آئے گا۔

میں یہاں سے کتاب شروع کرتا ہوں اور اللہ تعالی کی مدد سے کہتا ہوں:

تعارف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

(مراجع تعارف: حلیۃ الأولیاء: ابونعیم اصبہانی ۹:۶۳-۱۶۱، الفہرست: ابن الندیم ص۲۶۳، فی مناقب الأئمۃ الثلاثۃ الفقہاء: ابن عبدالبر ص ۶۵-۱۲۱، تاریخ بغداد: خطیب بغدادی، طبقات الفقہاء: ابواسحاق شیرازی ۴۸-۵۰، الأنساب: سمعانی ۷/ ۲۵۱-۲۵۴، تاریخ دمشق: ابن عساکر ۱۴/ ۳۹۵-۴۱۸، ۱۵/ ۱-۲۵، صفۃ الصفوۃ: ابن الجوزی ۲/ ۹۵، معجم الأدباء: یاقوت الحموی ۱۷/ ۲۸۱-۳۲۷، تھذیب الأسماء واللغات: امام نووی ۱/ ۴۴-۶۷، وفیات الأعیان: ابن خلکان ۴/ ۱۶۳-۱۶۹، تذکرۃ الحفاظ: ذہبی ۱/ ۳۶۱-۳۶۳، سیر أعلام النبلاء: ذہبی ۱۰/ ۵، الوافی بالوفیات: صفدی ۲/ ۱۷۱-۱۸۱، مرآۃ الجنان: یافعی ۲/ ۱۳-۲۸، طبقات الشافعیۃ الکبری: سبکی جلد اول، البدایۃ والنھایۃ: ابن کثیر ۱۰/ ۲۵۱-۲۵۴، تھذیب التھذیب: ابن حجر ۹/ ۲۵، إتحاف السادۃ المتقین شرح إحیاء علوم الدین: زبیدی ۱/ ۱۹۱-۲۰۱ وغیرہ، بہت سے ائمہ نے امام شافعی پر مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً آبری، ابن ابی حاتم، بیہقی، فخر الدین رازی، ابن حجر عسقلانی وغیرہ)

امام، عالم زمانہ، ناصرِ حدیث، فقیہِ ملت ابوعبداللہ محمد بن ادریس ابن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب قرشی مطلبی شافعی مکی، پیدائش غزہ میں ہوئی، رسول اللہ ﷺ کے خاندانی اور آپ کے چچا کی اولاد سے تعلق رکھنے والے، کیوں کہ مطلب ہاشم کے والد ہیں جو عبدالمطلب کے والد ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے: تمام اہل سیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شافعی قرشی اور مطلبی ہیں اور آپ کی ماں کا تعلق قبیلہ ازد سے ہے۔ قریش کے فضائل میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں اور تمام عرب کے قبائل اور دنیا کے سبھی لوگوں پر قبیلہ قریش کی فضیلت پر امت کا اجماع ہے۔ (المجموع شرح المہذب: امام نووی ۱/ ۷)

حافظ ابوعبداللہ ذہبی نے لکھا ہے: آپ کے دادا سائب مطلبی ہیں، آپ جنگ بدر

میں حالتِ کفر میں شریک ہونے والوں میں سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے، اس جنگ میں ان کو قید کیا گیا، وہ نبی ﷺ کے مشابہ تھے، ان کی والدہ شفاء بنت ارقم نضلہ ہے، نضلہ نبی ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے بھائی ہیں، کہا گیا ہے کہ جب انہوں نے اپنا فدیہ دیا اور چھوٹ گئے تو اسلام لے آئے، ان کے بیٹے شافع نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ کا شمار صغارِ صحابہ میں ہوتا ہے، ان کے بیٹے عثمان تابعی ہیں، مجھے ان سے زیادہ روایتوں کے بارے میں معلوم نہیں ہے، شافعی کا ننہال قبیلہ ازد ہے۔ (سیر أعلام النبلاء ۱۰/ ۹)

نشو ونما اور اخلاق

اس بات پر اصحاب سیر کا اتفاق ہے کہ شافعی کی پیدائش ۱۵۰ ہجری کو ہوئی، یہ وہی سال ہے جس میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ (المجموع شرح المھذب: امام نووی ۱/ ۷) اسی طرح یہ بات بھی متفقہ ہے کہ امام کی پیدائش غزہ میں ہوئی، آپ کے والد ادریس کی وفات جوانی میں ہی ہوئی، اس وجہ سے محمد کی پرورش یتیمی کی حالت میں والدہ کی گود میں بڑی تنگی میں ہوئی، والدہ کو آپ کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوا تو آپ کو لے کر مکہ تشریف لائیں، اس وقت آپ کی عمر دو سال تھی، یہیں آپ کی نشو ونما ہوئی، آپ تیر اندازی کی طرف متوجہ ہوئے، یہاں تک کہ اس فن میں اپنے ساتھیوں پر سبقت لے گئے، آپ کے دس تیروں میں سے نو نشانے پر لگتے تھے، پھر آپ نے زبانِ عربی اور شعر وشاعری کی طرف توجہ کی اور اس کے ماہر بن گئے، آپ بچپن میں ہی علماء کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

حمیدی نے لکھا ہے: میں نے شافعی کو کہتے ہوئے سنا: میں اپنی ماں کی پرورش میں یتیم تھا، اس کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ وہ معلم کو دے، معلم اس بات پر مجھے پڑھانے پر راضی ہوئے کہ جب وہ موجود نہ رہیں تو میں بچوں کی نگرانی کروں اور معلم کا بوجھ ہلکا کروں۔

امام شافعی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں ہڈیوں پر لکھتا تھا اور میں دیوان خانہ جاتا تھا اور جلدیں مانگ کر لیتا تھا اور ان پر لکھتا تھا۔

حمیدی نے کہا ہے: امام شافعی نے کہا: میں نحو اور ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے

نکلا تو میری ملاقات مسلم بن خالد زنجی سے ہوئی، انہوں نے دریافت کیا: نوجوان! تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟ میں نے کہا: میرا تعلق اہلیانِ مکہ سے ہے۔ انہوں نے دریافت کیا: تمہارا گھر کہاں ہے؟ میں نے کہا: خیف کی وادی میں۔ انہوں نے دریافت کیا: تمہارا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟ میں نے کہا: عبدِ مناف سے۔ انہوں نے کہا: بہت خوب بہت خوب! اللہ نے تم کو دنیا اور آخرت میں شرف سے نوازا ہے، تم نے اپنا دماغ اس فقہ میں نہیں لگایا، یہ تمہارے لیے بہتر ہے؟! اس وقت سے میں نے مسلم بن خالد کو لازم پکڑ لیا۔

امام شافعی نے مکہ ہی میں اپنے چچا محمد بن علی بن شافع سے علم حاصل کیا، وہ شافعی کے دادا عباس کے چچازاد بھائی تھے، اسی طرح داود بن عبدالرحمٰن عطار، سفیان بن عیینہ اور فضیل بن عیاض وغیرہ متعدد علماء سے علم حاصل کیا۔

بیس سے کچھ زیادہ عمر کو پہنچے تو مدینہ کا سفر کیا، اس وقت آپ افتاء اور امامت کے اہل بن چکے تھے، وہاں مالک بن انس سے موطا کا درس لیا اور اس کو یاد کر لیا، امام مالک نے آپ سے کہا: اللہ سے ڈرو اور گناہوں سے بچو، تمہاری عنقریب ایک بڑی شان ہونے والی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ امام مالک نے آپ سے کہا: اللہ عزوجل نے تمہارے دل پر نور کو ڈال دیا ہے، اس لیے اس کو گناہوں سے نہ مٹاؤ۔

حجاز میں ابراہیم بن ابی یحییٰ سے بہت علم حاصل کیا، اسی طرح عبدالعزیز دراوردی، عطاف بن خالد، اسماعیل بن جعفر، ابراہیم بن سعد اور ان کے ہم عصروں کی شاگردی اختیار کی۔

یمن میں مطرف بن مازن، ہشام بن یوسف قاضی اور دیگر علماء سے، بغداد میں عراق کے فقیہ محمد بن حسن سے علم حاصل کیا اور ان کے ساتھ لگے رہے اور ان سے ایک اونٹ کتابیں لی، اسی طرح اسماعیل بن عُلیہ اور عبدالوہاب ثقفی وغیرہ سے استفادہ کیا۔

حافظ ذہبی کہتے ہیں: آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کی اور علم کو مدون کیا، احادیث کے دلائل سے ائمہ کی تردید کی، اصولِ فقہ اور فقہی فروعات میں تالیف کی، آپ کو بڑی شہرت ملی اور آپ کے پاس طلبہ کی کثرت ہوئی، بڑے بڑے علماء نے اس امام کے بارے میں

قدیم زمانہ میں بھی تصنیف کی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ (طبقات الشافعیۃ الکبری میں تاج الدین السبکی ۱/۳۴۳۔۳۴۵ نے تحریر کیا ہے: جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام شافعی کے مناقب میں جس نے سب سے پہلے تصنیف کی ہے وہ ہیں امام داود بن علی اصفہانی؛ امام اہل ظاہر، اس بارے میں ان کی کئی تصنیفات ہیں۔ پھر زکریا بن یحیی ساجی اور عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے کتاب تحریر کی، پھر ابوالحسن محمد بن حسین بن ابراہیم آبری نے ایک طویل کتاب تصنیف کی جس کو ۷۴ ابواب میں مرتب کیا، پھر حاکم ابوعبداللہ بن بیّع نے جامع کتاب تصنیف کی، ان ہی کے زمانے میں ابوعلی الحسن بن حسین بن حمکان اصبہانی نے بھی ایک مختصر کتاب تحریر کی، پھر امام زاہد اسماعیل بن محمد سرخسی قراب نے طویل کتاب لکھی جس کو ۱۱۶ ابواب میں مرتب کیا، پھر جلیل القدر استاذ ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادی نے دو کتابیں تحریر کی، ان میں سے ایک بڑی طویل ہے جو مناقب کے ساتھ خاص ہے اور دوسری مختصر اور محقق ہے جو جرجانی حنفی کی تردید میں ہے جنہوں نے اس امام کے ساتھ گستاخی کی ہے، پھر حافظ ابوبکر بیہقی نے مناقب میں اپنی مشہور، بہترین، جامع اور محقق کتاب تصنیف کی، اور اس طرح کی دوسری کتابیں بھی تحریر کی، مثلاً ''بیان خطأ من أخطأ علی الشافعی'' وغیرہ، پھر حافظ ابوبکر خطیب نے مناقب کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور ایک مختصر رسالہ ''الاحتجاج بالشافعی'' تحریر کیا، پھر امام فخرالدین رازی نے اپنی مشہور کتاب لکھی، حافظ ابوعبیداللہ محمد بن محمد بن ابی زید اصبہانی المعروف بہ ابن المقری نے دو کتابیں تحریر کی، ایک کتاب کا نام ہے: ''شفاء الصدور فی محاسن صدر الصدور'' اور دوسری کتاب بڑی تختی میں ہے، جو ''شفاء الصدور'' کا اختصار ہے، اس کا نام ہے: ''الکتاب الذی أعده شافعی فی مناقب الإمام الشافعی''۔ حافظ ابوالحسن بن ابوقاسم بیہقی المعروف بہ فندق نے مناقب میں ایک بڑی طویل کتاب تحریر کی)

مزنی کہتے ہیں: میں نے شافعی رحمہ اللہ سے بڑھ کر کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا، آپ کبھی اپنی داڑھی مٹھی میں لیتے تو آپ کی مٹھی سے زائد نہیں رہتی۔

عمرو بن سواء کہتے ہیں: شافعی نے مجھ سے کہا: میں تیراندازی اور طلب علم کا شوقین تھا، مجھے تیراندازی میں اتنی مہارت ہوگئی کہ میں دس میں سے دس نشانے لگاتا تھا۔ آپ اپنے علم کے بارے میں بولنے سے خاموش رہے تو میں نے کہا: اللہ کی قسم! آپ علم میں تیر اندازی میں مہارت سے بڑھ کر ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اپنے زمانہ میں اہلِ حدیث کے امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے آپ سے اصولِ فقہ میں ایک کتاب تصنیف کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے ''کتاب الرسالۃ'' تصنیف کی، یہ اصولِ فقہ میں لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب ہے، عبد الرحمٰن اور یحیی بن سعید قطان کو یہ کتاب بڑی پسند آئی، قطان اور احمد بن حنبل اپنی نمازوں میں شافعی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔

امام نووی کہتے ہیں: شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت عراق میں مشہور ہوئی اور آپ کی شہرت پورے عالم میں ہوگئی، آپ کے فضل کے معترف موافقین بھی ہیں اور مخالفین بھی، اس کا اعتراف سبھی علماء نے کیا ہے، خلفاء اور گورنروں کے پاس آپ کا مرتبہ بہت بڑا تھا، آپ کی جلالت شان اور امامت ان کے پاس طے ہوگئی، آپ کی افضلیت اہلِ عراق وغیرہ کے ساتھ مناظروں میں ظاہر ہوگئی جیسی افضلیت کسی دوسرے کی ظاہر نہیں ہوئی۔

اصول وقواعد اور اہم اہم ضوابط آپ کے قلم سے نکلے جو آپ کے علاوہ کسی کے بھی قلم سے نہیں نکلے، آپ کو بہت سے موقعوں پر آزمائش میں مبتلا کیا گیا اور بہت سے مسائل میں آپ کو آزمایا گیا جن کا شمار بھی ممکن نہیں، ان موقعوں پر آپ کا جواب بالکل صحیح ہوتا، چھوٹے بڑے، ائمہ و بڑے بڑے علماء، اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے اور فقہی مسالک کو ماننے والے؛ سبھوں نے آپ سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ کی شاگردی اختیار کی، ان میں سے بہت سوں نے اپنے مسلک کو چھوڑ دیا اور آپ کا مسلک اختیار کیا مثلاً ابوثور اور بہت سے دیگر افراد، بہت سے اپنے شیوخ اور کبار ائمہ سے حصولِ علم کو ترک کر کے شافعی کے ساتھ لگ گئے، کیوں کہ انہوں نے شافعی کے پاس وہ علم دیکھا جو دوسرے کے پاس نہیں تھا، اللہ نے آپ کے لیے اور ان کے لیے ان علوم میں اور محاسن وصفات اور بہت سی بھلائیوں میں برکت عطا فرمائی۔

آپ نے اپنی تمام جدید کتابیں مصر میں تصنیف کی، اور آپ کی شہرت عالم میں پھیل گئی، شام، عراق، یمن اور دنیا کے دیگر علاقوں سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کرنے اور آپ کی نئی

کتابوں کو سننے اوران سے استفادہ کرنے کے لیے آپ کا رخ کیا، آپ مصر والوں اور دوسرے علاقے والوں پر چھا گئے، اور ایسے ابواب اور فصلیں ایجاد کی جو پہلے لکھی نہیں گئی تھیں، ان میں سے اصول فقہ، کتاب القسامۃ، کتاب الجزیۃ، باغیوں کے خلاف جنگ وغیرہ ہیں۔

امام شافعی کے مناقب اورآپ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جامع کلام

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی اور آپ کے حالات کے بارے میں جامع گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ بات جان لو کہ امام شافعی مناقب وصفات کی سبھی قسموں میں اعلی مقام پر فائز تھے، کیوں کہ اللہ تعالی نے آپ میں سبھی بھلائیاں جمع کردی تھی، اور آپ کو سبھی بہترین صفات کی توفیق دی تھی اور آپ کے لیے مکارم اخلاق کو آسان بنا دیا تھا، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں: پاکیزہ نسب اور ماہرانہ عنصر کی شرافت، نسب میں آپ کا اور رسول اللہ ﷺ کا ایک ہی شجرہ سے منسلک ہونا، یہ انتہا درجہ کی فضیلت اور انتہا درجہ کا حسب نسب ہے۔

جائے پیدائش اور جائے پرورش کی عظمت؛ کیوں کہ آپ کی پیدائش مقدس سرزمین میں ہوئی اور نشو ونما مکہ میں، آپ کی پیدائش اس وقت ہوئی جب کتابیں مرتب کی جاچکی تھیں اور تصنیف ہوچکی تھیں، احکام مقرر کیے جاچکے تھے اور ان کی تنقیح ہوچکی تھی، آپ نے متقدمین کے مسالک کو دیکھا اور نمایاں ائمہ سے اخذ کیا، ماہرین کے ساتھ مناظرہ کیا، اس وجہ سے ان کے مسالک پر آپ نے نظر کی اور ان کو غور سے دیکھا، ان کی تحقیق کی اور ان کا تجربہ کیا، پھر آپ نے قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کے جامع ایک مسلک کا خلاصہ پیش کیا اور ان میں سے بعض پر اکتفا نہیں کیا۔

انتخاب وترجیح، تکمیل اور تنقیح کے لیے اپنی کمال صلاحیت، علو ہمت، تمام قسم کے فنون میں مہارت اور ان پر مکمل مقدرت کے ساتھ فارغ ہوگئے، آپ قرآن وحدیث سے استنباط کرنے میں ماہر تھے، ناسخ اور منسوخ، مجمل اور مفصل اور خاص وعام وغیرہ خطاب کی تقسیمات کو جاننے میں بڑے ماہر تھے، اس دروازہ کو آپ سے پہلے کسی نے نہیں کھولا، کیوں

کہ کسی بھی اختلاف اور شک کے بغیر آپ ہی نے اصول فقہ میں سب سے پہلے تصنیف کی۔

عربوں کی زبان اور ان کے نحو وصرف میں آپ امام وحجت تھے، آپ نے اپنی بلاغت وفصاحت کے ساتھ عربی زبان میں بیس سال گزارے، حالانکہ خود آپ کی زبان عربی ہے، آپ کی جائے پرورش عرب ہے اور آپ کا زمانہ عربی دانوں کا ہے، اور اسی کے ذریعہ قرآن اور حدیث کو جانا جاتا ہے، تمام مورخین، احادیث کے حاملین اور اخبار کے ناقلین پر آپ کے بڑے احسانات ہیں کیوں کہ آپ نے ان کو سنن کے معانی سے واقف کرایا اور ان کو اس جانب متوجہ کرایا، جس کے نتیجہ میں ان کی بات مخالفین پر غالب آگئی۔

محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اگر کسی دن اصحابِ حدیث گفتگو کریں تو شافعی کی زبان سے گفتگو کریں گے۔ یعنی جب شافعی نے اپنی کتابیں ترتیب دی۔

آپ نے حدیث کی مدد ونصرت اور سنت کی اتباع میں بڑی جد وجہد کی اور انہوں نے اپنے مسلک میں پختگی وتحقیق اور معانی پر مکمل غور وخوض کے ساتھ تمام قسم کے دلائل کو جمع کیا، یہاں تک کہ آپ کو ناصر الحدیث کا لقب دیا گیا جب آپ عراق آئے، اور متقدمین علماء اور خراسانی فقہاء کے نزدیک قدیم زمانے میں اور آج آپ کے پیروکاروں کو اصحابِ حدیث کا لقب ملا۔

امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ معروف بہ امام الائمہ کہتے ہیں جو حفظِ حدیث اور سنت کی معرفت میں بلند مقام ومرتبہ پر فائز تھے، جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کوئی ایسی صحیح حدیث جانتے ہیں جس کو امام شافعی نے اپنی کتابوں میں نہ لکھا ہو؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں۔

آپ بڑے عبادت گزار، متقی وپرہیزگار، سخی اور زاہد تھے۔ (المجموع شرح المھذب: امام نووی ۱/۷)

رجب ۲۰۴ ہجری میں یہ امام ربانی اپنے رب سے جاملا اور قیامت تک کے لیے اپنا پاکیزہ تذکرہ چھوڑ گیا۔ اللہ آپ سے راضی ہو۔

امام شافعی کے اقوال زرین

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

جو دنیا کو چاہے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور جو آخرت کو چاہے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔

امام کہتے ہیں: فرائض کے بعد اللہ تعالی سے قریب کرنے والی طلبِ علم سے بڑھ کر کوئی افضل چیز نہیں ہے۔

امام کہتے ہیں: میں چاہتا ہوں کہ جو علم بھی میں نے حاصل کیا ہے اس کو لوگ سیکھ لیں، اس پر مجھے اجر ملے اور لوگ میری تعریف نہ کریں۔

امام کہتے ہیں: جس کو تقوی باعزت نہ کرے تو اس کے لیے کوئی عزت نہیں۔

امام کہتے ہیں: دنیا کی بے کار چیزوں کی تلاش ایسی سزا ہے جس کے ذریعہ اللہ اہلِ توحید کو سزا دیتا ہے۔

امام کہتے ہیں: جس پر دنیا کی سخت خواہش غالب آجائے تو دنیا والوں کی بندگی اس کے لیے ضروری ہو جاتی ہے، اور جو قناعت پر راضی ہو جائے تو اس سے (دنیا والوں کے سامنے) جھکاؤ ختم ہو جاتا ہے۔

امام کہتے ہیں: دنیا اور آخرت کی بھلائی پانچ چیزوں میں ہے: دل کی بے نیازی، دوسروں کو تکلیف دینے سے باز آنا، حلال کمائی، تقوی کا لباس، اور ہر حال میں اللہ تعالی پر بھروسہ۔

امام کہتے ہیں: جو اس بات کو چاہتا ہے کہ اللہ اس کا دل کھول دے یا اس کو نور سے بھر دے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے اور گناہوں سے بچے، اور اس کے اور اللہ تعالی کے درمیان مخفی عمل ہو۔ ایک دوسری روایت میں ہے: تو اس کے لیے خلوت، کم کھانا، بیوقوفوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑنا اور ان اہل علم سے بغض رکھنا ضروری ہے جن کے پاس نہ انصاف ہے اور نہ ادب۔

امام نے یونس بن عبدالاعلی سے کہا: اگر تم سبھی لوگوں کو خوش کرنے کی پوری کوشش کر لو تو اس کی کوئی راہ نہیں ہے، اس لیے اپنے عمل اور نیت کو اللہ عزوجل کے لیے خالص کرو۔

امام کہتے ہیں: ریا کو مخلص کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

امام کہتے ہیں: لوگوں کی سیاست (ان کو لے کر چلنا) چوپایوں کی سیاست (ان کو لے کر چلنے) سے زیادہ سخت ہے۔

امام کہتے ہیں: عقل مند وہ ہے جس کی عقل اس کو ہر قابل مذمت چیز سے روک دے۔

امام کہتے ہیں: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے میری مروءت میں کمی آتی ہے تو میں ٹھنڈا پانی نہیں پیوں گا۔

امام کہتے ہیں: مروءت کے چار ارکان ہیں: حسن اخلاق، سخاوت، تواضع اور عبادت۔

امام کہتے ہیں: مروءت یہ ہے کہ اعضاء کو لایعنی کاموں سے باز رکھا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا: مروءت والے مشقت میں ہیں۔

امام کہتے ہیں: جو چاہتا ہے کہ اللہ اس کے حق میں خیر کا فیصلہ فرمائے تو وہ لوگوں کے ساتھ اچھا گمان رکھے۔

امام کہتے ہیں: دنیا میں مرد اسی وقت مکمل ہوتے ہیں جب ان میں چار چیزیں پائی جائیں: دیانت، امانت، حفاظت اور پختگی۔

امام کہتے ہیں: وہ تمہارا بھائی نہیں ہے جس کی تمہیں چاپلوسی کرنی پڑے۔

امام کہتے ہیں: جو اپنے بھائی کی اخوت میں سچا ہے تو وہ اس کے اعذار کو قبول کرتا ہے، اس کی کمی کو پورا کرتا ہے اور اس کی غلطیوں کو معاف کرتا ہے۔

امام کہتے ہیں: دوست کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ اس کے دوست کے دوست کا دوست ہو۔

امام کہتے ہیں: کوئی خوشی دوستوں کی صحبت کے برابر نہیں اور کوئی غم ان کی جدائی کے برابر نہیں۔

امام کہتے ہیں: اپنے بھائی کے حق میں اس کی مودت پر اعتماد کرتے ہوئے کوتاہی مت کرو۔

امام کہتے ہیں: تم اپنا رخ اس کی طرف نہ کرو جس کے لیے تمہیں لوٹانا آسان ہو۔

امام کہتے ہیں: جس نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا تو اس نے تم کو باندھ دیا اور جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تو اس نے تم کو آزاد کیا۔

امام کہتے ہیں: جو تمہارے پاس چغلی کھاتا ہے تو وہ تمہاری بھی چغلی کھاتا ہے، اگر تم اس کو راضی کرو گے تو وہ تمہارے بارے میں وہ بات کہے گا جو تم میں نہیں ہے، اگر تم اس کو غصہ دلاؤ گے تو وہ تمہارے بارے میں ایسی بات کہے گا جو تم میں نہیں ہے۔

امام کہتے ہیں: جو خود کو اپنی حیثیت سے زیادہ بلند کرے تو اللہ اس کو اس کی حیثیت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

امام کہتے ہیں: جو باطل کے ذریعہ زینت اختیار کرے تو اس کا پول کھول دیا جاتا ہے۔

امام کہتے ہیں: تواضع سے محبت پیدا ہوتی ہے اور قناعت سے راحت ملتی ہے۔

امام کہتے ہیں: لوگوں میں سب سے زیادہ بلند قدر و قیمت والا وہ ہے جو اپنی قدر نہ دیکھے اور ان میں سب سے زیادہ فضل والا وہ ہے جو خود اپنا فضل نہ دیکھے۔

امام کہتے ہیں: جب ضرورتیں زیادہ ہوں تو ان میں سے سب سے زیادہ اہم سے ابتدا کرو۔

امام کہتے ہیں: سفارشیں مروءتوں کی زکوۃ ہے۔

یہ بڑا ہی وسیع موضوع ہے، اسی لیے ہم ان ہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں اور ان کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اللہ امام شافعی پر رحم فرمائے اور ہم کو آپ کے علوم و آداب سے فائدہ پہنچائے۔ آمین

علمِ فقہ کی ابتدائی باتیں

علامہ محقق محمد بن علی صبان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: (علامہ، محقق، اپنے ساتھیوں میں ممتاز ابو العرفان محمس بن علی الصبان مصری شافعی متوفی ۱۲۰۶، ان کی پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی، وہ زبان عربی اور ادب کے عالم و ماہر اور محقق ہیں، آپ نے شرعی اور عقلی علوم میں مہارت حاصل کی، آپ کی شہرت اور فضل مصر اور شام کے علماء میں بڑی تھی، آپ کی مشہور تصنیف ''شرح الأشمونی علی ألفیۃ ابن مالک'' ہے، آپ کا تعارف دیکھا جائے: عجائب الآثار: جبرتی ۲/ ۲۲۷، الأعلام: زرکلی ۶/ ۲۹۷)

إِنَّ مَبَادِیَ کُلِّ فَنٍّ عَشَرَۃٌ   اَلْحَدُّ، وَالْمَوْضُوْعُ، ثُمَّ الثَّمَرَۃُ

وَفَضْلُہُ، وَنِسْبَتُہُ وَالْوَاضِعُ   وَالْاِسْمُ، وَالْاِسْتِمْدَادُ، وَحُکْمُ الشَّارِعِ

مَسَائِلُ، وَالْبَعْضُ بِالْبَعْضِ اکْتَفٰی   وَمَنْ دَرَی الْجَمِیْعَ حَازَ الشَّرَفَا

ہر فن کی مبادیات دس ہیں، تعریف، موضوع پھر نتیجہ

اس کی فضیلت، نسبت، اس کو وضع کرنے والا، کہاں سے حاصل کیا گیا ہے، اس بارے میں شارع کا حکم

مسائل، بعض لوگ ان میں سے بعض پر اکتفا کرتے ہیں اور جس نے ان سبھوں کو جان لیا تو اس نے شرف کو پالیا۔

علم فقہ کی تعریف: شرعی عملی احکام کو جاننا جن کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا گیا ہو۔

فقہ کا موضوع: مکلفین کے اعمال وافعال

فقہ کا نتیجہ: اللہ کے اوامر کو بجالانا اور منع کردہ امور سے بچنا، یہی حقیقی تقوی ہے اور اسی سے دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

فقہ کی فضیلت: آیات کریمہ اور احادیث شریفہ سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ یہ علم توحید کے بعد تمام علوم میں سب سے افضل ہے۔

فقہ کی نسبت: اس کی نسبت علوم شرعیہ کی طرف ہے۔

فقہ کو وضع کرنے والے: صحابہ، تابعین اور ان کے بعد والوں میں سے ائمہ مجتہدین، ان میں مشہور جن کے اجتہادات کو مدون کیا گیا اور ان کو محفوظ رکھا ہے وہ ہیں: امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی، مالک بن انس اصبحی، محمد بن ادریس شافعی اور احمد بن حنبل۔

نام: علم فقہ ہے یا علمِ احکام شرعیہ، یا حلال وحرام کا علم، یا فقہ اصغر، یا دین کے فروعات

کہاں سے حاصل کیا گیا ہے: قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس

فقہ کے بارے میں شارع کا حکم:

۱۔فرض عین: اتنی مقدار میں جس پر عبادت کی صحت موقوف ہے مثلاً طہارت، نماز، روزہ، اور جس پر معاملات کی صحت موقوف ہے مثلاً خرید وفروخت اور نکاح۔

۲۔فرض کفایہ: جو اس سے زائد فتوی کے مرتبہ تک پہنچے۔

۳۔مستحب: جو فتوی کے مرتبہ سے زیادہ ہو۔

فقہ کے مسائل: بہت سے ہیں مثلاً طہارت نماز کے لیے شرط ہے، وضو میں چہرہ دھونا فرض ہے، وغیرہ

وہ احکام شرعیہ جن پر فقہ کا مدار ہے

حکم شرعی کی دو قسمیں ہیں: حکم شرعی تکلیفی اور حکم شرعی وضعی

حکم شرعی تکلیفی وہ ہے جو اللہ تعالی کا مکلفین کے افعال سے متعلق خطاب ہے۔

اس کی پانچ قسمیں ہیں: فرض، سنت، حرام، مکروہ اور مباح

۱۔فرض

اس کے لغوی معنی حصہ اور لازم کے ہیں۔ اور شرعی معنی جس کا شارع نے لازمی طور پر مطالبہ کیا ہو۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور اس کے چھوڑنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔

اس کے مترادف الفاظ یہ ہیں: مکتوب، واجب، رکن، لازم، حتمی

۲۔سنت

اس کے لغوی معنی طریقہ کے ہیں، اور شرعی معنی جس کا شارع نے لازمی طور پر مطالبہ نہ کیا ہو۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور اس کے چھوڑنے والے کو سزا نہیں دی جاتی ہے۔

اس کے مترادف الفاظ یہ ہیں: مندوب، مستحب، حسن، مرغوب فیہ، تطوع، نافلہ، فضیلت۔

۳۔حرام

اس کے لغوی معنی منع کردہ کے ہیں۔ اور شرعی معنی جس سے شارع نے لازمی طور پر

منع کیا ہو۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے چھوڑنے والے کو ثواب ملتا ہے اور اس کے کرنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔

اس کے مترادف الفاظ یہ ہیں: محظور، ممنوع، گناہ، معصیت، جس کے کرنے پر وعید سنائی گئی ہے، اور زجر و توبیخ کی گئی ہے۔

۴۔مکروہ

اس کے لغوی معنی ناپسندیدہ کے ہیں۔اور شرعی معنی جس سے شارع نے لازمی طور پر منع نہ کیا ہو۔

اس کا حکم یہ ہے کہ فرمانبرداری کی وجہ سے اس کے چھوڑنے والے کو ثواب ملتا ہے اور کرنے والے کو سزا نہیں ملتی۔

۵۔مباح

اس کے لغوی معنی جائز کے ہیں۔اور شرعی معنی جس کا چھوڑنا اور کرنا دونوں یکساں ہو۔

اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور نہ چھوڑنے والے کو سزا، البتہ نیت نیک ہو تو ثواب ملتا ہے۔

اس کے مترادف الفاظ یہ ہیں: جائز، حلال۔

بعض متاخرین نے ''خلاف اولی'' کا اضافہ کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اگر چھوڑنے کا مطالبہ کسی مخصوص نہی کی وجہ سے لازمی نہ ہو تو مکروہ ہے، ورنہ خلاف اولی ہے۔

حکم شرعی وضعی یہ ہے کہ اللہ کا خطاب کسی چیز کے سبب، یا شرط، یا رکاوٹ، یا صحیح یا فاسد ہونے کے لیے وارد ہوا ہو۔

اس کی مندرجہ ذیل پانچ قسمیں ہیں:

۱۔سبب

اس کے لغوی معنی رسی کے ہیں، اسی طرح وہ چیز جس کے ذریعہ دوسرے تک پہنچا جائے۔

اصطلاحی معنی یہ ہے کہ جس کے وجود سے وجود لازم آجائے اور جس کے عدم سے اس کی ذات کا عدم لازم آجائے۔

مثلاً وقت شروع ہونا، یہ نماز کا سبب ہے، جب یہ سبب پایا جائے تو نماز واجب ہو جاتی ہے، جب یہ نہ پایا جائے تو نماز واجب نہیں ہے۔

۲۔شرط

شرط کے لغوی معنی کسی معاملہ کو کسی معاملہ کے ساتھ معلق کرنا، جن دونوں کا تعلق مستقبل سے ہو۔

اس کے اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اس کے نہ پائے جانے سے عدم یعنی نہ پایا جانا لازم آتا ہو اور اس کے وجود سے نہ وجود لازم آتا ہو اور نہ اس کا عدم۔

مثلاً طہارت نماز کے لیے شرط ہے، جب طہارت نہ پائی جائے تو نماز بھی نہیں ہوگی، البتہ اس طہارت کے پائے جانے سے نماز کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، اور اس کے نہ پائے جانے سے خود نماز کا نہ پایا جانا ضروری نہیں ہے، بلکہ کبھی دوسرے سبب کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، یا کسی ایسی رکاوٹ کی وجہ سے ہوتا ہے جو نماز کے وجود میں مانع بن جائے اور رکاوٹ بنے۔

۳۔مانع

لغوی معنی رکاوٹ یا دو چیزوں کے درمیان حائل کے ہیں۔

اصطلاحی معنی: جس کے وجود سے عدم لازم آتا ہو اور اس کے عدم سے وجود لازم آتا ہو اور وہ بذات خود معدوم نہ ہو۔

مثلاً حیض نماز کے واجب ہونے سے مانع ہے، جب یہ معدوم ہو جائے تو نماز واجب ہو جاتی ہے، لیکن اس کی ذات کے لیے نہیں، کیوں کہ کبھی نماز واجب ہونے کی بقیہ شرطوں کے پائے جانے کی وجہ سے نماز پائی جاتی ہے۔

۴۔صحیح

لغوی معنی بیمار کی ضد ہے۔
اصطلاحی معنی: جس میں تمام معتبر شرطیں پائی جائیں، چاہے وہ عبادت ہو یا معاملہ۔

۵۔فاسد

اس کے لغوی معنی صحیح کی ضد ہے۔
اصطلاحی معنی: جس میں صحیح کی بعض شرطیں مفقود ہوں، چاہے وہ عبادت ہو یا معاملہ، ہمارے مسلکِ شافعی میں فاسد اور باطل ایک ہی معنی میں ہیں۔ (یہ فصل اصول فقہ کی مختلف کتابوں سے مرتب کی گئی ہے مثلاً ''لطائف الإشارات فی شرح نظم الورقات'' شیخ عبدالحمید قدس ص ۹۔۱۲، ''أصول الفقہ الإسلامی'' علامہ زحیلی ۱/۴۲۔۱۰۷ وغیرہ، حسن بن احمد الکاف نے ''التقریرات السدیدۃ'' میں اس کی بہترین تلخیص کی ہے ۴۹۔۵۲)

مسلکِ شافعی کی اہم اصطلاحات

اقوال کو اختیار کرنے کے درجات کے اعتبار سے

(مندرجہ ذیل مراجع سے خلاصہ کیا گیا ہے: النجم الوھاج۔ امام کمال الدین دمیری ۱/ ۲۰۷۔۲۱۱، مغنی المحتاج۔ امام شربینی الخطیب ۱/۱۲، نہایۃ المحتاج۔ امام شمس الدین رملی ۱/ ۴۸۔۴۹، الفوائد المکیۃ۔ سید علامہ علوی بن احمد سقاف ۴۶، الابتھاج فی بیان اصطلاح المنھاج۔ سید علامہ احمد بن ابوبکر بن سمیط ۶۔۹، سلم المتعلم المحتاج إلی معرفۃ رموز المنھاج۔ سید علامہ احمد میقری شمیلہ اہدل ۱۸۔۲۰، ملحق کتاب ''الخزائن السنیۃ من مشاھیر الکتب الفقھیۃ لأئمتنا الفقھاء الشافعیۃ'' عبدالقادر بن عبدالمطلب مندیلی، جس کو اس کتاب کے محقق عبدالعزیز بن سایب نے تحریر کیا ہے ۱۷۹۔۱۸۲ وغیرہ)

۔**الأظھر**: یہ اصطلاح مسلک کے امام شافعی کے دو میں سے ایک قول کو ترجیح دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور وہ دو قولوں میں سے راجح ہوتا ہے۔

۔**الظاھر**: یہ **الأظھر** کے مقابلہ میں ہے، اگرچہ یہ قول اپنے ادراک کی جگہ کی قوت کی وجہ سے ظاہر ہے، لیکن وہ مرجوح ہے، کیوں کہ فتوی اور حکم میں معتمد **الأظھر** ہی ہے۔

۔**المشھور**: اس اصطلاح سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ شافعی کے اقوال میں اختلاف ہے اور یہ قول راجح ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں جو قول ہے وہ مرجوح، خفی، غریب اور غیر مشہور ہے، کیوں کہ وہ ادراک کی جگہ کی کمزوری کی وجہ سے کمزور ہے۔

امام شمس الدین رملی کہتے ہیں: ''یہ بات ظاہر ہے کہ مشہور **الأظھر** سے اقوی ہے اور صحیح أصح سے اقوی ہے''۔ صحیح اور أصح کے معنی آرہے ہیں۔

مشہور **الأظھر** سے زیادہ طاقت ور ہے، کیوں کہ مشہور یقینی بات سے قریب ہے،

کیوں کہ اس کے مقابلہ میں خفی ہے اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، لیکن صحیح قرار دینے میں
الأظهر کو صحیح قرار دینا مشہور کو صحیح قرار دینے سے زیادہ قوی ہے، کیوں کہ اس کے مقابلہ
میں ظاہر ہے اور اس پر عمل کرنا جائز ہے، یہی معاملہ اصح اور صحیح میں بھی ہے۔ (ملحق ''الخزائن السنیۃ'' عبدالقادر مندیلی ص ۱۷۹)

-**القدیم**: اس سے مراد بغداد یا وہاں سے نکلنے اور مصر میں قیام پذیر ہونے سے
پہلے کے امام شافعی کے اقوال ہیں، جس کا امام نے قولاً یا تحریراً فتوی دیا ہے، ان میں سے
ایک کتاب ''الحجۃ'' ہے، قول قدیم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امام شافعی کے قول قدیم
اور قول جدید میں اختلاف ہے اور قول قدیم مرجوح ہے، راجح اور معمول بہ قول جدید ہے،
قولِ قدیم کے مشہور راوی امام احمد بن حنبل، زعفرانی، کرابیسی اور ابوثور ہیں۔

امام شافعی نے ان اقوال سے رجوع کیا اور ان سے منع کیا، اور کہا: مجھ سے یہ قول
روایت کرنے والے کو حلال نہیں بناتا ہے۔ عراق سے نکلنے کے بعد اور مصر میں قیام پذیر
ہونے کے بعد جو آپ نے کہا ہے تو یہ قول جدید ہے اور پہلے والا قدیم ہے، اگر کسی مسئلہ میں
دو قولِ جدید ہوں تو ان میں سے بعد والے پر عمل ہوگا اگر معلوم ہو جائے، اگر ان میں سے
بعد والا قول معلوم نہ ہو تو وہ قول معتمد ہوگا جس کو شافعی نے ترجیح دی ہے، اگر دونوں قول ایک
ہی وقت کا ہو پھر ان دونوں میں سے ایک پر عمل کیا ہو تو اس عمل کو ترجیح دی جائے گی۔

امام شافعی کے قول قدیم میں سے انیس مسائل کو ترجیح دی گئی ہے اور ان پر فتوی دیا
گیا ہے۔ (ان مسائل کے لیے دیکھا جائے: ''المجموع شرح المهذب'' امام نووی ۱/۶۶-۶۷) اس کی وجہ
یہ ہے کہ مسلک شافعی کے مجتہدین کی ایک جماعت کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ
دلائل میں قول جدید سے زیادہ طاقت ور ہیں، اس لیے قول قدیم کے مطابق فتوی دیا، لیکن
ان کی نسبت شافعی کی طرف نہیں کی گئی ہے، کیوں کہ امام شافعی نے ان سے رجوع کیا ہے،
اس لیے آپ کے حق میں یہ منسوخ کے حکم میں ہے، اگر چہ انہوں نے کہا ہے کہ جن قدیم
اقوال کو ترجیح دی گئی ہے ان کی مثال امام شافعی کے قولِ قدیم میں ملتی ہے، جہاں تک وہ قول

قدیم ہے جس کو امام شافعی نے جدید میں نہیں چھیڑا ہے؛ نہ اس کی موافقت کی ہے اور نہ
مخالفت تو یہ مسلکِ شافعی میں سے ہے۔

-**الجدید**: یہ امام شافعی کے وہ اقوال ہیں جو آپ نے مصر میں قیام پذیر ہونے
کے بعد کہے، چاہے اپنی تصانیف میں ان کو تحریر کیا ہو یا بطور فتوی بیان کیا ہو، قول جدید کے
مشہور راوی بویطی، مزنی، ربیع المرادی، ربیع جیزی، حرملہ، یونس بن عبدالاعلی، عبداللہ بن
زبیر حمیدی مکی، محمد بن عبداللہ بن حکم اور ان کے والد عبداللہ ہیں، پہلے کے تین افراد نے یہ
کام کیا اور باقی لوگوں سے تھوڑے تھوڑے اقوال منقول ہیں، حرملہ کی تصنیف کتاب الأمالی
اور المبسوط کتبِ جدید میں سے ہیں۔

قول جدید سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ امام شافعی کے قول جدید اور قول قدیم
میں اختلاف ہے، اور جدید راجح ہے اور قدیم مرجوح، اس وقت ہے جب قدیم اور جدید
میں اختلاف پایا جائے، اگر دونوں اقوال متفق ہوں تو بات واضح ہے، اگر امام شافعی نے کسی
مسئلہ کو صرف جدید میں چھیڑا ہے اور قدیم میں نہیں چھیڑا ہے تو یہ واضح ہے کہ یہی آپ کا
مسلک ہے، اگر کسی مسئلہ کو صرف قدیم میں موضوع بنایا ہو، جدید میں نہیں تو فتوی قدیم کے
مطابق ہی رہے گا، کیوں کہ قدیم سے رجوع بعض امور میں ہے، بعض امور سے رجوع سے
یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ نے اپنے سبھی قدیم مسائل سے رجوع کیا ہو، کیوں کہ جس سے
آپ نے رجوع کیا ہے وہ اکثر اقوال ہیں یا وہی ہیں جن میں رجوع کے سلسلہ میں آپ
سے نص منقول ہو، برخلاف اس کے جس کا تذکرہ امام نے جدید میں کیا ہی نہیں ہے۔

-**فی قول أو فی وجه**: اس سے اختلاف کی موجودگی پر دلالت ہوتی ہے اور
یہ کبھی امام شافعی کے اقوال میں بھی ہوتا ہے یا علمائے شافعیہ کے اقوال میں، جب یہ
اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے ضعیف ہونے پر دلالت ہوتی ہے اور **فی قول**
کے مقابلہ میں الأظہر یا مشہور ہے، اور **فی وجه** کے مقابلہ میں أصح یا صحیح ہے۔

-**کذا أو وكذا**: یہ اصطلاح اس کے بعد میں اختلاف پر دلالت کرتی ہے، اگر

اس کے اصح کا تذکرہ آئے تو اس کے مقابلہ میں صحیح ہوتا ہے، اگر صحیح کا تذکرہ آئے تو اس کے مقابلہ میں ضعیف ہوتا ہے، اگر اظہر کا تذکرہ ہو تو اس کے مقابلہ میں ظاہر ہوتا ہے، اگر مشہور کا تذکرہ ہو تو اس کے مقابلہ میں خفی ہوتا ہے۔

۔**فی قول کذا** :اس اصطلاح سے دلالت ہوتی ہے کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے اور شافعی کے اقوال میں اختلاف ہے، اور مذکورہ قول ضعیف ہے اور اس کے مقابلہ میں اظہر یا مشہور ہے اور یہ راجح ہے اور اسی پر عمل ہے۔ (اہدل نے کہا ہے: المنہاج میں ’’فی قول کذا‘‘ کا استعمال ۲۰۲ جگہوں پر کیا گیا ہے، یہ ’’قیل‘‘ کی تعبیر کے ساتھ ۶۴۱ جگہوں پر ہے، یہ سب اقوال ضعیف ہیں، سوائے پندرہ جگہوں کے جن کے معتمد علیہ ہونے کو متاخرین نے ترجیح دی ہے، ان میں سے بارہ کی تعبیر ’’قیل‘‘ سے کی گئی ہے اور تین کی تعبیر ’’وفی قول‘‘ سے کی گئی ہے، پھر اہدل نے ان جگہوں کا تذکرہ کیا ہے، تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: سلم المتعلم المحتاج ۳۴)

۔**القولان**: اس اصطلاح سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ شافعی کے دو اقوال میں اختلاف ہے، راجح وہ ہے جس کے راجح ہونے کی صراحت کی گئی ہو اور مرجوح وہ ہے جس کے مرجوح ہونے کی صراحت کی گئی ہو۔

۔**الأقوال**: اس اصطلاح سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ شافعی کے اقوال میں اختلاف ہے، ان میں سے کسی کے راجح ہونے کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب اصحاب شوافع نے اس کو ترجیح دی ہو یا اس پر نص پیش کیا گیا ہو۔

۔**الأصح**:

۔**الصحیح**:

۔**قیل**:

۔**الوجهان**:

۔**الأوجه**:

۔**المذهب**:

۔**النص**:

۔**المنصوص**:

۔**فی وجه کذا**:

۔**علی المعتمد**:

۔**علی الأوجه**:

طہارت

طہارت کے لغوی اور شرعی معنی:

طہارت کے لغوی معنی گندگیوں سے پاکی حاصل کرنے اور چھٹکارا پانے کے ہیں، چاہے وہ حسی گندگیاں ہوں مثلاً حدث اور پیشاب پاخانے سے پاکی حاصل کرنا، یا معنوی گندگیاں ہوں مثلاً دل کے امراض سے پاکی حاصل کرنا مثلاً تکبر، عجب، حسد اور ریا وغیرہ۔

طہارت کے اصطلاحی معنی: رفعِ حدث یعنی حدث کو دور کرنا یا نجاست کو زائل کرنا یا جو ان دونوں کے معنی میں ہے یا ان کی شکل وصورت میں ہے۔ (امام نووی نے اپنی کتاب ''المجموع شرح المھذب'' ۱/ ۷۹ میں اور تقی حِصنی نے ''کفایۃ الأخیار'' میں یہی تعریف کی ہے، اس کے علاوہ دوسری تعریفات بھی ہیں، لیکن یہی سب سے بہتر تعریف ہے)

اس تعریف کی تشریح ووضاحت:

رفعِ حدث مثلاً وضو اور غسل۔

نجاست کو زائل کرنا مثلاً پانی سے استنجاء کرنا اور نجاست لگے ہوئے کپڑے کو دھونا۔

جو رفعِ حدث کے معنی میں ہے: مثلاً تیمّم، اور صاحب ضرورت مثلاً پیشاب کی بیماری والے کا وضو، کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں حدث دور نہیں ہوتا ہے۔

جو نجاست کو زائل کرنے کے معنی میں ہے: مثلاً پتھر سے استنجاء کرنا، کیوں کہ نجاست کا اثر باقی رہتا ہے۔

جو رفعِ حدث کی شکل وصورت میں ہے: مثلاً مسنون غسل، ہاتھ پاؤں وغیرہ دھونے میں دوسری اور تیسری مرتبہ دھونا، کیوں کہ دوسری اور تیسری مرتبہ سے رفعِ حدث نہیں ہوتا ہے اور ان کی شکل پہلی مرتبہ دھونے کی طرح ہی ہے۔

جو نجاست زائل کرنے کی شکل میں ہے: مثلاً نجاست زائل کرنے میں دوسری اور تیسری مرتبہ دھونا، کیوں کہ دوسری اور تیسری مرتبہ سے نجاست زائل نہیں ہوتی ہے، اور ان کی شکل پہلی مرتبہ دھونے کی طرح ہے۔

طہارت کے وسائل

طہارت کے وسائل تین ہیں: پانی، مٹی اور دباغت (باجوری اور شاطری نے استنجاء کے پتھر کا بھی اضافہ کیا ہے، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ نجاست ختم کرنے والا، جامد، طاہر اور غیر محترم ہو۔ حاشیۃ الباجوری علی ابن قاسم علی أبی شجاع ۱/ ۴۶۔۴۷، الیاقوت النفیس۔ احمد بن عمر الشاطری ص۱۶)

۔پانی؛ خالص اور غیر مستعمل پانی، جس کو نجاست زائل کرنے اور ان سے پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اور وضو اور غسل میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۔مٹی؛ خالص مٹی جس کو تیمّم میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت برتن کو پاک کرنے میں جب کتا یا خنزیر اس میں منہ ڈال دے۔

۔چمڑے کی دباغت میں استعمال ہونے والی چیز؛ ہر وہ چیز جس کو مردار (کتے اور خنزیر کے علاوہ) کے چمڑے کو دباغت دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، البتہ دباغت دیے ہوئے چمڑے کو پانی سے دھونا اور بال ہو تو ہٹانا واجب ہے۔

پانی کی قسمیں

۔پانی کی تین قسمیں ہیں: طاہر، طھور، نجس

۔طاہر پانی: پاک پانی ہے، لیکن وہ خالص طہور (پاک کرنے والا) پانی نہیں ہے، کیوں کہ وہ کسی طاہر و پاک چیز سے ملا ہوا ہے، مثلاً گلاب کا پانی، یا وہ پانی جس کو فرض طہارت مثلاً وضو میں استعمال کیا گیا ہو، یہ طہارت کے کام نہیں آتا ہے۔

۔طہور (مطہر) پانی: یہ پاک اور پاک کرنے والا پانی ہے جو کسی پاک چیز سے ملا نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کو رفعِ حدث یا نجاست کو زائل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ (اس کو ماءِ مطلق بھی کہا جاتا ہے، ماءِ مطلق وہ پانی ہے جو اپنے تخلیقی وصف پر باقی ہو۔ دیکھا جائے: کفایۃ الأخیار ۱/ ۱۴)

۔نجس پانی: وہ کم پانی جو نجس ہو گیا ہو، یعنی جب اس میں نجاست گر جائے، یا زیادہ پانی جو نجاست گرنے کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو اور تبدیلی اس کے رنگ یا ذائقہ یا بو میں آئی ہو یا ان تینوں اوصاف میں آئی ہو۔

۔طہور پانی: یہ پاک اور پاک کرنے والا پانی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک جو آسمان سے نازل ہوا ہو مثلاً بارش کا پانی، برف کا پانی اور اولے کا پانی۔ دوسرا جو زمین سے نکلا ہو مثلاً سمندر کا پانی، نہر کا پانی، کنویں کا پانی اور چشمے کا پانی۔ (یہ بغوی کی ''التہذیب'' میں تحریر کردہ عبارت کا ماحصل ہے، انہوں نے لکھا ہے: جو پانی آسمان سے نازل ہو یا زمین سے نکلے اور اس میں کوئی چیز ملی ہوئی نہ ہو تو اس سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے)

طاہر پانی کی دو قسمیں ہیں:

مستعمل پانی جس کو وضو یا نجاست کے زائل کرنے میں استعمال کیا گیا ہو اور اس میں نجاست کا کوئی اثر نہ ہو، یا وہ پانی جو کسی پاک چیز سے ملا ہوا ہو مثلاً گلاب کا پانی یا سرکہ یا دودھ وغیرہ، یا درخت سے نکالا ہوا پانی، یہ طاہر پانی ہے اور اس کو کپڑے اور برتن دھونے میں استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ رفعِ حدث یا نجاست زائل کرنے کے لیے صحیح نہیں ہے۔

نجس پانی کی دو قسمیں ہیں:

۔کم پانی جس میں نجاست گر گئی ہو چاہے پانی میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو

۔کثیر پانی جس کے رنگ یا ذائقہ یا بُو میں نجاست گرنے کی وجہ سے تبدیلی آئی ہو

کثیر پانی وہ ہے جو دو قلے یا اس سے زیادہ ہو۔ دو قلے کی مقدار پانچ سو رطل بغدادی ہے یا تقریباً ۲۱۶ لیٹر ہے۔ (بعض لوگوں نے ۲۵۰ لیٹر کہا ہے، لیکن زیادہ دقیق حساب ۲۱۶ لیٹر ہے)

کم پانی وہ ہے جو دو قلہ سے کم ہو، جو نجاست کے ملتے ہی نجس ہو جاتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

مٹی کی قسمیں

مٹی کی تین قسمیں ہیں: طہور مٹی، طاہر مٹی اور نجس مٹی

۔طہور مٹی: جو مٹی پاک اور خالص ہو جس کے ساتھ کوئی چیز ملی ہوئی نہ ہو۔

۔طاہر مٹی: وہ مٹی جو کسی پاک یا حلال چیز سے ملی ہو مثلاً آٹا، یہ مٹی مطہر یعنی پاک کرنے والی نہیں ہے۔ (اس کی مثال وہ مٹی بھی ہے جو تیمّم کے بعد عضو سے گری ہوئی ہو، یہ مٹی پاک تو ہے لیکن پاک کرنے والی نہیں ہے کیوں کہ اس کو استعمال کیا گیا ہے)

۔نجس مٹی: جو کسی نجاست سے ملی ہوئی ہو مثلاً کھودی ہوئی قبروں کی مٹی۔

جو دباغت سے پاک ہو: وہ ہے جس کو زاج (زاج معدنی نمک ہے جو رنگ میں روشنائی کے مشابہ رہتا ہے اور ذائقہ میں پھٹکری کے، یہ فارسی معرب لفظ ہے) قرظ یا سلم درخت (کیکر کے مشابہ درخت جس کے پتوں سے چمڑے کی دباغت کی جاتی ہے) کے پتے، کیرب کا درخت (یہ کالا سوکھا پودا ہے جس سے دباغت کی جاتی ہے) انار کے چھلکے یا بلوط کے درخت کا گوند اور ہر وہ چیز جس سے چمڑے کی دباغت کی جاتی ہے چاہے وہ طاہر نہ ہو مثلاً کبوتر کی بیٹ، لیکن اس سے دباغت دیے ہوئے چمڑے کو دباغت کے بعد دھونا واجب ہے۔ (مسلکِ شافعی میں یہی صحیح ہے، دباغت دیے ہوئے چمڑے کے پاک ہونے کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''جب چمڑا دباغت دیا جائے تو وہ پاک ہو گیا'' مسلم: کتاب الحیض، باب طھارۃ جلود المیتۃ بالدباغ رقم ۳۶۶، یہ روایت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے)

طہارات

طہارات چار ہیں: وضو، غسل، تیمّم اور نجاست زائل کرنا، آخری وضو اور غسل سے پہلے سنت ہے اور تیمّم سے پہلے واجب ہے۔

وضو

وضو کی دو قسمیں ہیں: فرض اور سنت

فرض وضو: فرض نماز میں شامل ہونے سے پہلے وضو کرنا واجب ہے اور سنت نماز کے لیے وضو سنت ہے، یہ بات معلوم ہی ہے کہ وضو نماز صحیح ہونے کے لیے شرط ہے، اس لیے وضو کے بغیر نماز صحیح ہی نہیں ہوتی ہے۔ (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اللہ نماز کو طہارت کے بغیر قبول نہیں فرماتا''، مسلم: کتاب الطھارۃ، باب وجوب الطھارۃ للصلاۃ رقم ۲۲۴، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

بارہ موقعوں پر وضو کرنا سنت ہے:

۱۔تجدیدِ وضو یعنی جس وضو سے پہلے نماز پڑھی ہے اس وضو کے ہوتے ہوئے دوسری نماز کے لیے دوسرا وضو کرنا

۲۔غسل سے پہلے

۳۔جنبی (جس پر غسل واجب ہو) جب غسل کرنے سے پہلے سونا چاہے

۴۔جماع سے پہلے

۵۔کھانا کھانے سے پہلے

۶۔جنازہ اٹھانے کے بعد

۷۔غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے یعنی جب غصہ آئے

۸۔اذان کے لیے

۹۔اقامت کہنے کے لیے

۱۰۔مسجد میں اعتکاف کرنے کے لیے

۱۱۔سونے سے پہلے

۱۲۔زبانی قرآن کی تلاوت کرنے سے پہلے، البتہ مصحف اٹھا کر تلاوت کرنے کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

وضو چھ چیزوں پر مشتمل ہے

فرض، نفل، سنت، آداب، کراہت، شرط

وضو کے فرائض چھ ہیں:

۱۔نیت یعنی اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لیے اس کی خوشنودی کی تلاش (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' بخاری: کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقم ۱)

۲۔پورا چہرہ دھونا: بال اگنے کی جگہ سے ٹڈی تک، اور ایک کان سے دوسرے کان تک، چہرے کو اوپر سے دھونا شروع کرنا سنت ہے۔

۳۔دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا: ہاتھوں کی انگلیوں کے پور سے شروع کرنا سنت ہے۔

۴۔سر کے بعض حصے کا گیلے ہاتھ سے مسح کرنا: سر کے چمڑے یا ان بالوں پر مسح کیا جائے جو سر کے حدود میں ہوں یعنی جب بال کو پھیلایا جائے تو وہ سر کے حدود سے نہ نکلے۔

۵۔ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا: پاؤں کی انگلیوں سے شروع کرنا سنت ہے۔

۶۔ترتیب: سب سے پہلے چہرہ دھویا جائے پھر ہاتھ پھر سر کا مسح کیا جائے پھر پاؤں

دھوئے جائیں۔

وضو میں نفل صرف ایک ہی چیز ہے: وہ یہ کہ ایک سے زائد مرتبہ دھویا جائے اور کمال وضو اعضائے وضو میں سے ہر عضو کو تین مرتبہ دھونا ہے، سوائے سر کے، سر کا تین مرتبہ مسح کیا جائے گا۔

وضو کی سنتیں

وضو کی سنتیں پندرہ ہیں:

۱۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا۔ (بیہقی نے ''السنن الکبری'' میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈالا پھر اپنے صحابہ سے فرمایا: ''اللہ کا نام لے کر وضو کرو'' کتاب الطھارۃ، باب التسمیۃ علی الوضوء ۱/۴۳، مسند احمد ۱۲۶۹۴، ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے: ۱۴۴، اسی طرح ابن حبان نے بھی: ۶۵۴۴)

۲۔پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تین مرتبہ دونوں ہاتھوں کو دھونا۔

۳۔کلی کرنا۔

۴۔ناک میں پانی لینا۔

۵۔ناک سے پانی نکالنا۔

۶۔کلی اور ناک میں پانی لینے میں مبالغہ کرنا، البتہ روزہ دار کے لیے مبالغہ نہ کرنا مسنون ہے۔

۷۔تین تین مرتبہ کلی کرنا، ناک میں پانی لینا اور ناک سے پانی نکالنا۔

۸۔کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا الگ الگ پانی سے ہو۔

۹۔پورے سر کا مسح کرنا۔ (برخلاف ان لوگوں کے جو پورے سر کے مسح کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ دیکھا جائے: کفایۃ الاخیار ۱/ ۳۸)

۱۰۔دونوں کانوں کا باہر اور اندر سے مسح کرنا اور کان کے سوراخوں میں شہادت کی انگلی داخل کرنا۔

۱۱۔گردن کا مسح کرنا۔(رافعی نے اس کو صحیح کہا ہے، اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے: ''گردن کا مسح بغض وکینہ سے امان ہے'' اس کو امام غزالی نے ''اِحیاءعلوم الدین'' میں بیان کیا ہے اوراس کی نسبت عراقی نے مسند الفردوس میں دیلمی کی طرف کی ہے، نووی نے اس کو غیر ثابت کہا ہے اور کہا ہے کہ گردن کا مسح سنت نہیں ہے)

۱۲۔ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا پانی سے خلال کرنا۔

۱۳۔داہنے کو بائیں پر مقدم کرنا۔

۱۴۔اعضاے وضو کو اس طرح پے در پے دھونا کہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو یعنی ایک عضو کے سوکھنے سے پہلے دوسرا عضو دھوئے۔

۱۵۔جن اعضاے وضو کو دھویا جاتا ہے ان کو رگڑ کر دھونا۔

وضو مکمل ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے: **أَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ** (یہ دعا عقبہ بن عامر کی روایت میں ہے جس کو امام احمد نے اپنی مسند میں صحیح سند سے روایت کیا ہے ۱۷۳۶۳) ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، تیری ذات پاک ہے، اے اللہ! اور تعریف تیرے لیے ہی ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور تیری طرف رجوع ہوتا ہوں۔

وضو کی سنتوں اور آداب کے درمیان فرق یہ ہے کہ سنتوں کی تاکید زیادہ ہے اور آداب میں تاکید کم ہے۔

وضو کے آداب

وضو کے دس آداب ہیں:

۱۔وضو کے دوران قبلہ کی طرف رخ کرنا۔

۲۔وضو کے لیے اس طرح بیٹھنا کہ وضو کا پانی اس کے جسم پر نہ آئے اور اس کے چھینٹے بدن پر نہ اڑیں۔

۳۔اگر ایسے برتن سے کیا جارہا ہو جس کا حلقہ تنگ ہو تو برتن کو اپنے بائیں طرف رکھے۔

۴۔اگر اس کا حلقہ وسیع ہو تو برتن اپنے دائیں جانب رکھے تاکہ چلّو لینے میں آسانی ہو

۵۔وضو کرنے میں کسی کی مدد نہ لے، البتہ کوئی عذر ہو تو الگ بات ہے، جب کسی سے مدد لے تو پانی انڈیلنے والا وضو کرنے والے کے بائیں جانب کھڑا رہے۔

۶۔چہرہ دھونے کی ابتدا اوپر سے کرے۔

۷۔ہاتھ دھونے کی ابتدا انگلیوں اور ہتھیلی سے کرے۔

۸۔سر کا مسح کرنے کی ابتدا سر کے اگلے حصے سے کرے۔

۹۔پاؤں دھونے کی ابتدا انگلیوں سے کرے۔

۱۰۔اپنے ہاتھوں سے پانی نہ جھاڑے اور اعضاے وضو کو بغیر عذر کے تولیہ سے نہ پوچھے۔

(امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ضعیف قرار دی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کپڑا تھا جس سے وہ وضو کے بعد پوچھتے تھے۔ترمذی: کتاب الطھارۃ، باب ماجاء فی المندیل بعد الوضوء ۵۳، ترمذی نے کہا ہے: عائشہ کی حدیث صحیح نہیں ہے اور اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے)

وضو کے مکروہات

وضو کے مکروہات تین ہیں:

۱۔پانی میں اسراف کرنا، چاہے سمندر کے کنارے ہی وضو کیوں نہ کر رہا ہو۔

۲۔اعضاے وضو کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونا۔

۳۔بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ سر کا مسح کرنے کے بجائے اس کو دھونا مکروہ ہے، اور مسلک شافعی میں صحیح اور معتمد قول یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے، کیوں کہ دھونے میں مسح بھی شامل ہے اور یہ مسح سے زائد ہے۔

وضو کی شرطیں

وضو کی شرطوں کی تعداد پندرہ ہے: (یہی غسل کی بھی شرطیں ہیں)

۱۔ مسلمان ہو، اس لیے کافر کا وضو صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وضو ایسی عبادت ہے جس میں نیت ضروری ہے، اور کافر نیت کا اہل نہیں ہے۔

۲۔ ممیّز ہو، اس لیے غیر ممیّز کا وضو صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وضو عبادت ہے جس میں نیت ضروری ہے، اور نیت کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ نیت کرنے والا ممیّز ہو۔

۳۔ حیض اور نفاس سے پاک ہو۔

۴۔ پانی چمڑی تک پہنچنے میں کوئی چیز حائل نہ ہو، اس لیے ناخن میں پائی جانی والی گندگیوں کو صاف کرنا ضروری ہے۔ (جن کا کام ہی مٹی کا ہو تو ان کے لیے تھوڑا سا معاف ہے جیسے کسان وغیرہ، امام غزالی اور امام زرکشی نے ناخن میں پائی جانے والی گندگی کو معاف قرار دیا ہے، لیکن تحفہ میں لکھا ہے کہ یہ ضعیف ہے بلکہ غریب ہے ۲۰۸، شوافع کے نزدیک ناخن کی گندگی مطلقاً معاف ہونے کا بھی قول ہے جیسا کہ باجوری نے شرح ابی شجاع پر اپنے حاشیہ میں لکھا ہے ۱/ ۱۹۷) اسی طرح آنکھ کے کناروں میں پائی جانے والی گندگی کو، اور آنکھ کے اطراف میں پائے جانے والی گندگیوں کو صاف کرنا ضروری ہے، ان کے علاوہ ان سبھی گندگیوں کو صاف کرنا لازم ہے جو پانی کو چمڑے تک پہنچانے میں رکاوٹ بنتی ہوں۔

۵۔ عضو پر کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے پانی میں ایسی تبدیلی نہ آئے کہ اس سے پانی کا نام ہی ختم ہو جائے مثلاً روشنائی اور صابون وغیرہ۔

۶۔ وضو کی فرضیت کا علم ہو یعنی وضو کرنے والے کو معلوم ہو کہ وضو کرنا فرض ہے۔

۷۔ وضو کے فرائض میں سے کسی فرض کو سنت نہ سمجھے، اس میں بہت سے حالات ہیں:

أ۔ کبھی آدمی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ وضو کے سبھی اعمال فرض ہیں، اس صورت میں وضو صحیح ہو جاتا ہے۔

ب۔ کبھی آدمی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ وضو کے سبھی اعمال سنت ہیں، اس صورت میں وضو صحیح نہیں ہوتا ہے۔

ج۔ کبھی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ اس میں فرائض بھی ہیں اور سنتیں بھی، لیکن وہ ان کے درمیان تمیز نہیں کرتا ہے، اس مسئلہ میں تفصیل ہے: اگر وہ عام آدمی ہو تو بالاتفاق اس کا وضو صحیح ہو جاتا ہے، اگر وہ عالم ہو (یہاں عالم کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ طلبِ علم یا علماء کے ساتھ میں اتنا وقت گزارے کہ اس میں عام طور پر فرائض کو سنتوں سے ممتاز کرنا ممکن ہو) تو ابن حجر کے نزدیک اس کا وضو صحیح ہو جاتا ہے۔ (امام وفقیہ ماہر فنون احمد بن محمد بن حجر مکی ہیتمی متوفی ۹۷۳ ہجری، اپنے زمانہ میں شوافع کے امام اور مسلکِ شافعی میں بہت سی عمدہ کتابوں کے مصنف، ان میں سے علی الاطلاق جلیل القدر تصنیف ''تحفۃ المحتاج'' ہے، انہوں نے شہاب رملی وغیرہ سے فقہ حاصل کی، ان کا تعارف نجم غزی کی کتاب ''الکواکب السائرۃ بأعیان المئۃ العاشرۃ'' میں ہے ۳/ ۱۱۱۔۱۱۳)، اور رملی کے نزدیک صحیح نہیں ہوتا۔ (مشہور اور جلیل القدر امام شمس الدین محمد بن احمد بن حمزہ شہاب الدین رملی متوفی ۱۰۰۴ ہجری، ان کا لقب شافعی صغیر ہے، یہ دسویں صدی کے مجدد اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جو آپ کے امام ہونے کی دلیل ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور ''نھایۃ المحتاج شرح المنھاج'' ہے، آپ کا تعارف محبی کی کتاب ''خلاصۃ الأثر فی أعیان القرن الحادی عشر'' میں ہے ۳/ ۳۴۲)

د۔ کبھی وہ کہے کہ سر کا مسح اور پاؤں دھونے میں سے ایک سنت ہے اور اس کی تعیین نہ کرے تو اس کا وضو صحیح ہے، کیوں کہ وہ کسی متعین فرض کے سنت ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتا ہے۔

۸۔ طہور پانی ہو: کیوں کہ حدث طہور پانی سے ہی ختم ہوتا ہے جیسا کہ اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں

۹۔ عین نجاست کو زائل کیا جائے: اگر ایک مرتبہ دھونے سے عین نجاست زائل نہ ہوتی ہو تو بالاتفاق دوبارہ دھونا ضروری ہے، اگر ایک مرتبہ دھونے سے نجاست زائل ہو جاتی ہو تو رافعی کے نزدیک دو مرتبہ دھونا ضروری ہے: ایک مرتبہ نجاست کو زائل کرنے کے لیے اور دوسری مرتبہ رفعِ حدث کے لیے

امام نووی (دیکھا جائے: روضۃ الطالبین۔ حاشیہ بلقینی ص ۱/ ۶۸) کے نزدیک نجاست کو زائل

کرنے اور رفع حدث کے لیے صرف ایک مرتبہ دھونا کافی ہے اور یہی معتمد قول ہے۔

۱۰۔ پورے عضو پر اس طرح پانی بہایا جائے کہ پانی طبعی طور پر بہے، اس لیے عضو کا کسی کپڑے یا برف سے مسح کرنا کافی نہیں ہے

۱۱۔ پختہ نیت کے ساتھ وضو کرے، اگر شک کرتے ہوئے وضو کرے کہ وہ حدث سے ہے یا باوضو ہے تو اس کا وضو صحیح نہیں ہوتا ہے، چاہے یہ واضح ہو جائے کہ وہ باوضو نہیں ہے، کیوں کہ پختہ نیت پائی نہیں جاتی ہے۔ (اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کو جب طہارت یا حدث میں شک ہو جائے تو احتیاطاً وضو کر لے، اس میں کچھ تفصیل ہے: ۱۔ اگر یہ صاف ہو جائے کہ وہ باوضو ہے تو اس کا نیا وضو صحیح ہو جائے گا۔ ۲۔ اگر یہ واضح ہو جائے کہ وہ باوضو نہیں ہے تو اس کا نیا وضو صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وضو کی پختہ نیت نہیں پائی جاتی ہے۔ ۳۔ اگر یہ واضح ہی نہ ہو کہ وہ وضو سے ہے یا نہیں تو اس کا نیا وضو صحیح ہے۔ اس میں افضل یہ ہے کہ وہ اپنا وضو توڑ دے پھر وضو کرے، اس صورت میں وہ پختہ نیت کرنے والا بن جائے گا)

۱۲۔ حکماً نیت میں تسلسل ہو کہ اس کے منافی کوئی چیز دورانِ وضو پیش نہ آئے مثلاً ارتداد، اور نہ نیت کو وضو کے علاوہ کی طرف پھیر نہ دے۔

۱۳۔ نیت کو معلق نہ بنایا جائے کہ نیت کے توڑنے کو کسی چیز پر معلق کیا جائے، مثلاً کوئی اپنے وضو میں یہ نیت کرے کہ اگر فلاں آئے گا تو وضو توڑ دے گا، اس صورت میں نیت صحیح نہیں ہوتی ہے اور نہ وضو، چاہے وہ وضو کو توڑ نہ دے۔

۱۴، ۱۵۔ پیشاب اور مذی کی بیماری والے اور مستحاضہ کے لیے نماز کا وقت داخل ہو گیا ہو اور وہ پے در پے وضو کرے۔

وضو صحیح ہونے میں مانع چیزیں

۱۔ کوئی ایسا حائل ہو جو پانی کو اعضائے وضو تک پہنچنے میں رکاوٹ بنے مثلاً شمع وغیرہ

۲۔ کوئی ایسی چیز اعضائے وضو پر پائی جائے جس سے پانی کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہو

۳۔ ایسی چیز پائی جائے جو طہارت کے منافی ہو مثلاً حیض اور نفاس (التقریرات السدیدۃ فی المسائل المفیدۃ۔ از: سید حسن بن احمد الکاف ص ۹۵-۹۷)

نواقض وضو

(مکمل استفادہ کے لیے رجوع کیا جائے: ''الوسیط'' امام غزالی ۱/۳۱۱، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۵۱، ''حاشیۃ الباجوری'' ۱/۶۸)

آٹھ چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے:

۱۔ اگلی یا پچھلی شرمگاہ سے کوئی چیز نکلے

۲۔ اگلی یا پچھلی شرمگاہ میں سے کسی کو بند کر دیا جائے اور پیشاب پاخانہ کسی دوسری جگہ سے نکلے مثلاً ناف کے نیچے سے یا پہلو سے، البتہ شرط یہ ہے کہ یہ بند کرنا عارضی ہو، تخلیقی نہ ہو

۳۔ سونے، بیہوشی یا پاگل پن کی وجہ سے عقل زائل ہو جائے، البتہ اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ کوئی بیٹھ کر اپنی سرین کو زمین پر ٹیک لگائے ہوئے سو جائے تو اس سے وضو باطل نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اونگنے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا ہے، اس کے اور سونے کے درمیان فرق یہ ہے کہ اونگنے والا اپنے آس پاس کی گفتگو سنتا ہے لیکن اس کو سمجھتا نہیں ہے۔

۴۔ اپنے یا دوسرے کی اگلی شرمگاہ کو ہتھیلی کے اندرونی حصے سے چھونا چاہے وہ دوسرا شخص بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو اپنی اگلی شرمگاہ کو چھوئے تو وہ وضو کر لے'' اس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے: کتاب الطھارۃ، باب الوضوء من مس الذکر ۸۲، حاکم نے اس کو مستدرک میں صحیح کہا ہے ۱/۳۶، ابن حبان نے بھی اس کو صحیح کہا ہے: ۱۱۱۲، اس میں حدیث کی مکمل تخریج ہے)

۵۔ کسی رکاوٹ کے بغیر مرد کی چمڑی غیر محرم عورت کی چمڑی سے چھونا: اگر کپڑے کے اوپر سے چھوئے تو وضو نہیں ٹوٹتا ہے، اسی طرح ناخن، بال اور دانت کے چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا ہے، سات سال کے کم کی بچی کو چھوئے تو بھی وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔

۶۔ دائم الحدث شخص کی بیماری ختم ہو جائے، مثلاً پیشاب، مذی کی بیماری والا شفایاب ہو جائے یا استحاضہ والی عورت کا استحاضہ ختم ہو جائے تو اس کو نئے سرے سے وضو

کرنا ضروری ہے، اگر کوئی نماز میں ہو اور وہ اپنی بیماری سے شفایاب ہو جائے تو یہ وضو اور نماز کافی ہے اور اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔

۷۔ مسح علی الخفین (موزوں پر مسح) کی مدت ختم ہو جائے: اگر اس کا وضو مسح علی الخفین پر ہو اور اس کو مسح کی مدت ختم ہونے کا علم ہو تو اس کے لیے دوبارہ وضو کرنا واجب ہے، اس مسئلہ میں ایک دوسری رائے بھی ہے کہ وہ صرف اپنے پاؤں دھوئے گا، اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

(امام نووی نے منہاج الطالبین میں اس کو بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں: جو موزے اتارے اور وہ مسح علی الخفین کی طہارت پر ہو تو وہ اپنے پاؤں دھوئے گا، ایک قول یہ ہے کہ وہ وضو کرے گا۔ مغنی المحتاج ۱/ ۶۸)

۸۔ جب پٹی (جبیرہ) پر مسح کا حکم باطل ہو جائے، پٹی زخمی عضو پر باندھی جاتی ہے جس سے پانی اس عضو تک پہنچ نہیں پاتا ہے، چاہے وہ پٹی کپڑے کی ہو یا لکڑی کی ہو یا چونے کی، ڈاکٹر زخمی عضو پر جو بھی پٹی باندھتا ہے اس کو جبیرہ کہا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص وضو کرے اور پٹی پر مسح کرے، پھر وہ صحت یاب ہو جائے اور ڈاکٹر پٹی کھول دے اور دوبارہ پٹی باندھنے کی ضرورت نہ ہو تو اس پر وضو کرنا ضروری ہے، وہ پٹی والے عضو کو دھوئے اور اس کے بعد والے تمام اعضاء کو دھوئے، اگر پٹی ہاتھ پر ہو اور شفایابی کے بعد اس کو ہٹا دیا جائے تو وہ دونوں ہاتھ دھوئے گا، سر کا مسح کرے گا اور پاؤں دھوئے گا۔ اگر اعضائے وضو میں پٹی ہو تو وضو کرے گا اور پٹی باندھے گا، اس کے بعد وضو کرے گا تو گیلے ہاتھ سے پٹی پر مسح کرے گا اور تیمّم کرے گا، مالکیہ کے نزدیک صرف گیلے ہاتھ سے پٹی پر مسح کرنا کافی ہے، تیمّم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (دیکھا جائے: ''المعونۃ علی مذہب عالم المدینۃ'' قاضی عبدالوہاب بغدادی مالکی ۱/ ۱۴۱-۱۴۲)

غسل

(دیکھا جائے ''التنبیہ'' للشیرازی ص ۸۹، اور ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۵۸)

غسل کی دو قسمیں ہیں: فرض اور سنت

فرض غسل نو ہیں: پانچ مردوں اور عورتوں کے لیے اور چار عورتوں کے لیے مخصوص

مردوں اور عورتوں کے لیے پانچ فرض غسل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ منی آنے پر غسل کرنا۔

۲۔ دو ختنہ کی جگہوں کے ملنے پر غسل یعنی جماع (مرد میں ختنہ کی جگہ حشفہ ہے، یا حشفہ کٹا ہو تو اس کے بقدر اگلی شرمگاہ کی جگہ، اور عورت میں ختنہ کی جگہ دو شفر یعنی عورت کی اگلی شرمگاہ کے دو کنارے)

۳۔ پورا بدن نجس ہونے کی صورت میں غسل کرنا۔

۴۔ بدن کے ایک حصے کے نجس ہونے کی صورت میں غسل جب یہ جگہ معلوم نہ ہو۔

۵۔ میت کو غسل دینا۔

عورتوں کے لیے مخصوص تین فرض غسل

۱۔ حیض ختم ہونے پر غسل۔

۲۔ نفاس ختم ہونے پر غسل۔

۳۔ بچے کی پیدائش پر غسل چاہے طبعی پیدائش ہوئی ہو یا گابھ یعنی جنین ساقط ہوا ہو۔

جب عورت جماع کے بعد غسل کرے پھر اس سے شوہر کی منی نکلے تو اس پر نیا غسل فرض ہے اگر اس کے ساتھ شہوت بھی آئی ہو۔

سنت غسل بیس ہیں: (بعض شوافع کے نزدیک اس کی تعداد بائیس ہے: ''اللباب'' محاملی ۱/ ۵۲)

۱۔ جمعہ کی نماز کے لیے۔

۲۔عیدین کی نماز کے لیے۔

۳۔سورج گہن اور چاند گہن کی نماز کے لیے۔

۴۔استسقاء کی نماز کے لیے۔

۵۔میت کو غسل دینے کے بعد۔(اس بارے میں علمائے شوافع کے نزدیک اختلاف ہے کہ میت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنا مستحب ہے یا فرض،اس کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:''جو میت کو غسل دے تو وہ غسل کرے اور جو اٹھائے تو وہ وضو کرے'' مسند احمد ۹۸۶۲، ترمذی: کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الغسل من غسل المیت ۹۹۳، یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے،امام احمد نے اس کو ابو ہریرہ پر موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے یعنی یہ روایت مرفوع نہیں ہے)

۶۔جب کافر مسلمان ہو جائے۔

۷۔بیہوشی یا شعور کے فقدان سے ہوش میں آنے کے بعد یا جنون سے شفا ملنے کے بعد۔

۸۔حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کی نیت کرنے والے کے لیے۔

۹۔حرمِ مکی میں داخل ہوتے وقت۔

۱۰۔وقوفِ عرفہ کے وقت۔

۱۱۔مزدلفہ میں داخل ہوتے وقت۔

۱۲۔منی میں تین جمرات کو کنکری مارنے کے دنوں میں۔

۱۳۔مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت۔

۱۴۔طوافِ زیارہ کے لیے غسل، یہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے، اس کو طوافِ افاضہ اور طواف النساء کہا جاتا ہے، یہ طواف وقوف عرفہ کے بعد کیا جاتا ہے۔

۱۵۔پچھنی لگانے کے بعد۔

۱۶۔حمام میں داخل ہونے کے لیے۔

۱۷۔زیر ناف بال نکالنے کے بعد۔

۱۸۔جب بدن سے بدبو نکلے۔

۱۹۔کسی بھی اجتماع میں حاضر ہوتے وقت۔

۲۰۔جب بارش اترے اور اس کا پانی جاری ہو جائے تو بارش کے پانی سے غسل کرنا مسنون ہے، کیوں کہ یہ بدن کے لیے مفید ہے۔

☆☆☆☆☆

غسل میں چھ چیزیں ہوتی ہیں: فرض، نفل، سنت، ادب، کراہت اور شرط۔

غسل کے فرائض دو ہیں: نیت کرنا اور پورے بدن اور بال پر پانی بہانا۔

غسل کا نفل صرف ایک چیز ہے: بدن کو ایک مرتبہ سے زیادہ دھونا (دو یا تین مرتبہ)

غسل کی سنتیں دس ہیں:

۱۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا۔

۲۔غسل کرنے سے پہلے جسم پر موجود گندگیوں کو دور کرنا، ناک اور کان صاف کرنا، منھ دھونا تاکہ بدن کی مکمل طہارت اور پاکیزگی ہو،البتہ بغل کے بال اور ناخن غسل کے بعد نکالے جائیں تاکہ بدن کے تمام اجزاء سے جنابت دور ہو جائے، بعض صالحین نے بیان کیا ہے کہ بدن کا ہر وہ حصہ جو حالتِ جنابت کے دوران الگ ہوا ہے قیامت کے دن اس شخص کو اپنی طہارت کے بارے میں سوال کرے گا۔(شربینی الخطیب نے اس کو مغنی المحتاج میں امام غزالی کی کتاب اِحیاء العلوم سے نقل کیا ہے ۱/ ۱۲۹) البتہ یہ ممنوع ہونے یا مکروہ ہونے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔

۳۔نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا۔

۴۔غسل کے دوران اپنی ہتھیلی کے اندرون سے اگلی شرمگاہ کو نہ چھونا، تاکہ وضو ٹوٹ نہ جائے، اسی وجہ سے سنت یہ ہے کہ غسل اگلی شرمگاہ کو دھونے سے شروع کرے تاکہ اس کے بعد دوبارہ اگلی شرمگاہ کو دھونے کی ضرورت نہ پڑے۔

۵۔کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا (بعض مسالک میں یہ دونوں واجب ہیں) (یہ حنابلہ کا مسلک ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں: یہ یعنی کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا وضو اور غسل میں واجب ہے، کیوں کہ اللہ کا فرمان ہے:''فاغسلوا وجوھکم'' مائدہ ۶، یہ دونوں چہرہ کی حد میں داخل ہیں۔ الکافی ۱/ ۲۶)

۶۔تین مرتبہ سر پر پانی بہانا۔

۷۔سر اور داڑھی کے بالوں میں خلال کرنا تا کہ چمڑے تک پانی پہنچ جائے ، کیوں کہ غسل میں چمڑے تک پانی پہنچنا فرض ہے۔

۸۔داہنے جانب سے غسل کرنا۔

۹۔غسل میں بدن کو رگڑنا۔

رگڑنے کے طبی فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے دوران خون صحیح ہوتا ہے۔

۱۰۔غسل کے اختتام پر ''**أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله**'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں) کہنا، شروع میں بسم اللہ کہنا اور اخیر میں شہادتین پڑھنا تا کہ اللہ کی رضامندی کی خاطر کیے جانے والے ہر نیک عمل پر دلالت ہو۔ (کیوں کہ اسلام مومن سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے ہر کام کی ابتدا اور انتہا اللہ تعالی کے ذکر پر ہو)

غسل کے آداب

غسل کے آداب سات ہیں:

۱۔قبلہ کی طرف رخ کر کے غسل کرنا۔

۲۔پاکیزہ جگہ پر غسل کرنا جو غسل کرنے کے لیے تیار کیا ہوا ہو، تا کہ پانی اس پر لوٹ کر نہ آئے (مثلاً اس زمانے میں حمام خانے اور حوض ہیں) پانی کے چھینٹے جسم پر اڑنے اور غسل کرنے کے بعد گرا ہوا پانی دوبارہ بدن پر آنے سے چوکنا رہے۔

۳۔جب پانی کشادہ منہ والے سے برتن سے لے رہا ہو تو اس کو اپنے دائیں جانب رکھے، اگر برتن کا منہ تنگ ہو تو اس کو اپنے بائیں جانب رکھے۔

۴۔غسل کرنے میں کسی سے تعاون نہ لے، اگر کسی سے مدد لینے کی ضرورت پڑے تو مدد کرنے والا اس کے داہنے جانب کھڑا رہے۔

۵۔غسل کے وقت ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ بند رکھے، چاہے وہ تنہائی میں ہو، کیوں کہ اللہ تعالی سے بھی شرم کرنی چاہیے۔

۶۔بدن کے اوپری حصہ سے غسل کی ابتدا کرے۔

۷۔غسل کی جگہ کو بند کرے تا کہ کوئی بھی اس کو نہ دیکھے، اگر وہ عمومی حمام میں ہو تو اس کے لیے سترِ عورت کرنا ضروری ہے۔

غسل کے مکروہات

اعضائے بدن کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونا۔

پانی کے استعمال میں اسراف کرنا چاہے وہ سمندر کے کنارے ہی کیوں نہ ہو۔

غسل کی شرط یہ ہے کہ غسل ایسے پانی سے کیا جائے جو طہور اور خالص ہو جس میں کوئی چیز ملی ہوئی نہ ہو۔

جنبی (یعنی جس پر غسل فرض ہو) کے لیے مندرجہ ذیل امور حرام ہیں:

۱۔قرآن کی تلاوت چاہے از بر ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔مصحف کو چھونا اور اٹھانا۔

۳۔نماز۔

۴۔طواف۔

۵۔جمعہ وغیرہ کا خطبہ دینا۔

۶۔مسجد میں اعتکاف کرنا، البتہ مسجد سے گزرنا جائز ہے۔

۷۔سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر کرنا۔

تیمّم

(مکمل تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' ۱/۱۴۲۔ ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۷۷)

تیمّم کے لغوی معنی ارادہ اور قصد کرنے کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں تیمّم مخصوص شرائط کے ساتھ چہرہ اور ہاتھوں تک مٹی پہنچانے کو کہتے ہیں۔

تیمّم صرف پاک مٹی سے ہی جائز ہے، تیمّم یہ ہے کہ پاک مٹی پر دونوں ہاتھ دو مرتبہ مارے جائیں؛ ایک چہرے کے مسح کے لیے اور دوسرا کہنیوں سمت ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے۔ (مسلک شافعی میں یہی قول معتمد ہے، اسی کو بغوی نے ''التھذیب'' میں بیان کیا ہے ۱/۳۵۲، نووی نے ''المنھاج'' میں جیسا کہ مغنی المحتاج میں ہے ۱/ ۶۸، یہی امام شافعی کا قول جدید ہے، قدیم قول میں امام شافعی نے کہا ہے: ایک ہی مار کافی ہے جس سے وہ اپنے دونوں ہاتھوں اور اپنی ہتھیلیوں کے ظاہر اور اپنے چہرے کا مسح کرے گا، جیسا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی بخاری ۳۳۸، اور مسلم ۳۶۸ میں روایت ہے، امام نووی نے ''شرح المھذب'' میں کہا ہے: دلیل کے اعتبار سے یہ زیادہ قوی ہے اور صحیح حدیث کے ظاہر کے زیادہ قریب ہے، دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۸۶۔۸۷)

تیمّم کی دو حالتیں ہیں: پہلی: تیمّم اور وضو دونوں۔ دوسری: صرف تیمّم، وضو نہیں۔

پہلی: تیمّم اور وضو دونوں؛ اس کی مثالیں:

۱۔ جب کسی شخص کو پانی ملے لیکن وہ وضو کے لیے کافی نہ ہو، مثلاً چہرہ اور ہاتھ دھونے کے لیے پانی ملے اور پاؤں دھونے کے لیے نہ ملے، تو اس صورت میں وہ وضو کی نیت کرے گا پھر اپنا چہرہ اور ہاتھ دھوئے گا اور اپنے سر کا مسح کرے گا، پھر پاؤں دھونے کے بدلے تیمّم کرے گا۔

۲۔ اعضائے وضو میں سے کسی عضو پر زخم ہو جس کو دھونے سے بڑھنے یا سڑنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اپنے صحیح سالم اعضاء کے لیے وضو کرے گا اور وہاں پانی

پہنچائے گا، اور باقی ان اعضاء کے لیے تیمّم کرے گا جہاں پانی نہ پہنچتا ہو، یا اس عضو کے لیے تیمّم کرے گا جہاں تک پانی نہ پہنچ سکتا ہو۔

۳۔ اگر کسی کے پاس وضو کے لیے کافی مقدار میں پانی ہو، لیکن اپنا چہرہ اور ہاتھ دھونے کے بعد پانی غلطی سے بہا دے تو اس صورت میں اپنا وضو مکمل کرنے کے لیے تیمّم کرے گا۔

وہ حالات جن میں صرف تیمّم کیا جاتا ہے وہ سترہ ہیں، ان میں سے سات میں نماز دہرانا واجب ہے، اور دس ایسی ہیں جن میں نماز دہرانا نہیں ہے۔

وہ حالات جن میں نماز دہرانا لازم ہے:

۱۔ شہر میں پانی نہ پائے جانے کی وجہ سے تیمّم کرنا یعنی ایسی جگہ جہاں سال کے اکثر دنوں میں پانی ملتا ہے۔

۲۔ شہر میں سخت سردی پڑنے کی وجہ سے تیمّم کرنا۔

۳۔ یہ بھول کر تیمّم کرنا کہ اس کے سامان میں پانی موجود ہے۔

۴۔ ایسے عضو کے لیے تیمّم کرنا جس پر اعضاء تیمّم میں سے زخم کی وجہ سے کوئی ساتر اور رکاوٹ ہو۔

۵۔ ایسی پٹی کی وجہ سے تیمّم کرنا جس کو وضو کے بغیر باندھا گیا ہو جب پٹی زخم کی جگہ سے زیادہ لگی ہوئی ہو۔

۶۔ گناہ والے سفر پر جانے والا تیمّم کرے۔

۷۔ ایسے شخص کا تیمّم جس پر ایسی نجاست ہو جو معفو عنہ نہ ہو اور وہ اس کو زائل کرنے سے عاجز ہو۔

یہ سات حالتیں وہ ہیں جن میں نماز دہرانا واجب ہے۔ (اگر نماز کا وقت باقی ہو تو اعادہ کرنا، اگر وقت گزر چکا ہو تو اس کی قضا کرنا)

وہ دس حالتیں جن میں تیمّم کی صورت میں نماز دہرائی نہیں جائے گی:

۱۔ سفر میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کرنا، اگر وہ ایسی جگہ ہو جہاں عام طور پر پانی نہ ملتا ہو۔

۲۔ پانی کی موجودگی کے باوجود سفر میں تیمّم کرنا جب پانی بیچا جا رہا ہو اور مسافر میں اس کو خریدنے کی طاقت نہ ہو۔

۳۔ اس کے پاس پانی خریدنے کے لیے ضروری مال ہو، لیکن مسافر کو اس مال کی اپنے اخراجات کے لیے ضرورت ہو، کیوں کہ تیمّم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور اس پر قضا بھی نہیں ہے۔

۴۔ پانی اس کی قیمت سے زیادہ میں مل رہا ہو۔

۵۔ پانی تو ہو لیکن اس کو پینے کی ضرورت ہو۔

۶۔ پانی موجود ہو لیکن وہ اس کو بیچ کر اپنے اخراجات پورے کرنے کا ضرورت مند ہو۔

۷۔ اس کے اور پانی کے درمیان کوئی رکاوٹ یا ایسا دشمن ہو جو وہاں تک پہنچنے سے اس کو روک رہا ہو۔

۸۔ پانی کنویں میں ہو اور اس کے پاس کنویں سے پانی نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

۹۔ پانی موجود ہو، لیکن اس کو سفر میں سخت سردی کی وجہ سے نقصان کا خطرہ ہو یا اپنے ساتھیوں سے بچھڑنے کا خطرہ ہو۔

تیمّم کی یہ سبھی رخصتیں سفر کے ساتھ خاص ہیں۔

۱۰۔ اگر کوئی سفر پر ہو یا مقیم ہو اور اس کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جس کی وجہ سے اس کی زندگی کو خطرہ ہو یا مرض بڑھنے کا یا تاخیر سے شفایابی کا، یا چہرے اور ہاتھوں کو پانی لگانے سے کالے دھبے پڑتے ہوں، تو اس صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے اور اس پر نماز کی قضا نہیں ہے۔ (مسلک شافعی میں یہ راجح ہے: دیکھا جائے ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۷۹) واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

تیمّم پانچ امور پر مشتمل ہے: فرائض، سنتیں، آداب، مکروہات اور شرطیں۔

تیمّم کے فرائض چھ ہیں:

۱۔ مٹی اعضائے تیمّم کی طرف منتقل کرنا، صرف اس کو اعضاء تیمّم سے چھونا کافی نہیں ہے جس طرح غبار والی ہوا ہے۔

۲۔ نیت: تیمّم کرنے والا اپنے دل میں اللہ تعالی کی خاطر نماز حلال ہونے کے لیے تیمّم کی نیت کرے۔

۳۔ مٹی پر دونوں ہتھیلی مارنا پھر ان دونوں سے پورے چہرے کا مسح کرنا (کیوں کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''فامسحوا بوجوھکم وأیدیکم'' مائدہ ٦، رسول اللہ ﷺ سے یہی عمل منقول ہے)

۴۔ دونوں ہتھیلی دوسری مرتبہ مٹی پر مارنا اور ان سے ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح کرنا۔

۵۔ دونوں مسح کے درمیان ترتیب کا خیال رکھنا: پہلے چہرے کا مسح پھر ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح۔

بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ پانی تلاش کرنا تیمّم کے شرائط میں سے ہے، اس کے فرائض میں سے نہیں، ہمیں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا ہے۔ (اس مسئلہ کے مراجع کے لیے دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۸۰-۸۱)

تیمّم کی سنتیں

تیمّم کی سنتیں سات ہیں:

۱۔ بسم اللہ پڑھنا۔

۲۔ مٹی کم کرنے کے لیے ہاتھوں کو جھاڑنا۔

۳۔ مٹی سے مسح کرتے وقت دائیں کو بائیں پر مقدم کرنا۔

۴۔ انگلیاں کھلی رکھنا۔

۵۔ اپنا ہاتھ بلند نہ کرے تا کہ اس کا تیمّم مکمل ہو۔

۶۔ پہلی مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارتے وقت انگوٹھی اتارنا، البتہ دوسری مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارتے وقت انگوٹھی اتارنا واجب ہے، کیوں کہ ہاتھ کے سبھی اجزاء تک غبار کا پہنچنا واجب ہے اور اس کا ایک حصہ انگوٹھی کے نیچے بھی ہے۔

۷۔ وضو کی سنتوں میں سے جو بھی سنت تیمّم میں کرنا ممکن ہو اس کو کرنا (دیکھا جائے: روضۃ الطالبین۔ حاشیۃ بلقینی ۱/ ۱۴۷)

تیمّم کے آداب

تیمّم کے آداب تین ہیں:

١۔تیمّم کرتے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنا۔

٢۔چہرہ کے اوپر سے نیچے کی طرف مسح کرنا۔

٣۔ہاتھوں کے مسح کی ابتداانگلیوں سے کرنا پھرہتھیلیوں کا مسح کرنا۔

تیمّم کے مکروہات

تیمّم کے مکروہات دوہیں:

١۔چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرتے وقت مٹی زیادہ لینا۔

٢۔چہرے اور ہاتھوں کا مسح ایک سے زیادہ مرتبہ کرنا۔

تیمّم کی شرطیں

تیمّم کی شرطیں آٹھ ہیں:

١۔تیمّم مٹی سے ہو۔

٢۔مٹی طاہر اور خالص ہوجس میں کوئی چیز ملی ہوئی نہ ہومثلاً آٹا وغیرہ۔

٣۔مٹی کا قصد کرے۔

٤۔دومنتقلی سے مسح کرے۔

٥۔سب سے پہلے نجاست دور کرے۔

٦۔وقت داخل ہونے کے بعد تیمّم کرے۔

٧۔ہرفرض کے لیے تیمّم کرے۔

٨۔اگر پانی نہ پایا جانا شرعی عذر ہوتو وہ کسی گناہ کے سفر پر نہ ہو(مفقود ہونے کی دوقسمیں ہیں:ایک حسی اور دوسرا شرعی،پہلے کے معنی یہ ہیں کہ حسی طور پر پانی نہ پایا جائے،دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ پانی

تو پایا جائے لیکن اس کے استعمال میں کوئی رکاوٹ ہومثلاً بیماری اور سخت ٹھنڈی،ان دونوں کی تفصیل اور اصول وضوابط ہیں جن کی تفصیلات کے لیے طویل کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے)

تیمّم کو باطل کرنے والے امور

تیمّم بارہ چیزوں سے باطل ہوتا ہے،جن میں سے نو کا تذکرہ وضو باطل کرنے والی چیزوں میں کیا جاچکا ہے،کیوں کہ جو چیز وضوکو باطل کرتی ہے وہ تیمّم کو بھی باطل کرتی ہے، اسی طرح ہم نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ جب موزوں پر مسح باطل ہوجاتا ہے تو وضو بھی باطل ہوجاتا ہے،اگر تیمّم وضو کے ساتھ ملا ہوا ہوتو اس صورت میں موزوں پر مسح باطل ہونے کی صورت میں تیمّم بھی باطل ہوتا ہے۔

وہ چھ امور جن سے صرف تیمّم باطل ہوجاتا ہے:(دیکھا جائے:''حاشیۃ الباجوری''١/٩٨، اور''روضۃ الطالبین''١/١٤٨)

١۔نماز شروع کرنے سے پہلے پانی مل جائے،اگر وہ نماز شروع کرچکا ہواور پانی دیکھ لے تو تیمّم سے اس کی نماز باطل ہوجائے گی،اوروہ اپنی نماز مکمل کرسکتا ہے۔(اس مسئلہ میں تفصیل ہے،جس کو تقی حصنی نے''کفایۃ الأخیار''میں بیان کیا ہے١/٨٩)

٢۔وہ پانی کی قیمت پالے جس سے وہ پانی خریدے اور نماز کے لیے وضو کرے،مگر یہ کہ وہ پانی کی قیمت پانے سے پہلے ہی نماز شروع کرچکا ہوتو اس کا تیمّم صحیح ہے اور وہ اپنی نماز مکمل کرسکتا ہے۔

٣۔نماز شروع کرنے سے پہلے اس کو پانی کی موجودگی کا وہم ہوجائے،اگر وہ تیمّم کرکے نماز میں داخل ہوچکا ہواوراس کونماز میں پانی کی موجودگی کا وہم ہوجائے تو وہ اس کو مکمل کرسکتا ہے۔

٤۔نماز شروع کرنے سے پہلے چہرہ یا ہاتھوں میں پانی کے استعمال کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ختم ہوجائے،اگر وہ اس اندیشہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی نماز شروع

کر چکا ہو تو اس کا تیمّم صحیح ہے اور وہ اپنی نماز مکمل کر سکتا ہے۔

۵۔ جب اس کا تیمّم سفر کی وجہ سے ہو پھر وہ نماز کے لیے ٹھہر جائے اور نماز کے دوران پانی دیکھ لے اور اس کی نیت سفر سے اقامت میں تبدیل ہو جائے تو اس کا تیمّم باطل ہو جاتا ہے اور اس پر ضروری ہے کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھے۔

۶۔ مرتد ہو جائے (اللہ اس سے محفوظ رکھے)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

وضو اور تیمّم کے درمیان فرق

تیمّم پانچ چیزوں میں وضو سے مختلف ہے:

۱۔ تیمّم صرف دو اعضاء میں ہوتا ہے: چہرہ اور ہاتھ، جب کہ وضو چار اعضاء میں ہوتا ہے: چہرہ، ہاتھ، سر اور پاؤں۔

۲۔ وضو میں پانی کا بالوں کی جڑوں تک پہنچنا واجب ہے، جب کہ تیمّم میں مٹی صرف بال کے ظاہری حصہ پر لگنا کافی ہے۔

۳۔ تیمّم سے صرف ایک ہی فرض ادا کیا جا سکتا ہے، جب کہ وضو میں ایک وضو سے جتنے چاہے فرائض ادا کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ وقت شروع ہونے سے پہلے کسی بھی نماز کے لیے وضو کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے وضو کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ تیمّم عذر کی صورت میں ہی کرنا جائز ہے، جب کہ وضو کسی بھی وقت کرنا جائز ہے۔

نجاست کو زائل کرنے کے احکام

نجاست کی اکیس (۲۱) قسمیں ہیں: (محاملی نے ''اللباب'' میں یہی بیان کیا ہے ۱/۶۳)

پاخانہ، پیشاب، مٹی سے ملا ہوا حیوانات کا گوبر۔

مذی، ودی۔ (مذی: ایک شفاف سائل ہے جو شہوت کے بھڑکنے کے دوران اگلی شرمگاہ سے نکلتا ہے، جماع سے نہیں، ودی: گدلا سائل ہے جو پیشاب کے بعد بھاری وزن اٹھانے یا سخت ٹھنڈی کی وجہ سے نکلتا ہے)

کتے اور خنزیر کی منی (البتہ ان دونوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کی منی پاک ہے) اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ آدمی کی منی اس کے وجود میں آنے کی اصل ہے اور وہ پاک ہے۔

خون ملی پیپ، پیپ، زخم کا پانی، قئے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۱/۱۵۱، امام غزالی نے اس پر بہترین اور تفصیلی بحث کی ہے)

کتا اور خنزیر، اسی طرح ان دونوں کے ملنے یا ان میں سے کسی ایک کے دوسرے جانور سے ملنے کی وجہ سے پیدا ہونے والا جانور۔

پت (صفرا)، انسان کے علاوہ دوسرے جانوروں کا مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ رحم مادر میں لپٹا ہوا ہوتا ہے اور بوقتِ ولادت بچہ کے ساتھ نکلتی ہے) ماکول اللحم (جس کا گوشت کھانا شریعت میں جائز ہے) پرندہ کا انڈا جب وہ کسی ایک طرف سے خون ہو جائے۔

نشہ آور چیز، پیٹ سے نکلنے والا پانی، غیر ماکول اللحم (جس کا گوشت کھانا شریعت میں جائز نہیں ہے) جانوروں کا دودھ۔

مردار، سوائے تین کے: مچھلی، ٹڈی اور آدمی۔

خون نجس ہے سوائے تین کے: جگر اور تلّی اور مشک کا نافہ۔

صحیح قول کے مطابق مچھلی کا خون نجس ہے، اس کے مقابلہ میں ایک قول یہ ہے کہ مچھلی

کا خون پاک ہے جیسا کہ حنفی مسلک میں ہے۔ (دیکھا جائے ''ملتقی الأبحر'' امام حلبی حنفی ۱/۵۲)

انسان کا مشیمہ پاک ہے، انڈا پاک ہے چاہے وہ ایسے پرندہ کا ہو جس کا گوشت کھانا حرام ہے، بلغم جب لباس پر گر جائے تو پاک ہے، اور انسان کا دودھ پاک ہے۔

نجاست دور کرنے کا طریقہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۱/۱۹۱، ''اللباب'' محاملی ۱/۶۵)

نجاستوں کو دور کرنے کی دس قسمیں ہیں:

۱۔ بدن یا کپڑے پر لگنے والی نجاست: اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے، اگر بدن پر نجاست ہو تو دھونے سے اس کا دور ہونا ضروری ہے کہ نجاست کا اثر ختم ہو جائے، اگر اس کا ذائقہ باقی ہو تو بدن پاک نہیں ہوتا ہے، ذائقہ باقی ہونے کو جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس پر مکھی بیٹھتی ہے۔ (یہ بہت سی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، صرف یہی علامت نہیں، کیوں کہ مکھی مٹھائی وغیرہ پر بھی بیٹھتی ہے) اگر نجاست کا ذائقہ ختم ہو جائے اور اس کے صرف رنگ کو دور کرنا مشکل ہو یا صرف اس کی بُو کو تو اس کا حکم یہ ہے کہ نجاست دور ہو گئی ہے، اگر دونوں باقی ہو تو نجاست دور نہیں ہوئی ہے۔

۲۔ پتلی چیزوں میں گرنے والی نجاست: اس کا حکم یہ ہے کہ وہ چیز حرام ہو جاتی ہے، اور کبھی بھی پاک نہیں ہوتی ہے، اگر تیل نجس ہو جائے تو اس کا استعمال روشنی حاصل کرنے کی خاطر چراغوں میں جائز ہے، اسی طرح کشتیوں اور جانوروں کو طلا کرنے میں بھی صحیح ہے، اگر پارہ میں نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کے لیے دھونا جائز ہے، اگر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سائل بن جائے تو وہ پاک نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ موت کی وجہ سے آنے والی نجاست: یہ نجاست کبھی بھی پاک نہیں ہوتی ہے، ہر مردار نجس ہے، سوائے آدمی، ٹڈی اور مچھلی کے، البتہ مردار کا چمڑا دباغت سے پاک ہو جاتا ہے، اور دباغت کے بعد اس کو دھونا ضروری ہے، اگر اس پر کوئی بال ہو تو اس کو ہٹانا واجب

ہے، البتہ تھوڑا سا معاف ہے یعنی چھ سے سات بال، اگر مردار کتا یا خنزیر ہو یا ان دونوں سے پیدا ہونے والا یا ان میں سے کسی ایک سے پیدا ہونے والا جانور تو وہ پاک ہوتا ہی نہیں ہے اور نہ اس کا چمڑا پاک ہوتا ہے۔

۴۔ موزے کے نیچے لگنے والی نجاست جب وہ سوکھ جائے اور زمین سے موزہ گھسنے کی وجہ سے نجاست دور ہو جائے تو اس صورت میں امام شافعی کا قولِ قدیم یہ ہے کہ موزہ پاک ہو جاتا ہے اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ امام شافعی کا قولِ جدید یہ ہے کہ اس کو دھوئے بغیر پاک نہیں ہوتا ہے۔ (قفال نے ''حلیۃ الأولیاء'' میں اس کو نقل کیا ہے ۱/۲۵۴)

۵۔ پیشاب پاخانہ کی جگہ: اس کو پانی سے دھونے سے پاک ہوتا ہے یا تین مرتبہ پتھر سے پوچھنے سے تاکہ اس جگہ سے نجاست کو دور کر دیا جائے، پتھر کے حکم میں ہر وہ پاک چیز ہے جو نجاست کو ختم کرنے والی ہو اور اس سے نجاست کا اثر دور ہوتا ہو، چاہے وہ لکڑی ہو یا کپڑے کا ٹکڑا وغیرہ، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ کھائی جانے والی چیز نہ ہو، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اہمیت والی چیز نہ ہو مثلاً لکھنے کے لیے مخصوص سفید کاغذ۔ (یعنی وہ پاک ہو، نجاست دور کرنے والی ہو، کھائی جانے والی نہ ہو اور محترم نہ ہو جیسا کہ ''نہایۃ المحتاج'' تالیف: رملی میں ہے ۱/۱۴۶، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ صاف کرنے والی ہو، ورنہ نجاست کو دور کرنے میں پانی کا استعمال واجب ہے، اس میں صرف ایک ہی قول ہے)

۶۔ دودھ پیتے بچے کا پیشاب: جس نے اپنی ماں کے دودھ کے علاوہ کوئی دوسرا کھانا نہ کھایا ہو، اس کا پیشاب صرف اس پر پانی چھڑکنے سے صاف ہوتا ہے، البتہ دودھ پیتی بچی کا پیشاب اور ماں کے دودھ کے علاوہ دوسری چیز کھانے والے بچے کا پیشاب کا حکم بڑوں کے پیشاب کی طرح ہی ہے (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے گا اور بچی کے پیشاب پر پانی بہایا جائے گا'' مسند احمد ۵۶۳، ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماذکر فی نضح بول الغلام الرضیع ۶۱۰، امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے) دودھ پیتے بچہ کے پیشاب پر پانی چھڑکتے وقت پیشاب پر پانی پھیل جانا ضروری ہے۔

۷۔ جب کتے، خنزیر یا ان دونوں سے ہونے والے جانور کی نجاست لگ جائے: یہ

نجاست اسی وقت دور ہوتی ہے جب اس کو سات مرتبہ دھویا جائے اور ان میں سے ایک مرتبہ مٹی سے۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے کسی کے برتن میں جب کتا منہ ڈالے تو اس کی پاکی یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھویا جائے، ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی سے'' مسند احمد ۷۳۴۶، مسلم: کتاب الطھارۃ، باب حکم ولوغ الکلب ۲۷۹، یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

۸۔ جب زمین پر پیشاب کیا جائے تو وہ زمین وہاں موجود پیشاب سے زیادہ پانی بہانے سے پاک ہو جاتی ہے۔ (مسلک میں یہی صحیح قول ہے، بعض فقہاء نے یہ قید لگائی ہے کہ بہایا جانے والا پانی پیشاب سے سات گنا زیادہ ہو، یہ قول ضعیف ہے، دیکھا جائے: ''حلیۃ العلماء'' قفال شاشی ۱/۲۵۳)

۹۔ پسو، مچھر، کھٹمل اور مکھی وغیرہ کا خون جس میں بہتا خون نہیں پایا جاتا، اسی طرح بدن یا کپڑے پر ان کی نجاست معفو عنہ ہے، کیوں کہ اس سے بچنا دشوار ہے۔

۱۰۔ جب پانی نجس ہو جائے: اگر پانی قلیل ہو تو اسی وقت پاک ہوتا ہے جب اس میں پانی کا اضافہ کر کے اس کو دو قلے (۲۱۶ لیٹر) بنایا جائے، اگر پانی کثیر ہو اور اس میں تبدیلی آئے تو اسی وقت پاک ہوتا ہے جب خود بخود اس میں آئی ہوئی تبدیل دور ہو جائے، اگر اس میں مٹی وغیرہ ڈالنے کی وجہ سے اس کی تبدیلی دور ہو جائے تو وہ پاک نہیں ہوتا ہے۔ شربینی الخطیب نے لکھا ہے: ''اگر پانی کے اضافے کی وجہ سے نجس پانی دو قلے ہو جائے چاہے ملایا ہوا پانی مستعمل ہو، نجس ہو اور تبدیل شدہ ہو مثلاً زعفران وغیرہ ملنے کی وجہ سے تو وہ طہور ہے، کیوں کہ نجس ہونے کی علت دور ہوگئی ہے اور وہ علت ہے پانی کا کم ہونا، اگر اس کے بعد پانی کو الگ کیا جائے تو بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے''۔ (مغنی المحتاج بشرح المنھاج۔ شربینی الخطیب ۱/۳۸) یہ شرط ہے کہ اس سے نجاست کے اوصاف: ذائقہ، رنگ اور بُو دور ہو جائے جیسا کہ واضح ہے۔

☆☆☆☆☆

موزوں پر مسح

وضو میں پاؤں دھونے کے بدلے موزوں پر مسح کیا جاتا ہے، اس کے احکام مندرجہ ذیل ہیں: (دیکھا جائے: ''اللباب''، محاملی ۱/۷۰)

مسح کی نو قسمیں ہیں:

۱۔ تین پتھروں یا کپڑے کے ٹکڑے یا اس طرح کی کسی دوسری چیز سے پیشاب پاخانہ کو ہٹانے کے لیے مسح کرنا تا کہ وہ جگہ پاک ہو جائے۔

۲۔ تیمّم کے لیے مٹی پر ہاتھ مار کر مسح کرنا، اور دونوں ہاتھوں سے چہرے اور ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح کرنا جب کوئی ایسا عذر پایا جائے جس کی وجہ سے نماز یا طواف یا قرآن کی تلاوت کے لیے پاکی حاصل کرنے کی نیت سے تیمّم کرنا جائز ہو جائے۔

۳۔ پٹی یا زخم کو کسی دوسری چیز سے ڈھاکے ہوئے حصے پر وضو کے دوران مسح کرنا، اس کی تفصیلات تیمّم کے باب میں گزر چکی ہیں۔

۴۔ فرض وضو میں سر کا مسح کرنا۔

۵۔ کانوں کا مسح کرنا، یہ وضو کی سنتوں میں سے ہے۔

۶۔ چہرہ دھوتے وقت گردن کے اوپری حصہ کا مسح کرنا، یہ وضو کے مستحبات میں سے ہے۔ (اس بارے میں اختلاف کا تذکرہ ہو چکا ہے، مسلک میں قولِ معتمد یہ ہے کہ گردن کا مسح نہیں ہے)

۷۔ اگر ہاتھ کہنی کے اوپر سے کٹا ہو تو باقی ہاتھ کا مسح کرنا۔

۸۔ اگر پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کٹا ہو تو باقی پاؤں کا مسح کرنا۔

۹۔ وضو میں پاؤں دھونے کے بجائے موزوں پر مسح کرنا؛ اس کی دو قسمیں ہیں:

أ۔ مقیم ایک دن اور ایک رات مسح کرے گا۔

ب۔ مسافر تین دن اور تین رات مسح کرے گا

مسح کی مدت کی ابتدا موزے پہننے کے بعد وضو ٹوٹنے کے وقت سے ہوتی ہے۔

موزوں پر مسح کی شرطیں:

(دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۷۰، ''اللباب'' محاملی ۱/۷۱، صاحب لباب نے ساتویں شرط کا اضافہ کیا ہے کہ وہ مسافر ہونے کی صورت میں نافرمان نہ ہو)

موزوں پر مسح کی چھ شرطیں ہیں:

جب مندرجہ ذیل شرطیں پائی جائیں تو موزوں پر مسح کرنا جائز ہے:

۱۔ مکمل طہارت کے بعد موزے پہنے۔

۲۔ یہ طہارت وضو کے ذریعہ ہو، تیمّم کے ذریعہ نہیں۔

۳۔ موزے فرض جگہ کو چھپانے والے ہوں۔

۴۔ موزے ایسی قسم کے ہوں کہ ان پر مسلسل چلنا ممکن ہو، اس لیے جورب (پتلے موزہ) پر مسح کرنا جائز نہیں ہے، البتہ امام احمد کے نزدیک جورب پر مسح کرنا جائز ہے۔

۵۔ اس کے نیچے دوسرا موزہ نہ ہو، اگر دو مضبوط موزے ایک دوسرے پر پہنا ہوا ہو تو اوپر والے موزے پر مسح کافی نہیں ہے، اگر اوپر مضبوط موزہ ہو اور نیچے کمزور مثلاً موزے کے نیچے جورب ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پانی بہانے کی صورت میں پانی اندر نہ جاتا ہو، سوائے سلائی کی جگہ سے

پاؤں دھونے اور موزوں پر مسح کرنے کے درمیان فرق

پاؤں دھونے اور موزوں پر مسح کرنے کے درمیان چھ فرق ہیں: (''اللباب'' کے مصنف نے آٹھ فرق بیان کیے ہیں ۱/۷۲)

۱۔ جب تک وضو نہ ٹوٹے تو پاؤں دھونے کی کوئی مدت متعین اور محدود نہیں ہے، جب کہ موزوں پر مسح کی مدت متعین ہے؛ مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات، اور مسافر کے لیے تین دن تین رات، جب مدت ختم ہوجائے تو موزوں کو اتارنا اور باوضو ہو تو صرف پاؤں دھونا ضروری ہے، وضو دہرانا افضل ہے تاکہ پے در پے وضو کرنے کی سنت ادا ہو اور اس کو واجب کہنے والوں کی رعایت ہوجائے۔

۲۔ موزوں پر مسح چار چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے: مدت ختم ہوجائے، دونوں پاؤں یا کسی ایک پاؤں سے موزہ اتار دے، جب پاؤں میں نجاست لگ جائے اور اندر ہی دھونا ممکن نہ ہو، غسل واجب ہوجائے، جب کہ پاؤں دھونا نہ موزہ اتارنے سے ٹوٹتا ہے اور نہ مدت ختم ہونے سے۔

۳۔ حالتِ جنابت میں موزوں پر مسح جائز نہیں ہے۔

۴۔ اقامت اور سفر کی حالت میں موزوں پر مسح کی مدت الگ الگ ہوجاتی ہے، جب کہ پاؤں دھونا دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔

۵۔ موزے سے پاؤں نظر آنے سے موزوں پر مسح باطل ہوجاتا ہے۔

۶۔ پورا پاؤں دھونا واجب ہے، جب کہ موزوں پر مسح میں صرف موزوں کے اوپر مسح کرنا کافی ہے۔

حیض

عورتوں کو حیض آنے کی کم سے کم مدت نو سال مکمل ہونا ہے، کس عمر میں عورتوں میں حیض آنا بند ہوتا ہے؛ اس بارے میں اختلاف ہے، اس کو سنِ یاس کہا جاتا ہے، بعض علماء اس کو عورت کے مقام پر موقوف کہتے ہیں، جب کہ بعض لوگ اس کی جنسیت کو سبب مانتے ہیں، جب کہ دوسرے لوگ اس کی زندگی کے حالات کو وجہ گردانتے ہیں، کبھی یہ سبھی عوامل اور اسباب پائے جاتے ہیں۔

عورتوں میں حیض آنا بند ہونے کی مدت کے بارے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سب سے مشہور قول ۶۲ سال کی عمر ہے۔ (دیکھا جائے: روضۃ الطالبین ۳۷۲/۸، امام غزالی نے ''الوسیط'' میں بڑی مفید تفصیل بیان کی ہے ۱۲۴/۶)

حیض سے متعلق بیس مسئلے ہیں، بارہ مسائل کا تعلق حیض کی وجہ سے حرام والی چیزوں سے ہے اور آٹھ مسائل کا تعلق اس کے احکام سے ہے۔

حیض کے دوران مندرجہ ذیل بارہ چیزیں حرام ہیں: (دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۷۴/۱)

۱۔ قرآن کی تلاوت

۲۔ قرآن کو لکھنا

۳۔ مصحف کو چھونا

۴۔ مسجد میں داخل ہونا

۵۔ نماز

۶۔ سجدہ

۷۔ روزہ

۸۔مسجد میں اعتکاف

۹۔کعبہ کا طواف کرنا

۱۰۔شوہر کا اس سے جماع کرنا

۱۱۔شوہر کے لیے اس کو طلاق دینا حرام ہے

۱۲۔ناف اور گھٹنے کے درمیان سے لطف اندوز ہونا

حائضہ کے احکام

۱۔حیض آنے والی عورت کے لیے بلوغ ثابت ہوتا ہے۔

۲۔حیض کا خون بند ہونے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔

۳۔عدت: عدت کی مدت تین طہر ہے اور اس کے ساتھ تین حیض ہے۔

۴۔باندی کو جب خریدا جائے تو اس کا رحم حمل سے صاف ہو، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے پہلے مالک سے حاملہ نہیں ہے۔ یہ ایک حیض آنے سے ثابت ہو جاتا ہے۔

۵۔آزاد کا رحم حمل سے صاف ہو، یہ بھی ایک حیض سے معلوم ہو جاتا ہے۔

۶۔عورت کا حیض جاری ہونے کے سلسلہ میں اس کی گواہی کی قبولیت، نہ کہ حیض آنے کے بارے میں، اس لیے کہ حیض کی حالت میں اس کے شوہر کے لیے اس سے جماع کرنا حرام ہو جاتا ہے۔

۷۔حیض کی مدت کے دوران اس پر نماز فرض نہیں رہتی اور نہ اس کی قضا ہے۔

۸۔حائضہ کے لیے طواف وداع نہیں ہے۔

حیض کے معاملہ میں عورتوں کی دو قسمیں ہیں: (''اللباب'' محاملہ ا/۷۵)

۱۔ایک وہ عورت جس کی ماہواری وقت پر آتی ہے اور وقت پر ختم ہوتی ہے، اس کا حکم وہی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا۔

۲۔استحاضہ والی عورت جس کو خون مسلسل نکلتا رہتا ہے؛ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔مبتدئہ یعنی وہ عورت جس کو پہلی مرتبہ حیض آیا ہو

۲۔معتادہ: یعنی وہ عورت جس کو شروع میں وقت پر حیض آتا تھا، اس کے بعد وہ مستحاضہ ہوگئی ہو۔

اگر **مبتدئہ** حیض کے خون اور دوسرے خون میں فرق کر سکتی ہے تو وہ فرق کرے گی، حیض کے خون کے بارے میں معروف بات یہ ہے کہ وہ خون قوی ہوتا ہے، اس کا رنگ کالا ہوتا جو سرخی مائل رہتا ہے، کبھی وہ لال ہوتا ہے یا گہرے بھورے رنگ کا یا زرد یا گدلا، اور اس میں کریہ بدبو رہتی ہے، استحاضہ کا خون وہ ہے جو حیض اور نفاس کے اوقات کے علاوہ میں نکلتا ہے، اس صورت میں وہ اپنی طرف سے فرق کرے گی۔

فرق کرنے کی چار شرطیں ہیں: (دیکھا جائے: ''فتح الوہاب'' شیخ الاسلام زکریا ا/۲۸)

۱۔حیض کے خون کی کم سے کم مدت ایک دن اور رات ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس مدت میں مسلسل خون آتا رہے بلکہ اس کا وجود کافی ہے کہ خون اپنا اثر روئی کے ٹکڑے پر چھوڑ دے جس کو اس جگہ رکھا جاتا ہے۔

۲۔حیض کا خون پندرہ دن اور رات سے زیادہ نہ ہو۔

۳۔اس کو طہر کی کم از کم مدت سے پہلے خون نہ آئے، یہ مدت پندرہ دن اور رات ہے۔

۴۔وہ دو مختلف خون دیکھے: قوی اور ضعیف، جیسا کہ ہم نے بتادیا کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور رات ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن اور رات ہے، کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن اور رات ہے، اور زیادہ سے زیادہ مدت کی کوئی حد ہی نہیں ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی عورت کو پوری زندگی میں کبھی حیض ہی نہ آئے۔

جو مبتدئہ حیض اور استحاضہ کے خون میں فرق نہ کر سکتی ہو تو وہ کم از کم حیض پر قیاس کر سکتی ہے یعنی ایک دن اور رات اور باقی دن استحاضہ کے حکم میں ہوں گے، اس صورت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ احتیاطاً طہر کے بعد خون آنے کی جگہ روئی یا کپڑا رکھے اور ہر نماز کے لیے وضو کرے۔

معتادہ اگر حیض اور استحاضہ کے خون کے درمیان فرق کرسکتی ہے تو وہ فرق کرلے، اگر فرق نہ کرسکتی ہوتو وہ اپنی پرانی عادت کی طرف رجوع کرے گی، جواس سے زیادہ مدت میں خون نکلے گا اس کو استحاضہ کا خون مان لے گی۔

اگر معتادہ اپنی عادت کو بھول جائے تو فقہاء اس کو اصطلاح میں ''متحیرہ'' کہتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنی عادت کا حساب لگانے میں حیران رہتی ہے اور فقہاء اس کے معاملہ میں حیران اور پریشان رہتے ہیں۔ (اس میں بہت زیادہ اختلاف ہے، یہاں تک کہ اس میں مستقل تصنیفات تحریر کی گئی ہیں، دیکھا جائے: ''المجموع شرح المھذب'' امام نووی ۲/۴۳۴، ''فتح الوھاب'' ۱/ ۲۸) یہ حیض کے مشکل مسائل میں سے ہے، متحیرہ اپنے مسئلہ میں فقہاء سے رجوع کرے۔

ہر عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے حیض اور طہر کے حالات کو جان لے، تا کہ اس کی نماز، روزے اور مناسک حج وعمرہ کے فرائض ضائع نہ ہوجائیں، اسی وجہ سے عورتوں کے لیے حیض اور طہر کے مسائل کی تدریس اور ان کو ان مسائل سے واقف کرانے کی بڑی اہمیت ہے، کیوں کہ ان احکام سے ناواقفیت سے عورتوں کی عبادتیں بگڑ جاتی ہیں، اسی طرح شوہر بھی سخت پریشانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ولادت سے پہلے آنے والا خون فاسد خون ہے، نہ اس پر حیض کا حکم منطبق ہوتا ہے اور نہ استحاضہ کا۔ (البتہ اگر اس سے پہلے حیض آیا ہو اور وہ اقل حیض کی مدت میں ہی ہو تو اس پر حیض کا حکم ہوگا، قولِ معتمد یہ ہے کہ حاملہ کو کبھی حیض آتا ہے)

نفاس کا خون: وہ خون ہے جو ولادت کے بعد آتا ہے، کم از کم مدت ایک لحظہ ہے، درمیانی مدت چالیس دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ دن (اندازہ اور تجربہ یہی بتاتا ہے، دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۱۱۱) بعض عورتیں پچیس دنوں کے بعد پاک ہوتی ہیں اور کبھی یہ مدت دواؤں کے استعمال کی وجہ سے کم ہوتی ہے، افضل یہ ہے کہ خون بند کرنے والی دوا استعمال نہ کی جائے۔

نفاس اور حیض کے درمیان فاصلہ رکھنے کی مدت کے لیے کوئی حدود نہیں ہیں، یہ ممکن ہے کہ وہ نفاس کے خون سے پاک ہونے کے تین دنوں کے بعد ہی عورت کو حیض آجائے۔

نماز

صلاۃ کے لغوی معنی دعا کرنے کے ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''وَصَلِّ عَلَيْهِمْ'' (توبہ ۱۰۳) یعنی ان کے لیے دعا کیجیے۔

شرعی معنی: چند اقوال اور افعال ہیں، جن کو چند شرطوں کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے جن کی ابتدا تکبیر سے ہوتی ہے اور اختتام سلام پر ہوتا ہے۔

نماز کی پانچ قسمیں ہیں: فرض عین، فرض کفایہ، سنت، نفل، مکروہ

فرض عین پانچ نمازیں اور جمعہ کی نماز ہے، جو ہر مسلمان بالغ عاقل پر فرض ہے جو رکاوٹوں سے خالی ہو۔

فرض کفایہ مثلاً نماز جنازہ۔

وہ سنت نمازیں جو جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں مثلاً عیدین کی نماز، اور جو تنہا پڑھی جاتی ہیں مثلاً سنن رواتب۔

نفل نماز جس سے مقصود اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنا ہے، اس کی کوئی حد نہیں ہے، چاہے ایک ہی دن میں ہزار رکعتیں پڑھی جائیں۔

مکروہ نماز: مکروہ اوقات میں کسی وجہ کے بغیر نماز پڑھنا، مثلاً صبح کی نماز کے بعد نفل نماز پڑھنا۔

امام نووی کے قولِ معتمد کے مطابق جماعت کی نماز فرض کفایہ ہے اور یہی مسلک کا معتمد قول ہے۔ (''منھاج الطالبین'' امام نووی ۱/ ۲۲۹ شرح شربینی الخطیب)

ان نمازوں کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

سبھوں پر فرض نماز یعنی فرضِ عین، اس کی بارہ قسمیں ہیں: (اس تقسیم کے لیے دیکھا جائے ''اللباب'' محاملی ۱/ ۷۸)

۱۔حضر یعنی جہاں مقیم ہے وہاں فرض نماز

۲۔سولہ فرسخ مسافت کے سفر کی وجہ سے قصر نماز

۳۔سفر یا بارش کی وجہ سے ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء کے درمیان جمع کر کے پڑھی جانے والی نماز یعنی جمع بین الصلاتین

۴۔جمعہ کی نماز

۵۔جنگ کے دوران اور دشمن کے مقابلہ کے وقت صلاۃ الخوف

۶۔سخت خوف کے وقت نماز، یہ نماز جنگ میں دشمنوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے موقع پر پڑھی جاتی ہے

۷۔فرض کی قضا نماز

۸۔نماز کا اعادہ، اس کے اور قضا کے درمیان فرق یہ ہے کہ اس نماز کو فرض کے وقت میں ہی پڑھا جاتا ہے، جب کہ قضا کو فرض کا وقت ختم ہونے کے بعد پڑھا جاتا ہے

۹۔مریض کی نماز، وہ اپنی استطاعت کے مطابق کھڑے، بیٹھے یا لیٹے پڑھتا ہے

۱۰۔غرق ہونے والے کی نماز جس کو غرق ہونے والا غرق ہوتے وقت پڑھتا ہے۔ وہ نماز جس شکل میں چاہے پڑھ سکتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی میں نماز کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

۱۱۔معذور کی نماز

۱۲۔طواف کے بعد دو رکعت نماز، یہ ضعیف قول ہے، کیوں کہ صحیح قول کے مطابق طواف کی دو رکعتیں سنت ہیں، چاہے فرض طواف کے بعد ہو یا سنت طواف کے بعد۔

فرض کفایہ

۱۔نماز جنازہ

۲۔میت کو غسل دینا، کفن دینا اور دفن کرنا

۳۔اللہ کی راہ میں جہاد: اگر کافر مسلمانوں کے ملک میں ہوں تو جہاد فرض کفایہ ہے جب

کہ مسلمانوں کا جہاد سے مقصد اسلام کی نشر و اشاعت ہو، اگر کوئی بھی اسلامی علاقہ کافروں کے حملہ کا شکار ہو جائے تو اس وقت اس علاقہ والوں پر اپنے ملک کا دفاع کرنا فرض عین بن جاتا ہے، اور ان پر ضروری ہے کہ وہ اپنی سرزمین اور دین کے دفاع کے لیے قربانیاں دیں اور بہادری دکھائیں، یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ جب مسلمان جہاد سے رک گئے تو کافروں نے مسلمانوں کے ملکوں اور مالوں پر قبضہ کرنے کی طمع اور لالچ کی اور مسلمانوں کی کمزوری میں اضافہ ہو گیا۔

۴۔طلبِ علم: یہ مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، کیوں کہ علم کی سبھی فروعات اور شاخوں (جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا ہو) کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں میں سے چند لوگوں کا فارغ ہونا ضروری ہے تا کہ وہ عالم کی قیادت کریں۔

۵۔سلام کا جواب دینا: جب کوئی شخص کسی جماعت کو سلام کرے تو اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک جواب دے تو کافی ہے، اگر ایک ہی شخص کو سلام کیا جائے تو اس شخص کے لیے جواب دینا فرض عین ہے۔

۶۔جماعت کی نماز: یہ امام نووی اور مسلک شافعی کا معتمد قول ہے (روضۃ الطالبین کی عبارت یہ ہے: اصح یہ ہے کہ وہ (جماعت کی نماز) فرض کفایہ ہے۔ ۱/۳۳۹)

سنت نمازیں

سنت نمازیں بیس ہیں:

۱۔عید الفطر کی نماز

۲۔عید الاضحیٰ کی نماز

۳۔سورج گہن کی نماز

۴۔چاند گہن کی نماز

۵۔استسقاء کی نماز (پانی مانگنے کی نماز)

یہ پانچ نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اور یہ نمازیں سنت موکدہ ہیں۔

۶۔وتر کی نماز

٧۔فجر کی سنت نماز

٨۔تہجد کی نماز

یہ تین نمازیں سنت موکدہ ہیں جو تنہا ادا کی جاتی ہیں، جماعت کے ساتھ نہیں۔

٩۔فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں ادا کی جانے والی سنتیں جن کو سنن رواتب کہا جاتا ہے۔

١٠۔چاشت کی نماز

١١۔تراویح کی نماز؛ اگرچہ یہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے،لیکن اس کی فضیلت وتر کی نماز، فجر کی سنت،تہجد اور سنن رواتب کی طرح نہیں ہے۔

١٢۔توبہ کی نماز

١٣۔تحیۃ الوضو کی نماز

١٤۔تحیۃ المسجد کی نماز

١٥۔صلاۃ التسبیح

١٦۔استخارہ کی نماز

١٧۔اذان واقامت کے درمیان سنت نماز،سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر

١٨۔سفر کی سنت نماز اور سفر سے واپس آنے پر سنت نماز

١٩۔زوال کی سنت نماز

٢٠۔سنت نمازوں کی قضا

نفل نمازیں

جن نمازوں کا تذکرہ ہم نے کیا ہے،ان کے علاوہ ہر وہ نماز نفل ہے جو اللہ تعالی کے لیے پڑھی جاتی ہے اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، چاہے ایک ہی دن میں ہزار رکعتیں پڑھی جائیں۔

مکروہ نمازیں

مکروہ نماز کی چھ قسمیں ہیں:

١۔بھوکے کی نماز، کیوں کہ بھوک سے نماز میں دل حاضر نہیں رہتا ہے

٢۔اپنے پیٹ میں ہوا جمع کر کے رکھنے والے کی نماز

٣۔پیشاب روک کر پڑھنے والے کی نماز

٤۔پاخانہ روک کر پڑھنے والے کی نماز

٥۔پیاسے کی نماز

ان تمام حالتوں میں نماز میں دل حاضر نہیں رہتا ہے۔

٦۔کراہت کے اوقات میں بغیر وجہ والی نفل نماز، یہ کراہت تحریمی ہے۔

مکروہ اوقات مندرجہ ذیل ہیں:

١۔صبح کی نماز کے بعد سے سورج طلوع ہونے تک

٢۔سورج طلوع ہونے کے وقت سے اس کے طلوع ہونے کے ١٦ منٹ بعد تک

٣۔آسمان کے بیچ میں سورج کے سیدھا ہونے کے وقت (استواء) سے مغرب کی جانب زوال کے وقت تک

٤۔عصر کی نماز کے بعد سے غروب تک

٥۔سورج غروب ہونے کے وقت سے مکمل غروب ہونے تک، اگر نماز کی کوئی وجہ اور سبب ہو مثلاً تحیۃ الوضوء،تحیۃ المسجد، قضا نماز، نمازِ جنازہ اور سورج گہن کی نماز تو ان اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

ان اوقات میں استخارہ کی نماز اور احرام کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان نمازوں کا سبب ان اوقات سے موخر ہے۔

٧۔خطبہ کے وقت نفل نماز، سوائے دو رکعت تحیۃ المسجد نماز کے جو مسجد میں داخل ہوتے ہی پڑھی جاتی ہے۔

٨۔جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جارہی ہو تو تنہا نماز پڑھنا

نماز کے احکام

نماز تین چیزوں پر مشتمل ہے: شرائط، فرائض اور سنتیں۔

نماز کی شرطیں

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''کفایۃ الاخیار'' ۱/ ۱۳۱، ''عجالۃ المحتاج إلی توجیہ المنہاج'' ابن ملقب ۱/ ۲۲۵، ''اللباب'' محاملی ۱/ ۸۱)

نماز کی شرطیں سات ہیں جن کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی ہے، یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ قدرت رہنے کی صورت میں سترِ عورت کرنا (اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ '' اعراف ۳۱، ابن عباس نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز میں کپڑے پہننا ہے، دیکھا جائے تفسیر القرطبی ۷ /۱۱۲)

مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے اور نماز میں عورت کا ستر پورا بدن ہے سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے، البتہ اجنبی مرد کے لیے عورت کا ستر پورا بدن ہے جس میں چہرہ اور ہتھیلیاں بھی شامل ہیں، باندی کا ستر نماز میں مرد کے ستر کی طرح ہے، اگر باندی خوبصورت ہو تو اس کا ستر آزاد عورت کے ستر کی طرح ہی ہے، اگر کسی کو اپنا ستر کرنے کے لیے کپڑا نہ ملے یا نجس کپڑا ملے اور اس کو دھونے کے لیے پانی نہ ہو تو وہ ننگا نماز پڑھے گا اور اس پر اس کی قضا کرنا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ قبلہ کی طرف رخ کرنا

نماز کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط ہے، اس سے تین مواقع مستثنی ہیں:

اَ۔ سفر میں نفل نماز، چاہے وہ پیدل ہو یا سوار، وہ جس جانب بھی رخ کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہو جاتی ہے، اگر وہ پیدل سفر کر رہا ہو تو نیت کے دوران، رکوع، سجدوں

اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے میں اس کا رخ قبلہ کی طرف رہنا ضروری ہے۔ (وہ قیام، آخری تشہد، اعتدال اور سلام میں قبلہ کو چھوڑ سکتا ہے: ''مغنی المحتاج'' ۱/ ۱۴۳۔۱۴۴، ''إعانۃ الطالبین'' شیخ بکری شطا ۱/ ۱۲۴۔۱۲۵) اگر وہ سوار ہو کر سفر کر رہا ہو تو صرف نیت کے وقت قبلہ رخ ہونا کافی ہے اور باقی ارکانِ نماز میں جس طرف چاہے رخ کر سکتا ہے، یہ سب احکام اس وقت ہیں جب وہ کشتی میں سفر نہ کر رہا ہو، اگر وہ کشتی میں سفر کر رہا ہو تو پوری نماز میں قبلہ رخ رہنا ضروری ہے۔

ب۔ جنگ میں سخت خوف ہو تو دشمنوں کے ساتھ مدبھیڑ کی صورت میں نماز کسی بھی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے۔

ج۔ سفر میں قبلہ کے سلسلہ میں اشتباہ پایا جائے یعنی قبلہ معلوم ہی نہ ہو رہا ہو تو وہ جس جانب قبلہ سمجھے اس جانب رخ کر کے نماز پڑھے، یہ ہر مباح مسافت قصر والے سفر کے لیے مطلقاً حکم ہے، اگر اس کو وقت نکلنے سے پہلے یقین ہو جائے کہ اس نے جس جانب رخ کیا ہے غلط ہے تو اس کے لیے نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے (یہ امام شافعی کا قول جدید ہے اور یہی اصح قول ہے، دیکھا جائے: ''حلیۃ العلماء'' شاشی ۲/ ۶۳، ''المجموع'' امام نووی ۳/ ۲۲۵) اگر وقت نکل جائے تو وہ اس نماز کی قضا کرے گا۔

۳۔ نماز کا وقت شروع ہو چکا ہو:

یہ شرط ہے، سوائے تین موقعوں پر:

اَ۔ سولہ فرسخ (ہمارے موجودہ مقیاس کے مطابق ۸۷ کلومیٹر) مسافت والے سفر میں جمع بین الصلاتین جائز ہے، ظہر اور عصر کے درمیان جمع تقدیم کی جائے یا جمع تاخیر، یا مغرب اور عشاء کے درمیان جمع تقدیم کی جائے یا جمع تاخیر، اور چار رکعت والی نمازوں (ظہر، عصر اور عشاء) میں قصر کرنا جائز ہے۔

ب۔ سخت بارش اور نمازیوں کے کپڑے بارش سے بھیگ جانے کی صورت میں ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت میں جمع تقدیم کرنا جائز ہے، اور مغرب اور عشاء کو مغرب کے وقت میں جمع تقدیم کرنا جائز ہے، بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کے لیے شرط یہ ہے کہ نماز مسجد میں

جماعت کے ساتھ ادا کی جائے اور قصر نہ کیا جائے، فقہاے حنابلہ نے گھر میں بھی بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کی اجازت دی ہے، البتہ قصر کی اجازت نہیں ہے۔ (ابن قدامہ مقدسی نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ عمومی عذر میں مشقت کا اعتبار نہیں ہوگا جس طرح کہ سفر میں ہے: دیکھا جائے: ''الکافی'' ۱/۳۱۱)

ج۔حج میں مسافر کے لیے مکہ میں داخل ہوتے وقت جمع کرنا جائز ہے جب وہاں وہ داخل ہونے کے دن اور وہاں سے نکلنے کے دن کو چھوڑ کر مکمل چار دن مقیم نہ ہو۔ (یہ حج کے سفر اور مکہ میں داخل ہونے کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ ہر مباح سفر کے لیے عام حکم ہے جب اس میں جمع کی سبھی شرطیں پائی جائیں) یہ شوافع فقہاء کی راے ہے، البتہ غیر شوافع کے نزدیک عرفہ اور مزدلفہ میں جمع کرنا حج کے مناسک میں سے ہے، حجاج ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو جمع اور قصر کر سکتے ہیں۔

۴۔حدث اکبر اور حدث اصغر سے پاک ہو: (حدث اصغر وضو کا نہ ہونا ہے اور حدث اکبر جنابت، حیض اور نفاس ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے اس سے پہلے دلیل دی جا چکی ہے: ''اللہ طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا''۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۸۲)

البتہ پانی نہ پایا جائے (جنبی یا جس کو وضو نہ ہو اس کو پانی نہ ملے) اور تیمّم کا ارادہ کرنے والے کو مٹی نہ ملے، فاقد الطہورین (پانی اور مٹی نہ پانے والا) کے لیے ایسی جگہ فرض نماز اس کے وقت میں پڑھنا جائز ہے جہاں سال کے اکثر دنوں میں پانی نہ پایا جاتا ہو، لیکن پانی یا مٹی ملنے کے بعد اس نماز کی قضا کرے گا، مسافر کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانی یا مٹی ملنے کے بعد نماز دہرائے یا اس کی قضا کرے، البتہ اقامت والی جگہوں پر وضو کے ساتھ ہی نماز پڑھنا واجب ہے، کیوں کہ حضر میں تیمّم سے نماز پڑھنا کافی نہیں ہے، اور حضر میں مسلسل پانی کی موجودگی کی وجہ سے نماز دہرانا واجب ہے۔

۵، ۶، ۷۔نجاست سے پاکی حاصل کرنا:

تین امور میں نجاست سے پاکی حاصل کرنا شرط ہے:

أ۔بدن

ب۔لباس

ج۔نماز کی جگہ

ایک موقع ایسا ہے جس میں بدن یا کپڑے پر نجاست کے اثرات رہتے ہوئے نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو دہرایا بھی نہیں جائے گا، یہ حالت ہے کھٹمل، پسّو اور مچھر کا خون یا مکھی کی گندگی کپڑے یا بدن پر لگے یا دونوں پر، اور اس شخص کی نماز جو پتھروں سے استنجا کرنے کے بعد نماز پڑھے، کیوں کہ پتھر سے نجاست کا اثر زائل نہیں ہوتا ہے۔

تین مواقع ایسے ہیں جن میں لباس یا بدن پر نجاست کا اثر پائے جانے کی صورت میں نماز جائز ہے لیکن اس کو دہرانا ضروری ہے، وہ مواقع مندرجہ ذیل ہیں؛

۱۔بدن پر نجاست کا اثر ہو اور اس کو صاف کرنے کے لیے پانی نہ ملے، اس کا حکم یہ ہے کہ وقت کا احترام کرتے ہوئے نماز ادا کی جائے، پانی ملنے کے بعد نماز کو دہرانا واجب ہے، اگر لباس میں نجاست لگی ہو اور کوئی دوسرا لباس نہ ہو تو ننگے نماز پڑھی جائے گی اور اس نماز کا اعادہ نہیں ہے۔

۲۔بدن پر نجاست لگی ہو اور اس کو دھونے سے موت کا اندیشہ ہو، یا پانی بہت ہی زیادہ ٹھنڈا ہو اور پانی گرم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو وہ اسی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے، البتہ اس کے لیے نماز دہرانا واجب ہے۔

۳۔کوئی نماز پڑھ لے اور اس کو معلوم ہی نہ ہو کہ اس کے بدن یا کپڑے پر نجاست ہے، یا وہ بھول کر نماز پڑھے تو اس صورت میں نجاست ہٹانے اور پاکی حاصل کرنے کے بعد نماز دہرانا واجب ہے۔

بعض فقہاء نے نماز صحیح ہونے کی مذکورہ شرطوں کے علاوہ اسلام، ممیّز ہونے اور اس کی فرضیت کا علم ہونے، اس کے فرائض میں سے کسی فرض کو سنت نہ سمجھنے، بات نہ کرنے، عمل کثیر نہ کرنے، کھانے پینے کو چھوڑنے، تکبیر تحریمہ کی نیت میں کسی قولی یا فعلی رکن کو شک کے ساتھ نہ چھوڑنے، یا شک کی مدت زیادہ نہ ہونے، نماز کو توڑنے کی نیت نہ کرنے یا اس کو توڑنے میں متردد نہ ہونے اور اس کو توڑنے کو کسی چیز کے ساتھ معلق نہ کرنے کی شرط رکھی ہے۔ (''الیاقوت النفیس'' سید فقیہ احمد بن عمر شاطری ص۳۶-۳۷) لیکن ان میں سے بہت سی شرطیں یا تو سبھی عبادتوں میں عام ہیں یا نماز کو باطل کرنے والی چیزوں میں داخل ہیں۔

نماز کے فرائض

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' ۱/۲۳۳، ''عمدۃ السالک'' ابن النقیب ۴۲، ''اللباب'' محاملی ۱/۸۴)

نماز کے فرائض یعنی ارکان اٹھارہ (۱۸) ہیں:

۱۔نیت کرنا: یعنی نماز کرنے کا ارادہ کرنا، نماز کی تعیین کرنا اور ادا کی جانے والی نماز کی فرضیت کی تعیین کرنا، مثلاً اپنے دل میں تکبیر سے پہلے کہے یا اپنی زبان سے ادا کرے: میں ظہر کی فرض نماز اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہوں۔ مطلق نفل میں مثلاً تحیۃ المسجد میں نماز پڑھنے کی نیت کرنا کافی ہے، وقت والی نفل نماز اور وہ نماز جس کی کوئی وجہ ہو مثلاً عید کی نماز، ظہر کی سنت نماز اور سورج گہن کی نماز میں نماز کی نیت اور تعیین کرنا ضروری ہے، فرض نماز میں ان دونوں کے ساتھ فرض نماز کی بھی نیت کرنا ضروری ہے۔ (''الیاقوت النفیس'' شاطری ۳۴)

نیت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی خوش نودی کی طلب مستحضر ہو، اسی کے ساتھ دل حاضر ہو اور خشوع وخضوع، عبادت میں اخلاص اور مکمل طور پر نماز کی ادائیگی پائی جائے۔

نماز بصیرت والوں کی نماز ہو کہ اس کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کا احسان کی وضاحت میں بیان کردہ یہ فرمان صادق آجائے: ''تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے''۔ (بخاری: کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان ۵۰، مسلم: کتاب الإیمان، باب معرفۃ الإیمان ۳۴)

نماز میں پورا بدن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، کیوں کہ قدم بدن کو اٹھائے رہتے ہیں، آنکھیں سجدے کی جگہ پر دیکھتی رہتی ہیں، دل اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغول رہتا ہے، اسی وجہ سے نماز میں داخل ہوتے وقت زبان سے نیت کا ادا کرنا مستحب

ہے، تاکہ زبان اور کان نماز میں داخل ہوتے وقت شریک رہیں، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے نیت کی ہے''۔

(بخاری: باب بدء الوحی ۱، مسلم: کتاب الإمارۃ، باب قولہ ﷺ ''إنما الأعمال بالنیات'' ۳۶۲۱)

۲۔تکبیر تحریمہ: اس کا لفظ ''اللہ اکبر'' ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اقرار کیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ تمام چیزوں سے بڑا اور عظیم ہے اور ہر چیز مخلوق اور اس کے تابع ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ملکیت ہے، مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی نماز میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری طرف متوجہ رہے۔

۳۔نماز میں داخل ہونے کی نیت کے ساتھ تکبیر تحریمہ ملی ہوئی ہو۔

۴۔کھڑا ہونا: یہ استطاعت کی شرط کے ساتھ فرض ہے، اگر کوئی کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے گا، اگر بیٹھ بھی نہ سکتا ہو تو پہلو کے بل، اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو تو چت لیٹ کر، کیوں کہ فرض نمازیں مسلمان سے کسی بھی حال میں معاف نہیں ہیں جب تک اس کی عقل سلامت ہو۔

۵۔سورہ فاتحہ پڑھنا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے، اور جس سورہ سے بھی ابتدا کی جائے اس کی ایک آیت ہے، امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب فنون امام اپنے زمانے کے حافظ حدیث ابو الفضل جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابوبکر سیوطی شافعی (۸۴۹۔۹۱۱ہجری) ان کی پرورش یتیمی کی حالت میں ہوئی، آپ نے علم حاصل کیا اور اس میں ممتاز مقام پایا، جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو آپ نے لوگوں سے گوشہ نشینی اختیار کی، آپ کی تصنیفات ایک ہزار سے زائد ہے، کہا گیا ہے کہ ان کا لقب ابن الکتاب ہے، کیوں کہ آپ کے والد نے ان کی ماں سے کتاب لانے کی درخواست کی تو اسی وقت دردزہ آیا اور آپ کی پیدائش ہوئی جب کہ ماں کتابوں کے درمیان ہی موجود تھی۔ آپ کے تعارف کے لیے آپ ہی کی کتاب کو دیکھا جائے: ''التحدث بنعمۃ اللہ''، آپ کے شاگرد داوودی اور عبد القادر شاذلی نے آپ کی سوانح پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اسی طرح دیکھا جائے: ''الأعلام'' زرکلی ۳/۳۰۱، ''الکواکب السائرۃ'' غزی ۱/۲۲۶) اپنی کتاب ''قطف الأزهار المتناثرة فی الأحادیث

المتواترۃ ''میں کہتے ہیں: ''جہری نماز میں بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کی حدیث متواتر ہے، اور حفص بن عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے موجود قرآن کی تلاوت میں بسم اللہ قرآن کریم کی تمام سورتوں میں ثابت ہے''۔

یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کو بسم اللہ کے بغیر پڑھنے کا فتویٰ دیتے ہیں جب کہ بسم اللہ مصحف میں تمام سورتوں کے شروع میں لکھا ہوا ہے، صرف سورہ توبہ میں نہیں ہے، مسلمان اس بات کا مامور ہے کہ اپنا کھانا، پینا، پہننا، گھر میں داخل ہونا اور اپنا ہر اچھا کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرے تو قرآن کی تلاوت میں یہ حکم بدرجہ اولیٰ ہے۔

انس رضی اللہ عنہ سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح قرآن کی تلاوت کرنے کی درخواست کی جاتی تو وہ بسم اللہ سے قرآن کی تلاوت شروع کرتے۔

اگر کوئی غیر شافعی امام ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے شافعی ہو تو اس کے لیے اپنی تلاوت کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنا ضروری ہے، ورنہ وہ اپنے پیچھے موجود شوافع کی نماز کے باطل ہونے کا گناہ اپنے ذمہ لینے والا ہو جائے گا۔

اگر کوئی ایسا شخص نماز پڑھنا چاہے جس کو سورہ فاتحہ یاد نہ ہو تو وہ فاتحہ کے بقدر طویل سات آیتوں کی تلاوت کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ (مسلک میں یہی اصح قول ہے کہ سورہ فاتحہ کی سات آیتوں کے حروف کی تعداد میں سے کوئی بھی حرف کم نہ ہو، دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' ۱/ ۲۴۵، ''المجموع شرح المہذب'' ۳/ ۳۷۵)

ہر مسلمان کے لیے سورہ فاتحہ یاد کرنا فرض ہے۔ (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں''۔ بخاری: کتاب بدء الوحی، باب وجوب القرآۃ للإمام والمأموم ۷۵۶، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ۹۰۰، یہ روایت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہے) اگر کسی کو سات آیتیں بھی یاد نہ ہوں تو یہ تسبیح کر سکتا ہے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' اس کو اتنی مرتبہ دہرائے گا کہ وہ سورہ فاتحہ کے حروف کی تعداد کے برابر ہو جائے، اگر اس کو یہ تسبیحات اور اذکار یاد نہ ہوں یا وہ ان کو ادا نہ

کر سکتا ہو مثلاً وہ گونگا اور بہرا ہو تو وہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بقدر خاموش کھڑا رہے گا۔

۶۔ رکوع کرنا یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔

۷۔ رکوع میں ''سبحان اللہ'' کے بقدر طمانینت۔

۸۔ رکوع سے اٹھ کر کھڑا ہونا۔

۹۔ اعتدال میں طمانینت۔

۱۰۔ سجدے کرنا، سجدہ سات ہڈیوں پر ہوتا ہے: پیشانی، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے، دو پاؤں (پاؤں کی انگلیوں کا اندرونی حصہ) افضل یہ ہے کہ سجدوں کے وقت پیشانی کے ساتھ ناک رکھی جائے۔

۱۱۔ سجدوں میں طمانینت

۱۲۔ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا یعنی جلسہ

۱۳۔ جلسہ میں طمانینت

۱۴۔ نماز کے اخیر میں تشہد کے لیے بیٹھنا

۱۵۔ نماز کے اخیر میں تشہد پڑھنا

۱۶۔ آخری تشہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا، البتہ آخری تشہد میں آل رسول پر درود بھیجنا سنت ہے۔

۱۷۔ پہلا سلام

۱۸۔ مذکورہ بالا ارکان کو ترتیب کے ساتھ ادا کرنا۔

نماز کی سنتیں

نماز کی سنتوں کی دو قسمیں ہیں:(دیکھا جائے:''الإقناع فی حل ألفاظ أبی شجاع'' شربینی الخطیب ۱/ ۱۲۸،''اللباب'' محاملی ۱/ ۸۶)

سنن ابعاض؛ان سنتوں کی بھرپائی سجدہ سہو سے ہوتی ہے۔

۲۔سنن ہیئات: ان کو چھوڑنے سے سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

سنن ابعاض جن کے چھوڑنے سے سجدہ سہو کیا جاتا ہے سات ہیں:

۱۔دعائے قنوت

۲۔قنوت کے لیے کھڑا رہنا

۳۔قنوت کے بعد رسول اللہ ﷺ، آل واصحاب پر درود وسلام بھیجنا (یہ بات ''بشری الکریم'' کے مصنف نے بیان کی ہے ۱/۱۷۳) صبح کی نماز میں دوسری رکعت کے رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھا جاتا ہے، اور رمضان کے مہینہ میں سولھویں رمضان سے اخیر تک وتر کی نماز کے آخری اعتدال میں دعائے قنوت پڑھنا۔

۴۔قنوت میں کوئی بھی دعا پڑھی جاسکتی ہے، مثلاً:''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ''(اے اللہ! میری مغفرت فرما، اور محمد پر اور آپ کے آل پر درود نازل فرما اور سلامتی)، مصلی یہ دعا اس وقت پڑھے جب وہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو جو آخری رکعت کے سجدوں کے لیے جانے سے پہلے قنوت نہ پڑھتا ہو۔

حدیث میں منقول دعائے قنوت یہ ہے:''اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ، وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ، وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِکْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ وَقِنِیْ شَرَّ مَاقَضَیْتَ اِنَّکَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْکَ وَاِنَّہٗ لَایَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ وَلَا یَعِزُّ

مَنْ عَادَیْتَ تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ، فَلَکَ الْحَمْدُ عَلٰی مَا قَضَیْتَ، وَلَکَ الشُّکْرُ عَلٰی مَا أَعْطَیْتَ، نَسْتَغْفِرُکَ اَللّٰھُمَّ وَنَتُوْبُ إِلَیْکَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ''۔(ابوداود: کتاب الوتر، باب القنوت فی الوتر ۱۴۲۵، نسائی: باب الدعاء فی الوتر ۳/ ۲۴۸، ابن ماجہ: کتاب إقامۃ الصلاۃ، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر ۱۱۷۸، مسند احمد ۱۷۱۸، ۱۷۲۳، ۱۷۲۷، یہ روایت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ہے) ترجمہ:۔اے اللہ مجھے ہدایت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے ہدایت دی ہے اور مجھے عافیت دے، ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے عافیت دی ہے اور تو میرا کارساز بن جا ان لوگوں کے ساتھ جن کا تو کارساز بنا ہے، اور مجھے برکت عطا کر ان چیزوں میں جو تو نے مجھے عطا کی ہیں اور مجھے اس چیز کے شر سے بچا جس کا تو نے فیصلہ کیا ہے، بیشک تو فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا، وہ شخص کبھی ذلیل نہیں ہوسکتا جس کا تو والی ہو، اور وہ کبھی عزت نہیں پاسکتا جس کو تو اپنا دشمن قرار دے، اے ہمارے پروردگار تو ہی برکت والا ہے اور تو ہی بلند وبرتر ہے۔

۵۔تشہد اول اور اس کے لیے بیٹھنا

۶۔تشہد اول کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا

۷۔تشہد اخیر میں آل نبی ﷺ پر درود پڑھنا

تشہد کے مکمل الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ أَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ، أَشْھَدُ أَنْ لَاإِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًارَسُوْلُ اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ، وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

ترجمہ: تمام برکت وعظمت والے کلمے، تمام نمازیں اور تمام نیک اعمال اللہ کے لیے ہیں، سلام ہو آپ پر اے نبی، اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں، اور سلام ہو ہم

پراوراللہ کے نیک بندوں پر، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔اے اللہ! محمد ﷺ پراور محمد کے آل پر رحمت نازل فرما، جیسے تو نے ابراہیم اوران کی آل پر رحمت نازل فرمائی، بے شک تو ہی تعریف کے لائق اور بڑی بزرگی والا ہے، اور محمد اوران کی آل پر برکت نازل فرما، جیسے تو نے ابراہیم اوران کی آل پر برکت نازل فرمائی، بے شک تو ہی تمام جہانوں میں تعریف کے لائق اور بڑی بزرگی والا ہے۔

(مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب التشہد فی الصلاۃ ۴۰۳، ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب التشہد ۹۷۴، ترمذی: أبواب الصلاۃ، باب ماجاء فی التشہد ۲۹۰، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ہے، بیہقی نے اس کے تفصیلی الفاظ ''معرفۃ السنن والآثار'' میں بیان کیا ہے ۲/ ۹۷)

نماز کے سنن ہیئات ۵۶ ہیں: (''اللباب'' میں محاملی نے چالیس سنتیں بیان کی ہے ۱/ ۸۷)

نماز میں داخل ہونے کے لیے کہی جانے والی تکبیر تحریمہ کے وقت مونڈھوں کے مقابل میں دونوں ہاتھوں کو اس طرح اٹھانا (رفع یدین) کہ ہاتھوں کی انگلیاں کانوں کے مقابل میں ہو اور انگلیاں کھلی ہوئی ہوں، سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھنا، تکبیرہ تحریمہ کے بعد دعائے استفتاح (توجیہ) پڑھنا، توجیہ کے الفاظ یہ ہیں: '' وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا وَّ مَا أَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ، اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ، لَاَ شَرِیۡکَ لَهُ وَبِذٰلِکَ أُمِرۡتُ وَأَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ '' (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل ۷۷۱، ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب ما تستفتح بہ الصلاۃ من الدعاء ۷۶۰، یہ روایت حضرت علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ سے ہے)

ترجمہ: میں نے اپنا رخ کرلیا اس ذات کی طرف جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا، سب سے کٹ کر فرماں بردار ہوکر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں، بے شک میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔

دعائے استفتاح کے بعد **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھنا۔

جہری نمازوں میں تلاوت بلند آواز سے کرنا اور سرّی نمازوں میں آہستہ (نمازی نماز میں خود کو اپنی تلاوت سنائے، اگر نماز میں خود کو تلاوت نہ سنائے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے)۔

سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا، جہری نمازوں میں بلند آواز سے اور سرّی نمازوں میں آہستہ سے آمین کہنا۔

جہری نمازیں صبح کی نماز، مغرب اور عشاء کی نماز میں شروع کی دو رکعتیں، جمعہ، عید، استسقاء کی نمازیں اور رات کے وقت پڑھی جانے والی نفل نمازیں۔

سری نمازیں یہ ہیں: ظہر اور عصر، مغرب کی تیسری رکعت، عشاء کی آخری دو رکعتیں، سورج گہن کی نماز اور وہ تمام نمازیں جو دن کے اوقات میں ادا کی جاتی ہیں۔

سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورہ پڑھنا، چند آیتوں کے مقابلہ میں مکمل سورہ پڑھنا افضل ہے، مثلاً سورہ اخلاص ''قل هو الله أحد'' کی تلاوت جو چار آیتوں پر مشتمل ہے ایسی چار آیتوں سے افضل ہے جو مکمل سورہ نہ ہوں۔

رکوع کرتے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا۔

رکوع کے لیے تکبیر کہتے وقت رفع یدین کرنا۔

رکوع کے دوران ہتھیلیاں گھٹنوں پر رکھنا۔

رکوع میں تین مرتبہ ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَظِیۡمِ وَبِحَمۡدِهٖ'' کہنا۔ترجمہ: میرا عظیم پروردگار پاک ہے اور اسی کی تعریف ہے۔

امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) کے لیے رکوع سے اٹھتے وقت ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنۡ حَمِدَهٗ'' کہنا۔ترجمہ: اللہ نے اس کی بات سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔

رکوع سے اعتدال میں ''رَبَّنَا وَلَکَ الۡحَمۡدُ'' کہنا۔ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! تیرے لیے ہی تعریف ہے۔

اعتدال میں ''رَبَّنَا وَلَکَ الۡحَمۡدُ'' کہتے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھائے رکھنا۔

سجدہ میں جاتے وقت تکبیر کہنا۔

سب سے پہلے سجدہ میں گھٹنے زمین سے لگنے چاہیے، پھر ہاتھ پھر پیشانی اور ناک۔

سجدہ میں تین مرتبہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی وَبِحَمْدِهِ'' کہنا۔ میرا بلند و بالا پروردگار پاک ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے۔

سجدے کے دوران ہاتھ مونڈھوں کے مقابل رہنے چاہیے اور ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی قبلہ رخ رہنی چاہیے۔

سجدہ میں اپنے بازووں کو پہلووں سے دور رکھے، اور اپنا پیٹ رانوں سے اٹھا کر رکھے۔

سجدہ میں اپنے پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف کرے۔

سجدہ میں جو چاہے دعا کرے۔

سجدہ سے اٹھتے وقت تکبیر کہنا۔

دو سجدوں کے درمیان جلسہ میں یہ دعا پڑھنا ''رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاعْفُ عَنِّیْ'' (یہ دعا دو سجدوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے: ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب الدعاء بین السجدتین ۸۵۰، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) ترجمہ: اے میرے پروردگار! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے عافیت دے اور مجھے معاف فرما۔

دو سجدوں کے درمیان مفترش بیٹھنا؛ مفترش بیٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے بائیں پاؤں پر بیٹھے اور داہنے پاؤں کو کھڑا کرے۔

جلسہ استراحہ؛ اس کا وقت دوسری اور چوتھی رکعت کے لیے سجدہ سے اٹھتے وقت ہے۔

اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں پر ٹیک لگانا۔

تشہد اول میں مفترش بیٹھنا جس طرح دو سجدوں کے درمیان جلسہ میں بیٹھا جاتا ہے۔

تشہد اول سے اٹھتے وقت تکبیر کہنا۔

تشہد اول سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرنا۔

جب تشہد ''أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا رسول الله'' میں

''إلا الله'' پر پہنچے تو شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور اپنی انگلی کے کنارے کو جھکا دے۔

قیام اور رکوع میں اس کی نظر سجدہ کی جگہ پر ہو اور تشہد میں شہادت کی انگلی پر۔

نماز کے اختتام پر پہلے سلام کے وقت اپنی نگاہ داہنے کندھے پر کرے اور دوسرے سلام میں اپنی نگاہ اپنے بائیں کندھے پر کرے، تشہد اخیر میں متورک بیٹھے۔ (یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے: بخاری: کتاب الاذان ۸۲۸، یہ روایت حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے ہے) اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی سرین زمین پر رکھے اور اپنا بایاں پاؤں داہنے پاؤں سے نکالے۔

تشہد کے لیے بیٹھتے وقت اپنے ہاتھ رانوں پر رکھے۔

اپنے داہنے ہاتھ کی سبھی انگلیوں کی مٹھی باندھے سوائے شہادت کی انگلی کے، اس کو کھلی چھوڑ دے اور اس کے ساتھ انگوٹھے کو ملا دے۔

آخری تشہد کے بعد یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَأَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَات وَأَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ'' (مسلم: کتاب الصلاۃ، باب مایستعاذ منہ فی الصلاۃ ۵۸۹، ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب مایقول بعد التشهد ۹۸۵، یہ روایت سیدہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے)

ترجمہ: اے اللہ! میں تیرے حضور عذاب قبر سے اور جہنم کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں، اور میں تیرے حضور زندگی اور موت کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں، اور میں تیرے حضور مسیحِ دجال کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔

دوسرا سلام۔

پہلے سلام میں دائیں جانب دیکھنا۔

دوسرے سلام میں بائیں جانب دیکھنا۔

پہلے سلام میں امام اور اپنے دائیں جانب اپنی صف میں اور اگلی و پچھلی صفوں میں نماز پڑھ رہے لوگوں کو سلام کرنے کی نیت کرے اور دوسرے سلام میں اپنے بائیں جانب اپنی صف میں اور اگلی و پچھلی صفوں میں نماز پڑھ رہے لوگوں کو سلام کرنے کی نیت کرے۔

☆☆☆☆☆

نماز کے مکروہات

(مکروہات کی تعداد چودہ ہیں جیسا کہ محاملی نے ''اللباب'' میں بیان کیا ہے ۱/۹۰)

مندرجہ ذیل امور مکروہ ہیں:

نماز میں تکبیر تحریمہ کہتے وقت اپنے ہاتھوں کو اپنی آستین میں رکھنا مکروہ ہے۔

ادھر ادھر دیکھنا یا مطلب والے اشارے کرنا۔

سری نمازوں میں بلند آواز سے تلاوت کرنا یا جہری نمازوں میں آہستہ تلاوت کرنا۔

مقتدی بلند آواز سے تلاوت کرے، یعنی مقتدی کے لیے آہستہ آواز میں تلاوت کرنے کا حکم ہے۔

جلدی جلدی نماز ادا کرنا۔

اپنے ہاتھوں کو آستین میں رکھ کر سجدہ کرنا۔

نمازی سجدے میں اپنے بازووں کو پہلوؤں سے اور اپنے پیٹ کو رانوں سے ملانا۔

جلسہ میں ''اقعاء'' بیٹھنا، اس کی دو شکلیں ہیں:

۱۔ اپنی سرین کو زمین سے چپکائے اور اپنی پنڈلیوں کو سیدھا کر کے زمین پر اپنے ہاتھ رکھے جیسا کہ کتے بیٹھتے ہیں، یہ مکروہ ہے۔

۲۔ دو سجدوں کے درمیان اپنی سرین ایڑیوں پر رکھ کر بیٹھے، اس طرح بیٹھنا بھی مکروہ ہے۔

نماز میں طمانینت نہ کرنا مکروہ ہے، مثلا مرغی کے چونچ مارنے کی طرح رکوع اور سجدہ کرے، طمانینت ''سبحان الله'' کہنے کی مقدار تک رکنے سے حاصل ہوتی ہے، اس کے بغیر نماز باطل ہو جاتی ہے۔

جنگلی جانوروں کی طرح بازوؤں کو پھیلانا۔

مسجد میں ایک ہی جگہ نماز پڑھنے کے لیے متعین کرنا مکروہ ہے۔ (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں تین عادتوں سے منع کیا ہے: ''کوے کے چونچ مارنے سے، جنگلی جانوروں کے بیٹھنے سے

اور ایک ہی جگہ کو متعین کرنے سے جس طرح اونٹ کرتی ہے۔ دارمی نے یہ روایت کی ہے۔ ۱/۳۰۳، ابن ماجہ: کتاب اِقامۃ الصلاۃ، باب ماجاء فی توطین المکان فی المسجد ۱۴۲۹، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۲۲۷۷، یہ حدیث عبدالرحمٰن بن شبل انصاری رضی اللہ عنہ سے ہے) کیوں کہ سنت یہ ہے کہ نماز مختلف جگہوں پر ادا کی جائے تا کہ متعدد جگہیں قیامت کے دن اللہ تعالی کے سامنے سجدہ کرنے کی نمازی کے حق میں گواہی دیں۔

☆☆☆☆☆

نماز باطل کرنے والے امور

(محاملی نے ان کو مفسدات صلاۃ کہا ہے، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں ۱/۹۲)

نماز باطل کرنے والے امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حدث یعنی وضو کا ٹوٹ جانا چاہے عمداً ہو یا بھول کر۔ (اگر کسی کا وضو نماز کے دوران ٹوٹ جائے تو اس بارے میں دو اقوال ہیں: قول جدید کے مطابق اس کی نماز باطل ہوجاتی ہے۔ قدیم قول کے مطابق وہ وضو کرے گا اور اپنی نماز کو جاری رکھے گا۔ دیکھا جائے: ''الوسیط'' ۱/ ۶۳۹، ''حلیۃ العلماء'' ۲/ ۱۲۷)

۲۔ عمداً بات کرنا چاہے ایک حرف ہی ہو جس کے سمجھ میں آنے والے معنی ہو، مثلاً عربی کا لفظ ''قِ'' (بچاؤ) یہ ''وقی یقی'' سے فعلِ امر ہے۔

۳۔ کھانا چاہے شکر کے ایک دانے کے برابر ہو۔

۴۔ پینا

۵۔ عملِ کثیر مثلاً چلنا یا مسلسل تین مرتبہ حرکت کرنا، یا چھلانگ لگانا۔

۶۔ قہقہہ لگانا۔

۷۔ نماز کے فرائض میں سے کسی فرض کو چھوڑنا مثلاً سورہ فاتحہ، نماز میں کمی یا زیادتی کرنا مثلاً رکوع چھوڑ دینا، یا ظہر کی پانچ رکعات عمداً کرنا۔

۸۔ ستر کھل جانا اور فوراً ستر نہ ڈھانپنا جب وہ نماز کے دوران کھل جائے۔

۹۔ قبلہ کی طرف رخ نہ کرنا اور اس سے ہٹنا یا سینے کو اس سے ہٹانا۔

۱۰۔ بدن یا کپڑے پر نجاست لگنا۔

۱۱۔ کفریہ کلمہ کہنا۔

۱۲۔ نماز کے دوران نیت بدل جانا؛ مثلاً فرض نماز میں نفل نماز کی نیت کرنا، یا نماز سے نکلنے کو کسی بھی شخص کے داخل ہونے پر معلق کرنا، یا نماز سے نکلنے کی نیت کرنا۔

۱۳۔ کوئی رکن زیادہ کرنا، سوائے سورہ فاتحہ کے یا کوئی بھی قولی رکن کے مثلاً تکبیر تحریمہ دو مرتبہ کہنا، اس سے نماز باطل نہیں ہوتی ہے۔

۱۴۔ نماز کے ارکان کی ادائیگی میں معروف ترتیب کی پابندی نہ کرنا، مثلاً رکوع سے پہلے سجدہ کرنا۔

۱۵۔ جس کے پاس نماز شروع کرتے وقت کپڑا نہ ہو پھر اس کو دورانِ نماز کپڑا مل جائے؛ ایسے شخص کا ننگے نماز پڑھنا۔

اگر کوئی باندی نماز کے دوران آزاد ہوجائے تو وہ آزاد عورت کی طرح اپنا سر ڈھانک لے، کیوں کہ اب نماز کے دوران اس کی ہتھیلیوں اور چہرے کے علاوہ کسی چیز کا نظر آنا صحیح نہیں ہے، نظر آنے پر نماز باطل ہوجاتی ہے۔

اگر ننگے نمازی کے قریب کپڑے رکھے جائیں اور وہ مسلسل تین حرکتوں سے کم میں ستر چھپا سکتا ہو تو وہ اپنی نماز مکمل کرسکتا ہے، اگر نماز کے دوران آزاد ہونے والی باندی کے پاس سر ڈھانکنے کا کپڑا رکھا جائے اور وہ مسلسل تین حرکتوں سے کم میں اپنا سر ڈھانک سکتی ہو تو وہ بھی اپنی نماز مکمل کرسکتی ہے اور ان دونوں کی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔

۱۶۔ نماز کے کسی رکن کو مکمل ہونے سے پہلے عمداً توڑنا مثلاً سورہ فاتحہ آدھی پڑھ کر رکوع کرنا۔

۱۷۔ نماز کے دوران کوئی پاگل ہوجائے یا اس پر بیہوشی طاری ہوجائے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

اذان

اذان کے کلمات (یہ کلمات صحیح مسلم میں موجود ہیں: کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الأذان ۳۷۹، نسائی: کتاب الاذان، باب کیف الأذان ۲/۵، یہ روایت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

چار مرتبہ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ
دو مرتبہ: أَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ
دو مرتبہ: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ
دو مرتبہ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ
دو مرتبہ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ
دو مرتبہ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ
ایک مرتبہ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ

صبح کی اذان میں ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کے بعد اس کا اضافہ کیا جائے گا: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ (دو مرتبہ)

اذان کی قسمیں

اذان کی تین قسمیں ہیں: فاسد، مکروہ اور صحیح۔ (یہ تقسیم محاملی نے کی ہے: ''اللباب'' ۱/۹۴)

فاسد اذان کی پانچ قسمیں ہیں:

عورت مردوں کے لیے اذان دے، کافر کی اذان، مجنون کی اذان، نشہ آور کی اذان، وقت شروع ہونے سے پہلے اذان، اس سے صبح کی اذان مستثنیٰ ہے، کیوں کہ صبح کے لیے دو اذان دینا مستحب ہے، ایک فجر سے پہلے تاکہ مسلمانوں کو جگایا جائے اور وہ تہجد کی

نماز ادا کریں، اور صبح کی نماز کے لیے تیاری کریں۔ دوسری اذان فجر کا وقت شروع ہونے کے وقت تاکہ صبح صادق اور نماز فجر کا وقت شروع ہونے کی اطلاع دی جائے۔

مکروہ اذان کی دو قسمیں ہیں:

بغیر وضو اذان دینا، حالت جنابت میں اذان دینا، یہ زیادہ سخت مکروہ ہے۔

صحیح اذان کی ایک ہی قسم ہے؛ وہ یہ کہ مسلمان بالغ عاقل امانت دار اور وقت کو جاننے والا اذان دے۔

اذان کو باطل کرنے والے امور

پانچ امور سے اذان باطل ہو جاتی ہے: (دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۹۶)

مرتد ہو جائے یعنی کفر کی طرف لوٹ جائے، بیہوش ہو جائے، نشہ آور چیز استعمال کرے، اذان کے کلمات کے درمیان طویل طویل وقت خاموش رہے، یا اذان کے کلمات میں سے کسی کو عمداً یا بھول کر چھوڑ دے۔

اذان کی سنتیں

اذان کی سنتیں پانچ ہیں:

اپنی دو انگلیاں اپنے کانوں کے سراخ میں ڈال دے۔ اس طرح آواز بلند ہو جاتی ہے، بہرا جان لے کہ وہ اذان دے رہا ہے اور نماز کا وقت شروع ہو چکا ہے۔

معقول حد تک بلند آواز سے اذان دینا۔

اذان کے کلمات کو ترتیل کے ساتھ کہنا۔

جلدی جلدی اذان نہ کہنا۔

ترجیع یعنی پہلے شہادتین کو پست آواز میں کہنا پھر بلند آواز سے کہنا۔

تثویب یعنی صبح کی نماز کی دوسری اذان میں ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہنا۔

اذان کی سنتوں میں سے یہ بھی ہے کہ موذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہتے وقت اپنا چہرہ دائیں اور بائیں پھیرے، یہ بھی سنت ہے کہ قضاء نماز کے لیے

بھی اذان اور اقامت کہی جائے، جب نمازی ایک سے زیادہ قضا نمازیں کر رہا ہو تو صرف پہلی نماز کے لیے اذان اور اقامت کہے گا اور بعد والی نمازوں میں صرف اقامت کہنا کافی ہے۔

اذان کے مکروہات

صحیح اذان میں چار چیزیں مکروہ ہیں: گانے کی طرح اذان دینا، اذان کے کلمات کو زیادہ کھینچنا، اذان کے دوران بات کرنا، کھڑے رہنے کی طاقت رہنے کے باوجود بیٹھ کر اذان دینا۔

اقامت

اقامت کے کلمات: دومرتبہ ''**الله أكبر**''، ایک مرتبہ ''**أشهد أن لا إله إلا الله**''، اسی طرح ایک مرتبہ ''**أشهد أن محمدا رسول الله**''، ایک مرتبہ ''**حي على الصلاة**''، ایک مرتبہ ''**حي على الفلاح**''، دومرتبہ ''**قد قامت الصلاة**''، دومرتبہ ''**الله أكبر**'' اور ایک مرتبہ ''**لا إله إلا الله**'' کہنا۔

اذان اور اقامت کے بعد یہ دعا پڑھی جائے: **اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّآمَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَآئِمَةِ آتِ مُحَمَّدَانِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَّحْمُوْدَانِ الَّذِىْ وَعَدْتَّهُ ، إِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ** (بخاری: کتاب الأذان، باب الدعاء عند النداء ۶۱۴، ابن خزیمہ ۴۲۰، ابن حبان ۱۶۸۹، یہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے)

ترجمہ: اے اللہ! اے اس مکمل دعا اور قائم کی جانے والی نماز کے پروردگار! محمد کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما، اور ان کو مقام محمود سے سرفراز فرما، جس کا تو نے وعدہ کیا ہے، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اور اللہ درود و سلام نازل فرمائے ہمارے آقا محمد پر، اور ان کے آل و اصحاب پر۔

اذان اور اقامت کے درمیان فرق (دیکھا جائے: ''حلیۃ العلماء'' ۲/۳۵، ''اللباب'' ۱/۹۷)

اقامت اذان کی طرح ہی ہے سوائے تین امور میں:

۱۔ افراد: یعنی اقامت میں ''اللہ اکبر'' دومرتبہ کہنا، ''**أشهد أن لا إله إلا الله** اور **أشهد أن محمدا رسول الله**'' ایک ایک مرتبہ کہنا، **حي على الصلاة** اور **حي على الفلاح** ایک ایک مرتبہ کہنا، **قد قامت الصلاة** دومرتبہ کہنا، **الله أكبر** دومرتبہ کہنا، **لا إله إلا الله** ایک مرتبہ کہنا۔

۲۔ ادراج: (''الأم'' امام شافعی ۱/۸۹، مغنی المحتاج ۱/۱۳۶) یعنی اقامت جلدی جلدی اس طرح کہنا کہ اس کے حروف واضح ادا کیے جائیں، البتہ اذان میں رک رک کر کہنا سنت ہے۔

۳۔ وقت: کیوں کہ اقامت ہمیشہ وقت داخل ہونے کے بعد ہی کہی جاتی ہے، اور اذان وقت داخل ہونے کے ساتھ، سوائے فجر کی پہلی اذان کے، وہ وقت داخل ہونے سے پہلے بھی کہنا جائز ہے۔

☆☆☆☆☆

نمازوں کے اوقات

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''التنبیہ'' شیرازی ص ۱۰۵، ''روضۃ الطالبین'' ۱/ ۲۰۸، ''شرح صحیح مسلم'' امام نووی ۳/ ۱۱۵)

دن اور رات میں پانچ نمازوں کے اوقات مندرجہ ذیل ہیں:

ظہر کی نماز کا وقت: زوال سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک، جب سایہ اس سے تھوڑا بھی زیادہ ہوجائے تو عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

عصر کی نماز کا وقت: جب کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہوکر تھوڑا سا زیادہ ہوجائے، اس وقت سے سایہ دوگنا زیادہ ہونے تک، جب سایہ اس سے زیادہ ہوجائے تو عصر کا افضل وقت ختم ہوجاتا ہے، جب کہ اس نماز کا وقت سورج غروب ہونے تک رہتا ہے۔ اگر کوئی عورت سورج غروب ہونے سے پہلے حیض سے پاک ہوجائے، یا بیہوش کو غروب سے پہلے ہوش آئے یا پاگل اچھا ہوجائے تو ان سبھوں پر ظہر اور عصر دونوں نمازیں فرض ہیں۔

مغرب کی نماز کا وقت: جب سورج غروب ہوجائے تو عصر کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور مغرب کا وقت شروع ہوجاتا ہے، امام شافعی کے قول جدید کے مطابق مغرب کا وقت سورج غروب ہوکر اتنی مدت تک رہتا ہے کہ جو وضو کرنے، ستر کرنے، اذان اور اقامت کہنے اور پانچ رکعات نماز پڑھنے کے لیے کافی ہو۔ قولِ قدیم میں شفق احمر کے غروب ہونے تک رہتا ہے یعنی غروب کے وقت سے ایک گھنٹہ آٹھ منٹوں تک، یہی قول معتمد ہے۔ (بغوی نے ''التھذیب'' میں اسی کو اختیار کیا ہے ۲/ ۱۰، اور امام نووی نے اسی کو ''روضۃ الطالبین'' میں صحیح کہا ہے ۱/ ۲۰۹)

عشاء کی نماز کا وقت: اس کا فضیلت والا وقت شفق احمر کے غائب ہونے سے لے کر ایک تہائی رات تک ہے۔ (یہ فضیلت والا وقت ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ پیلا شفق اور سفید شفق بھی غائب ہوجائے) جائز وقت صبح صادق تک ہے، جب عورت اپنی ماہواری سے عشاء کے وقت میں تکبیر تحریمہ کہنے کے لیے کافی وقت میں پاک ہوجائے یا بیہوش یا مجنون صحیح ہوجائے تو ان لوگوں پر

مغرب اور عشاء کی نماز فرض ہے، کیوں کہ ان دونوں نمازوں کو جمع تاخیر پڑھنا جائز ہے۔

صبح کی نماز کا وقت: افضل وقت صبح صادق سے اسفار تک ہے، پھر جائز وقت سورج طلوع ہونے تک ہے، علامہ اصطخری کہتے ہیں: (امام جلیل حسن بن احمد بن یزید ابو سعید اصطخری (۲۴۴۔ ۳۲۸ ہجری) آپ سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے، آپ ایران کے شہر قم کے قاضی تھے، آپ بڑے متقی اور زاہد و بے نیاز تھے، ابو اسحاق مروزی اصطخری کی موجودگی میں ان کی اجازت کے بغیر فتوی نہیں دیتے تھے۔ آپ کے تعارف کے لیے دیکھا جائے: ''تاریخ بغداد'' خطیب ۷/ ۲۶۸، ''الأنساب'' سمعانی ۱/ ۲۸۶۔ ۲۸۷، ''طبقات الشافعیۃ الکبری'' ۳/ ۲۳۰۔ ۲۵۳) جب صبح کا اسفار ہوجائے تو صبح کی نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے۔

نماز کے اوقات کی ابتدا ظہر کے وقت سے ہوتی ہے، کیوں کہ نماز کے اوقات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ابتدا ظہر سے ہوتی ہے، اس کا وقت سورج کے زوال سے شروع ہوکر دوسرے دن سورج طلوع ہونے تک رہتا ہے، جب ظہر کا وقت ختم ہوجاتا ہے تو عصر کا وقت شروع ہوتا ہے، جب عصر کا وقت ختم ہوتا ہے تو مغرب کا وقت شروع ہوجاتا ہے، جب عشاء کی نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے تو صبح کی نماز کا وقت شروع ہوجاتا ہے، جب سورج طلوع ہونے کی وجہ سے صبح کی نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے تو پھر سورج کے زوال تک کسی بھی نماز کا وقت نہیں رہتا، سوائے سنت نمازوں کے، مثلاً اشراق اور چاشت کی نماز، یا چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا، یا نماز جنازہ، یا سورج گہن کی نماز یا نمازِ استسقا، یہ تینوں نمازیں بھی سنت نمازوں میں شامل ہیں۔

جس کو وقت میں ایک رکعت مل جائے تو اس کو پوری نماز مل جاتی ہے، اور یہ نماز ادا شمار کی جائے گی، اگر معذور شخص کو تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بقدر وقت ملے تو اس پر یہ نماز فرض ہے، معذور مندرجہ ذیل پانچ لوگ ہیں:

۱۔ کافر جب مسلمان ہوجائے۔

۲۔ مجنون جب اس کی عقل ٹھکانے آجائے۔

۳۔ بیہوش جب اس کو ہوش آجائے۔

۴۔ بچہ جب بالغ ہوجائے۔

۵۔ حائضہ جب حیض سے پاک ہوجائے۔

امامت کے احکام

امامت میں لوگوں کی مندرجہ ذیل چھ قسمیں ہیں: (محاملی نے ''اللباب'' میں یہی تقسیم کی ہے: ۱/۱۰۰، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الأم'' ۱/۱۹۵، ''التنبیہ'' ۱۳۶)

۱۔کسی بھی حال میں جس کی امامت صحیح نہیں ہے، وہ مندرجہ ذیل پانچ لوگ ہیں:

پاگل، کافر، ارتّ یعنی وہ شخص جو ایسی جگہوں پر ادغام کرتا ہو جہاں ادغام نہ ہو یا وہ راء کی جگہ ثاء پڑھتا ہو، ألثغ یعنی وہ شخص جو ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھتا ہو مثلاً سین کو ثاء یا راء کو غین پڑھتا ہو، وہ شخص جو ایسا لحن کرتا ہو جس سے معنی بدل جاتے ہوں۔اسی طرح غیر ممیّز کی امامت صحیح نہیں ہے۔

پاگل کی امامت اس لیے صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ ذمے داری اٹھانے کا اہل نہیں ہے اور اس کا ارادہ چھین لیا گیا ہے، جب کہ امامت ایک عظیم ذمے داری ہے۔

کافر کی امامت صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امامت عبادت ہے، اور کافر عبادت کا اہل نہیں ہے۔

ارتّ کی امامت جائز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ سورہ فاتحہ کی تلاوت صحیح طور پر کرے، جب کہ ارتّ فاتحہ کی تلاوت صحیح نہیں کرتا ہے۔

ألثغ کی امامت صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدلنے کی وجہ سے معنی بھی بدل جاتے ہیں اور قرآن کریم کی تحریف ہو جاتی ہے۔

ارتّ اور **ألثغ** میں اس تفصیل کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر ان میں سے کسی کی زبان صحیح تلفظ ادا کر سکتی ہو اور اس کے لیے سیکھنا ممکن ہو تو نہ اس کی تنہا نماز صحیح ہوگی اور نہ اس کی امامت میں نماز صحیح ہوگی، یہاں تک کہ وہ اچھی طرح تلاوت کر لے، اگر اس کی زبان

صحیح تلفظ ادا کرنے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہو تو اس کی تنہا نماز صحیح ہے، اسی طرح اس کے پیچھے اس شخص کی نماز صحیح ہے جو اس کی طرح ہی ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل کر پڑھتا ہو، البتہ شرط یہ ہے کہ دونوں ایک ہی حرف کو تبدیل کرتے ہوں۔

اس شخص کی امامت صحیح نہیں ہے جو تلاوت میں غلطی کی وجہ سے معنی کو بدل دیتا ہو، مثلاً کوئی سورہ فاتحہ میں ''أنعمتَ'' کی جگہ ''أنعمتُ'' کہے۔

۲۔جس کی امامت ایک حال میں صحیح ہو اور دوسرے حال میں صحیح نہ ہو:

وہ جنبی، اور بغیر وضو والا شخص ہے، اسی طرح وہ شخص جس کے بدن یا کپڑے پر نجاست لگی ہو، اس صورت میں پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز اس وقت صحیح ہوگی جب ان کو امام کی اس حالت کا علم نہ ہو، اگر علم ہو تو ان کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔

۳۔جس کی امامت چند لوگوں کے لیے صحیح ہے، دیگر لوگوں کے لیے نہیں:

یہ ان پڑھ، عورت اور مخنث ہے، ان لوگوں کی امامت ان ہی جیسے لوگوں کے لیے صحیح ہے، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے صحیح نہیں ہے، اس لیے ان پڑھ، ان پڑھ کی امامت کرے گا، عورت عورتوں کی امامت کرے گی، مخنث اپنے جیسے افراد کی امامت کرے گا جب کہ وہ واضح مخنث ہو یعنی یہ واضح ہو کہ مرد جیسا مخنث ہے یا عورت جیسا، وہ عورت کی بھی امامت کر سکتا ہے، البتہ مخنث مشکل یعنی جو واضح نہ ہو، صرف عورت کی امامت کر سکتا ہے۔

۴۔جس کی امامت مکروہ ہے:

مثلاً حرامی بچہ، علی الاعلان گناہ کرنے والا، دین میں علی الاعلان بدعت کرنے والا۔

۵۔جس کی امامت صحیح ہے، لیکن اس کے علاوہ دوسرے کی امامت افضل ہے:

ایسے لوگوں کی چار قسمیں ہیں: غلام، مکاتب (یعنی وہ غلام جس نے خود کو اپنے آقا سے خرید لیا ہو اور ابھی قیمت ادا نہ کی ہو) مدبّر (وہ غلام جس کی آزادی آقا کی موت پر معلق ہو) جو آدھا آزاد ہو اور آدھا غلام، اندھے اور بینا میں کوئی فرق نہیں ہے (یہ مسلک میں تین میں سے ایک قول ہے اور یہی معتمد ہے، پہلا قول یہ ہے کہ بینا کی امامت اولی ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ اندھے کی امامت اولی ہے) بالغ مراہق سے

اولی ہے، چاہے بالغ غلام ہی کیوں نہ ہو۔ (حاشیۃ الباجوری علی شرح ابن قاسم ۱/۳۷۶)

۶۔ جس کی امامت اولی اور افضل ہے:

یہ وہ شخص ہے جو تمام عیوب سے پاک ہو، دینی امور کو زیادہ جاننے والے اور افقہ کو مقدم کیا جائے گا، اس کے بعد قرآن کریم کی زیادہ تعلیم رکھنے والے کو، پھر زیادہ زہد رکھنے والے کو، پھر زیادہ پرہیز گار کو، پھر اس شخص کو جس کے آباؤ اجداد نے دارِ کفر سے دارِ اسلام کی طرف دوسروں کے مقابلہ میں پہلے ہجرت کی ہو، پھر اس کو جو اسلام میں زیادہ سن رسیدہ ہو (یہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے حاصل کردہ ہے ''قوم کی امامت ان میں اللہ کی کتاب کو زیادہ پڑھنے والا کرے گا، اگر وہ سب قراءت میں یکساں ہوں تو ان میں سے سب سے زیادہ حدیث کو جاننے والا، اگر وہ حدیث میں یکساں ہوں تو جو ان میں پہلے ہجرت کرنے والا ہو، اگر وہ ہجرت میں برابر ہوں تو ان میں سب سے پہلے اسلام لانے والا'' مسلم: کتاب المساجد، باب من أحق بالإمامۃ ۶۷۳، ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب من أحق بالإمامۃ ۵۸۲، یہ روایت ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ سے ہے) اس کے بعد وہ شخص جو حسب نسب میں سب سے زیادہ شریف ہو، پھر جس کی شہرت اچھی ہو، پھر جس کا کپڑا زیادہ صاف ہو، پھر جس کا چہرہ زیادہ صاف ہو، پھر بہترین آواز والا، پھر بہترین اخلاق والا، اور اخیر میں جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔

مقیم کی نماز

مقیم مسلمان کے حق میں اس کی اقامت کی جگہ دن اور رات میں یہ فرض نماز ہے، یہ کل سترہ رکعتیں ہیں، دو رکعتیں فجر کی فرض، چار رکعتیں ظہر کی فرض، چار رکعتیں عصر کی فرض، تین رکعتیں مغرب کی فرض اور چار رکعتیں عشاء کی فرض۔

صرف جمعہ کے دن یہ رکعتیں پندرہ ہوجاتی ہیں، کیوں کہ جمعہ کی نماز ظہر کی چار رکعت کے بدلے دو رکعتیں ہیں۔

سفر میں فرض نمازوں کی تعداد مسافر کے لیے گیارہ رکعتیں ہوجاتی ہیں، مسافر چار رکعت والی نمازوں کو چار کے بدلے دو دو رکعتیں ادا کرتا ہے اور یہ نمازیں ظہر، عصر اور عشاء ہیں۔

مسافر کی نماز

مسافر کی نماز مقیم کی نماز کی طرح ہی ہے، یعنی مسافر ویسے ہی نماز پڑھے گا جیسے وہ اپنے محلِ اقامت میں نماز پڑھتا ہے، البتہ مسافر کو چار رکعتوں والی نمازوں میں قصر کرنے کا اختیار ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع میں قصر کرنا اولیٰ ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قصر نہ کرنے سے منع کیا ہے جب اس کا سبب سنت سے بے رغبتی ہو اور کہا ہے کہ اس صورت میں قصر کرنا مستحب ہے۔ (کتاب ''الأم'' میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت یہ ہے ۱/ ۲۰۸: ''بہتر یہ ہے اور میں سفر کی حالت میں کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہی کیا جائے کہ خوف اور سفر میں نماز قصر کی جائے، اور بغیر خوف والے سفر میں، جو کوئی مکمل نماز پڑھے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی ہے۔)

چار رکعت والی نمازوں میں قصر جائز ہونے کے لیے مندرجہ ذیل آٹھ شرطیں ہیں:

۱۔ سفر سولہ (۱۶) فرسخ یا اس سے زیادہ ہو، ایک فرسخ تین میل یا (۵۵۴۴) میٹر ہوتا ہے، اس طرح سولہ فرسخ (۸۸۷۰۴) میٹر ہوتا ہے، یعنی تقریباً ۸۹ کلومیٹر، یہ کم سے کم مسافت ہے جس میں مسلمان کو نماز قصر کرنے کی اجازت ہے۔

۲۔ سفر کسی گناہ کے لیے نہ ہو، جو عورت اپنے شوہر کی نافرمانی کرتے ہوئے سفر کر رہی ہو تو اس کے لیے قصر کرنا جائز نہیں ہے، پھر چوری یا ڈاکہ ڈالنے کے لیے سفر کرنے والے کو سفر میں قصر کی رخصت سے فائدہ اٹھانا کیسے جائز ہے؟!

۳۔ سفر میں نماز کا وقت باقی ہو، اگر فرض نماز کا وقت نکل جائے اور اپنی اقامت کی جگہ پہنچ جائے تو اس کو قصر کرنے کا حق نہیں ہے۔

۴۔ جو سفر میں قصر کر سکتا ہے تو وہ ایک ساتھ جمع اور قصر کر سکتا ہے، یعنی وہ ظہر اور عصر ایک ساتھ جمع اور قصر کر کے ظہر کے وقت میں جمعِ تقدیم کر سکتا ہے یا عصر کے وقت میں جمع

تاخیر، یہی اصول مغرب اور عشاء کی نماز پر بھی منطبق ہو جاتا ہے یعنی وہ ان دونوں نمازوں کو عشاء کی نماز قصر کر کے مغرب کے وقت میں ایک ساتھ جمعِ تقدیم کر سکتا ہے، یا عشاء کے وقت میں پڑھ سکتا ہے۔

۴۔ نماز کے شروع میں قصر کی نیت کرے، مثلاً اپنے دل میں کہے: میں ظہر کی نماز قصر کرتے ہوئے اللہ کے لیے ادا کرنے کی نیت کرتا ہوں۔

۵۔ نماز کے دوران نماز ختم کرنے کی نیت نہ کرے۔

۶۔ ایسے امام کے پیچھے نماز نہ پڑھے جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ اس کی نیت قصر پڑھنے کی ہے یا نہیں۔

۷۔ مسافر ایسے امام کی اقتدا میں نماز نہ پڑھے جو چار رکعت والی نماز کو مکمل پڑھتا ہے۔

۸۔ اقامت کی نیت نہ کرے۔

اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو چار رکعت مکمل ادا کرنا ضروری ہے، اور سفر میں سولہ فرسخ سے کم مسافت میں قصر کرنا جائز نہیں ہے، یہ حضرات شوافع کا معتمد قول ہے۔ البتہ سولہ فرسخ سے کم مسافت والے سفر میں قصر کو ''التحفۃ'' میں جائز قرار دیا گیا ہے، اور صاحب ''بلوغ المرام'' نے اس سلسلہ میں صحیح حدیثوں کا ذکر کیا ہے۔ (''تحفۃ المحتاج'' ابن حجر ہیتمی ۲/ ۱۸۴۔ ''بلوغ المرام'' ابن حجر عسقلانی ۲/ ۹۸ مع شرح سبل السلام)

جمع بین الصلاتین

اس باب میں ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء کو ایک وقت میں جمع کر کے ادا کرنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بات جان لینی چاہیے کہ چار صورتوں میں ان دو نمازوں کو جمع کر کے ایک ساتھ ادا کرنا جائز ہے:

۱۔تقریباً ۸۹ کلومیٹر سے زائد مسافت والے سفر میں، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ سفر کسی گناہ کے کام کے لیے نہ ہو اور مسافر ظہر اور عصر کو یا تو ظہر کے وقت میں جمع تقدیم کرسکتا ہے یا عصر کے وقت میں جمع تاخیر، یہی حال مغرب اور عشاء کی نمازوں کا بھی ہے۔جمع تقدیم میں پہلی نماز سے پہلے یا اس کے دوران جمع کی نیت کرنا ضروری ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ اس کا سفر دوسری نماز کو شروع کرنے تک جاری رہے، اور وہ دو نمازوں کے درمیان زیادہ وقت فاصلہ نہ کرے، البتہ تیمّم کے لیے مٹی تلاش کرنے کے لیے ضروری مدت طویل وقت نہیں ہے، دو ہلکی نمازوں کو ادا کرنے سے زیادہ وقت کا فاصلہ دو نمازوں کے درمیان نہ پایا جائے۔

جمع کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ پہلی نماز صحیح ہو، اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ پہلی نماز کے کسی رکن کو چھوڑ دیا ہے تو اس کی دونوں نمازیں باطل ہو جائیں گی، البتہ اگر دوسری نماز کو شروع کرنے سے پہلے فصل طویل نہ ہو تو باطل نہیں ہوگی۔(فصلِ طویل یہ ہے کہ دو کم از کم رکعتوں سے زیادہ نہ ہو"تحفۃ المحتاج" ابن حجر ۲/ ۱۲۷) کیوں کہ دوسری نماز پہلی نماز سے متعلق ہے، اگر مسافر پہلی نماز کے وقت میں اترا ہو تو جمع تقدیم کرنا افضل ہے، اگر وہ پہلی نماز کے وقت میں سفر پر ہو اور دوسری نماز کے وقت میں اترتا ہو تو جمع تاخیر کرنا اولیٰ ہے۔

۲۔حج میں:(یہ حالت ہر مباح سفر میں عام ہے) اگر مکہ میں حاجی کے قیام کی مدت آنے اور جانے کے دنوں کو چھوڑ کر تین دنوں سے زیادہ نہ ہو تو اس کے لیے جمع بین الصلاتین جائز

ہے، اگر داخل ہونے اور نکلنے کے دنوں کو چھوڑ کر چار دن مکہ میں رہے تو وہ مقیم بن جائے گا اور اس کو جمع اور قصر کرنا جائز نہیں ہوگا۔حاجی عرفہ کے قریب مقامِ نمرہ میں یا عرفہ میں ظہر اور عصر جمع تقدیم کر کے ادا کرے گا اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء جمع تاخیر ادا کرے گا، وہ منیٰ کے دنوں میں بھی جمع کرسکتا ہے، شوافع فقہاء نے عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ میں سفر کے عذر کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کی اجازت دی ہے۔(مکّی شخص کے لیے سفر کی مسافت کم ہونے کی وجہ سے ان مقامات پر قول معتمد کے مطابق جمع کرنا جائز نہیں ہے۔"النجم الوھاج" دمیری ۳/ ۵۰۸)

البتہ اہل سنت کے دوسرے مسالک کی رائے یہ ہے کہ عرفہ اور مزدلفہ میں مناسک حج کے موقع پر جمع کرنے کی اجازت ہے، اس لیے ان کے نزدیک حاجی قصر اور جمع کرسکتا ہے چاہے وہ مسافر نہ ہو، امام نووی نے اپنی کتاب "ایضاح المناسک" میں یہ رائے بیان کی ہے۔("الایضاح فی المناسک" امام نووی ص ۲۷۳۔حاشیہ شیخ عبدالفتاح حسین راوہ مکی۔امام نووی نے لکھا ہے: یہ کہا گیا ہے کہ اس جمع بین الصلاتین میں مقیم اور مسافر دونوں یکساں ہیں اور وہ مناسک حج کی وجہ سے جمع کرے گا، قولِ اصح یہ ہے کہ جمع سفر کی وجہ سے ہے، اس لیے طویل سفر کرنے والے کے ساتھ جمع مخصوص ہوگا، یہ دو مرحلے ہیں، اور وہی شخص قصر کرے گا جو طویل سفر کرنے والا مسافر ہو، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے)

۳۔شدید بارش ہونے کی صورت میں ظہر اور عصر کے درمیان جمع کرنا جائز ہے (بارش کی صورت میں جمعِ تاخیر کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ سفر کے جاری رہنے کا تصور کیا جاسکتا ہے اور بارش کا جاری رہنا یقینی نہیں ہے، کبھی دوسری نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی بارش رک جاتی ہے) اسی طرح مغرب اور عشاء کے درمیان جمع کرنا جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ پہلی نماز کے شروع میں، سلام پھیرتے وقت اور دوسری نماز شروع کرتے وقت بارش جاری ہو، چاہے اس کے بعد بارش رک جائے، اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کی جائیں اور مصلیوں کے گھر مسجد سے دور ہوں، اس شرط کی وجہ سے یہ مانع نہیں ہے کہ بعض نمازیوں کے گھر مسجد سے قریب ہوں یا امام کا گھر مسجد سے ملا ہوا ہو تو جمع صحیح نہ ہو۔

۴۔شدید بیماری کے عذر کی وجہ سے جمع کرنا جائز ہے مثلاً سخت بخار ہو، اس صورت

میں مریض اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے جمع تقدیم بھی کرسکتا ہے اور جمع تاخیر بھی، چھوٹی سی بیماری مثلاً چکر آنے وغیرہ کی وجہ سے جمع نہیں کرسکتا ہے۔ فقہائے شافعیہ میں سے متاخرین نے بیماری کی صورت میں جمع کرنے کی اجازت دی ہے اور کہا ہے کہ یہ شریعت کے محاسن میں سے ہے اور یہ اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان کے مطابق بھی ہے: ''**وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ**'' (حج ۷۸) اور اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

جمعہ کی نماز

جمعہ کی نماز فرض ہے، اس کے چند ارکان اور شرطیں ہیں جس طرح اس کے علاوہ دوسری فرض نمازوں کی ہوتی ہیں، جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لیے مندرجہ ذیل چھ شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۲/۳۲۳، ''الوسیط'' غزالی ۲/۲۶۳، ''اللباب'' محاملی ۱/۱۰۷)

۱۔ شہر یا گاؤں میں اقامت ہو یعنی وہاں گھر بنے ہوئے ہوں، جمعہ صحراء یا خیموں میں رہنے والوں میں منعقد نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ تعداد؛ مصلیوں کی تعداد امام کو ملا کر چالیس سے کم نہ ہو، جو سب کے سب بالغ، آزاد اور جمعہ کی نماز قائم کی جانے والی جگہ قیام کرنے والے مسلمان ہوں، البتہ اگر ان کا سفر کسی پیش آنے والی ضرورت کی وجہ سے ہو جس کے بعد وہ اپنے مقام پر آکر سال کا اکثر حصہ گزارتے ہوں تو ان کو چالیس آدمیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ وقت یعنی جمعہ کی نماز ظہر کے وقت میں ادا کی جائے، اگر ظہر کا وقت نکل جائے تو جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، بلکہ اس کے بدلے ظہر کی نماز قضا کی جائے گی۔

۴۔ جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اس لیے جمعہ کی نماز تنہا پڑھنا جائز نہیں ہے۔

۵۔ شہر یا گاؤں میں جمعہ کی نماز دوسری جگہ اس سے پہلے یا بعد ادا نہ کی گئی ہو، البتہ شہر بڑا ہو اور تمام لوگوں کو ایک ہی مسجد میں جمع ہونا دشوار ہو تو دوسری جگہ جمعہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ نماز سے پہلے دو خطبے دیے جائیں اور خطیب ایسا شخص ہو جس کے پیچھے نماز صحیح ہو جاتی ہو۔

خطبہ کے احکام

جمعہ کی نماز سے پہلے دو خطبے دینا ضروری ہیں، خطیب کا حدث اکبر اور اصغر سے پاک رہنا بھی ضروری ہے، بے وضو اور جنبی کا خطبہ صحیح نہیں ہے اور نہ اس شخص کا جس کے جسم یا کپڑے پر نجاست لگی ہوئی ہو۔

طاقت اور قدرت ہونے کی صورت میں جمعہ کے دونوں خطبوں کے لیے کھڑا رہنا ضروری ہے، اسی طرح دو خطبوں کے درمیان سورہ اخلاص ''قل ھواللہ أحد'' کی تلاوت کے بقدر بیٹھنا اور پے در پے خطبے دینا لازم ہے، خطبہ عربی میں ہونا ضروری ہے۔ (یہ بات بغوی نے ''التھذیب'' میں کہی ہے۲/۳۴۲، ''الوسیط'' میں غزالی کہتے ہیں: خطبہ بلیغ اور لوگوں کی سمجھ سے قریب ہو اور غریب الفاظ سے خالی رہنا مستحب ہے)

جمعہ میں لوگوں کے چار مراتب ہیں:

۱۔ جن پر جمعہ کی نماز واجب ہے اور ان کے ذریعہ جمعہ منعقد بھی ہوتا ہے، یعنی مسلمان، بالغ، عاقل، آزاد اور شرعی اعذار سے پاک لوگ۔

۲۔ جن پر جمعہ تو فرض ہے، البتہ ان کے ذریعہ منعقد نہیں ہوتا ہے، وہ مسافر جو کسی جگہ چار سے زائد دن رکے، لیکن وہ سفر کا ارادہ رکھتا ہو، اور وہ شخص جو شہر کے باہر ہو اور اس کو اذان کی آواز سنائی دیتی ہو۔

۳۔ جن پر جمعہ فرض نہیں ہے، البتہ ان کے ذریعہ منعقد ہو جاتی ہے، یہ بیمار شخص ہے اور اسی کے حکم میں بیمار کی تیمارداری کرنے والا بھی ہے۔

۴۔ جن پر نہ جمعہ واجب ہے اور نہ ان کے ذریعہ جمعہ منعقد ہوتا ہے، یہ غلام، بچے، عورت، مسافر اور وہ مخنث ہیں جن کی جنس معلوم نہ ہو۔ (''بشری الکریم'' کے مصنف نے دو مراتب کا اس اعتبار سے اضافہ کیا ہے کہ جن کا جمعہ صحیح نہیں اور جن کا جمعہ صحیح ہے۲/۳۲۴، اس کو شاطری نے ''نیل الرجا'' میں نقل کیا ہے ص۲۲۶)

جمعہ کے خطبوں کے ارکان:

۱۔ اللہ عزوجل کی حمد بیان کی جائے، مثلاً کہے: الحمدللہ۔ یا کہے: أحمد اللہ۔ یا کہے: حمداً

للہ، حمد کا لفظ استعمال ہونا ضروری ہے، اور یہ دونوں خطبوں میں فرض ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ پر نبی ﷺ کا نام لے کر درود بھیجا جائے جیسا کہ تشہد میں ہے، صرف اتنا کہنا کافی ہے: ''**اللھم صل علی النبی**'' یا یہ کہے تو بھی کافی ہے: ''**اللھم صل علی الرسول**''۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے: ''**اللھم صل علیہ**''۔ چاہے اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا نام لیا جا چکا ہو۔

۳۔ نمازیوں کو تقوی اور اللہ کی خشیت کی وصیت کسی بھی عبارت سے کی جائے۔

دونوں خطبوں میں ان تینوں ارکان کا پایا جانا ضروری ہے۔

۴۔ دو خطبوں میں سے کسی ایک میں کوئی آیت تلاوت کی جائے۔

۵۔ دوسرے خطبہ میں مومنوں اور مومنات کے لیے دعا کی جائے۔

نمازِ جمعہ کا حکم

ہر مسلمان، آزاد، بالغ اور جمعہ قائم کی جانے والی جگہ قیام کرنے والے شخص پر فرضِ عین ہے (جمعہ کے فرض ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الہی ہے: ''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ'' جمعہ۹۔ ترجمہ: اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے آواز دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ و اور خرید و فروخت چھوڑ دو)، اسی طرح وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے سے کسی شرعی عذر کی وجہ سے معذور نہ ہو۔ اور اس میں نمازِ جمعہ منعقد ہونے کی سبھی شرطیں پائی جائیں۔ اگر معذور جمعہ کی نماز میں شریک ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہوتی ہے اور اس کا شمار ان لوگوں میں بھی ہوگا جن کے ذریعہ جمعہ کی نماز منعقد ہوتی ہے۔

جمعہ کی نماز اس شخص پر بھی فرض ہے جو جمعہ قائم کیے جانے والے شہر سے قریب رہتا ہو، اگر جس شہر میں جمعہ قائم کیا جا رہا ہے وہاں رہنے والوں کی تعداد چالیس مکمل نہ ہوتی ہو تو ان کے قریب رہنے والے کو جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے اس شہر میں آنا ضروری ہے جب اس کو اذان کی آواز سنائی دیتی ہو، اگرچہ کہ اس کا شمار ان چالیس لوگوں میں نہیں ہوتا ہے جن سے جمعہ کی نماز منعقد ہوتی ہے۔

پانچ لوگوں پر جمعہ فرض نہیں ہے:

بچہ، غلام، مسافر، عورت اور مخنث مشکل۔

اس کے باوجود اگر یہ لوگ جمعہ کی نماز میں آئیں تو ان کے ذریعہ جمعہ منعقد نہیں ہوتا ہے اور نہ ان پر جمعہ فرض ہے، البتہ ان کی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔

جس پر جمعہ کی نماز فرض ہے، اس کے لیے جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بعد سفر کرنا حرام ہے، البتہ اگر وہ جہاں جا رہا ہے وہاں پہنچ جاتا ہو یا کہیں سفر کے دوران جمعہ کی نماز ادا کر سکتا ہو تو سفر کرنے کی اجازت ہے، یا اس کے سفر نہ کرنے کی صورت میں اس کے سفر کے ساتھیوں کے چھوٹنے کا اندیشہ ہو تو بھی سفر کی اجازت ہے۔

جمعہ کے دن کی فضیلت:

یوم عرفہ کے بعد جمعہ کا دن دنوں میں سب سے افضل ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسی دن پیدا فرمایا، اسی دن آپ کی دعا قبول فرمائی اور اسی دن حضرت آدم کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت بھی آئے گی۔ (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا خلاصہ ہے: ''بہترین دن جس دن سورج طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن آپ کو جنت سے اتارا گیا، اسی دن آپ کی توبہ قبول ہوئی، اسی دن آپ کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت آئے گی'' ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب فضل یوم الجمعۃ ۱۰۴۶، ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی الساعۃ التی ترجی فی الجمعۃ ۴۹۱، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے)

جمعہ کے دن کے آداب:

(ان آداب کو امام غزالی نے ''إحیاء علوم الدین'' میں بیان کیا ہے ۱/۲۱۳)

-بہترین طور پر صفائی کرنا؛ اس کے لیے ناخن تراشے جائیں، بغل کے بال صاف کیے جائیں، سر اور داڑھی کے بال ٹھیک کیے جائیں، مسواک یا منہ صاف کرنے والی کسی چیز کا استعمال کیا جائے۔

-منہ، لباس اور جسم کو معطر کیا جائے۔

-صاف ستھرے اور سفید کپڑے پہنے جائیں۔

-جلدی مسجد چلا جائے۔

-مسجد میں داخل ہونے کے وقت سے ہی ذکر واذکار، نماز، تلاوت قرآن اور درود میں مشغول ہو جائے۔

-فقراء اور محتاجین پر صدقہ وخیرات کیا جائے۔

-صلہ رحمی کی جائے اور اپنے اہل وعیال اور رشتے داروں پر خرچ کرنے میں سخاوت کی جائے اور دل کھول کر ان پر احسان کیا جائے۔

نمازِ جمعہ چھوڑنے والے کی سزا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جو لاپرواہی کی وجہ سے تین جمعہ چھوڑ دے تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے'' (ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب التشدید فی ترک الجمعۃ ۹۰۱، ترمذی: کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی ترک الجمعۃ من غیر عذر ۴۸۲، ابن ماجہ: کتاب إقامۃ الصلاۃ، باب فیمن ترک الجمعۃ من غیر عذر ۱۱۲۱، ابن خزیمۃ: کتاب الجمعۃ، باب ذکر الدلیل علی أن الطبع علی القلب بترک الجمعات الثلاثۃ ۱۷۴۱) دوسری صحیح حدیث میں ہے: ''میں نے ارادہ کیا ہے کہ ایک شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں پھر ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو جمعہ سے پیچھے رہتے ہیں''۔ (مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ ۱۰۷۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ کا خیال یہ ہے کہ جو جمعہ کی نماز سے کسی شرعی عذر کے بغیر پیچھے رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو آگ سے جلا دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

صلاۃ الخوف

اس باب میں اس نماز کا تذکرہ کیا گیا ہے جو دشمنوں سے خوف کی حالت میں ادا کی جاتی ہے، اس کا تذکرہ فقہ کی تفصیلی کتابوں میں مکمل تفصیلات کے ساتھ ہے، ہم یہاں ان میں سے چار قسموں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو سولہ قسموں میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے: (دیکھا جائے ''الأم'' امام شافعی ۱/ ۲۱۵، ''التھذیب'' بغوی ۲/۳۵۴)

پہلی قسم: جب دشمن قبلہ کی سمت میں ظاہر ہو اور کوئی ایسی رکاوٹ نہ ہو کہ مسلمان دشمنوں کی تعداد کو دیکھ نہ سکتے ہوں، اور مسلمان زیادہ تعداد میں ہوں، تو اس صورت میں امام سبھی مسلمانوں کو ایک ساتھ نماز پڑھائے گا اور تکبیر تحریمہ کہے گا، جب امام رکوع کرے گا تو سبھی مقتدی بھی رکوع کریں گے، جب امام سجدہ کرے گا تو امام سے متصل صف پہریداری کے لیے کھڑی رہے گی اور اس صف کے بعد والی صف امام کے ساتھ سجدہ کرے گی، جب امام اور اخیر والی صف سجدوں سے فارغ ہوجائے گی تو پہلی والی صف سجدے کر کے امام سے دوسری رکعت میں آملے گی، دوسری رکعت میں امام کے ساتھ وہ صف سجدہ کرے گی جس نے پہلی رکعت میں امام کے ساتھ سجدہ نہیں کیا ہے، اور پہلی رکعت میں سجدہ کرنے والی صف پہریداری کے لیے کھڑی رہے گی۔

جب امام اور اس کے ساتھ سجدہ کرنے والے تشہد کے لیے بیٹھیں گے تو حفاظت کے لیے کھڑی رہنے والی صف سجدہ کرے گی اور سب ایک ساتھ امام کے ساتھ سلام پھیریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے خلیص کے قریب قبیلہ غطفان کے گاؤں عسفان میں اسی طرح نماز پڑھی تھی، یہ گاؤں مکہ سے سولہ فرسخ کے فاصلہ پر ہے، جیسا کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ الخوف ۱۴۳۲)

دوسری قسم: جب دشمن قبلہ کی سمت میں نہ ہو تو اس صورت میں امام ان کو دو جماعتوں میں بانٹ دے گا، ایک جماعت دشمن کے سامنے کھڑی رہے گی اور دوسری جماعت امام کے پیچھے نماز پڑھے گی، جب امام کے پیچھے نماز پڑھنے والی جماعت پہلی رکعت سے فارغ ہوجائے گی تو امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے گا اور مقتدی امام کا ساتھ چھوڑنے کی نیت کر کے اپنی دوسری رکعت مکمل کریں گے اور سلام پھیر کر چلے جائیں گے، دشمن کے سامنے کھڑی جماعت آئے گی تو امام ان کو دوسری رکعت پڑھائے گا، جب امام تشہد کے لیے بیٹھے گا تو وہ کھڑے ہو کر دوسری رکعت مکمل کریں گے اور امام ان کا تشہد میں انتظار کرے گا، جب وہ تشہد میں آئیں گے تو سلام پھیرے گا۔

ذات الرقاع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی، یہ نجد کا علاقہ ہے، یہ روایت بخاری اور مسلم نے کی ہے۔ (بخاری: کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع ۳۹۱۶، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ الخوف ۱۴۳۵)

ان مذکورہ احکام کے بیان کرنے کے بعد ہمیں اس بات کو محسوس کرنا چاہیے کہ اسلام اپنے تمام احکامات میں اپنے ماننے والوں کے درمیان کس حد تک عدل وانصاف کا حریص ہے، اسلام نے نماز کی ادائیگی میں صلاۃ الخوف کے موقع پر بھی دو جماعتوں کے درمیان برابری کا خیال رکھا ہے، اسی طرح دشمن کے مقابلہ اور حراست کے لیے کھڑے ہونے میں بھی، ایک جماعت کو امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ میں شرکت کا موقع دیا تو دوسری جماعت کو امام کے ساتھ نماز سے نکلنے میں شریک ہونے کا موقع دیا۔

یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کے دین کی مدد ونصرت کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دی، کیسے انہوں نے خالی پیٹ اور ننگے پاؤں جہاد کیا اور اللہ کی راہ میں خود کو قربان کردیا، صحابہ کرام اس کی خاطر اپنے مال واولاد اور بیویوں کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے، بلکہ اپنی روحوں اور جانوں کو بھی اللہ کی راہ میں قربان کردیا، صحابہ کی طرف سے پیش کردہ قربانیوں کو جاننا ہمارے لیے ضروری ہے تاکہ ہم صحابہ کرام کو گالی دینے والوں کا مقام جان لیں!

یہ طریقے دو رکعت والی نمازوں کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً فجر کی نماز اور چار رکعت والی نمازوں میں قصر کر کے دو رکعت، اگر امام مغرب کی نماز پڑھا رہا ہو تو وہ ایک جماعت کے ساتھ دو رکعت پڑھے گا اور دوسری جماعت کے ساتھ ایک رکعت، اگر چار رکعت والی نماز ہو تو ایک جماعت کے ساتھ دو رکعتیں اور دوسری کے ساتھ دو رکعتیں۔

۳۔امام مسلمانوں کو دو جماعتوں کو تقسیم کرے گا اور ان میں سے ہر جماعت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے گا، اس صورت میں امام دو مرتبہ نماز پڑھے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطنِ نخل میں اسی طرح نماز پڑھی، یہ نجد کا ایک علاقہ ہے، یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے۔(بخاری: کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع ۳۹۲۱، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ الخوف ۱۴۳۷)

حدیثوں کے علاوہ قرآن کریم میں بھی صلاۃ الخوف کی دلیل موجود ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ'' (نساء ۲)

☆☆☆☆☆

شدتِ خوف کی نماز

چوتھی قسم: شدتِ خوف کی نماز ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب دشمنوں کے ساتھ گھمسان کی جنگ جاری ہو، اسی بارے میں اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالاً أَوْ رُكْبَانًا'' (۲۳۹ بقرہ) (پس اگر تمہیں خوف ہو تو کھڑے یا سوار (نماز پڑھ لو)) اس نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا شرط نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا لشکر جس طرف رخ کیا ہوا ہو اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے چاہے وہ سمت کوئی بھی ہو، اس سے واضح ہوتا ہے کہ نماز کسی بھی حال میں چھوڑنا جائز نہیں ہے، اگر لشکر کو دشمن کے شر سے امان ہو تو سوار اتر کر اپنی نماز قبلہ کی طرف رخ کر کے مکمل کرے گا، اگر پیدل ہو تو اپنا رخ قبلہ کی طرف موڑ کر نماز مکمل کرے گا۔

شدت خوف کی نماز کا حکم گھمسان کی جنگ کے علاوہ بعض دوسرے موقعوں پر بھی نافذ ہوتا ہے، مثلاً کسی درندے کا خوف ہو، سانپ یا آگ کا خوف ہو، چور نمازی کا مال چوری کرنا چاہ رہا ہو، ان تمام صورتوں میں مسلمان کسی بھی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے، چاہے وہ دوڑتے ہوئے نماز پڑھنے پر مجبور ہو جائے، وہ رکوع اور سجدوں میں اپنے سر سے اشارے کرے گا۔

☆☆☆☆☆

بیمار کی نماز

بیمار جیسے ممکن ہو کھڑے، بیٹھے یا چت یا پٹ لیٹ کر نماز پڑھے گا، اگر وہ رکوع اور سجدے نہ کر سکتا ہو تو وہ اپنے سر سے اشارہ کر سکتا ہے، اگر سر سے اشارہ نہ کر سکتا ہو تو اپنی آنکھوں سے اشارہ کرے گا، اور اس پر اعادہ (یعنی اس حالت میں پڑھی ہوئی نماز کو دہرانا) لازم نہیں ہے۔

البتہ جس مریض کو اپنے کپڑے یا جسم پر لگی ہوئی نجاست کو دور کرنے کے لیے پانی وغیرہ نہ ملے تو وہ وقت کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے نماز پڑھے گا، البتہ شفایاب ہونے کے بعد اس کو مکمل طہارت کے بعد نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔

جس کو پانی اور مٹی دونوں نہ ملے کہ پانی سے وضو کر سکے یا مٹی سے تیمّم تو وہ وقت کی حرمت کا لحاظ کرتے ہوئے نماز پڑھے گا، جب سفر میں اس کو مٹی مل جائے گی تو وہ تیمّم کر کے نماز کا اعادہ کرے گا، اگر وہ کسی شہر پہنچ جائے جہاں پانی مل جائے تو وہ وضو کرے گا اور مکمل طہارت پر نماز پڑھے گا اگر اس نے تیمّم نہ کیا ہو اور سفر کے دوران نماز پڑھی ہو۔

☆☆☆☆☆

غرق ہونے والے کی نماز

غرق ہونے والا جیسے ممکن ہو نماز پڑھے گا، وہ اپنے سر سے اشارہ کرے گا یا بغیر اشارہ کے ہی نماز ادا کرے گا، اگر وہ اشارہ کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی اور اس پر نماز کا اعادہ لازم ہے۔

نجس جگہ پر قید میں موجود شخص اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے، وہ نجاست پر سجدہ نہیں کرے گا، اور اس پر اس نماز کا اعادہ ضروری ہے، کیوں کہ یہ حالات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں، اور شاذ و نادر کا کوئی حکم نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

معذور کی نماز

معذور سے مراد وہ شخص ہے جو نماز کے آخری وقت کا تھوڑا سا حصہ پائے۔

جس کو کسی نماز کے وقت میں مکمل ایک رکعت یا اس سے زیادہ ملے تو اس کی نماز ادا ہو جاتی ہے۔ (یعنی اس کو نماز مل جاتی ہے۔ امام بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کو نماز کی ایک رکعت مل جائے تو اس نے نماز کو پالیا''۔ مواقیت الصلاۃ: باب من أدرک من الصلاۃ رکعۃ ۵۸۰) اگر ایک رکعت سے کم مل جائے تو اس کی پوری نماز قضا ہو جاتی ہے۔

اگر کسی کو عذر زائل ہونے کے بعد صرف ''اللہ أکبر'' کہنے کا وقت مل جائے تو اس پر نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا ہوش کھو بیٹھے پھر اس کو ہوش آ جائے، یا کوئی عورت حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو جائے، اور نماز کا صرف اتنا وقت باقی ہو کہ اس میں ''اللہ أکبر'' کہا جا سکتا ہو تو ان دونوں پر یہ نماز فرض ہے، مثلاً عصر کے وقت کا آخری حصہ ہو، یا عشاء کی نماز کا آخری وقت ہو تو ان دونوں پر پہلی صورت میں ظہر اور عصر کی نماز فرض ہے اور دوسری صورت میں مغرب اور عشاء کی نماز فرض ہے۔

فرض نمازوں کی قضا

اگر کسی کی فرض نماز سونے یا بھول جانے کی وجہ سے چھوٹ جائے تو وہ نیند سے بیدار ہونے یا یاد آنے پر ادا کرے گا جب اس کو نماز کی ادائیگی کی طاقت ہو (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ثابت ہے: ''جو کوئی نماز بھول جائے تو یاد آنے پر اس کو پڑھ لے''۔ بخاری: مواقیت الصلاۃ، باب من نسی صلاۃ فلیصلہا إذا ذکرہا ۵۹۷۔ مسلم: کتاب المساجد، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ ۶۸۴۔ یہ روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے)، اس سے صرف دو حالتیں مستثنیٰ ہیں:

- موجودہ نماز کی ادائیگی کے لیے وقت بہت تھوڑا ہو اور اس کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں وہ موجودہ وقت کی نماز ادا کرے گا
- وہ چند لوگوں کے ساتھ ننگا ہو اور ان کے پاس صرف ایک ہی کپڑا ہو تو وہ اسی وقت نماز پڑھے گا جب یہ کپڑا اس تک پہنچ جائے تاکہ کپڑے میں نماز ادا کرے، البتہ اگر وہ خیال کرے کہ کپڑا آنے تک صبر کرنے سے نماز کا وقت نکل جائے گا تو وہ وقت کی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے ننگا نماز پڑھے گا، پھر جب کپڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا تو وہ نماز کا اعادہ کرے گا۔

کسی کی نمازِ ظہر چھوٹ جائے، جب وہ مسجد میں داخل ہو جائے تو لوگوں کو جماعت کے ساتھ عصر کی نماز پڑھتے ہوئے پائے تو اس پر سب سے پہلے ظہر کی نماز کی قضا کرنا ضروری ہے، پھر وہ اس کے بعد عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے جماعت کے ساتھ جا ملے گا، چاہے ظہر کی نماز پڑھنے کی صورت میں عصر کی جماعت چھوٹ جائے، اس کے باوجود وہ پہلے قضا نماز پڑھے گا۔

☆☆☆☆☆

نماز کا اعادہ

(اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب''، بغوی ۲/۳۲)

اعادہ اور قضا کے درمیان فرق یہ ہے کہ اعادہ وقت کے دوران ہی ہوتا ہے اور قضا وقت نکل جانے کے بعد۔ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ لے پھر اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کے کپڑے پر نجاست لگی ہوئی ہے اور ابھی نماز کا وقت باقی ہو تو وہ نجاست لگے ہوئے کپڑے اتارے گا اور دوسرے پاک کپڑے پہنے گا اور نماز پڑھے گا، اس دوبارہ نماز پڑھنے کے عمل کو اعادہ کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس کو وقت کے دوران ہی ادا کیا گیا ہے، اگر کسی کو وقت نکل جانے کے بعد اپنے کپڑے پر نجاست کا علم ہو جائے، پھر وہ کپڑے اتار کر صاف کپڑے پہن لے اور نماز پڑھ لے تو اس نماز کو قضا کہا جائے گا، کیوں کہ اس نماز کو وقت گزرنے کے بعد ادا کیا گیا ہے۔

دوبارہ پڑھی جانے والی نماز: جب کوئی تنہا یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لے پھر وہ دوسری جماعت کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لے تو اس کے لیے دوسری جماعت کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھنا سنت ہے، اگر کوئی شخص جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لے، پھر وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے جائے پھر وضو کرے اور دوسری جماعت کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھے اور ان کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے، لیکن اس کو یاد آ جائے کہ اس نے پہلی مرتبہ بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے تو اس پر اپنی پہلی نماز کو دہرانا واجب ہے، کیوں کہ اس کی یہ دوسری نماز ''دوبارہ پڑھی جانے والی نماز'' ہے، اور یہ سنت ہے، جب کہ اس کی پہلی نماز فرض ہے جو باطل ہو گئی ہے، کیوں کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھی تھی، اور سنت فرض کی طرف سے کافی نہیں ہوتی ہے، چاہے وہ یہ نماز فرض کی نیت کے ساتھ ادا کرے۔

امام کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ تین موقعوں پر امامت کی نیت کرے: دہرائی

جانے والی نماز میں، بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین میں اور جمعہ کی نماز میں۔ فقہاء نے نذر مانی ہوئی نماز کا بھی اضافہ کیا ہے، لیکن کہا ہے کہ اگر وہ امامت کی نیت نہ کرے تو نماز ہو جاتی ہے اور گناہ کے ساتھ صحیح ہوتی ہے۔ (شاطری نے ''نیل الرجا بشرح سفینۃ النجا'' میں اس کی صراحت کی ہے۔ ص ۲۰۷)

☆☆☆☆☆

عیدین کی نماز

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۲/۳۷۰۔ ''اللباب'' محاملی ۱/۱۱۸)

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز سنت موکدہ ہے۔ (شوافع میں اصطخری کی رائے یہ ہے کہ یہ نماز فرض کفایہ ہے، جس کو بغوی نے ''التھذیب'' میں بیان کیا ہے ۲/۳۷۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نمازوں کی پابندی کی ہے، یہ جمعہ کی نماز کی طرح دو رکعتیں ہیں، اس میں قرات جہراً کی جاتی ہے، البتہ اس نماز اور جمعہ کی نماز کا وقت الگ الگ ہے، کیوں کہ عیدین کی نماز سورج کے طلوع ہونے کے وقت سے زوال تک پڑھی جاتی ہے، افضل یہ ہے کہ عید کی نماز اس وقت پڑھی جائے جب افق میں سورج ایک نیزہ کے بقدر بلند ہو جائے یعنی سورج طلوع ہو کر تقریباً سولہ منٹ گزرنے کے بعد۔ البتہ جمعہ کی نماز سورج کے زوال کے بعد پڑھنا ضروری ہے، اس میں اور جمعہ کی نماز میں یہ بھی فرق ہے کہ عید کی نماز صحراء میں ادا کی جاتی ہے، جب کہ جمعہ کی نماز شہر یا گاؤں میں ادا کی جاتی ہے۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل فرق بھی پائے جاتے ہیں:

عید کی نماز کی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ اور توجیہ کے بعد سورہ فاتحہ سے پہلے سات تکبیرات کہی جاتی ہیں اور دوسری رکعت میں تکبیرِ قیام کے بعد پانچ تکبیرات کہی جاتی ہیں اور ہر تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے: ''سُبْحَانَ اللّٰہِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ''۔ اللہ کی ذات پاک ہے، اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اللہ سب سے بڑا ہے۔

عید کی نماز میں نہ اذان ہوتی ہے اور نہ اقامت، بلکہ صرف اتنا کہا جاتا ہے: ''**الصلاۃ الجامعة**'' یا ''**صلاۃ العید**''۔ اس کے پہلے خطبہ کے شروع میں تسلسل کے ساتھ سات تکبیرات کہی جاتی ہیں اور دوسرے خطبہ میں پانچ تکبیریں۔

خطیب عید الفطر کے خطبہ میں فطرہ کے احکام، اس کی مقدار، ثواب اور فرد و معاشرہ پر اس کے اثرات کو بیان کرتا ہے، اور عید الاضحیٰ کے خطبہ میں قربانی کے احکام اور فضائل بیان کرتا ہے۔

عید کا خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا ہے، جب کہ جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے دیا جاتا ہے۔

عید الاضحیٰ کی نماز؛ نماز اور خطبوں میں عید الفطر کی نماز کی طرح ہی ہے، اسی طرح دونوں عید کے موقع پر عید کی رات کا سورج غروب ہونے کے بعد سے عید کی نماز ادا کرنے تک بلند آواز سے تکبیر کہنا سنت ہے، تکبیر یہ ہے: ''اَللّٰہُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ''۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔

یہ عام تکبیر ہے، یعنی یہ کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہے، یعنی یہ تکبیر مسجد، گھر، بازار اور راستے ہر جگہ کہی جا سکتی ہے، عید الفطر کی رات تکبیر کہنا عید الاضحیٰ کی رات تکبیر کہنے کے مقابلہ میں زیادہ سنت موکدہ ہے، کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ'' (بقرہ ۱۸۵) (اور تم مدت پوری کر لو اور اللہ کی کبریائی بیان کرو) یہاں ''العدۃ'' سے مراد ماہِ رمضان کے دنوں کی تعداد ہے، آیت میں تکبیر سے مراد عید الفطر کی رات کی تکبیر ہے، اور عید الاضحیٰ کی تکبیر کو اس پر قیاس کیا گیا ہے۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز میں مندرجہ ذیل فرق ہیں:

عید الفطر کی نماز تھوڑی سی موخر کی جائے گی تا کہ مسلمانوں کو مسجد جانے سے پہلے عید کے دن صبح ناشتہ کھانے کا موقع ملے، یا وہ عید کی نماز سے پہلے مسجد میں ہی کچھ کھا لیں، جب کہ عید الاضحیٰ کی نماز میں جلدی کرنا مسنون ہے تا کہ مسلمانوں کو اپنی قربانی کے جانور ذبح کرنے اور اس کا گوشت تقسیم کرنے کے لیے بڑا وقت ملے۔

عیدین کی نماز کی پہلی رکعت میں سورہ قٓ یا سورہ اعلیٰ پڑھی جاتی ہے اور دوسری

رکعت میں سورہ قمر یا سورہ غاشیہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

عید الاضحیٰ میں مسلمان یوم عرفہ کی صبح کی نماز سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ یعنی ایام تشریق کے آخری دن کے عصر کی نماز تک ہر نماز کے بعد تین مرتبہ تکبیر کہتے ہیں، چاہے نماز فرض ہو یا سنت یا نمازِ جنازہ، تکبیر بلند آواز سے کہی جائے: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ''۔ (ترجمہ: اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں) اس کے بعد کہا جائے: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا''۔

یہ تکبیر مقید ہے؛ کیوں کہ یہ نماز کے بعد ہی کہی جاتی ہے، چاہے وہ نماز فرض ہو یا واجب نماز مثلاً نذر مانی ہوئی نماز، یا سنت نماز ہو مثلاً سنن رواتب، یا جنازہ کی نماز ہو، چاہے نماز ادا ہو یا قضا، البتہ سجدہ تلاوت یا سجدہ شکر کے بعد تکبیر نہیں کہی جائے گی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

استسقاء کی نماز (پانی مانگنے کی نماز)

استسقاء کی نماز بارش مانگنے کی نماز ہے، یہ نماز سنت ہے اور ضرورت پڑنے پر ادا کی جاتی ہے، اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ (بخاری: کتاب الاستسقاء، باب الدعاء فی الاستسقاء قائما ۹۹۰، مسلم: کتاب صلاۃ الاستسقاء ۱۵۲۷)

اسی طرح اس نماز پر امت کا اجماع بھی ہے۔

بارش مندرجہ ذیل تین طریقوں سے مانگی جاتی ہے:

۱۔ صرف دعا کی جائے۔

۲۔ فرض اور سنت نمازوں کے بعد، شرعی علوم کی تدریس کے بعد دعا کی جائے، یعنی ان اوقات میں دعا مانگی جائے جب دعا قبول ہونے کی امید کی جاتی ہے۔

۳۔ استسقاء کی نماز ادا کی جائے:

استسقاء کی نماز میں قرات جہراً کی جاتی ہے، یہ عید کی نماز کی طرح دو رکعت ہیں، اس میں بھی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد سات تکبیرات اور دوسری رکعت میں تکبیرِ قیام کے بعد پانچ تکبیرات کہی جاتی ہیں اور ہر دو تکبیر کے درمیان یہ دعا پڑھی جاتی ہے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ''۔ اس نماز میں امام پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قٓ اور دوسری رکعت میں سورہ قمر کی تلاوت کرتا ہے یا ان کے بدلہ سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ کی تلاوت کرتا ہے۔ اور اس نماز میں بھی عید کی نماز کی طرح خطبے نماز کے بعد دیے جاتے ہیں۔

البتہ استسقاء کی نماز اور عید کی نماز میں مندرجہ ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

امام کسی شخص کو لوگوں میں یہ اعلان کرنے کے لیے مکلّف کرے گا کہ وہ استسقاء کی نماز ادا کرنے کے لیے فلاں دن جمع ہو جائیں اور سبھی لوگ استسقاء کی نماز سے پہلے تین دن روزے

رکھیں، سبھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں، فقراء اور مسکینوں میں صدقات وخیرات کریں، رشتوں کو جوڑیں، جھگڑوں کو ختم کریں اور آپس میں مصالحت کریں، ایک دوسرے کی دشمنی سے باز آئیں، نماز کی جگہ اپنے ساتھ بوڑھوں کو بھی لے آئیں، اگر امام ان کو اپنے ساتھ جانوروں اور چوپایوں مثلاً گائے بکریوں کو لانے کا حکم دے تو ان کو بھی لے آئیں، تاکہ لوگ ان کو نماز کے دوران دیکھیں اور اس بات کو جان لیں کہ اللہ تعالی بوڑھوں، عاجز لوگوں اور جانوروں پر رحم کرتا ہے اور ان کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالی کی رحمت ان سب پر چھا جاتی ہے۔

جو مسلمان استسقاء کی نماز کے لیے حاضر ہوں تو ان سبھوں کو روزے رکھنا، معمولی کپڑے پہننا، عمدہ کپڑے نہ پہننا اور خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے، تاکہ ان پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے، جب وہ امام یا خلیفہ کی طرف سے مقررہ وقت پر نماز کے لیے جمع ہو جائیں تو عیدین کی نماز کی طرح دو رکعت نماز پڑھیں، یہ نماز جہری ہے، امام موجود لوگوں میں دو خطبے دے جس کے ارکان، شرائط اور سنتیں وہی ہیں جو عیدین کے خطبوں کی ہے، خطبہ شروع کرنے سے پہلے امام تھوڑی دیر بیٹھے گا پھر اپنا خطبہ شروع کرے گا، صلاۃ الاستسقاء اور عیدین کے خطبوں کے درمیان مندرجہ ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

-استسقاء کی نماز میں نماز سے پہلے خطبے دینا جائز ہے، جب کہ عیدین کے خطبے میں نماز کے بعد ہی دینا ضروری ہے، پہلے دینا جائز نہیں ہے۔

-عیدین کے خطبوں میں زیادہ سے زیادہ تکبیر پڑھنا سنت ہے، جب کہ استسقاء کے خطبوں میں زیادہ سے زیادہ استغفار کرنا سنت ہے۔

-پہلے خطبے میں امام یہ دعا کرے گا: ''اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا، هَنِيْئًا مَّرِيْئًا مَّرِيْعًا، غَدَقًا مُجَلِّجلاً سُحًّا، طَبَقًا دَائِمًا، اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا الْغَيْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِيْنَ. اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ إِنَّكَ كُنْتَ غَفَّارًا، فَأَرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْنَا مِدْرَارًا'' (یہ دعا امام شافعی نے ''الأم'' میں روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے ''التلخیص الخبیر'' میں کہا ہے: مجھے اس کی سند نہیں ملی۔ ۲/ ۲۰۱، بیہقی نے اپنی تصنیفات میں اس کی سند بیان نہیں کی ہے، بلکہ ''المعرفة'' میں شافعی کے طریق سے اس کو نقل کیا ہے)

-اسی طرح خطیب دونوں خطبوں میں ان آیات کی تلاوت کرے گا: ''فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَّيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا'' (نوح ۱۰-۱۲) خطیب بعض دعائیں بلند آواز سے کرے گا اور بعض دعائیں خاموشی کے ساتھ۔

-جب امام خطبہ ثانیہ میں ایک تہائی حصہ پر پہنچے گا تو قبلہ کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ اور مصلیان کثرت سے دعا کریں گے۔

-امام اور مصلی اپنی چادروں کے اوپری حصہ کو نیچے اور نچلے حصے کو اوپر کریں گے، اسی طرح دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں میں بدل دیں گے۔ اگر چادر نہ ہو تو وہ اپنا کپڑا بھی اسی طرح کریں گے یعنی دائیں کو بائیں طرف اور بائیں کو دائیں طرف کریں گے۔

-نمازی اپنی ہتھیلیاں اوپر کریں گے کہ ہتھیلی کا اندرونی حصہ بلندی کی طرف ہو جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، یہ روایت امام مسلم نے کی ہے۔ (مسلم: کتاب صلاۃ الاستسقاء، باب رفع الیدین بالدعاء فی الاستسقاء ۱۵۳۹)

-تکبیر کے بدلے خطیب صلاۃ الاستسقاء کے خطبہ میں یہ کہے گا: ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ، الَّذِىْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ''۔ (میں عظمت والے اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور اپنے بل پر ہمیشہ خود قائم رہنے والا ہے اور اس کی طرف رجوع ہوتا ہوں) خطیب کے لیے مستحب ہے کہ حاضرین میں سے کسی اچھے آدمی کا وسیلہ بارش مانگتے وقت کرے، کیوں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے، وہ صلاۃ الاستسقاء کے خطبہ میں دعا کرتے وقت کہا کرتے تھے: ''اے اللہ! جب ہم پر قحط آتا تھا تو ہم اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کرتے تھے تو تُو ہم پر بارش کرتا تھا، اب ہم ہمارے نبی کے چچا کا وسیلہ اختیار کر رہے ہیں اس لیے تو ہم پر بارش نازل فرما''۔ (بخاری: کتاب الجمعة، أبواب الاستسقاء، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا ۹۷۸۱)

لوگ اللہ تعالی سے بارش طلب کرنے کے لیے اللہ تعالی کے حضور کثرت سے دعا اور خشوع وخضوع کے ساتھ متوجہ ہو جایا کرتے تھے تو ان پر بارش ہوتی تھی۔

سورج گہن اور چاند گہن کی نماز

سورج گہن اور چاند گہن کی نماز سنت موکدہ ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام مسلم اور امام بخاری نے روایت کیا ہے، اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جن کو نہ کسی کی موت پر گہن لگتا ہے اور نہ کسی کے پیدا ہونے پر، جب تم اس کو دیکھو تو نماز پڑھو اور دعائیں کرو یہاں تک کہ تم پر آنے والا گہن ختم ہو جائے''۔ (بخاری: کتاب الجمعۃ، أبواب الکسوف، باب الصلاۃ فی کسوف الشّمس ۱۰۰۶، مسلم: کتاب الکسوف، باب ذکر النداء بصلاۃ الکسوف: الصلاۃ جامعۃ ۱۵۶۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس وقت کہی جب آپ کے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اس دن سورج کو گہن لگ گیا تھا، گہن کی نماز سنت ہونے کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اور تیسری دلیل امت کا اجماع ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن کی نماز عید کی نماز کی طرح دو رکعتیں ہیں، چاند گہن میں تلاوت جہراً کی جائے گی اور سورج گہن میں سرّاً، پھر نماز کے بعد خطیب دو خطبے دے گا۔

سورج و چاند گہن کی نماز اور عید کی نماز میں مندرجہ ذیل فرق ہیں:

-سورج گہن اور چاند گہن کی نماز میں تکبیر نہیں ہوتی۔

-سورج گہن اور چاند گہن کی نماز میں دو قیام اور دو طویل رکوع ہوتے ہیں۔

-پہلی رکعت کے پہلے قیام میں امام سورہ بقرہ، دوسرے قیام میں سورہ آل عمران، تیسرے قیام یعنی دوسری رکعت کے پہلے قیام میں سورہ نساء اور چوتھے قیام یعنی دوسری رکعت کے دوسرے قیام میں سورہ مائدہ پڑھے گا، یا پہلے قیام میں سورہ بقرہ، دوسرے قیام میں سورہ بقرہ کی دو سو آیتوں کے بقدر، تیسرے قیام میں ایک سو پچاس آیتوں کے بقدر اور چوتھے قیام

میں ایک سو آیتوں کے بقدر پڑھے گا، تلاوت کے یہ دونوں طریقے مسلک میں بیان کیے گئے ہیں۔ (امام نووی نے ان میں سے پہلے طریقے کی نسبت ''الأم'' اور ''المختصر'' کی طرف کی ہے اور دوسرے طریقے کی نسبت بویطی کی طرف، پہلے طریقہ کو ابو اسحاق شیرازی اور تمام عراقیوں اور ان کے علاوہ بعض لوگوں نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے طریقہ کو خراسانیوں نے اختیار کیا ہے۔ امام نووی نے کہا ہے کہ محققین کہتے ہیں: یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں قریب قریب طریقے ہیں۔ المجموع شرح المھذب ۵/۴۵)

-اگر کوئی سورج گہن اور چاند گہن کی نماز ایک رکوع اور ایک قیام کے ساتھ پڑھنا چاہے یعنی ظہر کی سنت دو رکعتوں کی طرح تو جائز ہے۔ جیسا کہ سنن ابوداود وغیرہ میں ہے۔ (ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب من قال أربع رکعات ۱۱۸۴، یہ روایت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ہے) البتہ اس صورت میں مکمل طریقہ کو چھوڑنے والا ہو جائے گا۔

-اگر کوئی سورج گہن یا چاند گہن کی نماز شروع کرے اور دوسرے قیام کے لیے کھڑا ہو جائے تو اس کے لیے یہ نماز اس طریقہ کے مطابق مکمل کرنا ضروری ہے جس کو ہم نے بیان کیا ہے یعنی ہر رکعت میں دو رکوع اور دو قیام کرے گا۔

-اگر مذکورہ طریقہ کے مطابق سورج گہن اور چاند گہن کی نماز مکمل کی جائے، اور اس کے بعد بھی گہن جاری ہو تو قیام اور رکوع میں اضافہ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اتنا ہی کافی ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن کے خطبہ میں امام کے لیے آیتِ توبہ تلاوت کرنا مسنون ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' سورہ تحریم کی آٹھویں آیت کے اختتام تک۔ اسی طرح لوگوں کو توبہ کرنے، معصیات کو ترک کرنے، اچھے اعمال کرنے اور عمل صالح کی طرف بڑھنے، خیرات کرنے، صلہ رحمی، اللہ کا ذکر، دعا اور استغفار کثرت سے کرنے کی تلقین کرنا بھی مسنون ہے۔

خطیب پر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو غفلت اور تکبر کے انجام سے ڈرائے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور احکام کی پیروی کرنے کی ترغیب دے جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔

جب سورج گہن یا چاند گہن ختم ہو جائے تو گہن کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، کیوں کہ اس نماز کی قضا نہیں، البتہ مسلمان وعظ وارشاد اور نصیحت کے لیے خطبے سننے کے لیے جمع ہوں گے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورج گہن ختم ہونے کے بعد لوگوں میں خطبہ دیا۔ (مسلم: کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاۃ الکسوف ۱۵۵۷)

سورج گہن کا وقت سورج غروب ہونے یا اس کا گہن ختم ہونے پر ختم ہو جاتا ہے اور چاند گہن کا وقت چاند نظر آنے یا سورج طلوع ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

☆☆☆☆☆

نفل نمازیں

نفل نمازوں کو سنت نمازیں، تطوع نمازیں، مندوب نمازیں، مستحب نمازیں وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔

نفل نمازوں میں سے سننِ رواتب ہیں جو فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں ادا کی جاتی ہیں۔

ان میں سے دس رکعتیں سنت موکدہ ہیں جن کا تذکرہ بخاری اور مسلم میں آیا ہے۔ (بخاری: کتاب الجمعۃ، أبواب تقصیر الصلاۃ، باب الرکعتین قبل الظہر ۱۱۴۰، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب فضل السنن الراتبۃ قبل الفرائض وبعدھن ۱۲۳۶): دو رکعتیں فجر سے پہلے، دو رکعتیں ظہر یا جمعہ کی نماز سے پہلے، دو رکعتیں ظہر کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد اور دو رکعتیں عشاء کے بعد۔

فجر سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد والی دو رکعتوں میں سورہ **قل یا أیھا الکافرون** اور سورہ **قل ھو اللہ أحد** پڑھنا سنت ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں آیا ہے۔ (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب استحباب رکعتی سنۃ الفجر ۱۲۳۰)

یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز سے پہلے والی دو سنت رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں یہ آیت تلاوت کرتے تھے: ”**قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا**“ (بقرہ ۱۳۶) اور دوسری رکعت میں یہ آیت: ”**قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ**“ (آل عمران ۶۴) (أیضاً ۱۲۳۲)

فجر کی سنت نماز اور فرض نماز کے درمیان تھوڑی دیر فصل کرنا مسنون ہے؛ یا تو چند لمحات کے لیے داہنے پہلو لیٹا جائے، یا سات مرتبہ ”**أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**“ کہا جائے، اور انیس مرتبہ بسم اللہ پڑھا جائے اور یہ تسبیح سو مرتبہ پڑھی جائے:

’’سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ‘‘۔یہ استغفار تین مرتبہ پڑھا جائے:
’’أَنْتَ رَبِّیْ لَا إِلٰـہَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِیْ وَأَنَا عَبْدُکَ، وَأَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَأَبُوْءُ بِذَنْبِیْ، فَاغْفِرْلِیْ فَإِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ‘‘۔اور یہ دعا کرے:
’’اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَئِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَإِسْرَافِیْلَ، وَرَبَّ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَنَجِّنِیْ مِنَ الْغَمِّ الَّذِیْ أَنَا فِیْہِ‘‘ تین مرتبہ۔

عشاء کی نماز کے بعد پڑھی جانے والی وتر کی سنت نماز کم از کم ایک رکعت ہے اور زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعتیں ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جو پانچ رکعت وتر کرنا چاہے تو وہ ایسا کرے، جو تین رکعت وتر پڑھنا چاہے تو وہ ایسا کرے، اور جو ایک رکعت وتر کرنا چاہے تو وہ کرے‘‘۔ابو داود نے صحیح سند سے یہ روایت کی ہے۔(ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب تفریع أبواب الوتر، باب کم الوتر ۱۲۲۵) اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ’’وتر کی نماز پانچ یا سات یا نو یا گیارہ پڑھو‘‘ بیہقی نے یہ روایت کی ہے اور اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے (السنن الکبری: کتاب الصلاۃ، جماع أبواب صلاۃ التطوع، باب الوتر برکعۃ واحدۃ ومن أجاز أن یصلی رکعۃ واحدۃ تطوعا ۴۴۵۶، مستدرک حاکم: کتاب الوتر ۱/۳۰۴) حاکم نے یہ روایت کی ہے اور اس کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ ماہِ رمضان کے نصف اخیر میں وتر کی نماز کی آخری رکعت کے اعتدال میں قنوت پڑھنا مسنون ہے، قنوت کی دعائے ماثور کا تذکرہ اس سے پہلے ہوا ہے۔

رواتب میں سے غیر موکدہ سنت رکعتوں کی تعداد بارہ ہے، ظہر اور جمعہ سے پہلے دو مزید رکعتیں، اس طرح ظہر اور جمعہ سے پہلے کی چار رکعت سنت ہوجائے گی، ظہر کی نماز کے بعد مزید دو رکعتیں، اس طرح ظہر کے بعد چار رکعتیں سنت ہوجائیں گی، عصر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں، مغرب سے پہلے دو رکعتیں اور عشاء سے پہلے دو رکعتیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں ان کا تذکرہ آیا ہے۔

جمعہ کی نماز سے متعلق ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (حافظ علامہ ابو العباس تقی الدین احمد بن عبد الحلیم

بن عبد السلام بن تیمیہ حنبلی (۶۶۱۔۷۲۸ھ) اپنے زمانہ کے کبارِ علماء میں سے تھے، آپ کی فقہ، عقائد اور تفسیر وغیرہ میں بہت سی تصنیفات ہیں، آپ کی فضیلت، زہد اور جہاد بہت ہی مشہور و معروف ہے جس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں نماز پڑھتے تو چار رکعتیں پڑھتے تھے، اگر اپنے گھر میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

دعائے قنوت

یہ دعا ’’اللھم اھدنی فیمن ھدیت ......‘‘ ہے جس کا مکمل نص پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، ماہِ رمضان کے نصف اخیر کی وتر میں آخری رکعت کے اعتدال میں دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کا تذکرہ ہے۔(ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب تفریع أبواب الوتر، باب القنوت فی الوتر ۱۲۲۹، السنن الکبری: بیہقی: کتاب الصلاۃ، جماع أبواب صلاۃ التطوع، باب من قال لا یقنت فی الوتر إلا فی النصف الأخیر ۴۲۹۶)

مذکورہ دعائے قنوت عام دنوں میں فجر کی نماز کی دوسری رکعت کے اعتدال میں پڑھی جاتی ہے، جیسا کہ بیہقی وغیرہ کی روایت میں ہے، علماء نے خلفاء راشدین سے نقل کیا ہے کہ وہ ہمیشہ فجر کی نماز کی دوسری رکعت کے اعتدال میں دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے، ابو داود وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی، یا کوئی وبا آتی یا قحط آتا یا ٹڈیوں کا حملہ ہوتا یا دشمنوں کا خوف ہوتا تو ہر نماز کے آخری اعتدال میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔(مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلاۃ إذا نزلت بالمسلمین نازلۃ ۱۱۱۹، ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب تفریع أبواب الوتر، باب القنوت فی الصلوات ۱۲۴۱)

چاشت کی نماز

یہ ان سنتوں میں سے ہے جن کے بارے میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، اس کا وقت سورج ایک نیزہ بلند ہونے سے شروع ہوتا ہے یعنی تقریباً طلوع کے سولہ منٹ بعد اور ظہر سے پہلے تک اس کا وقت باقی رہتا ہے۔

جس نماز کا بھی وقت متعین ہے تو اس کا وقت گزر جانے سے اس نماز کی قضا ہے،

چاشت کی نماز کے سلسلہ میں صحیح حدیث مروی ہے جس میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''اوابین کی نماز اس وقت ہے جب اونٹ کے بچوں کے کھر جل جائیں'' (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ الأوابین حین ترمض الفصال ۱۲۷۷) اور یہ حالت ربع النہار یعنی دن کا ایک چوتھائی حصہ گزر جانے کے بعد ہوتی ہے۔ چاشت کی نماز کم از کم دو رکعتیں ہیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں۔

توبہ کی نماز

یہ سنت اس وقت ادا کی جاتی ہے جب کسی بندے سے گناہ ہو جائے چاہے صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ گناہ تاکہ وہ نماز پڑھ کر اللہ سے توبہ کرے اور مغفرت طلب کرے۔

ابوداود اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اس کو ترمذی نے حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی بندہ کوئی گناہ کرتا ہے پھر وہ اٹھ کر وضو کرتا ہے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے مغفرت مانگتا ہے تو اللہ اس کی مغفرت کر دیتا ہے''۔ (ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب تفریع أبواب الوتر، باب فی الاستغفار ۱۳۱۳، ترمذی: أبواب الصلاۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی الصلاۃ عند التوبۃ ۳۸۶، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامۃ الصلاۃ، باب ما جاء فی أن الصلاۃ کفارۃ ۱۳۹۱)

تراویح کی نماز

رمضان کی راتوں میں عشاء کی نماز کے بعد تراویح کی نماز ادا کرنا سنت ہے، کیوں کہ بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ رمضان کی تئیسویں، پچیسویں اور ستائیسویں راتوں کو مسجد میں آئے اور مسلمانوں کو نماز پڑھائی، اور آپ کے ساتھ یہ نماز بعض صحابہ نے پڑھی، جب نماز کے لیے ان راتوں کے علاوہ میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو نبی ﷺ ان کے پاس نکل کر نہیں آئے اور فرمایا: ''مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض کر دی جائے گی''۔ (بخاری: کتاب الجمعۃ، باب من قال فی الخطبۃ بعد الثناء: أما بعد ۸۹۶، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب الترغیب فی قیام رمضان ۱۳۱۰)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے تراویح کی نماز بیس رکعتیں پڑھنے کی پابندی کی ہے، اسی وجہ

سے عشاء کی فرض نماز کے بعد رمضان کی راتوں میں تراویح کی نماز سنت ہے، یہ نماز باجماعت پڑھی جائے گی، اسی طرح وتر کی نماز بھی باجماعت ادا کی جائے گی، صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس کو رات کے آخری حصہ میں نماز کے لیے کھڑے نہ ہونے کا خوف ہو تو وہ شروع رات میں وتر پڑھ لے، اور جس کو رات کے آخری حصہ میں نماز کے لیے اٹھنے کی امید ہو تو وہ وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھے، کیوں کہ رات کے آخری حصہ کی نماز مشہود ہے''۔ مسلم نے یہ روایت کی ہے۔ (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب من خاف أن لا یقوم من آخر اللیل فلیوتر أولہ ۱۳۹۵)

شیخ الاسلام تقی الدین سبکی نے اس بات کے تذکرہ کے وقت کہا ہے کہ امام مالک کے نزدیک تراویح میں اصل ۳۶ رکعتیں ہیں: ''البتہ آج زمین کے کسی بھی حصہ میں اتنی تعداد میں کوئی بھی نماز پڑھنے والا نہیں ہے اور کوئی تئیس رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتا ہے اور ان سے کم بھی پڑھتا ہے۔ البتہ بعض اہل ظاہر سے ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ وہ گیارہ رکعتیں پڑھتے ہیں؛ حضرت عائشہ کی حدیث کی بنا پر، یہ ایک شخص اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور اس نے ایک حدیث سنی ہے، جس کی وجہ سے وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا کوئی معارض نہیں ہے! اس کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ کسی ایسی چیز کو چھوڑا نہیں جاتا ہے جس پر تمام علاقوں کا ہر زمانہ میں متواتر اجماع رہا ہے اور وہ بھی اس طرح کے امور کے سلسلہ میں کہ اگر ان کا موازنہ اسی طرح کی ظنی چیزوں سے کیا جائے کہ اس پر عمل کرنے والا ان کے ذریعہ ترجیح دینے کی قدرت نہیں رکھتا ہے''۔ (''ضوء المصابیح فی صلاۃ التراویح'' شیخ الاسلام تقی الدین سبکی ۵۲)

تہجد کی نماز

اس کو قیام اللیل بھی کہا جاتا ہے، یہ سنت ہے، قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ، نَافِلَةً لَكَ'' (إسراء ۷۹) یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے: ''كَانُوا قَلِيلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ'' (ذاریات ۱۷)

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرض کے بعد سب سے افضل نماز

رات کی نماز (تہجد) ہے''۔ (مسلم: کتاب الصیام، باب فضل صوم المحرم ۲۰۵۷) حاکم کی روایت میں ہے: ''تم قیام اللیل کی پابندی کرو، کیوں کہ یہ تم سے پہلے والے صالحین کا طریقہ ہے، اور یہ تمہارے لیے اپنے رب سے قربت ہے، اور گناہوں کا کفارہ بننے والی ہے اور گناہوں سے روکنے والی ہے''۔ (مستدرک حاکم: کتاب صلاۃ التطوع ۱۰۹۱۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور انہوں نے یہ روایت نہیں کی ہے)

تہجد کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی تعداد ہے، صرف دو رکعتوں پر اکتفا کرنا بھی ممکن ہے اور ایک سو یا اس سے زائد رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

ابن حبان اور حاکم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''نماز بہترین موضوع ہے، پس اس میں سے زیادہ پڑھو یا کم''۔ (ابن حبان: کتاب البر والإحسان، باب ماجاء فی الطاعات وثوابها، ذکر الاستحباب للمرء أن یکون له من کل خیر حظ ۳۶۲، مستدرک حاکم: کتاب تواریخ المتقدمین من الأنبیاء والمرسلین ۴۱۰۶)

سنت یہ ہے کہ تہجد کی ابتدا میں دو ہلکی رکعتیں پڑھے، وہ ان رکعتوں میں نیند بھگائے گا اور تہجد کی نماز کی تیاری کے لیے اپنے دل میں اللہ کی عظمت کا استحضار کرے گا۔

تحیۃ المسجد کی نماز

مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا سنت ہے، چاہے بار بار مسجد جانا ہو، کیوں کہ ہر مرتبہ داخل ہونے کی صورت میں نماز پڑھنا سنت ہے، بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھنے سے پہلے نہ بیٹھے''۔ (بخاری: کتاب الجمعة، أبواب تقصیر الصلاۃ، باب ماجاء فی التطوع مثنی مثنی ۱۱۲۷، مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب استحباب تحیۃ المسجد برکعتین ۱۲۰۲)

اگر فرض نماز کی جماعت کھڑی ہو اور کوئی مسلمان مسجد میں داخل ہو جائے تو تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جب نماز کھڑی ہو تو فرض نماز کے علاوہ کوئی بھی نماز نہیں ہے''۔ (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب کراهة

الشروع فی نافلة بعد شروع المؤذن ۱۱۹۵)

ہر مسجد میں تحیۃ المسجد کی نماز دو رکعتیں ہیں، البتہ مسجد حرام کا تحیہ کعبۃ اللہ کا طواف ہے، اگر کوئی طواف نہ کرے تو دو رکعت تحیۃ المسجد کی پڑھ لے۔ (امام محلی ''المنهاج'' پر اپنی شرح میں کہتے ہیں کہ طواف تحیۃ المسجد ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ بیت اللہ کا تحیہ ہے جیسا کہ ہم نے یہاں کہا ہے)

اگر بڑی دیر تک بیٹھے رہے تو تحیۃ المسجد کا وقت نکل جاتا ہے، اگر بیٹھنے کے فوراً بعد یاد آ جائے تو فوراً کھڑے ہو کر دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی ادا کرے۔

خطیب اگر خطبہ کے وقت مسجد میں داخل ہو جائے اور منبر کی طرف چلا جائے تو اس کے لیے تحیۃ المسجد نہیں ہے، اگر کوئی خطبہ کے اخیر میں مسجد میں آئے تو جمعہ کی نماز کا پہلا حصہ چھوٹنے کا خدشہ ہو تو اس کے لیے تحیۃ المسجد نہیں ہے۔

تسبیح کی نماز

صلاۃ التسبیح سنت ہے، یہ چار رکعتیں دو دو کر کے دو تکبیر تحریمہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، یا ایک ہی تکبیر تحریمہ کے ساتھ چار رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

سورہ فاتحہ اور سورہ کے بعد ہر رکعت میں مصلی یہ کلمات ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' پندرہ مرتبہ کہے گا۔ رکوع میں یہی کلمات دس مرتبہ، رکوع سے اٹھنے کے بعد دس مرتبہ، پہلے سجدہ میں دس مرتبہ، سجدے سے اٹھنے کے بعد دس مرتبہ، دوسرے سجدہ میں دس مرتبہ، دوسرے سجدہ سے اٹھنے کے بعد دس مرتبہ، دوسری رکعت کے تشہد کے بعد دس مرتبہ اور چوتھی رکعت کے بعد تشہد میں دس مرتبہ یہی کلمات کہے گا، اس طرح تسبیح کی تعداد ہر رکعت میں ۷۵ ہو جاتی ہے اور چار رکعتوں میں تین سو۔

صلاۃ التسبیح کی حدیث امام ابوداود اور ابن خزیمہ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔ (ابوداود: کتاب الصلاۃ، تفریع صلاۃ المسافر، باب صلاۃ التسبیح ۱۱۱۸، صحیح ابن خزیمہ: باب صلاۃ التسبیح ان صح الخبر فان فی القلب من هذا الاسناد شیٔ ۱۱۴۲) بہت سے ائمہ حفاظ نے اس موضوع پر الگ سے تصنیف کی ہے۔ (ان میں خطیب بغدادی، ابن ناصر الدین دمشقی اور شمس الدین ابن طولون وغیرہ ہیں)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اس کو مندوب نماز کہا ہے۔(''الأذکار''۲۲۹)

صلاۃ التسبیح والی حدیث میں آیا ہے:''......اگر تم اس کو ہر دن ایک مرتبہ پڑھ سکتے ہو تو پڑھو، اگر ایسا نہیں کر سکتے تو ہر جمعہ کو پڑھو، اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو ہر سال میں ایک مرتبہ پڑھو، اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو اپنی زندگی میں ایک مرتبہ پڑھو''۔ یعنی اس کے عظیم اجر وثواب سے تم محروم نہ رہو۔

خیر طلب کرنے کی نماز (صلاۃ الاستخارۃ)

استخارہ کی نماز سنت ہے اور اس کی دو رکعتیں ہیں، اس نماز کے تعلق سے صحیح بخاری میں روایت ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں نبی ﷺ تمام امور میں اسی طرح استخارہ سکھاتے تھے جس طرح ہمیں قرآن کی سورتیں سکھاتے تھے، آپ فرماتے تھے:''جب تم میں سے کوئی کام کا ارادہ کرے تو وہ فرض کے علاوہ دو رکعتیں نماز پڑھے پھر یہ دعا پڑھے:''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ، وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ، وَاَسْأَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ، فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ، وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، اَللّٰهُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ (یا فرمایا: فی عاجل أمری وآجله)، فَاقْدُرْهُ لِیْ، وَیَسِّرْهُ لِیْ، ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ، اَللّٰهُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِیْ بِهٖ''

پھر اپنی ضرورت بیان کرے''۔(بخاری: کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الاستخارۃ ۶۰۲۸)

ترجمہ: اے اللہ! میں تیرے علم کے واسطے سے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں، اور تیری قدرت کے واسطے سے تجھ سے طاقت طلب کرتا ہوں، اور تیرے عظیم فضل کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں، کیوں کہ تو قادر ہے، اور مجھ میں قدرت نہیں، تو جانتا ہے اور مجھے کچھ بھی علم نہیں، تو پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے

لیے میرے دین، میرے معاش اور میری آخرت میں بہتری کا باعث ہے تو اس کو میرے لیے مقدر فرما، اور میرے لیے اس کو آسان فرما، پھر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے میرے دین، میرے معاش اور میری آخرت میں شر کا باعث ہے تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھ کو اس سے پھیر دے، اور بھلائی جہاں کہیں بھی ہو اس کو میرے لیے مقدر فرما دے، پھر اس سے مجھ کو راضی فرما۔

اس ہدایت سے اسلام مسلمان کے سامنے تاکید کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں مددگار کے بغیر نہیں ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالی جو ہر چیز کی قدرت رکھنے والا، ہر چیز کے بارے میں جاننے والا اور نہایت مہربان ہے اس کا معین ومددگار ہے، ہر اُس معاملہ میں جس کے انجام کو مسلمان نہیں جانتا ہے وہ اللہ سے مدد اور نصرت طلب کرتا ہے، تاکہ اللہ اس کے لیے ہر وہ چیز آسان بنائے جس میں اس کے دین ودنیا کا خیر اور بھلائی ہے۔

استخارہ کی نماز میں پہلی رکعت کے سورہ فاتحہ کے بعد سورہ کافرون پڑھے گا اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھے گا۔

ترمذی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''ابن آدم کی یہ سعادت ہے کہ وہ اللہ تعالی سے کثرت سے خیر طلب کرے اور اللہ جس پر راضی ہو اس پر راضی برضا رہے، اور اس کی بدبختی ہے کہ وہ اللہ سے خیر مانگنا چھوڑ دے اور وہ اللہ کے فیصلہ پر ناراض ہو جائے''۔

یہ بھی روایت ہے:''جس نے خیر طلب کیا وہ نامراد نہیں ہوا اور جس نے مشورہ کیا وہ نادم نہیں ہوا اور جس نے میانہ روی اختیار کی وہ متکبر نہیں ہوا''۔(ترمذی: الذبائح، باب ماجاء فی الرضا بالقضاء ۲۱۲۸)

فرض نمازوں کی پہلی والی یا بعد والی سنت نمازوں کے بعد استخارہ کی نماز پڑھنا جائز ہے، اسی طرح تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کی نماز کے بعد بھی استخارہ کی نیت سے نماز پڑھنا جائز ہے، وہ ان میں سے کسی بھی سنت نماز کے بعد استخارہ کی دعا کر سکتا ہے۔

سفر کی سنت نماز

سفر پر نکلنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ کر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی حفاظت کی دعا

کرنا مسنون ہے تا کہ سلامتی کے ساتھ سفر پورا ہو اور سلامتی کے ساتھ واپسی بھی ہو اور اپنے گھر والوں کو خیر کے ساتھ پائے۔ مسافر سفر پر نکلنے سے پہلے گھر ہی میں دو رکعت نماز پڑھے؛ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ کافرون اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھے۔

مسافر کے لیے سفر سے واپس آنے کے بعد گھر جانے سے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنا مسنون ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس ہوتے تو مسجد جاتے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے گھر جاتے۔ (بخاری: کتاب الجهاد والسير، باب الصلاة اذا قدم من سفر ۲۹۳۹، مسلم: کتاب التوبة، باب حدیث توبة کعب بن مالک وصاحبیه ۵۰۷۹)

وضو کی سنت دو رکعتیں

بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے جن میں وہ اپنے دل سے گفتگو نہ کرے تو اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں''۔ (بخاری: کتاب الوضوء، باب الوضوء ثلاثا ثلاثا ۱۵۷، مسلم: کتاب الطهارة، باب صفة الوضوء وكماله ۳۵۸)

علامہ بلقینی نے کہا ہے: تیمّم کی دو رکعتیں سنت ہے اور غسل کی دو رکعتیں سنت ہے۔

(شیخ الاسلام امام حافظ مجتہد سراج الدین ابو حفص عمر بن رسلان بن نصیر البلقینی پیدائش ۷۲۴ وفات ۸۰۵ ہجری، اپنے زمانہ میں شوافع کے سب سے بڑے عالم، آپ کے ہاتھوں بہت سے شوافع فارغ ہوئے ہیں، آپ ذکاوت، قوت حافظہ اور جلد یاد ہونے میں ماہر تھے، جس کی وجہ سے آپ کے زمانے والے آپ کے سامنے سرنگوں ہو گئے، آپ کو عمر دراز حاصل ہوئی، آپ کے پاس دنیا کے مختلف علاقوں سے فتاوی آتے تھے، آپ کے فرزند صالح نے آپ کے فتاوی کا ایک حصہ ایک جلد میں جمع کیا ہے۔ علم میں جلالت شان کے بقدر آپ کی تصنیفات نہیں ہیں، اکثر تصنیفات نامکمل ہیں، آپ کا تعارف ''الضوء اللامع'' ۶/ ۸۵ تا ۹۰ میں ہے، آپ کے فرزندان جلال الدین اور علم الدین نے آپ کی حیات پر کتاب تصنیف کی ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، مخطوطہ کی شکل میں ہے)

ان کے علاوہ دوسری سنت نمازیں مندرجہ ذیل ہیں:

ـ طواف کی سنت نماز (زکریا انصاری نے ''أسنی المطالب'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے ۱/ ۲۰۵)

ہر طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا سنت ہے، چاہے طواف فرض ہو یا سنت۔

ـ غفلت کی سنت نماز (امام غزالی نے اس کا تذکرہ ''إحیاء علوم الدین'' ۲/ ۱۹۳)

یہ دو رکعتیں مسلمان ہر اس وقت پڑھتا ہے جب وہ کچھ وقت کے لیے اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائے، تا کہ اس کی غفلت کی وجہ سے جو ذکرِ الٰہی اس کو چھوٹ گیا ہے یہ نماز اس کا بدل بن جائے۔

ـ قتل کی سنت نماز (شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اس کے لیے شرط یہ رکھی ہے کہ نماز پڑھنا ممکن ہو اور اس کی دلیل میں حضرت خبیب بن عدی کا واقعہ پیش کیا ہے جو بخاری اور مسلم میں ہے: ''أسنی المطالب'' ۱/ ۲۰۵)

جس کے حق میں قتل کا حکم صادر ہوا ہو تو اس کے لیے ممکن ہو تو دو رکعت سنت نماز پڑھنا سنت ہے۔

ـ صلاۃ الحاجۃ (''أسنی المطالب'' ۱/ ۲۰۵، ترمذی نے اس سلسلہ میں مروی روایت کو ضعیف کہا ہے، لیکن امام نووی ''التحقیق'' میں کہتے ہیں: یہ مکروہ نہیں ہے، اگر چہ اس کی حدیث ضعیف ہے، کیوں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ دیکھا جائے: ''أسنی المطالب'' ۱/ ۲۰۵)

اگر کسی کی جائز حاجت اور ضرورت ہو تو اللہ کے حضور اپنی ضرورت پورا کرنے کی خاطر دعا کرنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا سنت ہے۔

ـ احرام کی سنت نماز (شیخ الاسلام نے اس کو مسنون کہا ہے: ''أسنی المطالب'' ۱/ ۲۰۵)

جو حج یا عمرہ یا دونوں کے احرام کی نیت کرنے کا ارادہ کرے تو احرام کی نیت کرنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا سنت ہے، البتہ فجر اور عصر کی نماز کے بعد اس کی ادائیگی جائز نہیں ہے، ہاں اگر مسجد میں ہو تو تحیۃ المسجد کے ساتھ اس کی بھی نیت کر سکتا ہے۔

ـ شادی کی سنت نماز (اس کا بھی تذکرہ شیخ الاسلام نے ''أسنی المطالب'' میں کیا ہے ۱/ ۲۰۶)

شبِ زفاف میں دلہا اور دلہن کے لیے ایک ساتھ نماز پڑھنا سنت ہے تا کہ دونوں کا پہلا اجتماع اللہ کی طاعت اور عبادت میں ہو۔

ـ حمام (غسل خانہ) سے نکلنے کے بعد دو رکعت نماز (أسنی المطالب ۱/ ۲۰۶)

۔ایسی زمین پر دو رکعت نماز پڑھنا جہاں کبھی اللہ کی عبادت نہ ہوئی ہو۔ (اس کو بھی شیخ الاسلام زکریا نے بیان کیا ہے۔ ''اسنی المطالب'' ۱/۲۰۶)

جب کوئی مسلمان ایسے علاقہ میں پہنچے جہاں کبھی اللہ کی عبادت نہ ہوئی ہو اور کسی نے کبھی یہاں نماز نہ پڑھی ہو تو وہاں نماز پڑھنا سنت ہے۔

۔ایسی زمین پر نماز جہاں کبھی کسی کا گزر ہی نہ ہوا ہو (ایضاً ۱/۲۰۶)

اگر کسی زمین پر انسان کا قدم پہلی مرتبہ پڑا ہو تو وہاں نماز پڑھنا سنت ہے۔

سجدوں کی قسمیں

سجدوں کی پانچ قسمیں ہیں: (''اللباب''، محاملی ۱/۱۳۹)

۱۔نماز کے ارکان میں سے ایک رکن سجدہ بھی ہے؛ یہ ہر رکعت میں دو سجدے ہیں، جس کی تفصیلات نماز کے ارکان میں گزر چکی ہیں۔

۲۔وہ سجدہ جو مسبوق مقتدی پر ضروری ہوتا ہے: جس کو پہلی رکعت امام کے ساتھ نہ ملے اور امام کو اس نماز میں سہو ہو جائے اور وہ نماز کے اخیر میں سجدہ سہو کرے تو اس مقتدی پر امام کے ساتھ سجدہ سہو کرنا واجب ہو جاتا ہے، پھر وہ اپنی نماز مکمل کرنے کے بعد سجدہ سہو کرے گا۔

۳۔سجدہ تلاوت: سجدہ تلاوت چودہ ہیں، ان آیتوں کو پڑھے یا سنے تو سجدہ کیا جاتا ہے، یہ سجدے مندرجہ ذیل ہیں: سورہ حج میں دو سجدے، سورہ اعراف، سورہ رعد، نحل، اِسراء، مریم، فرقان، نمل، سجدہ، فصلت، نجم، انشقاق اور اِقرأ میں ایک ایک سجدے۔

سجدہ تلاوت کا حکم نماز کی طرح ہے، اس کے لیے وضو رہنا، کپڑے، جسم اور سجدہ کی جگہ پاک رہنا اور قبلہ رخ رہنا ضروری ہے۔

نماز میں سجدہ تلاوت نماز کا ہی ایک حصہ ہے اور نماز کے باہر ہو تو نیت کرنا، قبلہ کی طرف رخ کرنا، تکبیر تحریمہ کہنا، سجدہ کے لیے تکبیر کہنا اور سجدے کے بعد سلام کرنا ضروری ہے اور سجدہ میں یہ کہنا مسنون ہے: ''**سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی**'' پھر ''**اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدْتُ**......'' اخیر تک منقول دعا پڑھے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اس دوران کوئی ایسا سورہ آتا جس میں سجدہ ہوتو آپ سجدہ فرماتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے، یہاں تک کہ ہم میں سے بعضوں کو اپنی

پیشانی رکھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔(مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ،باب سجود التلاوۃ ۹۳۲)

۴۔سجدہ شکر: جب کوئی مسلمان کسی نعمت سے سرفراز ہو یا اس سے کوئی مصیبت اور تکلیف دور ہو جائے یا کسی کو خطرناک مرض میں مبتلا دیکھے یا کسی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے تو سجدہ شکر کرنا سنت ہے۔

نئی نعمتوں میں سے یہ ہے کہ بچہ پیدا ہو جائے، یا اس کا قرض ادا ہو جائے تو اس کے لیے سجدہ شکر بجالانا سنت ہے، یا اللہ اس کو کسی مصیبت سے چھٹکارا دلائے مثلاً کسی دشمن اسلام کی موت ہو جائے۔ یا کوئی ڈوبنے والا غرق ہونے سے بچ جائے تو وہ اللہ کا شکر بجالائے۔(بیہقی نے ''السنن الکبریٰ'' میں روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بہت ہی ٹگنے، کمزور اور ناقص الخلقہ شخص کو دیکھا تو اللہ عزوجل کا شکر بجالاتے ہوئے سجدہ کیا ۲/ ۳۷۱۔ بغوی نے ''التھذیب'' میں لکھا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یمامہ کی فتح کی خبر پہنچی تو آپ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا ۲/ ۱۹۹)

اگر کوئی سخت بیماری میں مبتلا ہو تو اس کے سامنے ہی سجدہ شکر بجالانا جائز نہیں ہے، البتہ کوئی کبیرہ گناہ علی الاعلان کرتا ہو تو اسی کے سامنے سجدہ شکر بجالانا جائز ہے۔

مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر زبان، دل، سجدہ شکر، ضرورت مندوں کی مدد، طاعتِ الٰہی کی پابندی اور معصیتوں سے باز رہ کر بجالائے۔

سجدہ شکر کو بھی نماز کا ہی حکم ہے یعنی اس کے لیے باوضو رہنا، بدن، کپڑے اور سجدے کی جگہ کا پاک رہنا ضروری ہے، اسی طرح سجدہ شکر کی نیت کرنا، تکبیر تحریمہ کہنا، سجدہ کے لیے تکبیر کہنا، سجدہ کی تسبیح پڑھنا، پہلا سلام پھیرنا ضروری ہے، نیت، تکبیر تحریمہ، سجدے اور پہلا سلام سجدہ شکر کے ارکان میں سے ہیں اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں مسنون ہیں۔

سجدہ شکر نماز کے باہر ادا کیا جاتا ہے، نماز کے اندر اس کی ادائیگی جائز نہیں ہے، کیوں کہ اگر نماز کے اندر سجدہ شکر کیا جائے تو نماز ہی باطل ہو جاتی ہے۔

۵۔سجدہ سہو:

سجدہ سہو سلام سے پہلے دو سجدے ہیں، البتہ بھولنے کی صورت میں اس شرط کے

ساتھ سجدہ سہو نماز کے بعد کیا جا سکتا ہے کہ فصل زیادہ نہ ہو۔ ان سجدوں کو اگرچہ سجدہ سہو کہا جاتا ہے لیکن عمداً کرنے کی صورت میں یہ سجدے لازم ہو جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی مصلی تشہد اول کے لیے نہ بیٹھے تو اس کو سجدہ سہو کرنا چاہیے چاہے اس نے تشہد اول کو عمداً چھوڑا ہوا یا اس سے بھول ہو گئی ہو۔ مکرر سجدہ سہو کرنا جائز نہیں ہے، البتہ جو مسبوق امام کے ساتھ سجدہ سہو کرے تو وہ اپنی نماز مکمل ہونے کے بعد دوسری مرتبہ سجدہ سہو کر سکتا ہے۔

سجدہ سہو کے اسباب

سجدہ سہو کے اسباب سات ہیں: (''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۱۸۴، ''اللباب'' محاملی ۱/ ۱۴۰، انہوں نے سجدہ سہو کے تیرہ اسباب بیان کیے ہیں)

۱۔نماز کے سننِ ابعاض میں سے کوئی سنت چھوٹ جائے، مثلاً تشہد اول، اس میں بیٹھنا، قنوت یا اس میں کھڑا رہنا چھوڑ دے، ہم نے سنن ابعاض کے موقع پر ان کی تفصیلات بیان کر دی ہے۔

۲۔نماز کے ارکان میں سے کوئی رکن بھول کر دو مرتبہ کرے مثلاً رکوع دو مرتبہ کرے۔ اگر کوئی عمداً ایسا کرتا ہے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، البتہ قولی رکن کو عمداً دو مرتبہ کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی ہے مثلاً سورہ فاتحہ دو مرتبہ پڑھی جائے، اگر کسی نے عمداً یا بھول کر سورہ فاتحہ دو مرتبہ پڑھ لے تو سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔قولی رکن یا اس کے کسی حصہ کو کسی دوسرے رکن میں پڑھا جائے چاہے عمداً ہو یا بھول کر مثلاً رکوع میں سورہ فاتحہ پڑھا جائے یا قیام میں ''التحیات'' پڑھ لے تو دونوں صورتوں میں سجدہ سہو لازم ہے۔

۴۔ظہر کی نماز میں پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے یا دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ جائے تو سجدہ سہو کرنا ضروری ہے، اگر عمداً ایسا کرے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔

نماز میں شک ہو جائے کہ اس نے زیادہ رکعتیں کی ہیں، شک کی صورت میں اپنے

یقین والی کم سے کم رکعات کا شمار کیا جائے گا، اگر کسی کو نماز مکمل کر کے سلام پھیرنے کے بعد شک ہو جائے تو اس شک کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔

۶۔ بھول کر پہلے ہی سلام پھیر لے۔

۷۔ بھول کر نماز کے دوران تھوڑی سی بات کر لے، کم اور زیادہ جاننے کا طریقہ عرف ہے، قلیوبی نے کہا ہے: (امام، فقیہ، علامہ شہاب الدین احمد بن احمد بن سلامہ قلیوبی مصری شافعی متوفی ۱۰۶۹ ہجری، علوم شرعیہ کے عالم اور محقق تھے، آپ حساب، میقات اور طب کے ماہر تھے، عقلی علوم پر بڑی مہارت تھی، آپ بارعب، متواضع اور طاعتوں کے پابند تھے، آپ کی بعض تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں: حاشیۃ علی شرح المنھاج للمحلی، معرفۃ القبلۃ بغیر آلۃ۔ یہ دونوں کتابیں مطبوع ہیں۔ آپ کے تعارف کے لیے رجوع کیا جائے ''خلاصۃ الأثر'' محبی ۱/ ۱۷۵، ''الأعلام'' زرکلی ۱/ ۹۲) نے کہا ہے کہ چھ کلمات سے زیادہ کو کثیر کہا جائے گا۔

۸۔ سفر کے دوران سنت نماز میں بھول کر قبلہ سے ہٹ جائے۔

۹۔ سفر کے دوران سواری کے اچھلنے کی وجہ سے چند لمحات کے لیے بھول کر قبلہ سے ہٹ جائے۔ اس سلسلہ میں قولِ معتمد یہ ہے کہ سجدہ سہو کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے یہ بات کہہ دی ہے کہ سجدہ سہو سلام سے پہلے کیا جاتا ہے، چاہے نماز میں زیادتی ہوئی ہو مثلاً ظہر کی نماز چار رکعت کے بدلے پانچ رکعت پڑھ لے، یا کمی ہوئی ہو مثلاً تشہد اول کو چھوڑ دے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے، جس کی وجہ سے اسے معلوم نہ ہو کہ تین رکعت پڑھی ہے یا چار؟ تو وہ اپنا شک پھینک دے اور یقین پر اعتبار کرے، اگر اس نے پانچ رکعت پڑھی ہو تو یہ رکعتیں اس کے لیے سفارش کریں گی''۔ (مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب السھو فی الصلاۃ والسجود لہ ۵۲۰)

جماعت کے احکام

جماعت کے لیے کم از کم امام اور ایک مقتدی کا رہنا ضروری ہے، امام کے پیچھے مصلیوں کی تعداد میں جتنا زیادہ اضافہ ہوگا جماعت کی فضیلت اتنی ہی زیادہ بڑھ جائے گی۔

جماعت کی نماز کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ'' (نساء ۱۰۲) پس ان میں سے ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو جائے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماعت کی نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ستائیس گنا زیادہ افضل ہے''۔ دوسری روایت میں ہے: ''پچیس گنا زیادہ''۔ (بخاری: کتاب الأذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ ۶۲۷، ۶۲۸، مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ ۱۰۷۳، ۱۰۶۷) ستائیس گنا جہری نماز میں ہے، کیوں کہ اس میں آمین کہنے اور امام کی تلاوت سننے کا اضافہ رہتا ہے۔ اور سری نماز میں پچیس گنا زیادہ ثواب ہے۔

علماء نے کہا ہے: پانچ فرض نمازوں میں جماعت فرض کفایہ ہے، اور جمعہ کی نماز میں فرض عین ہے۔ یہ بھی قول ہے: فرض نمازوں کی جماعت کے ساتھ ادائیگی ہر دن اور رات میں ہر بالغ عاقل آزاد مسلمان پر فرض عین ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی گاؤں یا دیہات میں تین لوگ ہوں اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے تو شیطان کا ان پر غلبہ ہو جاتا ہے''۔ (ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب فی التشدید فی ترک الجماعۃ ۴۶۵، صحیح ابن حبان: باب الإمامۃ والجماعۃ، فصل فی فضل الجماعۃ، ذکر استحواذ الشیطان علی الثلاثۃ إذا کانوا فی بدو أو قریۃ ۲۱۲۶) اس حدیث سے کئی احکام معلوم ہوتے ہیں:

۔ جہاں کہیں بھی مسلمان ہوں چاہے شہر میں ہوں یا دیہات میں تو وہاں جماعت

کے ساتھ نماز قائم کرنا ضروری ہے، تاکہ اسلام کے شعائر میں سے اس شعار کا اظہار ہو۔

۔ ہر مسلمان بالغ عاقل آزاد پر جماعت فرض کفایہ ہے

۔ قضا نماز میں یا نذر کی نماز میں جماعت نہیں ہے

۔ جماعت کی نماز کسی عذر کے بغیر چھوڑنا صحیح نہیں ہے

جماعت چھوڑنے کے اعذار (''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۱/۳۱۰، ''اللباب'' محاملی ۱/۱۴۸)

کسی عذر کے بغیر جماعت چھوڑنا جائز نہیں ہے، اور جماعت چھوڑنا جائز ہونے کے اعذار مندرجہ ذیل ہیں:

۔ موسلا دھار بارش یا برف باری جس کی وجہ سے کپڑے بھیگ جائیں، چاہے رات میں ہو یا دن میں۔

۔ راستے میں کیچڑ ہو جہاں چلنے کی وجہ سے پیر گندے ہوتے ہوں۔

۔ رات کے وقت سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو جس کی وجہ سے مسجد جا کر جماعت میں شامل ہونا مشکل ہو۔

۔ پیشاب، پاخانہ لگا ہوا ہو یا ہوا خارج ہو رہی ہو تو پہلے فارغ ہونا چاہیے تاکہ نماز کی ادائیگی میں دل حاضر رہے۔

۔ بھوک اور کھانے پینے کا شوق، اس کو دور کرنے کے لیے چند لقمے کھانا اور ایک گلاس پانی پینا کافی ہے۔

۔ اس مریض پر اندیشہ ہو جس کی تیمارداری میں وہ لگا ہوا ہو۔

۔ اپنا مال ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

۔ نیند کا غلبہ ہو جس کی وجہ سے نماز کا خشوع ختم ہو۔

۔ کسی بیمار کی تیمارداری میں ہو اور اس کی تیمارداری کے لیے کوئی دوسرا نہ ہو، یا سکرات کے عالم میں پہنچے ہوئے کی دیکھ ریکھ میں مشغول ہو۔

۔ کسی مریض کے ساتھ رہ رہا ہو جس کی موجودگی سے مریض کو انسیت حاصل ہوتی ہو

۔ بدبودار چیز مثلاً کچا پیاز، لہسن وغیرہ کھایا ہو، البتہ پکانے سے اس کی بو ختم ہو جاتی ہے

۔ سفر کے ساتھیوں کے چھوٹنے کا خوف ہو کہ اگر وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تو مثلاً ہوائی جہاز چھوٹ جائے۔

۔ اگر کوئی اپنے گھر میں جماعت کی نماز قائم کرے تو مسجد جا کر وہاں کی جماعت میں حاضر ہونے سے کافی نہیں ہے۔

جماعت کی نماز کی ادائیگی اسی وقت ہوگی جب امام کی اقتدا میں نماز پڑھے یعنی اپنی نیت میں کہے: میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں۔

۔ امام کے پیچھے ''اللہ اکبر'' کہنے سے جماعت کا ثواب مل جاتا ہے چاہے امام تشہد اخیر میں ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ تکبیر تحریمہ کہے اور امام سلام پھیر لے تو اس کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے، لیکن یہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو شروع سے امام کی اقتدا میں نماز ادا کر رہا ہو۔

ابوداود نے حسن سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو وضو کرے اور بہترین وضو کرے پھر چلا جائے تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ عزوجل اس کو نماز پڑھنے والوں یا اس میں حاضر رہنے والوں کے برابر ثواب دے گا اور ان کے اجر میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جائے گا''۔ (ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب فیمن خرج یرید الصلاۃ فسبق بھا ۴۸۲)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ثواب اس شخص کے لیے ہے جو عمداً جماعت کے وقت سے تاخیر کر کے مسجد میں نہ جائے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جو جماعت کے ساتھ تکبیر تحریمہ کے بقدر شریک رہے اس کو ثواب اُس شخص سے کم ہی ہوگا جو پوری ایک رکعت جماعت کے ساتھ شریک رہے۔

یہ روایت مروی ہے کہ ''جو جمعہ میں پہلی ساعت میں حاضر رہے تو گویا اس نے ایک اونٹ قربان کیا''۔ (بخاری: کتاب الجمعۃ، باب فضل الجمعۃ ۸۵۵، سنن ترمذی: کتاب الجمعۃ، باب ما جاء فی التبکیر إلی الجمعۃ ۴۹۸، یہ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے) اس میں شک نہیں ہے کہ جو پہلی ساعت میں حاضر رہے تو اس کا ثواب آخری ساعت میں جمعہ کی نماز کے لیے آنے والے سے زیادہ

رہے گا، جس کو جمعہ کی ایک رکعت ملے تو امام کے سلام کے بعد وہ دوسری رکعت مکمل کرے گا۔

امام حاکم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کو جمعہ کی نماز میں ایک رکعت ملے تو اس کو پوری نماز مل گئی''۔ (مستدرک حاکم: کتاب الجمعۃ ۱۰۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے: ''جس کو جمعہ کی ایک رکعت ملے تو وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت پڑھے''۔ ان دونوں روایتوں کو حاکم نے شیخین کی شرط کی مطابق صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (مستدرک حاکم: کتاب الجمعۃ ۱۰۲۹، موطا امام مالک: کتاب الجمعۃ، باب فیمن أدرک رکعۃ یوم الجمعۃ ۲۳۵، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامۃ الصلاۃ، باب ماجاء فیمن أدرک من الجمعۃ رکعۃ ۱۱۱۹)

رکوع کا ایک حصہ اور اس میں طمانینت ملنے سے ایک رکعت شمار ہوتی ہے جب امام کا رکوع صحیح ہو، جمعہ کی نماز کے علاوہ میں اگر امام بھول کر مثلاً ظہر کی نماز میں پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو جس کو اس پانچویں رکعت میں امام کا رکوع ملا ہے وہ اس کے لیے رکعت حساب نہیں ہوگی۔

حرام لباس اور پہنی جانی والی چیزیں

مرد اور مخنث کے لیے ریشم کا کپڑا پہننا یا اس کا بستر بنانا حرام ہے، اسی طرح وہ کپڑا بھی جس میں ریشم زیادہ ہو، صحیح بخاری میں ہے: ''ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم اور دیباج پہننے سے منع فرمایا''۔ (بخاری: کتاب اللباس، باب افتراش الحریر ۵۵۰۶، مسلم: کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم استعمال إناء الذھب والفضۃ علی الرجال والنساء ۳۹۴۱)

جہاد میں فوجی دیباج پہن سکتا ہے جب اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ ملے اور دوسرا کپڑا اس کا کام نہ کرتا ہو۔

سونا اور چاندی کا استعمال، اسی طرح سونے اور چاندی کا طلاء کیے ہوئے سامان کا استعمال مرد اور مخنث کے لیے حرام ہے۔ (البتہ اگر پینٹ کیے ہوئے سامان کو آگ پر جلایا جائے اور اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو تو حرام نہیں ہے) اگر فوجی کو اچانک جہاد کے لیے آواز دی جائے اور اس کے پاس سونے یا چاندی سے سیے ہوئے کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو تو پہننا جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''یہ دو (یعنی سونا اور چاندی) میری امت کے مردوں پر حرام ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے''۔ (ابن ماجہ: کتاب اللباس، باب لبس الحریر والذھب للنساء ۳۵۹۵، ابو داود: کتاب اللبس، باب فی الحریر للنساء ۳۵۵۳، ترمذی: الذبائح، أبواب اللباس، باب ماجاء فی الحریر والذھب ۱۶۸۷)

دانتوں کے علاج میں سونے یا چاندی کا استعمال جائز ہے۔

شریعت نے کھجلی یا الرجی کے بیمار کے لیے ریشم پہننا جائز کیا ہے جب دوسرے کپڑے وہ پہن نہ سکتا ہو، بخاری اور مسلم میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام کو ان کو کھجلی رہنے کی وجہ سے ریشم کا کپڑہ پہننے کی رخصت دی۔ (بخاری: کتاب الجھاد والسیر، باب الحریر فی الحرب ۲۷۸۳، مسلم: کتاب اللباس والزینۃ، باب إباحہ لبس

الحریر إذا کان بہ حکۃ أو نحوھا ۳۹۶۲)

اسی طرح اپنے چوپائے کی پیٹھ کسی نجس چمڑے سے ڈھانک سکتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ یہ کتے یا خنزیر کا چمڑا نہ ہو۔

کتاب الجنائز

اس باب میں نمازِ جنازہ اور میت سے متعلق احکام یعنی غسل، کفن، نماز اور دفن کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

ہر شخص کو کثرت سے موت کو یاد کرتے رہنا چاہیے، کیوں کہ اس سے گناہ سے بچاؤ ہوتا ہے اور اطاعتِ خداوندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بندہ اپنے مولی سے موت کے بعد ملنے کی تیاری کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''لذتوں کو توڑنے والی چیز کو کثرت سے یاد کرو''۔ (نسائی: کتاب الجنائز، باب کثرۃ ذکر الموت ۴/۴، ابن ماجہ: کتاب الزھد، باب ذکر الموت ۲/۱۴۲۲، مسند امام احمد: ۲/۲۹۳، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے: ''اللہ سے شرم کرو جتنا شرم کرنے کا حق ہے''۔ صحابہ نے کہا: اللہ کے نبی! ہم حیا کرتے ہیں اور اللہ کے لیے ہی تمام تعریفیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اس طرح نہیں، لیکن جو اللہ سے شرم کرے جتنا شرم کرنے کا حق ہے تو وہ سر اور اس میں محفوظ چیزوں کی حفاظت کرے، پیٹ اور اس سے متعلقات کی حفاظت کرے، موت اور بوسیدگی کو یاد کرے، جو آخرت کو چاہتا ہے تو وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے، جس نے ایسا کیا تو اس نے اللہ سے شرم کی جتنا شرم کرنے کا حق ہے''۔ (ترمذی: کتاب الزھد، باب ما یقتضیہ الاستحیاء من اللہ حق الحیاء ۲۴۵۸، مسند احمد: ۱/ ۳۸۷، حاکم: ۴/۳۲۳، یہ روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے)

موت کو یاد کرنا ہر ایک کے لیے مستحب ہے؛ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، صحت یاب ہو یا مریض، کیوں کہ موت ان سبھوں کے قریب ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت جانو: موت سے پہلے زندگی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، مشغولیت سے پہلے فراغت کو، بوڑھاپے سے پہلے جوانی کو

اور فقیری سے پہلے مالداری کو''۔ (مستدرک حاکم: ۳۰۶/۴، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہے)

موت کی تیاری کرنا ضروری ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرے اور دوسروں کے حقوق ادا کرے، کسی پر ظلم کیا ہو تو معافی تلافی کر لے، مریض کے لیے یہ حکم تاکیدی ہے، کیوں کہ مریض کے حق میں بیماری موت کے مقدمات میں سے ہے۔

اپنی بیماری پر صبر کرنا اور اس پر تکلیف کا اظہار نہ کرنا مسنون ہے، البتہ یہ مکروہ نہیں ہے، بیماری کی زیادہ شکایت کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ اس سے کبھی قضا وقدر پر راضی نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور گھر والوں کے لیے اس کے ساتھ نرمی کرنا اور اس کی تکلیفوں پر صبر کرنا مسنون ہے۔

مریض کے لیے مسنون ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو سدھارے، دنیوی امور میں جھگڑے سے باز رہے، اور اپنے تعلقات والوں کو راضی کرے مثلاً بیوی اور پڑوسی وغیرہ کو راضی رکھنے کی کوشش کرے، خود کو ذکر واذکار اور صالحین کے موت کے وقت کے حالات کا پابند بنائے یعنی موت کے وقت صالحین کے جو معمولات رہے ہیں ان کو وہ خود بھی اپنائے، اپنے گھر والوں کو اپنے جانے پر صبر کرنے اور نوحہ نہ کرنے وغیرہ کی وصیت کرے اور ان بدعات سے باز رہنے کی تلقین کرے جو عام طور جنازہ ہونے کی صورت میں انجام دی جاتی ہیں۔

دوسروں کو مریض کی عیادت کے لیے جانا مسنون ہے چاہے بیماری کے پہلے دن ہی چلا جائے اگر مریض مسلمان ہو، ہلکی ملاقات کر کے واپس آئے، اگر کوئی ذمی ہو اور اس کے ساتھ رشتے داری ہو یا وہ پڑوسی ہو یا اس کے مسلمان ہونے کی امید ہو تو صلہ رحمی، پڑوسی کے حق کی ادائیگی اور اس کو جہنم کی آگ سے بچانے کی خاطر عیادت کے لیے جانا مسنون ہے۔ (''مغنی المحتاج''، شربینی خطیب ۳۲۹/۱۔۳۳۰)

جانکنی کے عالم میں مطلوبہ آداب

جس کی موت کا وقت قریب آچکا ہو لیکن ابھی اس کا انتقال نہ ہوا ہو، بلکہ موت کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہوں اور وہ سکرات کے عالم میں ہو تو اس کے گھر والوں کو مندرجہ ذیل

امور کی ادائیگی مسنون ہے:

۱۔اس کو قبلہ رخ کر کے داہنے پہلو لٹایا جائے۔

۲۔اس کو کلمہ توحید ''لا إلہ إلا اللہ'' کی تلقین کی جائے، اس میں نرمی اختیار کی جائے، اصرار کے ساتھ تلقین نہ کی جائے، کوئی اس کے پہلو میں بیٹھ کر کلمہ توحید کو دہراتا رہے، اس کو کہنے کے لیے نہ کہے، بلکہ اس کو صرف سنائے تا کہ اس کو کلمہ توحید یاد آجائے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس کی آخری بات ''لا إلہ إلا اللہ'' ہو تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا''۔ (مسند امام احمد: ۲۲۰۳۴، سنن ابوداود: کتاب الجنائز، باب فی التلقین ۳۱۱۶، مسند بزار: ۲۶۲۵، وغیرہ نے یہ روایت معاذ بن جبل سے نقل کی ہے)

۳۔اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھا جائے کہ اللہ اس پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا اور اس کو معاف کرے گا، جو وعدہ اللہ نے موحدین کے ساتھ کیا ہے وہ بھی اسی وعدہ کا مستحق بن جائے گا، وہ کریم آقا اور رحیم وغفور رب کی طرف جانے والا ہے، بیمار اور مرض الموت میں مبتلا شخص کے پاس موجود شخص کے لیے سنت ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالی کے ساتھ بہترین گمان رکھنے اور اس کی رحمت کی امید رکھنے کو یاد کراتا رہے۔

انتقال ہونے کی صورت میں مطلوبہ آداب

جب کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کے محارم میں سب سے زیادہ قریبی شخص کو مندرجہ ذیل امور کی ادائیگی مسنون ہے:

۱۔اس کی آنکھیں بند کی جائے تا کہ اس کی آنکھیں کھلی رہنے اور ان کے لٹکے رہنے کی وجہ سے قبیح منظر پیدا نہ ہو، اور ان کو بند کرتے وقت ''بِسۡمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوۡلِ اللّٰهِ ﷺ'' کہنا چاہیے۔

۲۔چہرے کی ہڈیوں کو چوڑے کپڑے سے باندھ دیا جائے جس میں اس کے دونوں جبڑے چھپ جائیں اور اس کو سر کے اوپر اس طرح باندھا جائے کہ منہ بند ہو جائے۔

۳۔اس کو کسی چارپائی پر لٹایا جائے تا کہ اس کا جسم زمین کی تری سے بھیگ کر تبدیل

نہ ہو جائے۔

۴۔اس کا رخ قبلہ کی طرف اس طرح کیا جائے کہ اس کو ٹڈی کے بل لٹایا جائے اور اس کا چہرہ اور تلووں کا رخ قبلہ کی طرف کیا جائے۔

۵۔جوڑوں کو نرم کیا جائے تا کہ جسم میں حرارت باقی رہے، پھر اس کے اعضاء کو اس طرح پھیلایا جائے کہ غسل کے لیے اس کا بدن تیار ہو جائے۔

۶۔کپڑے اتارے جائیں اور اس کی جگہ ہلکے کپڑوں سے ستر کیا جائے، تا کہ اس کا جسم جلدی بگڑ نہ جائے، اس سے معرکہ میں شہید ہونے والا مسلمان مستثنیٰ ہے۔

۷۔پیٹ پر کوئی بھاری چیز رکھی جائے تا کہ پیٹ پھول نہ جائے، آج کے زمانے میں اس کے بجائے برف میں رکھنا کافی ہے جس کی وجہ سے میت میں تبدیلی اور پھولنے سے حفاظت ہوتی ہے۔

۸۔اس کے حق میں دعا کی جائے اور اس کے ارد گرد موجود لوگ اس کے بارے میں خیر ہی کہے، میت کے گھر والوں اور دوست احباب کو اس کے چہرے کو بوسہ دینا جائز ہے، کیوں کہ اس سلسلہ میں احادیث مروی ہیں۔

۹۔پہلی فرصت میں اس کا قرض ادا کیا جائے اور ممکن ہو تو فوراً اس کی وصیت نافذ کی جائے۔

مسلمان میت کے حق میں پانچ چیزوں کی انجام دہی واجب ہے اور یہ اجماع کی وجہ سے فرض کفایہ ہے:

۔غسل دینا چاہے غرق ہونے والے کی لاش ہو۔

۔سر سے پاؤں تک اس کو کفن دینا۔

۔نماز جنازہ پڑھنا۔

۔تدفین اور اس کی قبر کو مٹی سے بھر دینا۔

البتہ اسلامی ملک میں رہنے والے ذمی اور مسلمانوں کی امان میں رہنے والا کافر اور جس کے ساتھ معاہدہ ہو؛ ان سبھوں کو کفن دینے اور دفن کرنے کی ذمے داری مسلمانوں کی

ہے، مسلمانوں پر ان کی تکفین اور تدفین ضروری ہے۔

البتہ مرتد، حربی اور زندیق کو کفن اور دفن کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ اس پر مٹی ڈالی جائے گی تا کہ اس کی بدبو سے مسلمانوں کو تکلیف نہ ہو۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے مجاہد کو اسی کے کپڑوں میں دفنایا جائے گا، اس کو نہ کفن دیا جائے گا اور نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، اس کو شہید اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنتی ہونے کی گواہی دی ہے۔(''اُنیس الفقھاء'' میں ہے: شہید فعیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے، اس کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نص کی وجہ سے اس کے جنتی ہونے کی گواہی دی گئی ہے، یا اس وجہ سے کہ فرشتے اس کی موت کے وقت اس کے اکرام کے لیے حاضر رہتے ہیں، یا یہ فاعل کے معنی میں ہے کیوں کہ وہ اللہ تعالی کے پاس زندہ اور حاضر رہتا ہے)

آخرت کا شہید مثلاً جو پیٹ درد کی وجہ سے انتقال کر جائے یا وضع حمل کے وقت کوئی عورت وفات پا جائے، جو اسہال کی بیماری میں انتقال کرے، جو اپنے شہر کے علاوہ کسی دوسرے علاقہ میں مر جائے، جو دوسرے کے ظلم کی وجہ سے انتقال کر جائے، جو علم کے حصول کے دوران وفات پائے تو اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور اس کی تکفین وتدفین بھی کی جائے گی۔

حمل ساقط ہو جائے اور اس میں کوئی جان نہ ہو تو اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی۔(''التھذیب'' بغوی ۲/۴۲۳) اگر اس کی عمر چار ماہ ہو تو اس میں روح پھونک دی جاتی ہے، اس صورت میں اس کو غسل دیا جائے گا، کفن دیا جائے گا اور تدفین بھی کی جائے گی، اگر کسی بچہ میں زندگی کی علامتیں ظاہر ہو جائیں مثلاً وہ روئے یا اس کی سانس چلے تو اس کا حکم عام آدمی کی طرح ہی ہے یعنی اس کو غسل دیا جائے گا، کفن دیا جائے گا، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کو دفن بھی کیا جائے گا۔

جس کے بکھرنے کا اندیشہ ہو تو اس کو غسل نہیں دیا جائے گا، بلکہ تیمّم کر کے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس میت کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی جس کو غسل دینا اور تیمّم کرنا بھی دشوار ہو، کیوں کہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے غسل کرنا شرط ہے۔

حج یا عمرہ کی نیت کرنے والا اگر انتقال کر جائے تو اس کو غسل دیا جائے گا، کفن دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، البتہ خوشبو والی کوئی بھی چیز مثلاً کافور یا حنوط وغیرہ اس کے قریب نہیں کیا جائے گا، اس کے بال اور ناخن نکالے نہیں جائیں گے، اگر عورت ہے تو اس کا چہرہ نہیں ڈھانکا جائے گا، اگر مرد ہے تو اس کا سر نہیں ڈھانکا جائے گا۔

کفن میں سنت یہ ہے کہ تین چادریں استعمال کی جائیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ نبی ﷺ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا جن میں قمیص اور عمامہ شامل نہیں ہے۔ (بخاری: کتاب الجنائز، باب الکفن بغیر قمیص ١٢٢٥، مسلم: کتاب الجنائز، باب فی کفن المیت ١٦١٤) پانچ کپڑوں تک کا اضافہ کرنا جائز ہے، یہ مکروہ بھی نہیں ہے، عورت کو لہنگا، اوڑھنی، ایک کپڑے اور دو چادروں میں کفن دیا جائے گا تاکہ اوڑھنی سے اس کا سر ڈھانکا جائے، یہ نبی کریم ﷺ کی دختر ام کلثوم کا کفن ہے، مرد اور عورت کے لیے پانچ سے زیادہ کپڑوں کا استعمال مکروہ ہے۔

اگر میت قرض دار ہو تو قرض خواہوں کی رضامندی کے بغیر ایک سے زائد چادر میں کفن دینا جائز نہیں ہے، چادر سے مراد وہ کپڑا ہے جو میت کے جسم کو سر سے لے کر پاؤں تک ڈھانک دے۔

نماز جنازہ کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں:

١۔ نیت، نیت اس طرح کرے: میں اس میت پر اللہ تعالی کی خاطر نماز جنازہ کی نیت کرتا ہوں، نیت کا تکبیرہ تحریمہ کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

٢۔ کھڑے رہنے کی طاقت رکھنے والے کے لیے کھڑا رہنا۔

٣۔ چار تکبیریں کہنا۔

٤۔ پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا۔

٥۔ دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھنا۔

٦۔ تیسری تکبیر کے بعد میت کے لیے دعا کرنا۔

٧۔ چوتھی تکبیر کے بعد پہلا سلام پھیرنا۔

نماز جنازہ کی سنتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۔ سورہ فاتحہ سے پہلے أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا

۔ ہر تکبیر کے ساتھ رفعِ یدین کرنا

۔ ہر تکبیر کے بعد سینے پر ہاتھ رکھنا

۔ چوتھی تکبیر کے بعد متوفی، دوسرے متوفین اور مسلمانوں کے لیے دعا کرنا

۔ نماز کے اختتام پر دوسرا سلام پھیرنا

میت کی قبر پر علامت رکھنا سنت ہے تاکہ اس کے رشتے داروں کو قبرستان جانے کی صورت میں اس کی تدفین کی جگہ معلوم ہو اور دوسرے کی تدفین کے وقت اس جگہ کو چھوڑ دیا جائے، ابو داود نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کے قریب ایک پتھر رکھا اور فرمایا: ”میں اس کے ذریعہ اپنے بھائی کی قبر پہچانوں گا اور اس کے قریب اپنے گھر والوں میں سے انتقال کرنے والے کو دفن کروں گا“۔
(ابوداود: کتاب الجنائز، باب فی جمع الموتی فی قبرہ والقبر یعلم ٣٢٠٦)

قبر پر عمارت تعمیر کرنا، اس کو مزین کرنا اور اس پر تحریر کرنا مکروہ ہے، البتہ عالم اور صالح کی قبر پر اس کا نام لکھنا جائز ہے۔

کتاب الزکاۃ

زکوۃ کے لغوی معنی پاک کرنے، بڑھنے اور خیر و برکت میں کئی گنا اضافہ ہونے کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں زکوۃ کے معنی مال کی متعین مقدار ہے جس کو متعین مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے، اور مال کی اس مقدار کی تعیین مسلمان کی مال و جان (جانور) کی ملکیت کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔

قرآنی نصوص سے مسلمان پر زکوۃ فرض ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''وءاتوا الزکوۃ'' (بقرہ۴۳) زکوۃ ادا کرو۔

یہ حکم قرآن مجید میں تقریباً پچاس مرتبہ آیا ہے، قرآن کی آیت کریمہ میں نماز کے حکم کے ساتھ زکوۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے: ''وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَءَاتُوا الزَّكٰوةَ'' (۴۳ بقرہ) نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔

اس آیت کریمہ میں نماز کو قائم کرنے کے حکم اور زکوۃ کی ادائیگی کے حکم کو ملا کر بیان کیا گیا ہے۔

احادیث نبویہ میں اس مجمل الٰہی حکم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے واضح کیا ہے کہ ہم کیسے نماز پڑھیں، اسی طرح آپ ﷺ نے پوری وضاحت کے ساتھ ہر اس مال کی زکوۃ کی مقدار بیان کی ہے جس پر زکوۃ فرض ہے۔

زکوۃ نکالنے کا حکم صحیح احادیث میں بھی آیا ہے، جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے......''۔ ان میں آپ ﷺ نے زکوۃ کی ادائیگی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

(بخاری: کتاب الإیمان، باب قول النبی ﷺ بنی الإسلام علی خمس ۸، مسلم: کتاب الإیمان، باب قول النبی ﷺ ''بنی الإسلام علی خمس'' ۴۶) اس حدیث میں بیان کردہ اسلام کی بنیادوں میں زکوۃ تیسرا رکن ہے۔

زکوۃ فرض ہونے اور اس کی فرضیت کا انکار کرنے والے کے کافر ہونے پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

اسلام میں مالی حقوق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ حقوق العباد جن کے مالک معلوم ہیں، اس صورت میں یہ فرد کا حق ہے۔

۲۔ کسی ایک شخص کی تعیین کے بغیر عامۃ المسلمین سے متعلق اللہ تعالی کا حق۔

اس کی پانچ قسمیں ہیں: زکوۃ، مالِ فئ، مالِ غنیمت، کفارہ اور فدیہ، ان سبھی قسموں کی تفصیل الگ الگ باب کے تحت بیان کی جائے گی، اس باب میں صرف زکوۃ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

زکوۃ واجب ہونے کی شرطیں

جب مکلّف اور اس کے مال میں مندرجہ ذیل امور پائے جائیں تو زکوۃ واجب ہوتی ہے:

۱۔ آزادی، اس لیے غلام پر زکوۃ نہیں ہے۔

۲۔ اسلام، اسی لیے کافر پر زکوۃ نہیں ہے، اگر اس کے والدین اسلام لے آئیں اور وہ فقیر ہوں تو اس پر ان کا فطرہ واجب ہو جاتا ہے۔

۳۔ صاحبِ مال حقیقی شخص ہو؛ اس لیے بیت المال کے اموال پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح ائمہ مساجد پر خرچ کرنے کے لیے کیے ہوئے اوقاف پر بھی زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ مسجد کا امام بدلتا رہتا ہے۔

۴۔ سال گزر جائے یعنی مال کی ملکیت پر پورا ایک قمری سال گزر جائے، یہ شرط نقدی، مالِ تجارت، اونٹ، گائے، بکری اور مینڈھے پر نافذ ہوتی ہے، البتہ کھجور، انگور اور غلہ میں یہ شرط نہیں ہے، بلکہ جب نصاب مکمل ہو جائے تو ان چیزوں کی زکوۃ کٹائی اور صفائی کے فوراً بعد واجب ہے، اسی طرح خزانوں کی زکوۃ بھی ہے، اس بچہ کی طرف سے فطرہ نکالنا واجب ہے جو رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے پیدا ہوا ہو اور اس دن کا سورج غروب ہونے تک زندہ رہا ہو، اسی طرح گائے، اونٹ اور بکری کے بچوں کی

بھی زکوۃ نکالنا واجب ہے، یعنی نصاب میں ان کو بھی شامل کیا جائے گا۔

سامانِ تجارت کی اس میں ہونے والے فائدوں کو شامل کرتے ہوئے سونے یا چاندی سے قیمت نکالنا یا تجارت کیے جانے والے ملک کی کرنسی میں اس کی قیمت نکالنا ضروری ہے، پھر ان کی زکوۃ نکالی جائے گی، اگر سامانِ تجارت کی قیمت بیس مثقال سونے کے بقدر ہو جائے اور اس کا فائدہ آخری سال میں دس مثقال ہو تو تیس مثقال سونے کے مطابق زکوۃ نکالی جائے گی، اگر سامانِ تجارت بیچا جائے اور اس کی قیمت نقدی کی شکل میں ہو تو راس المال کی زکوۃ نکالی جائے گی، البتہ فائدہ کی زکوۃ ایک سال گزرنے کے بعد نکالی جائے گی۔

اگر مالِ تجارت سامان کی شکل میں ہو اور اس کی قیمت بڑھ جائے تو زکوۃ اس کے فائدوں کے ساتھ نکالی جائے گی، اگر ایک سال گزرنے سے پہلے پورے سامانِ تجارت کو بیچ دیا جائے تو سال کے اخیر میں راس المال کی زکوۃ نکالی جائے گی اور فائدوں کی زکوۃ اس پر ایک سال گزرنے کے بعد نکالی جائے گی۔

۵۔ نصاب؛ یعنی وہ کم سے کم مقدار جس پر زکوۃ فرض ہوتی ہے مثلاً سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے۔

۶۔ زکوۃ نکالنے کی طاقت ہو، یہ زکوۃ کے مال کی ضمانت اور گیارنٹی کے لیے شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوۃ کا مال موجود ہو، اور زکوۃ کے مستحقین موجود ہو اور زکوۃ نکالنے کے لیے موقع بھی ہو، اگر یہ سب امور پائے جائیں اور زکوۃ نہ نکالی جائے پھر اس کے بعد مال ضائع ہو جائے تو زکوۃ ساقط نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے ذمہ میں رہتی ہے، اگر طاقت اور تمکن کی شرط نہ پائی جائے مثلاً آگ زکوۃ واجب ہونے کے آخری دن تمام مال کو جلا دے تو اس صورت میں زکوۃ ساقط ہو جاتی ہے اور اصلاً زکوۃ فرض ہی نہیں ہوتی ہے۔

وہ چیزیں جن پر زکوۃ واجب ہے:

مندرجہ ذیل پانچ چیزوں پر زکوۃ واجب ہے:

۱۔ نقدی
۲۔ سامانِ تجارت
۳۔ جانوروں میں سے اونٹ، گائے اور بکریاں
۴۔ نباتات یعنی پھل اور کھیتی
۵۔ انسانوں کی زکوۃ یعنی زکوۃ فطر

(۱) نقدی یعنی سونے چاندی کی زکوۃ

اس باب میں نقدی یعنی سونے، چاندی اور کرنسی جو سونے اور چاندی کا متبادل ہے کی زکوۃ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں:

سونا بیس مثقال ہوتو ہی زکوۃ واجب ہوتی ہے، یہ ۸۰ گرام کے برابر ہے، جب سونا اس نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی قیمت میں سے ڈھائی فیصد زکوۃ نکالنا واجب ہوجاتا ہے۔

چاندی پر اسی وقت زکوۃ ہے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے یعنی اس کی مقدار دوسو درہم ہوجائے یعنی ۵۶۰ گرام، اس صورت میں اس کی زکوۃ ڈھائی فیصد نکالی جائے گی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیس دینار سے کم میں کچھ نہیں ہے اور بیس دینار میں نصف دینار ہے''۔ ابوداود نے یہ حدیث صحیح سند سے روایت کی ہے۔
(ابوداود: کتاب الزکوۃ، باب فی زکوۃ السائمۃ ۱۳۵۵)

یہ بھی فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں زکوۃ نہیں ہے''۔
(بخاری: کتاب الزکوۃ، باب لیس فیما دون خمس ذود صدقۃ ۱۴۰۱، مسلم: کتاب الزکوۃ ۱۶۸۲) یہ بھی حدیث مروی ہے: ''چاندی میں چالیسواں حصہ ہے''۔ بخاری نے یہ روایت کی ہے۔ (بخاری: کتاب الزکوۃ، باب زکوۃ الغنم ۱۳۹۷)

پانچ اوقیہ دوسو درہم کے برابر ہے، دینار، مثقال، مشخص اور مُجر؛ یہ چاروں ایک ہی وزن ہیں اور یہ چار گرام ہوتے ہیں، اور بیس مثقال کے اسّی گرام ہوتے ہیں، بیس مثقال یعنی ۸۰ گرام میں چالیسواں حصہ یعنی نصف دینار واجب ہے، اوقیہ چالیس درہم وزن کے برابر رہتا ہے۔

شریعت نے عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کی اجازت دی ہے، اس لیے عورت کے زیور پر زکوۃ نہیں ہے، البتہ اگر اسراف کی حد تک پہنچ جائے مثلاً آٹھ سو گرام کا

پازیب بنایا جائے تو اس میں زکوۃ ہے، یا ان زیورات کا مقصد تجارت ہو یا ان کا استعمال حرام میں ہوتا ہوتو بھی زکوۃ ہے، کیوں کہ یہ وزن معروف زیورات سے نکل جاتا ہے، اگر زیورات میں اسراف نہ ہوتو اس میں زکوۃ نہیں ہے چاہے سونے سے بنائے ہوئے زیورات کے ٹکڑے کتنے بھی ہوں۔

اگر مرد سونے اور چاندی سے زینت اختیار کرے جو حرام ہے تو اس میں زکوۃ ہے چاہے اس کا وزن جتنا بھی ہو، مرد کے لیے صرف چاندی کی ایک انگوٹھی پہننا جائز ہے۔

ان کے علاوہ مکروہ زینت بھی ہے جس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، یہ سونے اور چاندی کے دستے ہیں جو برتنوں پر لگائے جاتے ہیں۔

اگر زیورات میں سے کوئی زیور ٹوٹ جائے اور اس کی مرمت کی نیت ہوتو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اگر اس کی مرمت ممکن نہ ہو اور اس کو دوبارہ بنانے کی ضرورت ہوتو اس پر زکوۃ واجب ہوجاتی ہے۔

مالِ تجارت کی زکوۃ

اس باب میں مالِ تجارت کی زکوۃ کے مخصوص مسائل بیان کیے گئے ہیں۔(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' نووی ۲/۱۶۴، ''التھذیب'' بغوی ۳/۱۰۱)

تجارت کے معنی فائدہ کی نیت سے خرید وفروخت کرنے کے ہیں، امام حاکم نے دو صحیح سندوں سے ایک صحیح حدیث روایت کی ہے جس کو مالِ تجارت میں زکوۃ واجب ہونے کی اصل دلیل مانی جاتی ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اونٹ میں زکوۃ ہے، گائے میں زکوۃ ہے، بکری میں زکوۃ ہے، اور کپڑے میں زکوۃ ہے''۔(مستدرک حاکم: کتاب الزکوۃ ۱۳۶۸۔۱۳۶۹) حدیث میں زکوۃ کے لیے لفظ ''صدقۃ'' کا استعمال کیا گیا ہے، ''بز'' سے مراد تمام قسم کے کپڑے ہیں اور جو کپڑوں کی تجارت کرتا ہے اس کو عربی میں ''بزّاز'' کہا جاتا ہے، یہ بات معلوم ہی ہے کہ کپڑوں پر زکوۃ نہیں ہے، صرف اسی صورت میں زکوۃ ہے جب وہ سامانِ تجارت ہو یعنی کپڑوں کو اپنے پاس رکھنے کا مقصد خرید وفروخت کرنا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ہو تو اس صورت میں زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، مالِ تجارت کی زکوۃ اس کی قیمت میں ڈھائی فیصد ہے۔

اگر مالِ تجارت کو نقد دے کر یا سونے یا چاندی سے خریدا جائے یا کرنسی کے بدلے خریدا جائے تو سال کے اخیر میں اسی کرنسی میں قیمت لگانا ضروری ہے جس میں مال کی خریدی ہوئی ہے اور اسی کرنسی میں زکوۃ بھی نکالی جائے گی، اس کا نصاب بیس مثقال سونا ہے، اس صورت میں یہ شرط نہیں ہے کہ نصاب کے بقدر مال سے ہی مالِ تجارت خریدا جائے، کیوں کہ زکوۃ واجب ہونے میں اعتبار مکمل ایک ہجری سال گزرنے کے بعد مالِ تجارت کی قیمت لگانا ہے، اگر محرم کے شروع میں کوئی تاجر ایک ہزار سے مال خریدے تو

سال کے اخیر میں درہم میں ہی اس کی قیمت لگائے گا اور ایک سال گزرنے کے بعد اگر وہ مال نصاب کو پہنچا ہو جو بیس مثقال سونا ہے تو اس کی زکوۃ نکالے گا، اگر اس کی قیمت حدِ نصاب یعنی بیس مثقال سونے تک سال کے اخیر میں نہ پہنچی ہو تو اس پر زکوۃ نہیں ہے۔

اگر نقدی کے علاوہ دوسرے سامان سے تجارت کی ابتدا ہوئی ہو، مثلاً کوئی عورت پانچ بکری مہر پر شادی کرے اور ان بکریوں کی تجارت شروع کرے اور اس کے بدلہ دس بوری چاول خریدے، وہ مثال کے طور پر رمضان میں مہر ملتے ہی تجارت شروع کرے تو دوسرے رمضان میں وہ اپنی تجارتی سامان کی قیمت اپنے ملک کی کرنسی سے کرے گی، اگر اس کی قیمت زکوۃ کے نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوۃ نکالنا واجب ہے، اگر وہ تجارت اپنے ملک میں جاری کرنسی کے علاوہ دوسری کرنسی میں کرے مثلاً وہ دبئی میں ہندوستانی روپیوں سے تجارت شروع کرے تو وہ سال کے اخیر میں روپیوں سے ہی مالِ تجارت کی قیمت لگائے گی اور اس کی زکوۃ ادا کرے گی۔

اگر کوئی ایسی چیز سے زکوۃ شروع کرے جس میں زکوۃ ہو مثلاً چالیس بکریوں سے تجارت شروع کرے تو قولِ معتمد کے مطابق اسی چیز کی زکوۃ نکالے گا، تجارت کی زکوۃ نہیں نکالے گا، کیوں کہ عین چیز کی زکوۃ پر اتفاق ہے اور تجارت کی زکوۃ مختلف فیہ ہے، امام نووی نے ''المنھاج'' میں کہا ہے: اگر سامانِ تجارت چوپائے ہوں اور دو میں سے صرف ایک زکوۃ کا نصاب مکمل ہوجائے تو زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، یا دونوں نصاب کو پہنچ جائے تو قولِ جدید کے مطابق عین چیز پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔(''منھاج الطالبین'' ۱/۴۰۰، شرح شربینی)

سامانِ تجارت چاہے خرید وفروخت کے لیے مخصوص کردہ زمین ہو یا لکڑیاں یا فرنیچر وغیرہ تو اس کی زکوۃ کا حساب سال کے اخیر میں زکوۃ واجب ہونے کے وقت پر اس کی قیمت میں سے ڈھائی فیصد نکالنے کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

جانوروں کی زکوۃ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۱۵۶، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۲۵۹)

اس باب میں اونٹ، گائے اور بکریوں کی زکوۃ کی تفصیلات بیان کی گئی ہے، ان جانوروں پر زکوۃ شرعی نصوص اور اجماع کی وجہ سے فرض ہے۔

اونٹ کی زکوۃ کا نصاب

اونٹ پر زکوۃ واجب ہونے کے لیے اس کے مالک کا آزاد ہونا، مسلمان ہونا اور اونٹ کا مباح چارہ یعنی اس چارہ سے کھانا ضروری ہے جس کو خریدنا نہ پڑتا ہو، اور پانچ سے کم اونٹ پر زکوۃ نہیں ہے۔ (کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''پانچ سے کم اونٹ میں زکوۃ نہیں ہے'' بخاری: کتاب الزکاۃ، باب زکوۃ الورق ۱۴۴۷، مسلم: کتاب الزکاۃ ۹۷۹، یہ روایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے)

جب پانچ اونٹ ہوں تو اس کی زکوۃ ایک بکری ہے؛ بکری ہو تو دو سال مکمل ہو چکے ہوں یا مینڈھا ہو تو ایک سال۔

دس اونٹوں میں دو بکریاں۔

پندرہ اونٹوں میں تین بکریاں۔

بیس اونٹوں میں چار بکریاں۔

پچیس اونٹوں میں ایک ''بنت مخاض''، یعنی وہ اونٹنی جس کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو، اگر ''بنت مخاض'' نہ ملے تو اس کے بدلہ ''ابن لبون'' اونٹ زکوۃ میں نکالے گا، ''ابن لبون'' سے مراد وہ اونٹ ہے جس کے دو سال مکمل ہو چکے ہوں، چاہے اس کی قیمت ایک سالہ اونٹنی سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

اگر اونٹ والے کے سبھی اونٹ کمزور ہوں تو اس کو سب سے بہتر اونٹ زکوۃ میں نکالنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر مالک کے پاس ''بنت مخاض'' ہو تو زکوۃ میں اسی کو نکالنا

واجب ہے، وہ دو سالہ یا تین سالہ اونٹ نہیں نکالے گا (یعنی اس کا مکلّف نہیں بنایا جائے گا، اگر وہ ''بنت لبون'' کی جگہ ''بنت مخاض'' کو نکالے تو اس نے اعلی قسم کو نکالا ہے اس لیے اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا)، چاہے یہ اونٹ اس کے اونٹوں میں سب سے بہتر ہی کیوں نہ ہو، اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ یہ اونٹ زکوۃ میں نکالے یا زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ''بنت مخاض'' کو خرید لے۔

۳۶ اونٹ پر ایک بنت لبون یعنی جس کی عمر دو سال مکمل ہو چکی ہو۔

۴۶ اونٹ پر ایک ''حقہ''، یعنی جس کی عمر تین سال مکمل ہو چکی ہو۔

۶۱ اونٹ پر ایک ''جذعہ''، یعنی جس کی عمر چار سال مکمل ہو چکی ہو۔

۹۱ پر دو ''حقہ''۔

۱۲۱ پر تین ''بنت لبون''۔

ایک سو تیس اور اس سے زائد پر دو ''بنت لبون'' اور ایک ''حقہ''، پھر ہر چالیس پر ایک ''بنت لبون'' اور ہر پچاس پر ایک ''حقہ''۔

ایک سو پچاس پر تین ''حقہ'' زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

ایک سو ساٹھ پر چار ''بنت لبون'' زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

اسی طرح ہر چالیس پر ایک ''بنت لبون'' اور ہر پچاس پر ایک ''حقہ''۔

گائے کی زکوۃ

گائیں اگر تیس سے کم ہوں تو زکوۃ نہیں ہے۔

تیس پر ایک تبیع ہے، تبیع سے مراد وہ بچھڑا ہے جس کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو، اس کو تبیع کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چراگاہ میں اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

ہر چالیس پر ایک ''مسنۃ'' ہے یعنی وہ گائے جس کے دو سال مکمل ہو چکے ہوں اور تیسرا سال شروع ہو چکا ہو، اس کو ''مسنۃ'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پورے دانت نکل چکے ہوتے ہیں۔

ساٹھ میں دو ''تبیع'' ہے، اگر اس سے زیادہ گائیں ہوں تو ہر تیس پر ایک ''تبیع'' ہے اور ہر چالیس پر ایک ''مسنۃ'' ہے۔

صحیح احادیث میں گائے پر زکوۃ واجب ہونے کے نصوص ملتے ہیں اور گائے پر زکوۃ واجب ہونے پر اجماع بھی ہے۔ (اس میں سب سے زیادہ مشہور حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس بارے میں اس وقت بتایا جب آپ نے ان کو یمن روانہ کیا۔ ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب فی زکاۃ السائمۃ ۱۵۷۶، ترمذی: کتاب الزکاۃ، باب ماجاء فی زکاۃ البقر ۶۱۹)

بکریوں کی زکوۃ

شریعت میں بکریوں پر زکوۃ ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع بھی ہے۔ (اس کی دلیل حضرت معاذ کی سابقہ روایت ہے)

بکریوں میں زکوۃ کی شروعات چالیس عدد ہونے پر ہوتی ہے اور اس کی زکوۃ ایک بکری ہے، اگر چالیس سے کم ہو تو زکوۃ نہیں ہے۔

ایک سو اکیس پر دو بکریاں۔

دو سو ایک پر تین بکریاں۔

چار سو پر چار بکریاں۔

اس کے بعد ہر سو پر ایک بکری۔

بکری میں مینڈھا اور دنبہ بھی شامل ہیں، مادہ بکریوں کی زکوۃ بھی واجب ہے، صرف نر بکروں کی زکوۃ نکالنا کافی نہیں ہے، البتہ اگر ریوڑ میں سبھی بکرے ہو تو صرف بکروں کی زکوۃ نکالی جائے گی، اگر زکوۃ میں بکری نکالی جائے تو اس کے دو سال مکمل ہونا ضروری ہے، اگر مینڈھا نکالے تو ایک سال کا ہونا کافی ہے۔

زکوۃ میں صحیح بکری نکالنا ضروری ہے، مریض نکالے تو کافی نہیں ہے اور نہ وہ بکری جس میں عیب ہو، اور نہ وہ جو ریوڑ کے ساتھ چلنے سے عاجز ہو۔

اللہ کی طرف سے ہمیں عطا کردہ مال میں زکوۃ نکالنا اللہ تعالی کا حق ہے، اسی وجہ سے اس مال میں سے بہتر چیز کو زکوۃ میں دینا ضروری ہے۔

زکوۃ میں مادہ کو نکالنا ضروری ہے، البتہ اگر پانچ اونٹوں کی زکوۃ ایک بکری نکالی جارہی ہو تو ضروری نہیں ہے، اسی طرح تیس گایوں کی زکوۃ ''تبیع'' کی صورت میں نکالی جارہی ہو تو بھی مادہ ہونا ضروری نہیں ہے، یا بنت مخاض نہ ملنے کی صورت میں ابن لبون نکالا جائے تو مادہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی أعلم۔

نباتات یعنی غلہ اور پھلوں کی زکوۃ

نباتات میں صرف تین چیزوں پر زکوۃ ہے: انگور، کھجور اور وہ حبوب ودانے جن کو پکا کر کھایا جاتا ہے مثلاً گیہوں، جو، چاول، دال، چنا اور مٹر وغیرہ۔

نباتات میں زکوۃ واجب ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَءَ اتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ'' (أنعام ۱۴۱) اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو۔

اس بارے میں صحیح احادیث بھی ہیں، عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور کے سلسلہ میں کہا: ''اس کا اسی طرح اندازہ لگایا جائے گا جس طرح کھجور کے درختوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے پھر اس کی زکوۃ کشمش کی شکل میں دی جائے گی جس طرح کھجور کی زکوۃ سوکھے کھجور سے ادا کی جاتی ہے''۔ (ابوداود: کتاب الزکوۃ، باب فی خرص العنب ۱۶۰۳، ترمذی: کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی الخرص ۶۴۴، ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے، مستدرک حاکم: ۳/ ۵۹۵)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش، نہروں اور چشموں سے سیراب ہونے والے یا خود سے سیراب ہونے والے نباتات میں عشر (دسواں حصہ) مقرر کیا، اور جس کو پانی کھینچ کر سیراب کیا جائے تو اس میں نصف العشر (بیسواں حصہ) مقرر کیا''۔ (ابوداود: کتاب الزکوۃ، باب صدقۃ الزرع ۱۵۹۶، ترمذی: کتاب الزکاۃ، باب ماجاء فی صدقۃ فیما یسقی بالأنھار ۶۴۰۔ اس معنی میں اصل حدیث بخاری میں ہے: ۱۴۸۳)

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو نہروں اور بارش سے سیراب ہو اس میں دسواں حصہ ہے اور جس کو کنویں سے سیراب کیا جائے اس میں بیسواں حصہ ہے''۔ (مسلم: ۹۸۱، ابوداود: ۱۵۹۷، ترمذی: ۶۳۹، نسائی ۵/ ۴۱ وغیرہ نے یہ روایت کی ہے)

غلہ اور پھلوں میں زکوۃ واجب ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

امام شافعی کا قولِ قدیم یہ ہے کہ زعفران، زیتون، ورس (ایک قسم کا پھول جس سے کپڑے

رنگے جاتے ہیں) اور شہد پر بھی زکوۃ ہے اور اس کے دلائل کو امام رملی نے بیان کیا ہے، لیکن قولِ قدیم اور شوافع کے نزدیک قولِ معتمد یہ ہے کہ ان چیزوں پر زکوۃ نہیں ہے، اسی طرح دیگر پھلوں مثلاً سیب، انجیر، ناشپاتی، انار اور آڑو وغیرہ پر زکوۃ نہیں ہے، اسی طرح سبزیوں، پیاز، پودینہ وغیرہ پر بھی زکوۃ نہیں ہے۔

البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک سبزیوں پر زکوۃ ہے، آپ اس کی دلیل میں یہ آیت کریمہ پیش کرتے ہیں: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ'' (بقرہ ۲۶۷) اے ایمان والو! اپنی کمائی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے جن کو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے۔

غلہ اور پھلوں میں زکوۃ واجب ہونے کے لیے کوئی فرق نہیں ہے کہ اس کو بویا جائے یا وہ خود بخود اُگ جائیں، یہی قولِ معتمد ہے جیسا کہ امام نووی نے ''المجموع'' میں کہا ہے۔

انگور، کھجور اور پکائے جانے کے لائق غلوں میں مذکورہ شرطوں کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ زکوۃ کے نصاب کو پہنچ جائے، اور اس کا نصاب پانچ وسق ہے یعنی ایک ہزار چھ سو رطل، یہ دوسو من کے برابر ہوتا ہے، وزن یعنی کلو کی صورت میں غلہ کی اقسام کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوجاتا ہے، بعض محقق فقہاء نے اس کے لیے ایسے مکعب کی تعیین کی ہے جو ۷۔۹ سینٹی میٹر ہو۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ملکِ ایران کے علاقہ ''لنجہ'' میں کھجور، گیہوں اور چاول میں زکوۃ کا نصاب ایک سو پچاس ''من'' ہے، جب کہ وہیں پر جَو میں زکوۃ کا نصاب ایک سو چالیس ''من'' ہے، اور بھٹے کا نصاب ایک سو پینتیس من، زکوۃ کے نصاب میں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ان چیزوں کو ناپا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا، جب کہ یہ بات معلوم ہی ہے کہ چیزوں کے اعتبار سے ناپ اور تول میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

نباتات میں زکوۃ واجب ہونے کا وقت

غلوں اور پھلوں میں زکوۃ نکالنا یا اس کا حساب لگانا یا اس کا اندازہ لگانا اس وقت واجب ہے جب پھل پختہ ہوجائیں یا دانے سخت ہوجائیں، یعنی جب کھجور یا انگور پر رنگ

چڑھ جائے اور وہ کھانے کے لائق بن جائیں، اور غلہ جب پختہ ہوجائے اور دانے سخت ہوں، اگر کسی شخص کے ایک سے زائد کھیت یا باغ ہوں تو سب کو جمع کیا جائے گا اور ان سب کا نصاب مکمل ہونے کے بعد اس کی زکوۃ نکالی جائے گی۔

اگر کھیت چند شریکوں یعنی پاٹنروں کا ہو تو پیداوار کی زکوۃ کا حساب ایک مالک کے اعتبار سے نکالا جائے گا جب اس میں پارٹنرشپ کی تمام شرطیں پائی جائیں۔

زکوۃ کی مقدار

پھلوں اور غلوں میں دسواں حصہ ہے جب سینچائی پر کوئی خرچ نہ آتا ہو (دیکھا جائے: التہذیب۔بغوی۲/۸۸) یعنی بارش، نہر سے یا خودبخود سینچائی ہو۔

اگر کنویں سے ڈول کھینچ کر یا بیل کے ذریعہ یا پمپ سیٹ کے ذریعہ سینچائی کی جائے تو اس میں زکوۃ کی مقدار بیسواں حصہ ہے۔

اگر بارش کے پانی اور پمپ سیٹ دونوں سے ایک ساتھ سینچائی کی جائے تو اس کی زکوۃ تیرہ میں سے ایک حصہ ہوگا یعنی تیرہ من غلہ میں ایک من زکوۃ ہوگی، یہ تقریباً دسویں حصہ کے چوتھائی حصہ کا تین چوتھائی ہے، یہ اس وقت ہے جب خرچ اور اس کی مدت کا حال معلوم نہ ہو، ورنہ ہر ایک کا الگ الگ حساب رکھا جائے گا، اس کا حساب مہینوں میں رکھا جائے گا، سینچائی کی تعداد کا اعتبار نہیں ہوگا۔

پھل توڑنے، تر کھجور اور انگور کو جمع کرنے اور ان کو سکھانے یعنی سوکھے کھجور اور کشمش میں تبدیل کرنے کا خرچ مالک کے ذمہ ہوگا، اسی طرح غلہ کی کٹائی، ان کو الگ کرنے اور سکھانے کے اخراجات بھی مالک کے ذمہ ہوں گے۔

پھلوں کا اندازہ لگانے کی سنت

تر کھجور کو اندازہ لگایا جائے کہ وہ سوکھنے کے بعد کتنی مقدار میں کھجور بنے گا، یا انگور کو اندازہ لگایا جائے کہ سوکھنے کے بعد کتنی کشمش بنے گی؛ اس کو عربی میں ''خرص'' کہا جاتا ہے، جس کے معنی اندازہ لگانے کے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ زکوۃ میں واجب مقدار کو

معلوم کیا جائے اور اسی وقت زکوۃ ادا کی جائے۔

یہ عمل سنت ہے، اندازہ لگانے والے ہر نخلستان میں جائیں گے اور وہاں موجود تر کھجور کا اندازہ لگائیں گے اور یہ بھی اندازہ لگائیں گے کہ اس سے کتنا کھجور بنے گا، اسی طرح انگور اور اس سے بننے والی کشمش کا اندازہ لگائیں گے، اس کے ساتھ ہر کھیت اور نخلستان پر واجب ہونے والی زکوۃ کی مقدار بھی تحریر کریں گے، جب کھجور سوکھ جائے گا اور انگور کشمش بن جائے گا تو مالک پر زکوۃ کی یہ مقدار واجب ہوجائے گی، اس طرح اس کو پیداوار میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہوجائے گا، وہ بیچ بھی سکتا ہے، ہدیہ بھی دے سکتا ہے اور خود بھی استعمال میں لاسکتا ہے، البتہ اندازہ لگانے کے اس عمل سے پہلے مالک کو کسی بھی طرح کے تصرف کا اختیار نہیں ہے، کیوں کہ ہر کھجور کا دسواں حصہ اللہ تعالی کا حق ہے، جو مستحقین میں تقسیم کرنا ضروری ہے، جب تک پھلوں کا اندازہ نہیں لگایا جائے گا اس وقت تک اللہ تعالی کے حق کی مقدار معلوم نہیں رہے گی، جب یہ عمل کیا جائے گا تو پھر مالک اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے۔

اگر کسی زمین میں سال بھر میں دو مرتبہ کھیتی ہوتی ہو اور اس کی کٹائی سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہو تو دونوں کو جمع کرکے نصاب دیکھا جائے گا اور زکوۃ نکالی جائے گی۔

اندازہ لگانے والے کا ثقہ ہونا ضروری ہے، کیوں کہ فاسق کی بات کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اندازہ لگانے میں مہارت رہنا بھی ضروری ہے، قولِ اصح یہ ہے کہ مرد رہنا بھی شرط ہے، کیوں کہ اندازہ لگانا ولایت ہے، اور عورت ولایت کے لیے اہل نہیں ہے۔

ایک ہی اندازہ لگانے والا کافی ہے، جیسے کہ فیصلہ کرنے کے لیے ایک ہی قاضی کافی ہے، کیوں کہ وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد پر عمل کیا جاتا ہے۔ (یہی بات بغوی نے اپنی کتاب ''التہذیب'' میں کہی ہے ۲/۸۰-۸۱) اس کی دلیل یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے: نبی ﷺ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو یہود کے پاس بھیجتے تھے تو وہ نخلستان کے پکنے کے بعد اس میں سے کچھ کھائے جانے سے پہلے اندازہ لگاتے تھے۔ (ابوداود ۱۶۰۶، شرح معانی الآثار۔ طحاوی ۲/۳۸)

اگر پھل یا غلہ کا مالک تمام پیداوار یا کچھ حصے کے ضائع ہونے کا دعوی کرے تو دیکھا

جائے گا؛ اگر اس کے دعوی کے ساتھ کوئی ایسا سبب پایا جائے جس کی حس سے تکذیب ہوتی ہو اور اس کا جھوٹا ہونا معلوم ہوتا ہو تو اس کے دعوی کو قابلِ توجہ سمجھا نہیں جائے گا اور اس سے زکوۃ لی جائے گی، اگر وہ ضائع ہونے کا سبب کسی مخفی معاملہ کو بتائے مثلاً چوری وغیرہ تو اس کو دلیل پیش کرنے کا مکلّف نہیں بنایا جائے گا، البتہ اس کی بات پر قسم لینا مستحب ہے، اگر وہ قسم کھائے تو اس کی زکوۃ ساقط ہو جائے گی، اگر وہ قسم نہ کھائے تو پہلے زکوۃ واجب ہونے کی وجہ سے اس سے زکوۃ لی جائے گی، قسم نہ کھانے کی وجہ سے نہیں، اگر کسی ظاہری سبب کی وجہ سے ضائع ہو جائے مثلاً جل جائے اور اس کے اثرات نظر آ رہے ہوں تو بغیر قسم لیے اس کی بات سچ مانی جائے گی، اگر اس سبب میں اس کو متہم بنایا جائے تو اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا۔

مختلف جگہوں پر باغات ہوں

اگر کھجور یا انگور کے باغات مختلف جگہوں پر ہوں اور ان کا مالک ایک ہی ہو اور ہر جگہ کی پیداوار نصاب کو نہ پہنچتی ہو تو سبھی پیداوار کو ملایا جائے گا اور زکوۃ ادا کی جائے گی۔

پھل مختلف قسم اور نوعیت کے ہوں

اگر کھجور مختلف قسم کے ہوں تو ان کو ایک ساتھ جمع کر کے زکوۃ نکالی جائے گی، جب نوعیت میں اختلاف ہو اور ہر قسم کی زکوۃ الگ الگ نکالنا دشوار ہو تو زکوۃ درمیانی نوع سے نکالی جائے گی۔

اگر تر کھجور کی کوئی ایسی قسم ہو جو سوکھا کھجور نہ بنتی ہو مثلاً ''نلسان'' کھجور ہے تو اس کی زکوۃ تر رہنے کی صورت میں ہی نکالی جائے گی، جب اندازہ لگانے کا عمل مکمل ہو جائے اور فقراء اپنا حصہ تر کھجور کی شکل میں ہی لینے کو ترجیح دیں تو ان کو بطورِ زکوۃ تر کھجور دینا جائز ہے، بہرصورت زکوۃ میں دسویں حصہ نکالنا کافی ہے اور اسی شکل میں جس پر فقراء راضی ہوں۔

بیعِ عرایا

اس خرید وفروخت کی شکل یہ ہے کہ کھجور کے درخت پر موجود تر کھجور کو زمین پر موجود سوکھے کھجور کے بدلے تول کر بیچا جائے، یا درخت پر موجود انگور کا اندازہ لگا کر زمین پر موجود کشمش کے بدلے بیچا جائے، اس خرید وفروخت کی اجازت پانچ وسق سے کم مقدار میں ہو تو دی گئی ہے، یعنی یہ خریدنے والے اور بیچنے والے کے ہر خرید وفروخت میں ۱۵۰ من سے زیادہ نہ ہو۔

صدقہ فطر

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۲/۱۲۰، ''کفایۃ الأخیار'' حصنی ۲/۲۷۷)

صدقہ فطر ہر مسلمان اپنے بدن کو پاک کرنے کے لیے نکالتا ہے۔

اس کے فرض ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر ایک پر رمضان میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر فرض کیا چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ، أبواب صدقۃ الفطر، باب فرض صدقۃ الفطر ۱۴۴۲، مسلم: ۹۸۴)

صدقہ فطر واجب ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

صدقہ فطر واجب کرنے کی حکمت

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ انھوں نے صدقہ فطر کو روزے دار کے لیے گناہ اور لغو سے پاکی کے طور پر اور مسکینوں کو کھلانے کے لیے فرض کیا، جو اس کو نماز سے پہلے ادا کرے تو یہ مقبول زکوۃ ہے، اور جو اس کو نماز کے بعد ادا کرے تو یہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے''۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الفطر ۱۶۰۹، ابن ماجہ: کتاب الزکاۃ، باب صدقۃ الفطر ۱۸۲۷)

صدقہ فطر کو فرض کرنے کی حکمت یہ ہے کہ نفس کو باطل سے پاک کیا جائے اور روزے کی عبادت پر آنے والی کمی کو پورا کیا جائے، امام وکیع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''رمضان کے مہینے کے لیے صدقہ فطر اسی طرح ہے جس طرح نماز کے لیے سجدہ سہو ہے، یہ روزہ کی کمی کو اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح سجدہ سہو نماز کی کمی کو پورا کرتے ہیں''۔ (المجموع شرح المہذب ص ۶/۱۴۰)

صدقہ فطر فرض کرنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عید کے دن فقراء اور مساکین کو مانگنے سے بے نیاز کیا جائے۔

صدقہ فطر کس پر فرض ہے؟

صدقہ فطر ہر اس شخص پر فرض ہے جو رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے سے ایک لحظہ پہلے اور عید کی رات کا سورج غروب ہونے کے بعد ایک لحظہ موجود ہو، جس کا انتقال رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہوجائے تو اس پر صدقہ فطر واجب نہیں ہے۔

اسی طرح جو رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے کے بعد یعنی عید کی رات پیدا ہوجائے تو اس پر بھی صدقہ فطر نہیں ہے۔

صدقہ فطر ہر مسلمان پر فرض ہے، چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا۔

صدقہ فطر ہر اس مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس عید کی رات اور دن کی اپنی ضروریات اور اپنے گھر والوں کی ضروریات سے زیادہ مال موجود ہو۔

مندرجہ ذیل پانچ لوگوں پر صدقہ فطر فرض نہیں ہے: (''اللباب'' محاملی ۱/۱۶۰)

۱۔ جس کے پاس عید کی رات اور دن کی اپنی ضروریات اور اپنے گھر والوں کی ضروریات سے زیادہ مال موجود نہ ہو۔

۲۔ اس بیوی کا جو اپنے اس فقیر شوہر کی فرمانبردار ہو جس کے پاس صدقہ فطر دینے کی طاقت نہ ہو، چاہے وہ بیوی مالدار ہی ہو۔

۳۔ بیت المال کا غلام۔

۴۔ مسجد کی خدمت کے لیے وقف کردہ غلام۔

۵۔ مکاتب غلام یعنی جس غلام نے اپنی آزادی کے لیے آقا سے معاہدہ کیا ہو۔

صدقہ فطر کی مقدار

اپنے شہر کی عمومی غذا میں سے ایک صاع جو غذا سال کے اکثر دنوں میں استعمال کی جاتی ہو؛ مثلاً گیہوں، چاول، جو، کھجور وغیرہ، دو قسم کو ملا کر ایک صاع دینا جائز نہیں ہے، مثلاً گیہوں اور چاول کو ملا کر ایک صاع دیا جائے، یا کھجور اور چاول، یا جو اور چاول۔

ایک صاع تین کلو کے برابر ہے، ایک صاع سے کم زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ کوئی شخص آدھا غلام ہو اور آدھا آزاد تو وہ نصف صاع صدقہ فطر دے گا۔

ہر شخص اپنی بیوی اور بچوں کا صدقہ فطر نکالے گا، اسی طرح والدین کا بھی اگر وہ فقیر ہوں، جب اپنے والد کا صدقہ نکالنا واجب ہوجاتا ہے تو ان کی بیوی اور اپنے والد کی ام ولد (وہ باندی جس کو اپنے آقا سے بچہ ہوا ہو) کی بھی زکوۃ نکالنا واجب ہوجاتا ہے۔

کافر پر صدقہ فطر نہیں ہے، البتہ اگر اس کے والدین مسلمان ہیں اور وہ فقیر ہیں تو ان دونوں کا صدقہ فطر نکالنا اس پر ضروری ہے۔

صدقہ فطر کے مستحقین

صدقہ فطر ان ہی کو دیا جائے گا جو زکوۃ کے مستحق ہیں، البتہ ان میں زکوۃ وصول کرنے والے اور مولفۃ القلوب مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ وہ ضرورت مندوں میں سے نہیں ہیں۔

صدقہ فطر اپنے ان رشتے داروں کو دینا مستحب ہے جن کا نفقہ اس پر واجب نہیں ہے۔

صدقہ فطر کافر کو دینا جائز نہیں ہے، یہ زکوۃ کی طرح ہی ہے، امت کا اجماع ہے کہ زکوۃ ذمی کو نہیں دی جائے گی۔

شروع رمضان سے صدقہ فطر نکالنا جائز ہے۔ (عید کے دن سے اس کو موخر کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اس دن ان کو مانگنے سے بے نیاز کردو'' دار قطنی نے یہ روایت کی ہے: کتاب زکاۃ الفطر ۲/۱۵۲، بیہقی: ۴/۱۷۵) کیوں کہ یہ دو وجوہات کی بنا پر واجب ہوتا ہے: رمضان کے روزے اور اس سے افطار کرنے پر، جب ان دو میں سے ایک پایا جائے تو دوسرے کے وجود میں آنے سے پہلے اس پر عمل کرنا جائز ہے، اسی وجہ سے رمضان کا مہینہ آنے سے پہلے صدقہ فطر نکالنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ابھی دونوں امور پیش نہیں آئے ہیں، اس صورت میں یہ اس زکوۃ کی طرح ہوجائے گا جس کو سال گزرنے اور نصاب کو پہنچنے سے پہلے نکالا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

وہ شکلیں جن میں زکوۃ میں قیمت لینا جائز ہے

پانچ حالات میں نقدی میں زکوۃ نکالنا جائز ہے:

۱۔ مالِ تجارت کی زکوۃ میں، جس کی قیمت سال کے اخیر میں لگائی جاتی ہے، اور اس کی زکوۃ نقد میں نکالی جاتی ہے۔

۲۔ بدل کی صورت میں؛ مثلاً زکوۃ میں حقہ یعنی چار سالہ اونٹ دینا واجب ہوا اور اس کے پاس حقہ نہ ہو تو وہ دو سالہ اونٹ زکوۃ میں نکالے گا اور فرق کے بدلے دو بکریاں یا بیس درہم ادا کرے گا۔

۳۔ پانچ سے بیس اونٹوں کی زکوۃ میں ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری زکوۃ ہے، یہاں بکری اونٹ کے بہ نسبت قیمت کے برابر مانی جاتی ہے۔

۴۔ دو فرائض کے درمیان فرق کی صورت میں اس کا انتخاب کیا جائے گا جس میں فقراء کا مفاد ہو، اگر وہ چیز میسر نہ ہو جو شریعت کی طرف سے مقرر کردہ ہو تو دو فرائض کے درمیان فرق کو نقدی میں نکالا جائے گا، مثلاً کسی کے پاس دو سو اونٹ ہوں تو اس صورت میں اس پر ضروری ہے کہ ہر پچاس پر ایک حِقّہ نکالے یا ہر چالیس پر ایک بنت لبون یعنی دو سالہ اونٹنی نکالے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ چار حِقّہ کے مقابلہ میں پانچ بنت لبون فقراء کے حق میں زیادہ مفید ہے، اگر پانچ بنت لبون نہ ملیں تو پانچ بنت لبون اور چار حِقّہ کے درمیان کے فرق کو نقد میں نکالا جائے گا۔

زکوۃ کی جلد ادائیگی

سال گزرنے سے پہلے زکوۃ نکالنا جائز ہے، اگر فقراء میں سے کسی کو بطورِ زکوۃ ایک بکری دی جائے، پھر اللہ تعالی اس فقیر کو بے نیاز کردے اور وہ مالدار ہو جائے، جس کی وجہ

سے وہ زکوۃ کا مستحق باقی نہ رہے، وہ زکوۃ میں لی ہوئی بکری کو واپس کرنا چاہے، لیکن اس کے پاس بکریاں موجود نہ ہوں تو اس کے پاس سے بکری کی قیمت کو نقد کی صورت میں واپس لینا جائز ہے۔ (شرط یہ ہے کہ زکوۃ دیتے وقت فقیر کو بتا دیا ہو کہ یہ جلد ادا کی جانے والی زکوۃ ہے جیسا کہ ''بشری الکریم'' میں ہے)

یہ عمومی بات ہے کہ سامانِ تجارت میں مختلف قسم کی چیزیں رہتی ہیں، اسی وجہ سے تاجر سے یہ مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی چیز کا ڈھائی فیصد زکوۃ ادا کرے، اسی وجہ سے اس کے پاس موجود سبھی مال کی قیمت لگائی جائے گی اور کل قیمت سے ڈھائی فیصد زکوۃ لی جائے گی۔

جانوروں کی زکوۃ کی کمی پورا کرنے میں جن کو پانی پینے کی جگہ جمع کیا جاتا ہے اور اس کی زکوۃ ادا کی جاتی ہے، یہ دشوار ہے کہ ان جانوروں کی قیمت مال میں لگانے والے کو حاضر کیا جائے، اسی وجہ سے شریعت نے زکوۃ ادا کرنے والے کو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دو بکریاں دینے یا بیس درہم دینے کے درمیان اختیار دیا ہے۔

اسی طرح ہر پانچ اونٹ پر دی جانے والی بکری اونٹ کی جنس ہی سے نہیں ہے، اسی وجہ سے اونٹوں کی زکوۃ میں بکری کو دینا قیمت کے طور پر ادائیگی مانی جائے گی جیسا کہ ہم نے ابھی تھوڑی دیر قبل بتا دیا ہے، اسی طرح دو فرائض کے درمیان کمی بیشی کے لیے نکالے جانے والی زکوۃ بھی قیمت میں ہی ادا کی جا سکتی ہے، زکوۃ کی بکری واپس لینے کی صورت میں بھی اس کی قیمت لی جاتی ہے، جب زکوۃ میں دی ہوئی ہی بکری واپس لینا دشوار ہو۔

ایک ہی مال میں دو زکوۃ جمع ہو جائیں (''اللباب''، محاملی ۱/۱۶۴)

یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب تجارت کے مسلمان غلام کی زکوۃ ادا کرنا ہو، سال کے اخیر میں مالک پر ضروری ہے کہ وہ ان غلاموں کی قیمت لگا کر ڈھائی فیصد زکوۃ ادا کرے، اس کے ساتھ عید الفطر کی رات ان ہی غلاموں کا صدقہ فطر دینا بھی ضروری ہے۔

مبادلہ

مبادلہ یہ ہے کہ کسی چیز کو اسی طرح کی چیز کے ساتھ بیچا جائے۔(''الحاوی الکبیر'' ماوردی ٣/١٩٥،''حلیۃ العلماء'' قفال شاشی ٣/٢١) اس طرح کے تبادلہ سے سال دوبارہ شروع ہوجاتا ہے جس کی بنیاد پر زکوۃ کا حساب کیا جاتا ہے، البتہ اس سے مندرجہ ذیل تین مسائل مستثنیٰ ہیں:

(محاملی کی کتاب اللباب میں چار مسائل بیان کیے گئے ہیں)

١۔کسی سامان کو تجارت کی غرض سے دوسرے سامان سے سال کے دوران بدل دیا جائے، مثلاً قالین کو لوہے سے تبدیل کیا جائے، اس صورت میں تجارت کے نئے سال کی ابتدا نہیں ہوگی، بلکہ اسی سال کی بنیاد پر تجارت کا حساب لگایا جائے گا۔ جب تاجر شروع محرم میں قالین خریدے اور رجب کے مہینہ میں قالین کو لوہے سے بدل دے تو لوہے میں تجارت کا سال محرم سے ہی شروع ہوجائے گا۔

٢۔اپنے تجارتی سامان کو نقدی نصاب کے بدلے بیچ دے۔اس کی مثال یہ ہے کہ محرم کے مہینہ میں کوئی شخص عطریات کی تجارت شروع کرے اور شعبان کے مہینہ میں بیس مثقال سونے کے بدلے عطریات کو بیچ دے، جو کہ سونے کا نصاب ہے، اس صورت میں تجارتی سال کے حساب کی ابتدا محرم کے مہینے سے ہوگی۔اگر وہ بیس مثقال سونے کا مالک شوال کے مہینے میں ہو پھر وہ اس سے رمضان کے مہینے میں تجارتی سامان خریدے تو تجارت کا سال شروع محرم سے شمار کیا جائے گا۔

٣۔اگر کسی کے پاس محرم کے شروع میں بیس مثقال سونا ہو یا اس کے مساوی نقدی موجود ہو، پھر وہ ان روپیوں سے رہنے کے لیے گھر خریدے تو اس طرح وہ تجارتی سال کے حساب کو منقطع کرنے والا ہوجائے گا، اگر اس کے بعد وہ تجارت اور نفع کی غرض سے گھر بیچ

دے تو یہ بیع تجارتی سال کے حساب کے لیے نیا سال شمار ہوگا جس کی بنیاد پر زکوۃ کا حساب لگایا جاتا ہے۔(چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ جب درہم اور دینار کا تبادلہ کرے تو اس میں دو اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اس میں زکوۃ ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں زکوۃ نہیں ہے۔ یہ ابن سریج کا اختیار کردہ ہے، دیکھا جائے:''اللباب''١/١٦٥)

تجارتی مال یا جانور ملانے کا مسئلہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین''۲/۸۷، ''التہذیب''۳/۳۷)

اس باب میں اس مسئلہ کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ جب دو یا زائد اشخاص اپنی ملکیت کے جانور یا تجارتی سامان کو ملاتے ہیں تو ان کی زکوۃ کا حساب کیسے نکالا جائے گا۔

اس باب کی دلیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو جب بحرین روانہ کیا تو نبی کریم ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ صدقات کو تحریر کیا، اسی میں ہے: ''زکوۃ کے خوف سے نہ جدا جدا کو جمع کیا جائے گا اور نہ جمع کو جدا جدا کیا جائے گا''۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ، باب لا یجمع بین متفرق ۱۴۵۰، ابن خزیمہ: ۲۲۶۱، ابن حبان: ۳۲۶۶، یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے)

زکوۃ واجب ہونے یا زیادہ ہونے کے خوف سے الگ الگ کرنے یا جمع کرنے سے مالک کو اس روایت میں منع کیا گیا ہے، اسی طرح زکوۃ وصول کرنے والے کے لیے ممانعت ہے کہ وہ زکوۃ ساقط ہونے یا کم ہونے کے اندیشے سے الگ الگ کرے یا جمع کرے۔

خلطہ یعنی ملانے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خلطۃ شیوع؛ اس کی شکل یہ ہے کہ دو اشخاص کا مال پارٹنرشپ کی بنیاد پر ملا ہوا ہو، مثلاً دو لوگ ایک سو بکریاں اس طرح خریدیں کہ ایک کا حصہ دو دوسرے کے حصہ سے جدا گانہ نہ ہو اور دونوں سو بکریوں میں شریک ہوں۔

۲۔ خلطۃ جوار؛ مثلاً ہر ایک کی پچاس پچاس بکریاں ہوں اور وہ ان سو بکریوں کو ملا دیں، البتہ ہر ایک کی بکریاں جدا جدا ہوں۔

ان دونوں صورتوں میں ان کی زکوۃ ایک شخص کی زکوۃ کی بنیاد پر حساب کی جائے گی، لیکن اس کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

۔ دونوں کی ملکیت کا مال زکوۃ کے مقررہ نصاب کو پہنچ جائے، مثلاً کسی کے پاس پندرہ

بکریاں ہوں اور دوسرے کے پاس بھی اتنی ہی بکریاں ہوں، اور وہ دونوں اپنی بکریوں کو ملا دیں تو زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ مجموعہ نصاب کو نہیں پہنچا ہے۔

اگر ایک کے پاس پندرہ بکریاں ہوں اور دوسرے کے پاس پچیس بکریاں ہوں اور دونوں اپنی بکریوں کو ملا دیں تو جملہ چالیس بکریاں ہوگئیں، اس طرح ہر ایک کی بکریاں حد نصاب سے کم ہیں، لیکن ملانے کی وجہ سے ان بکریوں کی زکوۃ نکالنا واجب ہے، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب دو میں سے ایک شخص کے پاس چالیس بکریاں ہوں اور دوسرے کے پاس پچاس بکریاں ہوں۔

اگر ایک شخص کے پاس بیس بکریاں ہوں اور دوسرے کے پاس بھی بیس ہوں اور وہ دونوں اپنی ۱۹۔۱۹ بکریوں کو ملائیں اور ایک ایک بکری اپنے پاس جداگانہ رکھیں تو ان بکریوں پر زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ جملہ ۳۸ بکریاں ہوتی ہیں یعنی نصاب ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ملانے کی صورت میں اسی وقت زکوۃ ہے جب زکوۃ کا نصاب مکمل ہو جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے۔

اسی طرح رات گزارنے کی جگہ، چرنے کی جگہ، پانی پلانے کی جگہ، دودھ دوہنے کی جگہ اور سانڈ بھی ایک ہونا ضروری ہے، یعنی ان امور میں امتیاز نہ ہو، البتہ دودھ دوہنے کے برتن یا پانی پلانے کے ڈول الگ ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ بکریاں ایک ہی چراگاہ میں ہوں، چرواہا ایک ہی ہو اور چوکیدار بھی ایک ہی ہو۔ مقصود یہ ہے کہ ان تمام چیزوں میں اشتراک ہو، ایک کا مال دوسرے سے ممتاز نہ ہو، البتہ اس سے دودھ دوہنے اور پانی پلانے کے برتن مستثنی ہیں، ان میں امتیاز ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

کھیتی میں خلطہ ہو تو یہ شرط ہے کہ غلہ جمع کرنے کی جگہ ایک ہو، بیچی جانے والی جگہ، حمالی، وزن کرنے والا، ناپنے والا اور چوکیدار ایک ہی ہو، یعنی شرط یہ ہے کہ مال کسی فرق کے بغیر ایک ہی ہو، تاکہ اس کے اخراجات بڑھ نہ جائیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص کے پاس چالیس بکریاں ہوں اور دوسرے کو ساتھ رکھنے کی شرط پر آدھی بکریاں بیچ دے تو ان میں سے ہر ایک پر سال کے اخیر میں آدھی آدھی بکری بطور زکوۃ نکالنا واجب ہے۔

زکوۃ وقت سے پہلے ادا کرنے کے مسائل

اس باب میں زکوۃ کو وقت سے پہلے ادا کرنے کے احکام ومسائل کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً کوئی شخص اپنے مال یا تجارت یا جانوروں یا کھیت کی زکوۃ اس کی ادائیگی کا وقت آنے سے پہلے یعنی سال مکمل ہونے سے پہلے ادا کرے۔

اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زکوۃ کو وقت آنے سے پہلے نکالنے کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ان کو رخصت دی۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب فی تعجیل الزکاۃ ۱۶۲۴، ترمذی: کتاب الزکاۃ، باب ماجاء فی تعجیل الزکاۃ ۶۷۸، مستدرک حاکم ۳/۳۳۲، بیہقی: السنن الکبری ۴/۱۱۱)

زکوۃ واجب ہونے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جانوروں کی ملکیت، تجارت یا پھل پر ایک سال گزر جائیں، البتہ ایک سال کے دوران وہ جب چاہے اپنی زکوۃ نکال سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ اس کا مال نصاب کو پہنچا ہو اور اس پر زکوۃ سال کے اخیر تک واجب ہی رہتی ہو، اور زکوۃ لینے والا فقیر سال کے اخیر تک فقیر ہی رہے، اور وہ ادائیگی کے وقت فقیر سے کہے: یہ جلد ادا کی جانے والی زکوۃ ہے۔ ان تین شرطوں کی موجودگی میں وقت سے پہلے زکوۃ کی ادائیگی جائز ہے۔

اگر سال کے اخیر تک مالک زندہ نہ رہے، یا مالک اور فقیر میں سے کوئی ایک دینِ اسلام سے مرتد ہوجائے، اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے، یا مالک خود فقیر بن جائے، یا فقیر مالدار بن جائے، تو مالک اس کو وقت سے پہلے دی ہوئی زکوۃ واپس لے سکتا ہے، اگر زکوۃ میں جانور دیا گیا ہو اور وہ موٹا ہوگیا ہو تو ویسے ہی واپس لیا جائے گا، اور اگر وزن میں کمی آئی ہو یا اس کو کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہو تو دینے والے کو بدل اور معاوضہ لینے کا حق نہیں ہے، اگر اس جانور کو فقیر کے پاس رہنے کے دوران بچہ ہوجائے تو یہ فقیر اس بچے کو اپنے پاس رکھ سکتا

ہے اور وہ صرف جانور واپس کرے گا۔

یہ تمام احکام ان مالوں کی زکوۃ میں ہیں جن میں عین چیزیں زکوۃ میں واجب ہوتی ہیں، مثلا نقدی اور مویشی۔ اگر وہ مال ہوں جن میں عین چیزیں زکوۃ میں واجب نہ ہوتی ہوں، اس سے مراد سامانِ تجارت ہیں تو ان کی زکوۃ وقت سے پہلے اس وقت بھی نکالنا جائز ہے جب مال نصاب کو نہ پہنچا ہو اور اس پر ابھی ایک سال گزرا نہ ہو، کیوں کہ تجارت میں نصاب کی شرط کا اعتبار سال کے اخیر میں ہوتا ہے۔

کان اور خزانے کی زکوۃ

کان سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں سونا، چاندی، لوہا اور تانبا وغیرہ پایا جاتا ہے۔

کان کی زکوۃ سے مراد وہ زکوۃ ہے جس کو مسلمان بنجر پڑی ہوئی زمین جس کا کوئی مالک نہ ہو یا اپنی ملکیت کی زمین کے کان سے نکالتا ہے، اس تعریف کی وجہ سے وہ مال نکل جاتا ہے جس کو ذمی نکالے، اس پر زکوۃ نہیں ہے۔

کان میں بھی صرف سونے اور چاندی میں زکوۃ واجب ہے، لوہے اور تانبے وغیرہ کی کان میں زکوۃ نہیں ہے، اسی طرح نفیس اور قیمتی پتھروں مثلاً یاقوت، مرجان، عقیق اور فیروز وغیرہ میں بھی زکوۃ نہیں ہے۔

سونے اور چاندی کے کان سے جو کچھ نکالا جائے، چاہے اس پر اخراجات آئیں تو اس کی قیمت کا ڈھائی فیصد زکوۃ ہے۔ سونے، چاندی اور خزانہ میں شرط یہ ہے کہ وہ نصاب کو پہنچے یعنی بیس مثقال سونا ہو، یا دوسو درہم چاندی ہو۔

سونے اور چاندی میں زکوۃ فرض ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:
''یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَنفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَکُمْ مِنَ الْأَرْضِ'' (البقرۃ ۲۶۷) (اے ایمان والو! پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمایا ہے ان میں سے خرچ کرو اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے) زمین سے نکالی جانے والی چیزوں میں غلہ، پھل اور کان سب موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''چاندی میں دسویں حصے کا چوتھا ہے''۔ بخاری نے اس کی روایت کی ہے۔ (یہ بخاری کی روایت کردہ طویل حدیث کا ایک حصہ ہے: کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم ۱۴۵۴، یہ روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے) یعنی ڈھائی فیصد۔

حاکم وغیرہ نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر قبلہ کی کانوں کی زکوۃ لی۔ (موطأ امام مالک ۱/ ۲۴۸۔۲۴۹، امام مالک نے یہ روایت مرسلاً کی ہے، جب کہ امام ابوداود نے اس کو موصولاً روایت کیا ہے: کتاب الخراج والفئ، باب فی إقطاع الأرضین ۳۰۶۲) قبلہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک شہر کا نام ہے، جو بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے، یہ مدینہ سے ۳۲ فرسخ کے فاصلہ پر ہے، وہاں چند کانیں پائی جاتی تھیں۔

شرط یہ ہے کہ جس کان کی زکوۃ ادا کی جارہی ہے اس سے مسلسل سونا اور چاندی نکالا جائے، جب دس مثقال سونا نکالا جائے اور اس کے پاس پہلے سے دس مثقال سونا ہو تو اس نکالے ہوئے سونے کا ڈھائی فیصد زکوۃ میں دینا واجب ہے۔

رکاز (خزانہ) سے مراد وہ مال ہے جو زمین میں مدفون ہے، اگر یہ مال کسی شخص کی طرف سے زمین میں دبایا گیا ہو تو وہ خزانہ ہے، اگر الہی قدرت سے مدفون ہو تو وہ کان ہے، خزانہ میں دونوں چیزیں شامل ہیں، اور فقہاء کے نزدیک خزانہ سے مراد وہ مال ہے جو زمانہ جاہلیت میں زمین میں دبا کر رکھا گیا ہو۔

خزانہ میں زکوۃ واجب ہونے کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''اور خزانہ میں پانچواں حصہ ہے''۔ (بخاری: کتاب المساقاۃ، باب من حفر بئرا فی ملکہ ۲۲۵۵، مسلم: کتاب الحدود، باب جرح العجماء ۱۷۱۰، یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

خزانہ سے پانچواں حصہ یعنی بیس فیصد زکوۃ لینے کی حکمت یہ ہے کہ جس کو یہ خزانہ ملتا ہے، اس کی کوئی زیادہ محنت نہیں رہتی اور اخراجات بھی نہیں آتے، خزانہ کی زکوۃ اور کان کی زکوۃ کے درمیان یہی فرق ہے، کان سے سونا یا چاندی نکالنے میں انسان کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، اس لیے کان کی زکوۃ صرف ڈھائی فیصد ہے۔

خزانہ کی زکوۃ کے مصارف بھی وہی آٹھ قسم کے لوگ ہیں جو عام زکوۃ کے ہیں۔

خزانہ میں زکوۃ واجب ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ نصاب کو پہنچا ہو یعنی سونا ہو تو بیس مثقال اور چاندی ہو تو دوسو درہم، اور یہ بھی شرط ہے کہ خزانہ زمانہ جاہلیت سے مدفون

ہو، یہ بھی شرط ہے کہ اس کو پانے والا اپنی ملکیت کی زمین میں پائے، اس کو جو سونا یا چاندی ملے وہ کسی دوسرے کی ملکیت کی زمین میں نہ ہو، یا عام راستے پر نہ ملا ہو، اور کسی ایسے گاؤں یا شہر میں نہ ملا ہو جہاں لوگ سکونت پذیر ہوں، کیوں کہ جب کوئی خزانہ عام راستے میں ملے، یا ایسی جگہ ملے جہاں لوگ رہتے ہوں، یا ایسی جگہ جہاں لوگ آتے جاتے ہوں مثلاً مساجد وغیرہ تو اس پر لقطہ کا حکم منطبق ہوگا، لقطہ کے احکام آگے ان شاء اللہ آئیں گے۔

اگر دوسرے کی ملکیت والی جگہ خزانہ کسی کو ملے تو وہ زمین کے مالک کا خزانہ ہوگا۔ جو خزانہ اور کان کے تفصیلی احکام جاننا چاہتا ہے تو وہ فقہ کی طویل کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

زکوۃ کی تقسیم

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۱۰۷، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۲۸۲، ''روضۃ الطالبین'' ۲/۲۰۱)

اس باب میں زکوۃ کے مستحقین پر زکوۃ کی تقسیم کی تفصیلات بیان کی جائیں گی، زکوۃ کے مستحقین کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں آیا ہے: ''**إِنَّمَا الصَّدُقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ**'' (التوبۃ ۶۰) زکوۃ تو حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور اس کے کام پر جانے والوں کا اور ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے اور غلاموں (کے آزاد کرنے) میں اور جو قرض داروں (کے قرض چکانے) میں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر (کی ضرورت) میں (اس کو خرچ کیا جائے) اللہ کی طرف سے طے شدہ، اور اللہ خوب جاننا بڑی حکمت رکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی ابتدا حصر کے صیغہ ''إنما'' سے ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زکوۃ صرف ان ہی لوگوں کو دی جائے گی، ان کے علاوہ دوسروں کو نہیں دی جائے گی، ائمہ کا اس پر اجماع ہے، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی کے وقت ان سبھوں کو دیا جائے گا یا نہیں؟ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ زکوۃ کے سلسلہ میں کسی نبی کے حکم پر راضی نہیں ہوا اور نہ نبی کے علاوہ دوسرے کے حکم پر، اس لیے اس سلسلہ میں خود ہی فیصلہ کیا؛ اس کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا، اگر تم ان حصوں میں سے ہو تو میں تم کو تمہارا حق دوں گا''۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقۃ ۱۶۳۰، دارقطنی ۲/۱۳۷، بیہقی ۴/۱۷۴، یہ روایت زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے ہے)

مذکورہ مستحقین زکوۃ کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔فقراء:

فقیر سے مراد وہ مسلمان ہے جس کے پاس مال نہ ہو، اور اس کی کمائی اور آمدنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی نہ ہوتی ہو، اگر کسی کے پاس سر چھپانے کے لیے گھر ہو اور پہننے کے لیے کپڑے ہو تو وہ فقیری سے نکلتا نہیں ہے، بلکہ اگر اس کے پاس غلام ہو جس کی اس کو اپنی خدمت کے لیے ضرورت ہو تو بھی وہ فقیر ہی رہتا ہے، اس کو ایسا کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو اس کے لائق نہ ہو مثلاً حرام کمائی، یا کوئی ایسی کمائی جس میں قوی شبہہ پایا جاتا ہو۔

حدیث میں ہے کہ دو لوگوں نے نبی ﷺ سے زکوۃ مانگی، تو آپ نے ان پر نگاہ ڈالی اور غور سے دیکھا، پھر فرمایا: ”میں تم کو اس کے بعد دوں گا کہ میں تم کو بتا دوں کہ اس میں کسی مال دار کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ طاقت ور کمانے کے لائق آدمی کا“۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقۃ ۱۶۳۳، نسائی ۵/۴۷، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عدی بن خیار رضی اللہ عنہ سے ہے)

۲۔مساکین

مسکین سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس مال ہو، لیکن اس سے اس کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، مثلاً وہ سات سو روپئے کماتا ہو اور اس کی ضرورت ایک ہزار روپیوں کی ہو۔ فقیر کا حال مسکین سے برا رہتا ہے اور وہ مسکین سے زیادہ ضرورت مند رہتا ہے۔

۳۔زکوۃ وصول کرنے والے

یہ وہ عاملین اور ملازمین ہیں جن کو امام زکوۃ کے مستحقین سے زکوۃ وصول کرنے کی ذمہ داری دے، یہ مندرجہ ذیل افراد ہیں:

ساعی یعنی جس کو زکوۃ جمع کرنے کے لیے بھیجا جائے۔

عریف یعنی وہ جو زکوۃ دینے والوں کو جانتا ہے۔

کاتب یعنی وہ جو زکوۃ ادا کرنے والوں کے نام اور ان میں سے ہر ایک کی طرف

سے ادا کردہ زکوۃ کی مقدار کو لکھتا ہے۔

حاشر یعنی وہ شخص جو مالداروں کو زکوۃ کی ادائیگی کے لیے جمع کرتا ہے۔

حاسب یعنی وہ شخص جو زکوۃ کا مال گنتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک ہزار اونٹوں پر بیس حقہ اونٹ (اس سے مراد وہ اونٹ ہے جس کے تین سال مکمل ہو چکے ہوں) اس وجہ سے ہے کہ ہر پچاس اونٹ پر ایک حقہ اونٹ ہے۔ یا کہتا ہے: ایک ہزار اونٹوں پر ۲۵ بنت لبون (اس سے مراد وہ اونٹنی ہے جس کے دو سال مکمل ہو گئے ہوں) اس اعتبار سے ہے کہ یہ فقیروں کے لیے زیادہ سود مند ہے۔

حافظ: یہ وہ شخص ہے جو زکوۃ کے مال کی نگرانی کرتا ہے۔

قاسم یعنی وہ شخص جو زکوۃ کا مال مستحقین پر تقسیم کرتا ہے۔

زکوۃ کے لیے کام کرنے والوں کا حصہ ان کی اجرت کے بقدر ہونا ضروری ہے، اور شرط یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ضرورت ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ان کو ان اعمال کا مکلّف بنائے، اگر خود مال والا ہی اپنی زکوۃ خود سے تقسیم کر رہا ہو تو اس صورت میں عاملین علی الزکاۃ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔مولفۃ القلوب

ان سے مراد نئے مسلمان ہیں، ان کے ایمان کو تقویت پہنچانے کے لیے زکوۃ کے مال میں سے ان کا حصہ دیا جائے گا۔

کفار میں سے جو مولفۃ القلوب ہیں، یعنی اسلام سے قریب کرنے کے لیے کفار کو حضور ﷺ نے جو مال دیا تھا، ان کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے بعد زکوۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھے یہ بات نہیں پہنچی ہے کہ عمر نے کسی کو اسلام سے قریب کرنے کے لیے دیا ہے، نہ عثمان سے یہ بات معلوم ہوئی ہے اور نہ علی سے، اللہ نے اسلام کو اس بات سے معزز فرمایا کہ اس پر کسی کی تالیفِ قلب کی جائے، اور اس پر اللہ ہی کی تعریف ہے۔ (معرفۃ السنن والآثار۔امام بیہقی ۱۱/۱۷۹)

ایک قول یہ ہے کہ ان کو بیت المال سے دیا جائے گا، زکوۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔

قرآن کریم نے ان مذکورہ چار قسم کے لوگوں کے حق کے بارے میں گفتگو کرتے وقت لام ملکیت کا استعمال کیا ہے، تاکہ ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ جو ان کے پاس پہنچتا ہے وہ اس کے مالک بن جاتے ہیں اور ان کو اس میں تصرف کا حق رہتا ہے۔

۵۔الرقاب

یہ وہ غلام ہیں جو زکوۃ کا مال غلامی سے آزاد ہونے کے لیے لیتے ہیں، اس سے مراد مکاتب غلام ہیں جو اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ اتنا مبلغ ادا کریں تو ان کو آزادی دی جائے، اور ان کے آقا ان کے ساتھ اس پر معاہدہ کرلیں۔

۶۔غارمون

اس سے مراد وہ قرض دار ہیں جو اپنے قرض ادا نہ کرسکتے ہوں، ان کی تین قسمیں ہیں:

ایک وہ جو کسی مقتول کی دیت ادا کرنے کے لیے قرض لے تاکہ قتل کی وجہ سے دو گروہوں کے درمیان پھوٹنے والے فتنہ کو روک دیا جائے۔

دوسرے وہ جو تنگ دست ہے اور اپنے اہل وعیال اور بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے لیے قرض لیتا ہے، اور وہ اس قرض کو ادا نہیں کرسکتا ہے، یہ دونوں اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے زکوۃ لے سکتے ہیں۔

تیسرے وہ جو کسی قرض دار کی ضمانت لے اور اس کے بدلہ خود قرض کی ادائیگی پر مجبور ہو جائے، اور قرض دار کے پاس قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ ہو تو اللہ تعالی نے اس کے لیے زکوۃ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے، تاکہ وہ اپنی طرف سے ادا کردہ رقم واپس لے تاکہ کسی قرض دار کی ضمانت لینے کی وجہ سے اس کو نقصان نہ ہو، اس طرح کی ضمانت لینا اچھے کاموں میں سے ہے، اگر اس کے لیے زکوۃ لینے کی اجازت نہیں ہوگی تو لوگوں کے ساتھ بھلائی کی یہ راہ مسدود ہو جائے گی۔

شرط یہ ہے کہ قرض لینے والے نے قرض کسی معصیت کے لیے لیا نہ ہو، اگر قرض

کسی گناہ کے ارتکاب کے مقصد سے لیا گیا ہو تو اس کو زکوۃ نہیں دی جائے گی، اسی طرح اس ضمانت لینے والے کو بھی زکوۃ نہیں دی جائے گی جو یہ جانتے ہوئے ضمانت لے کہ قرض لینے والا کسی معصیت کے کام کے لیے لے رہا ہے۔

۷۔فی سبیل اللہ

اس سے مراد وہ مجاہدین ہیں جو اللہ کے دین کی نصرت کے لیے جنگ کرتے ہیں اور ان کو جہاد کے بدلے حکومت کی طرف سے تنخواہ نہیں ملتی ہے، اگر حکومت ان پر خرچ کرتی ہے اور ان کو تنخواہیں دیتی ہے تو مجاہدین فی سبیل اللہ کے حصے سے زکوۃ نہیں دی جائے گی۔

۸۔ابن السبیل

اس سے مراد فقیر مسافر ہیں جو اپنے ملک واپس جانا چاہتے ہیں اور ان کے پاس سفر کے اخراجات موجود نہیں ہیں، ان کو ابن السبیل کے حصے میں سے دیا جائے گا، تاکہ وہ اپنے ملک واپس ہوسکیں، شرط یہ ہے کہ سفر معصیت کا نہ ہو۔

قرآن کریم نے مکاتب غلاموں، قرض داروں، مسافروں اور مجاہدین کے لیے زکوۃ کے مال میں سے حصہ کو مخصوص کرنے کو مقصد کو بڑی باریکی کے ساتھ متعین کیا ہے، اس لیے ان قسم کے لوگوں کے لیے ''فی'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مکاتب غلاموں کے لیے مخصوص زکوۃ کا حصہ ان کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے ہی خرچ کیا جائے گا، اگر اس مقصد کے لیے استعمال میں نہ لایا جائے تو ان سے واپس لیا جائے گا، اسی طرح فی سبیل اللہ کا حصہ ان ہی مجاہدین کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جو اللہ کے دین کی نصرت کے لیے جنگ کرتے ہیں، اگر وہ جنگ نہ کریں تو ان کو دیا ہوا مال واپس لیا جائے گا، اسی طرح قرض دار اگر زکوۃ کے مال سے اپنے قرض ادا نہ کریں تو اس کو واپس لینا واجب ہے، اسی طرح مسافر بھی ہیں، اگر وہ اپنے شہر واپس نہ ہو تو ان کو دیا ہوا زکوۃ کا مال واپس لیا جائے گا۔

ان تمام مستحقین زکوۃ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوں، غلام نہ ہوں، اس سے صرف مکاتب غلام مستثنی ہے جو زکوۃ کا مال اپنی آزادی خریدنے کے لیے استعمال کرتا ہے، یہ بھی شرط

ہے کہ وہ بنی ہاشم یا بنی مطلب میں سے نہ ہو، چاہے وہ سادات میں سے نہ ہوں، مثلاً عباس بن عبد المطلب کی اولاد؛ کیوں کہ ان کا تعلق بنی ہاشم اور بنی مطلب سے ہے، لیکن وہ سادات نہیں ہیں، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ زہراء کی اولاد کو ہی سادات کا درجہ دیا ہے۔

بعض متاخر علماء نے فتوی دیا ہے کہ سادات کو زکوۃ دینا جائز ہے، کیوں کہ اب انہیں مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ نہیں ملتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ ان کو بتا کر دیا جائے۔

مستحقین زکوۃ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ مالدار نہ ہوں، مالداروں سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں آیا ہے: ''زکوۃ مالدار کے لیے حلال نہیں ہے، سوائے پانچ لوگوں کے: اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا، یا زکوۃ کا کام کرنے والا، یا قرض دار، یا اس شخص کے لیے جو اس (زکوۃ میں دیے ہوئے مال) کو اپنے مال سے خریدے، یا اس شخص کے لیے جس کا پڑوسی مسکین ہو اور اس مسکین پر صدقہ کیا جائے تو وہ مسکین اس کو ہدیہ میں دے''۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب من یجوز لہ أخذ الصدقۃ وھو غنی ۱۶۳۵، یہ روایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ہے اور عطاء سے مرسلاً ہے)

ایک شہر سے دوسرے شہر زکوۃ منتقل کرنا اس صورت میں جائز نہیں ہے جب پہلے شہر میں زکوۃ کے مستحقین موجود ہوں۔ بعض متاخر علماء نے ایک شہر سے دوسرے شہر زکوۃ کو منتقل کرنا جائز قرار دیا ہے، (دیکھا جائے ''أسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۱/۳۹۲) تا کہ زکوۃ دینے والے اس کے ذریعہ قریبی رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کریں یا بہت ہی زیادہ غریبوں کو ملے یا زیادہ نیک فقیروں کو زکوۃ حاصل ہو۔

زکوۃ کے مستحقین میں سے ہر ایک قسم کے تین افراد کو زکوۃ دینا واجب ہے، اگر زکوۃ کا مال زیادہ ہو اور وہ تمام مستحقین کے لیے کافی ہوتا ہو تو ان سبھوں کو دینا واجب ہے، اگر زکوۃ کی مقدار زیادہ نہ ہو اور تمام لوگوں کی ضرورت پوری نہ کرتی ہو، بلکہ کم ہو تو ایک ہی فقیر، ایک ہی مسکین اور ایک ہی قرض دار کو دینا جائز ہے۔

زکوۃ دینے والا خود سے مستحقین میں زکوۃ تقسیم کر سکتا ہے، اگر مسلمانوں کا نیک خلیفہ ہو تو زکوۃ خلیفہ کے حوالہ کرنا افضل ہے تا کہ وہ زکوۃ کے مستحقین میں زکوۃ تقسیم کرے۔

مالِ فیٔ اور مالِ غنیمت کی تقسیم

(تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''أسنی المطالب'' ۳/۸۷، ''کفایۃ الأخیار'' ۲/۲۸۸)

مالِ فیٔ سے مراد وہ مال ہے جو کافروں سے بغیر جنگ کیے حاصل ہوتا ہے، مثلاً وہ مال جو کفار اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے۔

مالِ غنیمت سے مراد وہ مال ہے جو کافروں کے خلاف جنگ سے حاصل ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں قرآن مجید نے یہ حکم دیا ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ''وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْئٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ'' (الأنفال ۴۱) اور جان لو کہ تم نے جو بھی مالِ غنیمت حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے اور اس کا ہے جو سفر پر ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے: اور اس بات کو جان لو کہ جو تمہیں کفار کا مال حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور پانچویں حصہ کو پھر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ مالِ غنیمت اور مالِ فیٔ کو پچیس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا؛ جن میں سے بیس حصے مجاہدین کے ہوں گے، اور پانچ حصوں کے مصارف کے بارے میں اللہ تعالی نے یوں بتایا ہے:

۔ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے، آپ کے بعد یہ حصہ مسلمانوں کے مفادات میں صرف کیا جائے گا یعنی سرحدوں کی ضرورتوں، قاضیوں، علماء، قرآن کی تعلیم دینے والوں اور کمائی سے عاجز لوگوں پر خرچ کیا جائے گا، ان میں سے اہم فالاہم کے اصول پر عمل کیا جائے گا، اور ان میں سب سے زیادہ اہم سرحدوں کی ضرورتیں ہیں، یعنی مسلمانوں کے ملک کے اطراف میں خوف کی جگہیں۔

۔ایک حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے داروں کے لیے، یہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں، اس میں مالدار، فقیر، مرد اور عورت سب شامل ہیں، اور مرد کو وراثت کی طرح فضیلت دی جائے گی۔

۔ایک حصہ یتیموں کے لیے، یتیم سے مراد وہ چھوٹا بچہ ہے جس کے والد نہ ہو اور اس کے لیے فقر کی شرط ہے۔

۔ایک حصہ مسکین کے لیے

۔ایک حصہ مسافر کے لیے، اس کا فقیر ہونا شرط ہے، ابن السبیل سے مراد وہ لوگ ہیں جو مباح سفر میں نکلے ہوئے ہوں اور ان کا مال ختم ہوا ہو، اور ان کے پاس اپنے گھر لوٹنے کے لیے سفر کے اخراجات نہ ہوں۔

مالِ فیٔ کی تقسیم کا حکم بھی قرآن مجید میں آیا ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ '' (الحشر ۷) اور اللہ نے بستی والوں سے جو بھی اپنے رسول کے ہاتھ لگایا تو وہ اللہ کا ہے اور رسول کا ہے اور (ان کے) قرابت داروں کا ہے اور یتیموں کا ہے اور مسکینوں کا ہے اور مسافر کا ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے کافروں کے مال میں سے بغیر جنگ کیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مال دیا ہے ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا: ایک حصہ رسول کا ہے اور باقی چار حصے رشتے داروں کے لیے ہیں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب کے لیے، یتیموں، مسکینوں اور ان مسافروں کے لیے ہے جن کے پاس اپنے گھر پہنچنے کے لیے سفر کے اخراجات نہیں ہیں، شرط یہ ہے کہ سفر معصیت اور گناہ کا نہ ہو۔ اسلام سے مرتد ہونے والے کی وراثت کے ساتھ مالِ فیٔ کا سا معاملہ کیا جائے گا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے کافر کو قتل کرنے والے مجاہد کا چھینا ہوا مال اسی قتل کرنے والے مجاہد کو دیا جائے گا، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو کسی کو قتل کرے تو اس کا چھینا ہوا مال اسی کے لیے ہے''۔ (بخاری: کتاب فرض الخمس، باب من لم یخمس الأسلاب ۳۱۴۱، یہ حدیث عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ہے) یہ مجاہد کے اس کام کا بدلہ ہے کہ اس نے مسلمانوں

کو ایک خطرناک کافر کے شرور سے نجات دی۔

کافر کا چھینا ہوا مال سے مراد اس کا کپڑا اور جنگ میں استعمال ہونے والے اس کے ہتھیار، اس کے پاس جو بھی مال، سونا یا زیب و زینت کی چیزیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مالِ غنیمت کو تقسیم کرنے سے پہلے مقتول کافروں کا چھینا ہوا مال الگ کیا جائے گا تا کہ یہ مال مجاہدین میں سے قتل کرنے والوں کو دیا جائے، پھر مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس کی حفاظت اور منتقلی کے اخراجات نکالے جائیں گے، پھر باقی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، چار حصے مجاہدین اور جہاد میں ان کے معاونین پر خرچ کیا جائے گا؛ شرط یہ ہے کہ یہ اعوان شروع جنگ ہی سے شریک رہے ہوں، جو جہاد ختم ہونے کے بعد شریک ہوں تو ان کو مالِ غنیمت میں سے دیا نہیں جائے گا، مجاہدین پر تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ گھڑ سوار کو تین حصے دیے جائیں گے اور پیادہ کو ایک حصہ۔

اگر جہاد میں عورتیں، بچے اور غلام شریک ہوں تو ان کو مالِ غنیمت میں سے اتنا دیا جائے گا کہ وہ مجاہد کے حصے کے بقدر نہ ہو جائے۔

باقی بچا ہوا ایک حصہ یعنی پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کا حصہ مسلمانوں کے مفادات مثلاً قلعوں کی تعمیر، سرحدوں کی حفاظت، قاضیوں، علماء اور دینی شعائر کو قائم کرنے والے لوگوں، ائمہ اور موذنین پر خرچ کیا جائے گا۔

کفارہ کے احکام

لفظ ’’کفارۃ‘‘، ’’کفر‘‘ سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں، مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے: ’’کَفَرَ الزَّارِعُ الْبَذْرَ بِالتُّرَابِ‘‘ کسان نے بیج کو مٹی سے ڈھانک دیا۔ کافر کو کافر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کفر اس کے پورے دل پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں کفارہ سے مراد اللہ کی طرف سے اپنے بندوں پر عائد کردہ تاوان ہے جب کوئی ان میں سے اللہ کے اوامر یا نواہی میں اس کی نافرمانی کرے؛ اس وجہ سے یہ کہنا ممکن ہے کہ دین میں کفارہ سے مراد وہ چیز ہے جو گناہوں کو ڈھانکتی ہے اور ان کو چھپاتی ہے۔

کفارہ چار قسم کے ہیں: (دیکھا جائے: اللباب۔محاملی ۱/۱۷۳) ظہار کا کفارہ، قتل کا کفارہ، رمضان کے دن میں عمداً جماع کرنے کا کفارہ، قسم کا کفارہ۔

۱۔ظہار کا کفارہ

ظہار یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی سے کہے: تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے، جب کوئی یہ بات کہے اور بیوی کو طلاق نہ دے تو اس پر ظہار کا کفارہ واجب ہوجاتا ہے۔ ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کردیا جائے، اگر یہ نہیں کرسکتا ہے تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے، اگر یہ بھی نہیں کرسکتا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، ہر مسکین کو اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد (ایک مد پاؤنا کلو ہوتا ہے) چاہے وہ گیہوں ہو یا چاول وغیرہ۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ’’وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ أَن يَّتَمَاسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِه، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ، فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَن يَّتَمَاسَّا فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِه وَتِلْكَ

حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ أَلِيْمٌ‘‘ (المجادلۃ ۳۔۴) اور جو لوگ اپنی عورتوں کو ماں کہہ بیٹھے ہیں پھر جو انھوں نے کہا اس سے رجوع کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذمہ دونوں (میاں بیوی) کے ملنے سے پہلے ایک گردن آزاد کرنا ہے، تمہیں اس کی نصیحت کی جاتی ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اس کی پوری خبر رکھتا ہے، پھر جو (غلام یا باندی) نہ پاسکے تو اس کے ذمہ دونوں کے ملنے سے پہلے ہی مسلسل دو مہینے کے روزے ہیں پھر جو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (کو مضبوط) رکھو اور یہ اللہ کی (طے کردہ) حدیں ہیں اور انکار کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۲۔قتل کا کفارہ

جو کسی کی جان بغیر حق کے لے اور اس کو قصاص میں قتل بھی کیا جائے تو اس پر کفارہ لازم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کردیا جائے، اگر یہ نہیں کرسکتا ہے تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے، اور قتل کے کفارہ میں کھلانا نہیں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالی کا فرمان ہے: ’’وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَئًا وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلٰى أَهْلِه، إِلَّا أَن يَّصَّدَّقُوْا، فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ، وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلٰى أَهْلِه، وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا‘‘ (النساء ۹۲) اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ مسلمان کو مار ڈالے سوائے اس کے کہ غلطی سے ایسا ہوجائے اور جس نے مسلمان کو غلطی سے ماردیا تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا (اس پر واجب ہے) اور خون بہا ہے جو اس کے گھر والوں کے حوالہ کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں اور اگر وہ (مقتول) تمہاری دشمن قوم سے تھا اور وہ خود مسلمان تھا تو صرف ایک مسلمان آزاد کرنا (واجب ہے) اور اگر (مقتول) اس قوم سے تھا جس کا تم سے معاہدہ ہے تو خون بہا ہے جو اس (مقتول) کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی واجب ہے پھر جس کو یہ میسر نہ آئے تو مسلسل دو مہینے کے روزے ہیں اللہ سے بخشوانے کے لیے، اور اللہ خوب جانتا ہے بڑی حکمت رکھتا ہے۔

۳۔ رمضان کے دن میں عمداً جماع کا کفارہ

جو رمضان کے کسی روزے کو عمداً جانتے ہوئے جماع کے ذریعہ توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے: ایک غلام یا باندی آزاد کیا جائے، اگر یہ نہیں کرسکتا ہے تو مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے، اگر یہ بھی نہیں کرسکتا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، ہر مسکین کو ایک مد اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے، چاہے وہ گیہوں ہو یا چاول وغیرہ (ایک مد سے مراد تین چوتھائی کلو ہے)۔

اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی روایت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اللہ کے رسول! میں ہلاک ہوگیا!۔ آپ نے دریافت کیا: تم کو کس چیز نے ہلاک کیا؟ اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے پاس باندی یا غلام ہے جسے تم آزاد کردو؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے دریافت کیا: کیا تم مسلسل دو مہینوں کے روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے پاس ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کی طاقت ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ نبی ﷺ کے پاس ایک بڑا برتن آیا جس میں کھجور تھا، آپ نے فرمایا: اس کو صدقہ کرو۔ اس نے دریافت کیا: کیا ہم سے زیادہ فقیر پر؟ کیوں کہ ان دو حرّوں کے درمیان کوئی بھی گھر والے ہم سے زیادہ اس کے ضرورت مند نہیں ہیں! نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپ کے سامنے کے دانت نظر آئے۔ پھر آپ نے فرمایا: جاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ (بخاری: کتاب کفارات الأیمان ۶۷۰۹، مسلم: کتاب الصیام، باب تغلیظ تحریم الجماع فی نهار رمضان ۱۱۱۱)

علماء نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان: ''جاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ'' کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اس شخص کی خصوصیت ہے۔ (یہ امام شافعی کی عبارت کا ماحصل ہے، اور رافعی وغیرہ اعیانِ شوافع نے یہی بات کہی ہے، دیکھا جائے: أسنی المطالب ۱/۴۲۶) اس لیے وہ فقیر اپنے گھر والوں پر خرچ نہیں کرسکتا جو کھلانے کی قدرت رکھتا ہو۔

کفارہ میں جس غلام کو آزاد کیا جائے؛ اس کا مسلمان ہونا اور ایسے عیوب سے پاک رہنا ضروری ہے جس سے کام میں واضح نقصان نظر آتا ہو، مثلاً اندگا یا لنگڑا یا مشلول، اور اس کے کسی بھی عضو میں کوئی کمی نہ ہو، چھوٹا بچہ ہو یا گنجا ہو یا ایسا بیمار ہو جس سے شفایابی کی امید ہو تو آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس سے کفارہ ادا ہوجائے گا۔

قتل، ظہار اور رمضان میں جماع کے کفارہ میں روزوں کا مسلسل دو مہینے رکھنا ضروری ہے، یعنی ایک بھی دن درمیان میں افطار نہ کرے، اگر کوئی دو مہینوں کے آخری دن افطار کرلے چاہے عذر یا بیماری کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو تو نئے سرے سے دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھنا واجب ہے، البتہ عورت کے لیے حیض کے دن مستثنی ہیں، اس سے تسلسل منقطع نہیں ہوگا، کیوں کہ مسلسل دو مہینوں تک پاک رہنا عورتوں کے لیے ممکن نہیں۔

رمضان کے مہینے میں دن کو عمداً جماع کرنے کی صورت میں کفارہ صرف شوہر پر ہے، عورت پر نہیں، اگر نذر کے روزوں میں یا رمضان کی قضا کے روزے میں جماع کرے تو کفارہ نہیں ہے، صرف اس دن کی قضا کرنا کافی ہے۔

۴۔ قسم کا کفارہ

قسم کا کفارہ وہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ میں صراحت کی گئی ہے:

۔ دس مسکینوں کو کھلایا جائے، ان میں سے ہر ایک کو اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد دیا جائے چاہے وہ گیہوں ہو یا چاول وغیرہ، جس طرح صدقہ فطر میں نکالا جاتا ہے

۔ یا ان کو کپڑے دیے جائیں، چاہے بہترین حال میں موجود مستعمل کپڑے ہوں۔ ایک فقیر کو قمیص، دوسرے کو پائجامہ اور تیسرے کو اندرونی کپڑے دیے جائیں تو جائز ہے، چاہے سائز صحیح نہ ہو، البتہ بہتر یہ ہے کہ جس کو دیا جائے اُسی کے سائز اور حجم کا دیا جائے اور لباس نیا ہو۔

۔ یا ایک غلام یا باندی کو آزاد کیا جائے، اس کا ایسے عیوب سے پاک ہونا ضروری ہے جن سے کام کرنے میں نقصان ہوتا ہو، اگر وہ کسی غلام کو آزاد کرنے، کھانا کھلانے اور پہنانے سے عاجز ہو تو قسم توڑنے کے بعد تین دنوں کے روزے رکھنا ضروری ہے۔

قسم کے ان تین کفارات میں اختیار ہے، اور جب چاہے مسلمان اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کرسکتا ہے، مثلاً کہے: اللہ کی قسم! میں زید کے گھر نہیں جاؤں گا۔ جب وہ زید کے گھر جانا چاہے تو پہلے کفارہ ادا کرے گا؛ غلام یا باندی کو آزاد کرے، یا مسکینوں کو کھلائے، یا پہنائے، پھر اس کے بعد زید کے گھر جائے۔ اگر کفارہ ادا نہ کرے اور زید کے گھر جائے تو وہاں جانے کے بعد دس مسکینوں کو کھانا کھلائے گا یا کپڑے پہنائے گا یا باندی غلام کو آزاد کرے گا، اگر ان میں سے کوئی کام نہیں کرسکتا ہے تو تین دنوں کے روزے رکھے گا، البتہ روزے اسی وقت بطور کفارہ رکھے جائیں گے جب قسم توڑی جاچکی ہوں، یعنی اسی وقت روزے رکھے جائیں گے جب قسم توڑی جاچکی ہو۔

جب فقیر یا مسکین کا لفظ کہیں استعمال کیا جائے تو دونوں کے معنی یکساں ہیں، اگر دونوں کا ایک ساتھ استعمال کیا جائے تو تھوڑا سا فرق ہے جس کی تفصیلات زکوۃ کے مستحقین میں گزرچکی ہیں۔

ان چار کفارات کو عظیم کفارات کہا جاتا ہے، چھوٹ کفارات کو فدیہ کہا جاتا ہے، جس کا تذکرہ اگلے باب میں آرہا ہے۔

فدیہ

(دیکھا جائے:''اللباب''محاملی ۱/۱۷۵)

فدیہ سے مراد کھانا یا بکری دینا ہے جس سے عبادت یا حج کے مناسک میں کمی کو پورا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

فدیہ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک مد ادا کیا جانے والا فدیہ

رمضان کا کوئی روزہ کسی عذر مثلاً حمل یا رضاعت یا بڑھاپے کی وجہ سے چھوڑا جائے، جن کی موجودگی میں روزہ رکھنا ممکن نہ ہو۔

اس کی مقدار رمضان کے ہر دن کے بدلہ ایک مد اپنے شہر کی معتاد غذا ہے جو فقراء کو دی جائے گی۔

اسی طرح قضا روزے کو دوسرے سال تک موخر کرنے کی صورت میں اتنی ہی مقدار میں فدیہ نکالنا واجب ہے، اگر کوئی بیماری کی وجہ سے رمضان کے تین دن روزے نہ رکھنے پر مجبور ہو اور دوسرے سال ان کی قضا کو موخر کردے تو اس قضا کے ساتھ ہر دن کے بدلہ اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد فقراء کو دینا واجب ہے۔

اگر دو سال قضا روزے کو موخر کرے تو ایک دن کے بدلے دو مد فدیہ دینا واجب ہے، اسی طرح جتنے زیادہ سال گزریں گے اتنے ہی زیادہ مد دینا ضروری ہے۔

مذکورہ تمام کفارات میں ایک مد فدیہ ہے۔ اسی طرح حج یا عمرہ کے احرام میں ایک بال نکالنے اور ایک ناخن تراشنے پر ایک مد فدیہ ہے۔ اگر تین بال نکالے جائیں اور تین ناخن تراشے جائیں تو ایک بکری ذبح کی جائے گی، اگر بال نکالنا یا ناخن تراشنا مقصود نہ ہو تو

ایک بال نکالنے پر یا ایک ناخن تراشنے پر ایک صاع فدیہ ہے، دو بال نکالے یا دو ناخن تراشے تو دو صاع فدیہ ہے، تین نکالے تو تین صاع، اسی طرح منیٰ میں ایک رات نہ گزارنے پر ایک مد فدیہ ہے، اسی طرح منی میں جمرات کو ایک کنکری کم مارنے پر ایک مد فدیہ ہے جب تین راتیں منی میں نہ گزارنے اور تین کنکریاں کم مارنے میں بکری ذبح کرنے کی نیت ہو، اگر اس کی نیت نہ کرے تو ایک رات منی میں نہ گزارنے کا فدیہ ایک صاع ہے اور ایک کنکری کم مارنے پر ایک صاع ہے۔

حرم کے نباتات میں سے کسی کو اکھاڑنے یا کاٹنے میں ایک مد فدیہ ہے اگر اس کی قیمت ایک مد ہو، اور حرم کے شکار کے کسی عضو کو کاٹنے میں ایک مد ہے اگر اس کی قیمت ایک مد بنتی ہو، مثلاً شکار کا ایک کان کاٹے، اگر کان کی قیمت ایک مد ہے تو ایک مد دے گا، کیوں کہ اگر شکار کی قیمت کم یا زیادہ ہے تو قیمت کے اعتبار سے فدیہ بھی مختلف ہو جاتا ہے، شکار سے مراد ہر جنگلی ماکول اللحم (یعنی جس کا گوشت کھایا جاتا ہے) جانور ہے۔

کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمہ کسی دن کا روزہ باقی ہو تو وارثین کو اختیار ہے کہ وہ اپنی میت کی طرف سے روزہ رکھیں یا ایک مد فدیہ دیں۔

اگر کوئی یہ نذر مانے کہ وہ پوری زندگی روزہ رکھے گا، اور وہ کسی دن افطار کرے تو اس پر ایک مد فدیہ دینا ضروری ہے، کیوں کہ اس کے لیے قضا کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔

۲۔ وہ فدیہ جس میں دو مد واجب ہوتے ہیں (یعنی سوا کلو) مثلاً کوئی احرام کی حالت میں دو بال نکالے یا دو ناخن تراشے، چاہے دو مکمل بال نکالے یا آدھا آدھا نکالے، یا دو مکمل ناخن تراشے یا آدھا آدھا تراشے، اس کی وضاحت ہم تھوڑی دیر قبل کر چکے ہیں۔

حرم میں شکار کرنے یا حالت احرام میں غیر حرم میں شکار کرنے، اسی طرح حرم مکہ کے درختوں میں سے کسی درخت کو کاٹنے کا فدیہ دو مد ہیں، جب شکار یا درخت کی قیمت دو مد ہوں۔

ہمیشہ فدیہ شہر کی معتاد غذا میں سے دیا جائے گا۔

منی کی راتوں میں سے دو راتیں منی میں نہ گزاری جائیں، یا جمرات کو دو کنکریاں کم

ماری جائیں تو اس کا فدیہ دو مد ہیں، جیسا کہ ہم نے ایک کنکری کم مارنے اور منی میں ایک رات کم گزارنے کے مسئلہ میں وضاحت کر دی ہے۔

۳۔ وہ فدیہ جس میں ایک بکری ذبح کی جاتی ہے، یہ بیس موقعوں پر ہوتا ہے:

(''اللباب'' محاملی ۱/۱۷۶)

احرام کی حالت میں یا حرم مکہ میں شکار کرے؛ اگر اس شکار کی کوئی مثل ہو تو اس کو ذبح کرنا واجب ہے، مثلاً ہرن کا شکار کیا جائے تو بکری ذبح کی جائے گی، اگر نیل گائے کو مارا جائے تو گائے ذبح کی جائے گی، اگر شتر مرغ مارا جائے تو اونٹ ذبح کی جائے گی۔

ان جانوروں کو حرم میں ہی ذبح کیا جائے گا اور وہیں گوشت تقسیم کیا جائے گا۔

احرام کی حالت میں یا مکہ میں شکار کا فدیہ بکری ذبح کرنا ہے اگر اس جیسا کوئی جانور نہ ہو، اسی طرح جماع کا فدیہ، بال منڈھانے، خوشبو استعمال کرنے، سلے ہوئے کپڑے پہننے، ناخن تراشنے، میقات سے احرام نہ باندھنے، غروب سے پہلے عرفہ سے نکلنے، طوافِ وداع چھوڑنے، طوافِ قدوم ترک کرنے، فرض طواف کی دو رکعت چھوڑنے کا فدیہ ایک بکری کو ذبح کرنا ہے۔

دم تمتع، دمِ قران، حج چھوٹ جانے، احصار (یعنی کسی وجہ سے احرام باندھنے کے بعد حج کے دنوں میں مکہ پہنچنے سے عاجز ہو جائے) حج فاسد کرنے، تین بال نکالنے کا فدیہ ایک بکری ہے، اسی طرح تین ناخن نکالنے کا حکم پورے ناخن نکالنے کا ہے یعنی اس کا فدیہ بھی ایک بکری ذبح کرنا ہے۔

ہر بال یا ہر ناخن کے بدلے ایک روزہ رکھنا بکری ذبح کرنے کا بدل ہو سکتا ہے، یہ بات جان لینی چاہیے کہ بال کا کوئی حصہ، اسی طرح ناخن کا حصہ بھی مکمل بال اور ناخن کے حکم میں ہے۔

اگر منی میں رات گزارنا عمداً چھوڑا نہ گیا ہو تو ذبیحہ کے بدلہ ایک صاع فدیہ دینا جائز ہے، ہر رات کے بدلہ ایک صاع فدیہ دے گا، ایک صاع تین کلو ہوتا ہے، جو شہر کی معتاد غذا میں سے دیا جائے گا منی میں کنکری مارنے کو چھوڑ دیا جائے تو بھی یہی حکم ہے۔

حرم کے شکار سے مراد جس میں فدیہ واجب ہوتا ہے، ہر وہ جانور ہے جو جنگلی ہو اور اس کا گوشت کھانا حلال ہو، مثلاً ہرن وغیرہ۔

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس پر روزے باقی ہوں تو وارثین کے لیے ہر دن کے بدلے اپنی شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد نکالنا جائز ہے۔

جو پوری زندگی روزے رکھنے کی نذر مانے تو وہ کسی دن روزہ نہ رکھنے کی صورت میں ایک مد فدیہ دے گا اور یہ اس پر واجب ہے۔

ذبح کیے ہوئے جانور کے فدیہ میں اسی طرح کا جانور قربانی کرنا واجب ہے جو اسی کی جنس کا ہو جس کا قتل حرم میں کیا گیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حرم میں ہرن کو مار دے تو اس پر بطور فدیہ بکری قربان کرنا واجب ہے، کوئی نیل گائے مار دے تو اس کے بدلہ شہری گائے ذبح کرنا ضروری ہے، کوئی جنگلی اونٹ کا شکار کرے تو اس پر لازم ہے کہ اونٹ ذبح کرے، اور فدیہ کے جانور کا گوشت حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا، قیمت دے کر کھانا خرید کر تقسیم کر سکتا ہے۔

ہر دن کے روزے کے بدلہ ایک مد کی مقدار میں فدیہ دے سکتا ہے۔

اگر حرم میں حج کے موسم میں شکار کیے ہوئے جانور جیسا کوئی جانور دستیاب نہ ہو تو اس کی قیمت نکالنا جائز ہے۔

حالتِ احرام میں جو کوئی جسم یا کپڑے پر خوشبو کا استعمال کرے تو ایک بکری ذبح کرنا اور اس کا گوشت حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

سیے ہوئے کپڑے یا پورے جسم کو ڈھانکنے والے کپڑے پہننے کی صورت میں ایک بکری ذبح کی جائے گی اور اس کا گوشت حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا، چاہے عذر کی وجہ سے ہی سلے ہوئے کپڑے پہنے۔

احرام کی حالت میں جماع کرنے سے حج فاسد ہو جاتا ہے اور اس پر ایک اونٹ فدیہ میں دینا ضروری ہو جاتا ہے، اگر بار بار جماع کرے تو جتنی مرتبہ جماع کیا ہے، اتنی

تعداد میں بکریوں کو فدیہ کے طور پر ذبح کرنا واجب ہے، اگر تحلل اول (یعنی پہلے دن رمی جمار، طوافِ افاضہ اور حلق؛ ان تینوں حج کے ارکان کی تکمیل) کے بعد جماع کرے تو حج فاسد نہیں ہوتا ہے، البتہ ایک بکری فدیہ میں دینا اور اس کا گوشت حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

حرم میں ایک بڑا درخت کاٹنے کا فدیہ گائے کا ذبیحہ ہے، چھوٹے درخت کو کاٹنے کا فدیہ ایک بکری ہے۔

حج کے مہینوں (شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن) میں مکہ والوں کے علاوہ دوسرے لوگ حج تمتع کریں یعنی حج کے ساتھ عمرہ کی بھی نیت کریں تو ان کا فدیہ ایک بکری ذبح کرنا ہے، اسی طرح حج قران کرنے والوں کا بھی یہی فدیہ ہے۔

جس کا حج چھوٹ جائے، مثلاً کوئی عید کے دن مکہ پہنچ جائے، اور اس کو وقوفِ عرفہ نہ ملے تو اس پر ایک بکری فدیہ ہے اور دوسرے سال حج کے لیے آنا ضروری ہے۔

احصار کے فدیہ سے مراد یہ ہے کہ حج کا احرام پہننے کے بعد مکہ سفر کرنے سے روک دیا جائے، یا غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر احرام باندھے، یا بیوی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر حج کی نیت کرے، تو ان تینوں پر ضروری ہے کہ وہ احرام کی نیت کھول دیں، بال چھوٹے کریں، اور آنے سال حج کی قضا کے ذبح کریں، چاہے فرض حج کا احرام ہو یا سنت حج کا۔

کوئی اپنا حج یا عمرہ جماع کے ذریعہ فاسد کر دے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام مناسک پورا کرے اور ایک اونٹ فدیہ کے طور پر ذبح کرے اور اس کا گوشت مکہ کے فقیروں پر تقسیم کرے اور دوسرے سال اپنے حج یا عمرہ کی قضا کرے۔

سر، داڑھی اور بھوں کے بالوں کو تیل لگانے کا فدیہ ایک بکری ہے، البتہ جسم کے دوسرے حصوں میں تیل لگانے پر فدیہ نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

اسلام کا تیسرا رکن

صیام یعنی روزہ

صیام کے لغوی معنی کھانے یا پینے یا کسی دوسری چیز سے رکنے اور باز رہنے کے ہیں، گفتگو سے باز رہنے کو بھی لغت میں صوم کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں مریم علیہا السلام کا قول نقل کیا گیا ہے: ''إني نذرت للرحمان صوما'' (مریم۲۶)

عربی زبان میں کہا جاتا ہے: ''**صَامَتِ الْخَيْلُ**''۔ جب گھوڑا کھانے سے باز رہتا ہے، شاعر کہتا ہے:

خَيْلٌ صِيَامٌ وَخَيْلٌ غَيْرُ صَائِمَةٍ   تَحْتَ الْعَجَاجِ، وَأُخْرٰى تَعْلِكُ اللُّجَمَا

چند گھوڑے کھانے سے باز رہنے والے ہیں اور چند باز رہنے والے نہیں ہیں غبار کے نیچے، اور دوسرے گھوڑے ایسے ہیں جو لگاموں کو چبا رہے ہیں۔

(یہ شعر نابغہ ذبیانی کا ہے، دیکھا جائے: دیوان النابغۃ ۱/ ۱۱۵، ''خزانۃ الأدب'' بغدادی ۲/۴۲)

شریعت کی اصطلاح میں صیام کہتے ہیں؛ پورا دن فجر سے لے کر غروب تک روزہ توڑنے والی چیزوں سے باز رہنے کو۔

روزے فرض ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''**فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**'' (البقرۃ ۱۸۵) پس جو تم میں سے اس (رمضان کے) مہینہ میں حاضر رہے تو وہ اس کے روزے رکھے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ**'' (البقرۃ ۱۸۳) تم پر روزے فرض

کر دیے گئے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ....''۔ ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے روزوں کا بھی ذکر کیا۔ (بخاری: کتاب الإیمان، باب فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''بنی الإسلام......'' ۸، مسلم: کتاب الإیمان، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''بنی الإسلام علی خمس'' ۴۶)

رمضان کے روزے مسلمانوں پر فرض ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

روزے صحیح ہونے کے لیے چار شرائط ہیں: مسلمان ہو، عاقل ہو، حیض اور نفاس سے پورا دن پاک ہو، روزے کا وقت معلوم ہو۔

اس لیے کافر، پاگل، حائضہ اور نفاس والی پر روزے فرض نہیں ہیں۔

روزے رمضان کے مہینہ میں ہونا ضروری ہے، نہ اس سے پہلے فرض ہیں اور نہ اس کے بعد، اور عید الفطر کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔

روزے فرض ہونے کی شرطیں

روزے فرض ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں: (اللباب ۱/ ۱۷۷، کفایۃ الأخیار ۱/۲۹۳)

- مسلمان ہو
- مکلّف ہو یعنی بالغ اور عاقل ہو
- روزے رکھنے کی طاقت ہو

کافر سے دنیا میں روزے رکھنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، البتہ آخرت میں روزے چھوڑنے پر اس کو سزا دی جائے گی۔ (کیوں کہ کافر شریعت کے فروعی احکام کے مخاطب ہیں) بچہ، پاگل، بیہوش اور اپنے ہوش میں نہ رہنے والے پر روزے فرض نہیں ہیں۔ اسی طرح ایسے بوڑھے پر روزے فرض نہیں ہیں جس میں طاقت نہ ہو، وہ اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد ہر دن کے بدلہ فدیہ ادا کرے گا اور فقراء کو دے گا۔

روزے کے ارکان تین ہیں:

۱۔رات کو ہر دن کے فرض روزے کی نیت کرے، مالکیہ نے رمضان کی پہلی رات پورے مہینہ کے روزوں کو ایک ہی نیت سے رکھنے کی اجازت دی ہے۔البتہ نفل یا سنت روزوں میں زوال سے پہلے نیت کرنا جائز ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے روزہ توڑنے والا کوئی عمل نہ کیا ہو۔

۲۔خود روزہ رکھنے والا

۳۔روزہ توڑنے والے امور کو چھوڑ دے یعنی کھانا، پینا، عمداقئے، عمدا جماع...... رمضان کا پورا دن ان چیزوں سے اجتناب کیا جائے گا۔

روزے کی چار قسمیں ہیں: فرض، سنت، مکروہ اور حرام، جن کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔فرض روزے:

اس کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس میں تسلسل شرط ہے، مثلاً رمضان کے روزے، ظہار، قتل، رمضان کے مہینہ میں عمدا جماع کے کفارے کے روزے اور نذر کے وہ روزے جن کو مسلسل رکھنے کی نذر مانی ہو۔

دوسری قسم: وہ فرض روزے جن کو الگ الگ رکھنا واجب ہے، مثلاً حجِ تمتع اور حج قران کے روزے جن کو حج میں قربانی کا جانور یا اس کی قیمت نہ ملے، تو اس پر دس روزے فرض ہوجاتے ہیں؛ تین حج میں یعنی پانچ، چھ اور سات ذی الحجہ کو مکہ میں، (یا چھ، سات، آٹھ ذی الحجہ کو جیسے کہ باجوری وغیرہ نے کہا ہے) اور سات روزے اپنے گھر لوٹنے کے بعد۔

اگر کوئی نذر مانے کہ وہ الگ الگ روزے رکھے گا تو اس کے لیے مسلسل روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔

تیسری قسم: وہ فرض روزے جن کو مسلسل رکھنا بھی جائز ہے اور الگ الگ

رکھنا بھی، مثلاً رمضان کے فرض روزے کی قضا، حج یا عمرہ میں جماع کا کفارہ، قسم کا کفارہ، سر منڈھانے کا فدیہ، شکار کرنے کا فدیہ، حرم کے درخت کاٹنے کا فدیہ، سلے ہوئے کپڑے پہننے یا خوشبو استعمال کرنے کا فدیہ، احصار کا فدیہ، حالتِ احرام میں ناخن تراشنے یا سر اور داڑھی کے بالوں میں تیل لگانے کا فدیہ، جو نذر مانے کہ وہ دس دن روزے رکھے گا، اور مسلسل رکھنے یا الگ الگ رکھنے کی قید نہ لگائے تو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے۔

مسئلہ: جب کسی مسلمان کا انتقال ہوجائے اور اس پر ظہار یا قتل یا رمضان کے مہینہ میں صبح کے وقت عمداً جماع کرنے کے کفارہ کے روزے ہوں جن میں مسلسل دو مہینے روزے رکھنا واجب ہے، اور اس کے رشتے داروں میں سے اس کے بدلہ میں روزے ادا کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر مسلسل دو مہینے روزے رکھنا لازم نہیں ہے، بلکہ وہ دو مہینوں کے روزے الگ الگ کر کے رکھ سکتا ہے۔

۲۔سنت روزے:

اس کی قسمیں بہت سی ہیں، کیوں کہ شریعت نے کثرت سے روزے رکھنے کی ترغیب دی ہے، سنت روزے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔پیر اور جمعرات کے روزے

۲۔اشہرِ حرم؛ ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے روزے

۳۔یوم عرفہ کا روزہ اس کے لیے جو حج نہ کررہا ہو

۴۔ذی الحجہ کے شروع کے نو دنوں کے روزے

۵۔جو محرم کے شروع دس دن کے روزے نہ رکھے اس کے لیے نویں محرم کا روزہ جس کو تاسوعاء کہا جاتا ہے۔

۶۔دس محرم کا روزہ، جس کو عاشوراء کہا جاتا ہے

۷۔ایک دن روزہ، ایک دن افطار، یہ صیامِ داودی کے نام سے مشہور ہے۔

۹۔ایک دن روزہ اور دو دن افطار، اس طرح روزے رکھنے کا رسول اللہ ﷺ نے

عبداللہ بن عمرو بن عاص کو حکم دیا تھا۔ (مسلم؛ کتاب الصیام، باب النھی عن صوم الدھر لمن تضرر بہ ۲۰۳۶)

۹۔اس دن کا روزہ جس دن کھانے کو کچھ نہ ملے، رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہے جب آپ نے اپنے گھر والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے کہا؛ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''میں روزے سے ہوں''۔ (مسلم: کتاب الصیام، باب جواز صوم النافلۃ بنیۃ من النھار قبل الزوال ۲۰۲۲) شرط یہ ہے کہ یہ زوال سے پہلے ہو۔

۱۰۔شعبان کے روزے

۱۱۔شوال کے چھ روزے، افضل یہ ہے کہ عید الفطر کے فوراً بعد رکھے جائیں۔

۱۲۔ایام بیض کے روزے؛ یعنی ہر قمری مہینے کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے، ان دنوں میں دن بڑے روشن رہتے ہیں اور چاندنی رات رہتی ہے۔

۱۳۔ایام سود کے روزے؛ یہ وہ دن ہیں جن کی راتیں تاریک رہتی ہیں، یہ اٹھائیسویں، انتیسویں اور تیسویں تاریخ کے روزے ہیں۔

۱۴۔ ہر مہینے تین روزے، مثلاً پہلے دن، گیارہویں دن اور اکیسویں دن، ہر مہینہ تین روزے رکھنا سنت موکدہ ہے۔

یہ تمام روزے صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

۳۔مکروہ روزے: (اللباب۔محاملی ۱/۱۷۹)

مکروہ روزے دس ہیں: مریض، مسافر، حاملہ عورت، دودھ پلانے والی، بہت ہی بوڑھے آدمی کا روزہ رکھنا، اگر روزے سے ان کو مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہو، کیوں کہ بہت ہی زیادہ مشقت کے ساتھ روزہ رکھنا مریض، مسافر، حاملہ عورت اور دودھ پلانے والے کے حق میں حرمت تک پہنچا دیتا ہے۔

اسی طرح اس شخص کے لیے سنت روزے رکھنا مکروہ ہے جس پر فرض روزے ہوں، بلکہ فرض روزوں کی قضا کی مہلت بڑی ہی تنگ ہو تو اس صورت میں سنت روزے رکھنا حرام ہو جاتے ہیں، مثلاً رمضان آنے میں صرف تین دن باقی ہوں، اور اس کے ذمہ سابقہ رمضان

کے تین روزے باقی ہوں تو اس صورت میں اس پر فرض روزوں کی قضا کرنا واجب ہے۔

صرف جمعہ، یا صرف سنیچر کا روزہ رکھنا مکروہ ہے، جب کوئی سبب نہ ہو، اگر کسی فرض روزے کی قضا رکھنا ہو تو ان دنوں میں رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یا نذر کے روزے ہوں، مثلاً کوئی جمعہ کے دن روزہ رکھنے کی نذر مانے، یا ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کی نذر مانے اور روزہ رکھنے کا دن جمعہ کا آئے تو اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔

اسی طرح اس شخص کے لیے ہر دن روزہ رکھنا مکروہ ہے جس کو نقصان کا اندیشہ ہو۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے حج میں عرفہ کا روزہ نہیں رکھا۔ (بخاری: کتاب الحج، باب صوم یوم عرفۃ ۱۵۸۶، مسلم: کتاب الصیام، باب استحباب الفطر للحاج بعرفات یوم عرفۃ ۱۹۵۹) اس سے بعض فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ حاجی کے لیے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھنا اولی اور افضل ہے۔

۴۔حرام روزے:

عید الفطر، عید الأضحیٰ اور ایام تشریق کے تین دنوں کے روزے رکھنا حرام ہے، چاہے حج تمتع کرنے والا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ (مسلم: کتاب الصیام، باب تحریم صوم أیام التشریق ۱۱۴۰، ۱۱۴۱)

حائضہ اور نفاس والی کے لیے روزہ رکھنا حرام ہے، اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے، اسی طرح شک کے دن کا روزہ رکھنا حرام ہے، یہ شعبان کا تیسواں دن ہے جب اس سے پہلے والی رات میں چاند دیکھنے کے سلسلہ میں گفتگو ہوا اور رویت ثابت نہ ہوئی ہو۔

شک کے دن کا روزہ صرف ایک سبب سے رکھنا جائز ہے، مثلا! پیر کا دن ہو اور روزہ رکھنے والا پیر کے دن روزہ رکھنے کا عادی ہو۔

اسی طرح شعبان کے نصفِ ثانی کے روزے رکھنا حرام ہیں، جس کی ابتدا سولہویں تاریخ سے ہوتی ہے، وہ شخص رکھ سکتا ہے جس نے نصفِ اول کے روزے رکھے ہوں۔ (یہ شرط نہیں ہے، بلکہ پندرہویں تاریخ کا روزہ رکھنا کافی ہے، اگر اس کے بعد ایک دن بھی افطار کرے چاہے کسی عذر کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ دیکھا جائے: نیل الرجا شرح سفینۃ النجاۃ) یا فرض روزوں کی قضا ہو۔

روزہ توڑنے والے امور

اس باب میں ان امور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں: (دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۲۹۶، ''اللباب'' محاملی ۱/ ۱۸۰)

۱۔ کوئی ایسی چیز پیٹ (جوف) میں پہنچ جائے جس کا کوئی مادی جسم ہو، چاہے کھانے یا پینے سے ہو یا کسی آلہ سے ہو۔

۲۔ کلی کرتے وقت یا ناک میں پانی لیتے وقت مبالغہ کرنے کی وجہ سے پانی پیٹ میں پہنچ جائے، عطر کی خوشبو سونگھنے یا کھانے کا مزا چکھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا چاہے اس کا اثر حلق میں پہنچ جائے، البتہ شرط یہ ہے کہ ذائقہ حلق سے تجاوز نہ کر جائے۔ اسی طرح سرمہ لگانے یا بدن میں تیل لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔

جوف سے مراد معدہ، دو آنتیں اور دماغ ہیں۔ اگر سر زخمی ہو جائے اور اس کی دوا دماغ تک پہنچ جائے، یا پنڈلی میں زخم ہو جائے اور اس کی دوا گوشت تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹتا ہے۔

۳۔ عمداً قئے کیا جائے، اگر روزے دار کو یقین ہو کہ کوئی چیز اس کے معدہ میں لوٹ گئی ہے۔

۴۔ عمداً منی نکالی جائے، چاہے لمس سے ہو یا بوسے دینے سے ہو یا لپٹنے سے ہو۔ البتہ نیند کے دوران منی نکل جائے یا صرف دیکھنے سے خارج ہو جائے یا سوچنے سے تو روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔

۵۔ عمداً اپنے اختیار سے یہ جانتے ہوئے اگلی شرمگاہ میں جماع کرے کہ رمضان کے دن میں ایسا کرنا حرام ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔

اگر جماع بھول کر یا مجبور ہو کر یا اس کی حرمت کو نیا نیا مسلمان ہونے کی وجہ سے نہ جانتے ہوئے کرے تو اس کا روزہ باطل نہیں ہوتا ہے۔

پچھلی شرمگاہ میں جماع کرنے کا حکم اگلی شرمگاہ میں جماع کرنے کا ہی ہے، اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگلی شرمگاہ میں جماع کرنے سے یہ مندرجہ ذیل امور میں مختلف ہے:

۱۔ اس سے بیوی اپنے اُس سابقہ شوہر کے لیے حلال نہیں ہوتی ہے جس نے تین طلاق دی ہو، کیوں کہ پچھلی شرمگاہ میں جماع صحیح جماع یا نکاح صحیح نہیں ہے۔

۲۔ اس سے مسلمان شادی شدہ نہیں ہوتا ہے

۳۔ اس سے باکرہ لڑکی ثیبہ نہیں ہوتی ہے

۴۔ اس سے نامردی زائل نہیں ہوتی ہے یعنی مرد کا عورت کے ساتھ جماع کرنے سے عاجزی ختم نہیں ہوتی ہے

۵۔ ایلاء میں عورت کا دعوی ساقط نہیں ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

جو جماع کے ذریعہ اپنا روزہ توڑ دے تو اس روزے کی قضا کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہے، اور وہ گنہ گار بھی ہوگا، اگر کوئی قضا روزے کو جماع کے ذریعہ توڑ دے تو اس پر صرف اس کی قضا ہے، کفارہ لازم نہیں ہے، نذر کے روزے کو جماع کے ذریعہ توڑ دے تو بھی اس پر کفارہ لازم نہیں ہے، بلکہ اس کی قضا کرنا کافی ہے۔

جو رمضان میں جماع کے ذریعہ اپنا روزہ توڑ دے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ سورج غروب ہونے تک روزہ توڑنے والے امور سے بچا رہے، اس لیے نہ کھائے، نہ پیے اور نہ اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرے۔ اسی طرح کوئی رات میں رمضان کے روزے کی نیت کرنا بھول جائے تو وہ بھی سورج غروب ہونے تک روزہ توڑنے والی چیزوں سے باز رہنا ضروری ہے، اس کو روزے دار شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کی قضا بھی ہے۔

جو فجر کے وقت یہ گمان کرتے ہوئے کھائے کہ ابھی رات باقی ہے، پھر اس کے بعد

معلوم ہوجائے کہ اس نے فجر کی اذان کے بعد کھایا تھا؛ تو اس پر ضروری ہے کہ کھانے پینے اور جماع سے غروب تک باز رہے، لیکن اس کا روزہ شمار نہیں ہوگا اور اس پر قضا واجب ہے۔ جو یہ گمان کرتے ہوئے کھائے کہ سورج غروب ہوگیا ہے، پھر واضح ہوجائے کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا ہے تو اس پر بقیہ دن مفطرات سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی قضا اس پر لازم ہے۔

ناک میں پانی لینے اور کلی میں مبالغہ کرنے کی وجہ سے پانی پیٹ میں چلا جائے تو وہ پورا دن کھانے پینے سے باز رہے گا، البتہ اس کا روزہ شمار نہیں ہوگا، اور اس کی قضا واجب ہے، جن حالات میں ہم نے کھانے پینے سے باز رہنا ضروری بتایا ہے ان حالات میں روزے کا حکم نہیں رہتا، لیکن اس دوران اپنی بیوی سے جماع کرنے کی صورت میں وہ گنہ گار ہوگا، البتہ اس پر کفارہ لازم نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

رمضان کے مہینہ میں افطار کے احکام

(دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' ۲/۲۵۳، ''اللباب'' محاملی ۱/۱۸۱)

رمضان میں افطار کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔ قضا کے ساتھ افطار واجب ہے، یہ حیض اور نفاس والی عورت کے لیے ہے۔

۲۔ قضا واجب ہونے کے ساتھ افطار جائز ہے، یہ اس مریض کے لیے ہے جس کو روزہ رکھنا دشوار ہو، اور مسافر کے لیے جس کی مسافت ۱۶ فرسخ سے زیادہ ہو۔

۳۔ ایسا افطار جس سے فدیہ اور قضا دونوں واجب ہوتا ہے؛ یہ اس شخص کے لیے ہے جو کسی ڈوبتے کو بچائے، حاملہ عورت اور اس عورت کے لیے جو اپنے بچہ کو دودھ پلا رہی ہو جب اس کو اپنے بچہ پر اندیشہ ہو، اگر وہ صرف اپنی جان کے خوف کی وجہ سے افطار کرے تو فدیہ کے بغیر قضا واجب ہے، جس افطار سے دو لوگوں کو فائدہ ہوتا ہو تو اس پر فدیہ لازم ہے، جس کی مقدار اپنے شہر کی معتاد غذا میں سے ایک مد ہے، اور اس پر قضا واجب ہے، اسی طرح جو رمضان کے ایک دن کی قضا کو دوسرا رمضان آنے تک موخر کرے تو اس پر ایک مد غلہ دینا واجب ہے، اگر اور ایک سال موخر کرے تو اس پر قضا کے ساتھ دو مد واجب ہے۔

۴۔ روزہ چھوڑنے پر قضا کے بغیر فدیہ واجب ہوتا ہے: کوئی بوڑھا روزہ کی طاقت نہ رکھنے والا ہو یا ایسا بیمار ہو جس کی شفایابی کی امید نہ ہو، تو ان دونوں پر رمضان کے ایک دن کے روزے کا فدیہ ایک مد ہے۔

۵۔ ایسا افطار جس سے قضا واجب ہے، فدیہ نہیں ہے؛ کوئی بیہوش ہوجائے، اور اس کا دماغ ماووف ہو، اسی طرح اس شخص کا افطار جو رات کو نیت کرنا بھول جائے۔

۶۔ ایسا افطار جس سے نہ قضا واجب ہے اور نہ فدیہ؛ یہ مجنون کا افطار ہے، کیوں کہ وہ جنون کے دوران مکلّف ہی نہیں ہے۔

روزے کے مکروہات

رمضان یا غیر رمضان میں روزہ کے دوران گالی دینا مکروہ ہے، بلکہ حرام ہے، اگر کوئی گالی دے تو کہے: میں روزے سے ہوں۔ (یہ حدیث کے الفاظ ہیں؛ بخاری: کتاب الصیام، باب ھل یقول إنی صائم إذا شتم ۱۹۰۴) سورج غروب ہونے کے بعد افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت اس وقت تک بھلائی میں رہے گی جب تک وہ افطار میں جلدی کریں گے''۔ (بخاری: کتاب الصوم، باب تعجیل الإفطار ۱۸۷۰، مسلم: کتاب الصیام، باب فضل السحور وتأکید استحبابہ ۱۹۰۳)

منہ میں تھوک جمع کرنا مکروہ ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ جمع کردہ لعاب نگلنے سے روزہ باطل ہوجاتا ہے۔ کھانا چکھنا بھی مکروہ ہے، پچھنا لگوانا بھی مکروہ ہے، پچھنا لگوانے والے کے لیے بھی مکروہ ہے اور جس کو پچھنا لگوایا جائے اس کے لیے بھی مکروہ ہے، بغیر شہوت کے بوسہ دینا مکروہ ہے، بعض فقہاء نے اس کو مکروہات میں شمار کیا ہے اور بعضوں نے خلاف اولی کہا ہے۔

حمام میں داخل ہونا بھی مکروہ ہے، کیوں کہ اس سے کمزوری پیدا ہوتی ہے، زوال کے بعد مسواک اور برش استعمال کرنا بھی مکروہ ہے، اپنی بیوی یا باندی پر شہوت کی نظر ڈالنا مکروہ ہے، روزے کا مطلب تو شہوتوں سے باز رہنا ہے، چاہے کان سے سنی جانے والی شہوتیں ہوں یا آنکھوں سے دیکھی جانے والی، یا خوشبو سونگھا ہو یا کپڑے ہوں، البتہ جن کی طرف دیکھنا حرام ہے ان کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا حرام ہے چاہے روزے دار کے لیے ہو یا غیر روزے دار کے لیے، لیکن روزے کی حالت میں بڑا سخت گناہ ہے۔

جوف تک پہنچے لیکن روزہ نہ ٹوٹتا ہو

جو چیز جوف تک کسی بھی منفذ مفتوح (کھلے راستے) سے پہنچے، لیکن اس کو جسم کے

اندر پہنچانے کا ارادہ نہ ہو، مثلاً بھول جائے یا ناواقف ہو یا کھانے پر مجبور کیا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔

لعاب نگلنے اور منہ میں جمع ہونے والا سائل نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے، چاہے وہ اس کو نکال سکتا ہو یا نہ نکال سکتا ہو، کیوں کہ لعاب منہ سے نکلتا ہے۔ راستے کے غبار اور آٹے کی چھننی سے روزہ نہیں ٹوٹتا، مکھی اڑکر انسان کے ارادہ کے بغیر پیٹ میں پہنچ جائے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، کیوں کہ روزے دار کے لیے اس سے بچنا مشکل ہے۔

☆☆☆☆☆

اعتکاف

شریعت میں اعتکاف کہتے ہیں مسجد میں عبادت کی نیت سے ٹھہرنے کو۔

اعتکاف کے دلائل بخاری اور مسلم میں موجود ہیں، امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے درمیانی عشرہ کا اعتکاف کیا، پھر آخری عشرہ کا اعتکاف کیا، اور اس کی پابندی کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دی۔ (بخاری: کتاب الأذان، أبواب صفة الصلاة، باب السجود على الأنف ۱۹۳۹، مسلم: کتاب الصیام، باب فضل لیلة القدر ۲۰۶۲)

اعتکاف کا حکم قرآن کریم سے بھی ثابت ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ '' (البقرۃ ۱۸۷) اور تم ان (عورتوں) سے ہم بستری نہ کرو، جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہوں۔

امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اعتکاف سنت ہے، اور رمضان کے آخری عشرہ میں شب قدر کی تلاش میں سنت موکدہ ہے۔

اعتکاف کے ارکان چار ہیں: (دیکھا جائے: ''کفایة الأخیار'' ۱/ ۳۰۷، ''روضة الطالبین'' ۲/ ۲۸۰) مسجد میں ہی ٹھہرے رہنا، اعتکاف کی نیت، اعتکاف کرنے والا، اور مسجد جہاں اعتکاف کیا جاتا ہے۔

مسجد میں اعتکاف کرنے والے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، عاقل ہو، حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاک ہو (یعنی وضو اور غسل کی ضرورت نہ ہو)، کیوں کہ جنبی، حیض اور نفاس والی عورت کے لیے اعتکاف نہیں ہے۔

اعتکاف طواف اور تحیة المسجد کی طرح ہے، یعنی ان دونوں کے لیے مسجد کا پایا جانا شرط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع مسجد میں اعتکاف کیا، جامع مسجد سے مراد وہ مسجد ہے

جہاں مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں، اسی وجہ سے جامع مسجد میں اعتکاف کرنا افضل ہے۔

عمداً جماع سے باطل ہوجاتا ہے، یہ بھی جاننا چاہیے کہ اعتکاف کے دوران جماع کرنا حرام ہے۔ اپنی شرمگاہ کو اس انداز میں چھوکر منی نکالنے سے اعتکاف باطل ہوجاتا ہے جس سے وضو ٹوٹتا ہے، کیوں کہ اعتکاف عبادت ہے جس میں شہوات ترک کرنا مقصود ہے۔

اعتکاف شراب پینے سے باطل ہوتا ہے، کیوں کہ اعتکاف عبادت ہے جو نشے یا عقل کے ختم ہونے کے مناسب ہے۔ اسی طرح کسی شرعی عذر کے بغیر مسجد سے نکلنے سے بھی اعتکاف باطل ہوجاتا ہے۔ (اس سے تسلسل منقطع ہوجاتا ہے، اور اس پر دوبارہ اعتکاف شروع کرنا ضروری ہے۔ دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۳/ ۲۲۹) اسی طرح حد نافذ کرنے کے لیے مسجد سے نکلنے سے بھی اعتکاف باطل ہوجاتا ہے۔ مرتد ہونے اور کلمہ کفر بکنے سے بھی اعتکاف باطل ہوجاتا ہے، حیض یا نفاس آنے سے عورت کا اعتکاف باطل ہوجاتا ہے، چاہے وہ اپنے لیے متعین مدت مسجد میں گزارنے کے لیے طے کرے۔

مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے مسجد سے نکلنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا ہے:

- کھانا کھانے کے لیے نکلنے سے، چاہے مسجد میں کھانا ممکن ہو۔
- پانی پینے کے لیے نکلنے سے، اگر مسجد میں پانی مہیا نہ ہو۔
- اپنی بشری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نکلنے سے، اس سے مسجد کے صحن میں موجود بیت الخلا میں استنجا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ وہ اپنی بشری ضرورت اپنے گھر میں پوری کرسکتا ہے، چاہے چھوٹا استنجا ہو یا بڑا استنجا۔
- مسجد سے قریب قریب اس کے حدود سے باہر موجود اذان خانہ سے اذان دینے کے لیے نکلنے سے، اگر وہ خود اس مسجد کا موذن ہو۔
- جنابت پیش آنے، یا حیض یا نفاس آنے کی صورت میں اعتکاف کو ختم کرنا واجب ہے، کیوں کہ ان حالات میں مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے۔
- اگر معتکف پر بیہوشی طاری ہوجائے یا بیماری لاحق ہوجائے جس کی وجہ سے مسجد

میں ٹھہرنا دشوار ہو جائے تو اس کو نکلنے کی رخصت ہے، اسی طرح کسی کو جنون لاحق ہو جائے تو بھی نکلنے کی اجازت ہے۔

۔کسی کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو اپنے اوپر عدت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے مسجد سے نکلے گی۔

۔معتکف قئے کرنے کے لیے مسجد سے نکلے گا۔

۔اگر نکلنے پر مجبور کیا جائے تو مسجد سے نکلے گا، جب مسجد میں ٹھہرنے کی صورت میں ظلم ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی معتکف نکل سکتا ہے۔

۔مسجد کے گرنے یا اس کی چھت گرنے کا اندیشہ ہو تو مسجد سے نکل جائے گا۔

۔جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد سے نکلے گا، لیکن اس سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ مسجد جامع میں اعتکاف کر سکتا تھا۔

۔کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کی تدفین کے لیے کوئی دوسرا شخص نہ ہو تو معتکف مسجد سے نکلے گا۔

۔گواہی دینے کے لیے مسجد سے معتکف نکل سکتا ہے جو فرض عین ہے، کیوں کہ گواہی اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں دے سکتا ہے، اور اس وجہ سے اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔

۔معتکف جہاد کے لیے مسجد سے نکلے گا جب اپنے شہر کا دفاع مقصود ہو اور شہر دشمنوں کے قبضہ میں جانے کا اندیشہ ہو اگر وہ نہ نکلے۔

۔احتلام کا غسل کرنے کے لیے مسجد سے نکلے گا، اسی طرح میت کو غسل دینے، نماز جنازہ پڑھنے اور تدفین کے لیے مسجد سے نکلے گا اگر کوئی دوسرا میت سے متعلق ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے والا نہ ہو۔

جب کوئی ان اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے مسجد سے نکلے تو کام ہوتے ہی فوراً مسجد واپس آنا ضروری ہے۔

اگر اعتکاف کے لیے کوئی مدت متعین نہ کی ہو تو وہ جب بھی کسی فرض نماز کی

جماعت کے ساتھ ادائیگی کے لیے داخل ہو تو اعتکاف کی نیت کر سکتا ہے، اور اس سے جماعت کی نماز کا ثواب بھی ملے گا اور اعتکاف کی نیت کا بھی اجر ملے گا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''جو رمضان کے آخری عشرہ کے اعتکاف میں نبی ﷺ کی اقتدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اکیسویں رات سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائے، تاکہ آخری عشرہ میں سے کوئی بھی حصہ چھوٹ نہ جائے، اور عید کی رات سورج غروب ہونے کے بعد نکلے، چاہے مہینہ تیس کا ہو یا اس سے کم کا، افضل یہ ہے کہ عید کی رات مسجد میں گزارے تاکہ وہیں عید کی نماز پڑھی جائے، یا وہیں سے عید کی نماز کے لیے عید گاہ چلا جائے، اگر لوگ عید کی نماز عید گاہ میں پڑھتے ہوں''۔

(''روضۃ الطالبین'' حاشیۃ البلقینی ۲/۲۷۱)

☆☆☆☆☆

حج وعمرہ

حج کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور شریعت میں حج سے مراد مخصوص اوقات میں مخصوص نیت سے مخصوص اعمال کی ادائیگی کے لیے بیت اللہ کا قصد کرنا ہے۔

عمرہ کے لغوی معنی زیارت کے ہیں یا کسی آباد جگہ کا قصد کرنے کے ہیں۔ اور شریعت میں مناسک کی ادائیگی کے لیے کعبہ شریف کی زیارت کو عمرہ کہتے ہیں۔

حج اور عمرہ کے فرض ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ'' (البقرۃ۱۹۶) اور حج وعمرہ اللہ کی خاطر مکمل کرو۔

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً'' اور اللہ کی خاطر ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو وہاں جانے کی استطاعت رکھتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے......''۔ اسی طرح حج فرض ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

حج اور عمرہ افضل عبادات میں سے ہیں، کیوں کہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان''۔ پوچھا گیا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد''۔ پوچھا گیا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: ''حج مبرور''۔ (بخاری: کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور ۱۵۱۹، مسلم: کتاب الایمان، باب بیان کون الإیمان باللہ تعالی أفضل الأعمال ۸۳) یعنی مقبول حج۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک عمرہ سے دوسرا عمرہ ان دونوں کے درمیان کفارہ ہے، اور حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے''۔ (بخاری:

کتاب العمرۃ، باب العمرۃ ۱۷۷۳، مسلم: کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرۃ ۱۳۴۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو حج کرے تو نہ فحش بات کرے اور نہ کوئی گناہ کا کام کرے تو ایسے لوٹتا ہے جیسے اس دن ہوتا ہے جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا ہو''۔ (بخاری: کتاب المُحصَر، باب قول اللہ تعالی: ''فلا وربک'' البقرۃ ۱۹۷، حدیث ۱۸۲۰، مسلم: کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرۃ ۱۳۵۰)

حج میں مسلمان کی نیت اللہ تعالی کی رضا مندی اور خوشنودی کی تلاش ہونی چاہیے اور اس کے اخراجات حلال مال سے ہونے چاہیے، تاکہ اللہ تعالی اس کا حج قبول فرمائے۔

سات شرطوں کی موجودگی میں حج فرض ہو جاتا ہے: (''اللباب'' محاملی ۱/۱۸۵، ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۲/۵۷۰، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۳۱۱، ''الوسیط'' غزالی ۲/۵۸۱)

مسلمان ہو، بالغ ہو، آزاد ہو، عاقل ہو، استطاعت ہو، ممکن ہو، اور وقت۔

استطاعت سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کے پاس اس کا اپنا اور اپنے اہل وعیال کا واپسی تک کا نفقہ ہو، اگر وہ تنہا ہے تو صرف اپنا نفقہ موجود ہو، جب کہ اس کی ماتحتی میں ماں، باپ یا بھائی بہن نہ ہوں۔

حج کا وقت شوال، ذو القعدہ اور ذو الحجہ کے دس دن ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ'' (البقرۃ ۱۹۷) (حج چند معلوم مہینوں کا نام ہے) حج صرف ان ہی ایام میں کیا جاتا ہے اور حج کی نیت بھی صرف ان ہی ایام میں کی جا سکتی ہے۔

کافر، بچے، پاگل اور غلام باندی پر حج فرض نہیں ہے، اسی طرح غیر مستطیع پر بھی حج نہیں ہے۔ مرتد اگر اپنے حالتِ ارتداد میں حج کا مستطیع بن گیا ہو تو اس کے ذمہ حج فرض باقی رہتا ہے۔

عمرہ کے لیے بھی یہی شرطیں ہیں، البتہ وقت کی تعیین نہیں ہے، کیوں کہ اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، سال کے تمام دنوں میں عمرہ کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر حج کر رہا ہے تو حج کے ایام میں رمی جمار سے فارغ ہونے سے پہلے عمرہ نہیں کر سکتا ہے، پھر اس کے بعد وہ عمرہ کا احرام پہن سکتا ہے، کیوں کہ حج کے احرام میں رہتے ہوئے عمرہ کے احرام میں

داخل نہیں ہوسکتا ہے۔

البتہ عمرہ کے احرام میں ہوتو عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج کا احرام پہن سکتا ہے۔

لفظ ''نُسُک'' کی جو حج یا عمرہ کے معنی میں ہے؛ چار قسمیں ہیں:

۱۔ اسلام کا حج اور عمرہ؛ یہ دونوں پوری زندگی میں مسلمان پر ایک مرتبہ فرض ہیں۔

۲۔ قضا حج اور عمرہ: حج کی قضا کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً کسی کو وقوفِ عرفہ چھوٹ جائے، کسی کا حج فاسد ہوجائے، تو ان دونوں کے لیے دوسرے سال آکر حج کی ادائیگی اور قضا ضروری ہے، کیوں کہ حج اس کے متعین اوقات میں فرض ہے، البتہ عمرہ کی قضا نہیں ہے، کیوں کہ سال کے تمام اوقات میں عمرہ کی ادائیگی ہوسکتی ہے، البتہ اگر کوئی حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام پہنے پھر اس کو کسی بھی وجہ سے میدانِ عرفات نہ پہنچنے کی وجہ سے وقوفِ عرفہ چھوٹ جائے، یا عمرہ کے ساتھ ملے ہوئے حج (قران) کو باطل کردے تو اس صورت میں آئندہ سال دونوں کی ایک ساتھ نیت کرکے حج اور عمرہ کی ادائیگی ضروری ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی رمضان میں عمرہ کرنے کی نذر مانے، پھر رمضان آئے اور عمرہ نہ کرسکے تو اس پر رمضان کے بعد عمرہ کی قضا واجب ہے۔ اسی طرح کوئی عمرہ کا احرام پہنے پھر کوئی دشمن اس کو عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ میں داخل ہونے سے روک دے تو اس صورت میں اس کے لیے احرام اتارنا واجب ہے، یعنی بکری کی قربانی، اپنے سر کے بال منڈھا کر یا کم کرکے احرام سے نکلنا چاہیے، پھر جب اس میں عمرہ کی ادائیگی کی طاقت ہوگی واپس آکر عمرہ کرنا ضروری ہے، اس طرح کا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ کے سال پیش آیا جب آپ کو عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ جانے سے روک دیا گیا، آپ نے اور آپ کے ساتھ موجود صحابہ نے احرام اتارا، پھر دوسرے سال عمرہ کی قضا کرنے کے لیے آئے۔ (ابوداود: کتاب المناسک، باب العمرۃ ۱۹۹۲، ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰۰۳، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۳۹۴۶، یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے)

۳۔ نذر کا حج اور عمرہ؛ اس شخص کے لیے جس نے حج اور عمرہ کرنے کی نذر مانی ہو۔

۴۔ سنت حج اور عمرہ؛ یہ اسی کے حق میں ہے جس نے فرض حج اور عمرہ کیا ہو، یا جو بچہ ہو یا غلام۔ البتہ بالغ عاقل آزاد مستطیع مسلمان کے لیے پہلی مرتبہ حج اور عمرہ کرنا فرض ہے، چاہے ادا ہو یا قضا یا نذر۔

حج کی قسمیں:

حج کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ افراد؛ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے حج مکمل کیا جائے، اس کے بعد عمرہ ادا کیا جائے، یہ شوافع اور مالکیہ کے نزدیک حج کی قسموں میں سب سے افضل قسم ہے۔ (دیکھا جائے: ''الأم'' ۲۱۴/۷، ''کفایۃ الأخیار'' ۳۱۴/۱)

۲۔ تمتع؛ اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی یہ کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام پہنے، اور عمرہ ادا کرے، اور اسی سال مکہ سے میقات واپس ہوئے بغیر حج کا احرام پہنے، اس صورت میں اس پر ایک بکری فدیہ ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حج کے مہینوں کے علاوہ میں عمرہ کا احرام پہنے، پھر اسی سال یا اس کے بعد والے سال حج کا فریضہ ادا کرے، یہ بھی بعض علماء کے نزدیک حج تمتع کی شکلوں میں سے ہے، لیکن اس میں دم نہیں ہے۔ حنابلہ کے نزدیک حج تمتع حج کی قسموں میں سب سے افضل ہے۔ (دیکھا جائے: ''الکافی'' ابن قدامہ حنبلی ۴۷۶/۱، انھوں نے کہا ہے کہ سب سے افضل حج تمتع ہے)

۳۔ قران؛ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ساتھ حج اور عمرہ کا احرام اس طرح پہنا جائے کہ حج کے اعمال سے فارغ ہونے کی صورت میں حج اور عمرہ دونوں ادا ہوجائے گا، حج قران کرنے والے پر ایک بکری فدیہ میں دینا ہوگا، حنفیہ کا خیال ہے کہ قران حج کی قسموں میں سب سے افضل ہے۔ (دیکھا جائے: ''البحر الرائق شرح کنز الدقائق'' ابن نجیم ۳۸۴/۲) جو حج قران یا تمتع کرے تو مکہ کے باشندوں کے علاوہ دوسروں پر ایک بکری ذبح کرنا واجب ہے۔

مسجد حرام کے باشندوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے گھر حرم مکہ سے سولہ فرسخ سے کم فاصلہ میں ہو، (سولہ فراسخ سے مراد ۸۸،۷۰۴ کلومیٹر ہے)، اس مسافت کے اندر

رہنے والے حج تمتع یا قران کریں تو ان پر دم نہیں ہے۔

جو حج تمتع یا قران کر رہا ہو اور وہ مکہ والوں میں سے نہ ہو تو وہ اس طرح فدیہ ساقط کرسکتا ہے کہ میقات (خارج مکہ) سے حج کے لیے احرام پہنے، اس صورت میں اس سے فدیہ کا مطالبہ نہیں ہے، کیوں کہ فدیہ اس سے معاف ہو جاتا ہے جو حج کے لیے احرام پہننے کے لیے مکہ سے نکل کر میقات پہنچ جائے۔

حج کا احرام

اگر اہلِ مکہ میں سے نہ ہو یا سعودی عرب کے باہر سے آرہا ہو تو حج کا احرام اور نیت میقات سے کرنا واجب ہے۔

کوئی دوسرے ملک سے حج کا ارادہ کرے اور عمرہ ادا کرے اور مکہ میں مقیم ہو تو وہ آٹھویں ذی الحجہ کو منیٰ نکلنے سے پہلے مکہ ہی میں احرام پہن سکتا ہے، جو حجاج کو منی، مزدلفہ اور عرفات وغیرہ لے جانے والے ہیں وہ آٹھ ذی الحجہ سے پہلے ان جگہوں پر حجاج کرام کے لیے خیموں کو لگانے کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی جگہ ہی سے احرام پہن سکتے ہیں۔

عمرہ کا احرام اور نیت. مکہ یا سعودی عرب کے باہر رہنے والے شخص کے لیے میقات سے احرام پہننا واجب ہے، اگر وہ مکہ یا حرم میں مقیم ہو تو حرم سے نکلنا اس کے لیے ضروری ہے، اور وہ مندرجہ ذیل مساجد میں سے کسی مسجد سے عمرہ شروع کرے گا:

۱۔ مسجد عائشہ جو مقامِ تنعیم میں ہے

۲۔ مسجد جعرانہ

پھر اس کے بعد عمرہ کے اعمال کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے گا، اگر وہ عمرہ کا احرام پہننے کے لیے میقات نہ جائے تو اس کا احرام صحیح ہے، البتہ اس پر دم لازم آتا ہے، یعنی وہ ایک بکری فدیہ میں دے گا۔

عمرہ کے ارکان

۱۔ عمرہ کا احرام پہننا یعنی عمرہ میں داخل ہونے کی نیت کرنا، مثلاً کہے: میں عمرہ کی

نیت کرتا ہوں اور اس کا احرام پہنتا ہوں اللہ تعالی کے لیے۔

۲۔ کعبہ کے اطراف طواف کرنا یعنی سات چکر لگانا؛ طواف میں طہارت اور سترِ عورت شرط ہے۔

۳۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا یعنی سات چکر لگانا؛ سعی کا شمار صفا سے مروہ تک ایک چکر ہوتا ہے، اور مروہ سے صفا ایک، یہاں تک کہ سات چکر مکمل ہو جائیں۔

۴۔ سر کے بال منڈھائے یا قصر کرے، اور کم سے کم اپنے سر کے تین بال نکالنا ضروری ہے۔

عمرہ کی نیت میقات سے کرنا ضروری ہے، حرم میں اقامت پذیر شخص پر ضروری ہے کہ وہ عمرہ کا احرام پہننے کے لیے میقات چلا جائے، اور جعرانہ یا تنعیم سے احرام پہنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے احرام پہنا، (بخاری: کتاب الطھارۃ، باب من قسم الغنیمۃ فی غزوہ وسفرہ ۲۹۱۹) اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو تنعیم سے احرام کی نیت کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری: کتاب الحج، باب الحج علی الرجل ۱۴۵۶)

☆☆☆☆☆

حج کے ارکان اور واجبات

حج کے ارکان پانچ ہیں: (دیکھا جائے: کفایۃ الأخیار۱/۳۱۳، اللباب۔ محاملی۱/۱۸۷)

۱۔احرام؛ یعنی حج میں داخل ہونے کی نیت کرنا، مثلاً کہے: میں نے حج کی نیت کی اوراس کا احرام اللہ تعالی کی رضا کی تلاش اوراس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے پہنا۔

۲۔وقوفِ عرفہ: اس کے لیے متعین وقت ہے، یہ نویں ذی الحجہ کو سورج کے زوال سے لے کر دسویں ذی الحجہ کے طلوعِ فجر تک ہے، وہاں اس وقت کے دوران ایک حصہ ٹھہرے، چاہے وہ جا کر سو جائے یا وہاں سے گزرے۔عرفہ کا وقوف حج کا اصل رکن ہے، کیوں کہ جو عرفہ کے میدان میں کھڑا نہ رہے یا عرفہ نہ پہنچے تو اس کا حج نہیں ہوتا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ’’حج عرفہ کا نام ہے‘‘۔ (ترمذی: أبواب الحج عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فیمن أدرک عرفۃ فقد أدرک الحج ۸۴۸، سنن ابن ماجہ: کتاب المناسک، باب من أتی عرفۃ ۳۰۱۲، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۳۸۹۲)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ’’عرفہ پورا کا پورا ٹھہرنے کی جگہ ہے‘‘۔ (مسلم: کتاب الحج، باب ما جاء أن عرفۃ کلھا موقف ۱۲۱۸، یہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے)

عرفہ میں سب سے افضل ٹھہرنے کی جگہ جبل الرحمہ ہے، افضل اور اولی یہ ہے کہ عرفہ میں دن کا ایک حصہ اور رات کا ایک حصہ ٹھہرا جائے اور مغرب کے بعد تک رکا جائے۔

۳۔طوافِ افاضہ؛ یہ وقوفِ عرفہ کے بعد کا طواف ہے، اس کو طوافِ رکن بھی کہا جاتا ہے، اور طوافِ نساء بھی، یہ سات چکر ہیں جس کی ابتدا حجر اسود سے ہوتی ہے اور انتہا بھی اسی پر ہوتی ہے، یہ ضروری ہے کہ طواف کرنے والا کعبہ کے اطراف اس حال میں طواف کرے کہ کعبہ اس کے بائیں جانب ہو، طواف افاضہ کا وقت عیدالاضحیٰ کی رات کے نصف آخر سے ہوتا ہے۔

۴۔صفا ومروہ کے درمیان سعی: سعی طوافِ افاضہ کے بعد ہونا ضروری ہے اگر اس نے طوافِ قدوم کے بعد سعی نہ کیا ہو، اگر حاجی طوافِ قدوم کے بعد سعی کر چکا ہو تو اس شرط کے ساتھ یہی سعی کافی ہے کہ اس نے وقوفِ عرفہ سے پہلے طوافِ قدوم کر چکا ہو؛ کیوں کہ جب اس نے طواف قدوم کیا ہو اور وقوف عرفہ کے لیے نکلا ہو تو وہ وقوف عرفہ کے بعد اسی وقت سعی کر سکتا ہے جب اس نے طوافِ افاضہ کیا ہو۔ہم نے عمرہ کی سعی کے بارے میں گفتگو کرتے وقت سعی کی کیفیت بیان کر دی ہے۔

۵۔سر منڈھانا یا بال چھوٹے کرنا؛ امام رافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: حج کے ارکان میں ترتیب ضروری ہے، سب سے پہلے احرام پہنے گا، پھر وقوف عرفہ کرے گا، پھر طواف افاضہ کرے گا، پھر سعی کرے گا، پھر سر منڈھائے گا یا قصر کرے گا‘‘۔ (رافعی کا یہ کلام دیکھا جائے: الشرح الکبیر۷/۳۹۲)

طواف میں چار شرطیں ہیں، چاہے فرض طواف ہو جو طوافِ افاضہ ہے، یا واجب طواف ہو جو طوافِ وداع ہے، یا سنت طواف ہو جو طواف قدوم ہے، یا نفل طواف ہو، مسجد حرام میں جب بھی داخل ہو تو طواف کرنا سنت ہے، یہ چار شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:
(’’اللباب۱/ ۱۸۸، اس میں صرف دو شرطیں بیان کی گئی ہیں،’’ کفایۃ الأخیار‘‘۱/ ۳۱۵۔۳۱۶)

۱۔مکمل طہارت اور وضو، اگر طواف کے دوران کسی کا وضو نہ رہے تو نئے سرے سے وضو کرنا واجب ہے، اور وہ اپنا طواف مکمل کرے گا۔

۲۔اپنا سر نہ جھکائے یعنی عمومی چال چلے گا، اپنا سر نیچے کی طرف نہیں جھکائے، اور نہ اپنے پاؤں اپنے ہاتھوں سے اوپر نہیں اٹھائے گا۔

۳۔ستر چھپائے گا جس طرح نماز میں کیا جاتا ہے۔

۴۔طواف کی ابتدا حجر اسود سے کی جائے گی، اس طور پر کہ کعبہ اس کے بائیں جانب ہو، اور شاذروان (یعنی جو بیت اللہ کی بنیاد سے اٹھا ہوا حصہ باقی ہے جس پر کعبہ تعمیر نہیں کیا گیا ہے) کے باہر سے کعبہ کا طواف کرے، اور مسجد حرام کے اندر طواف کرے چاہے اوپر سے ہی کرلے۔

طواف کی سنتیں:

حجر اسود کو استلام کرنا، اس پر پیشانی رکھنا، ہر ایک شوط یعنی چکّر میں بوسہ دینا اگر یہ ممکن ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو پہلے، تیسرے، پانچویں اور ساتویں شوط میں بوسہ دے، اگر حجر اسود کو استلام کرنا یعنی اپنے ہاتھ سے چھونا ممکن ہو تو بہتر ہے، اس کے بعد اپنے ہاتھ کا بوسہ لے، اگر ہاتھ سے چھونا ممکن نہ ہو تو اپنے عصا سے لمس کرے پھر اس کو بوسہ دے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرے، یا اپنے ہاتھ میں موجود کسی بھی چیز سے اشارہ کرے، پھر جس چیز کے ذریعہ حجر اسود کی طرف اشارہ کیا ہے اس کو بوسہ دے۔ عورتوں کے لیے حجر اسود کو چھونا یا اس کا بوسہ لینا مسنون نہیں ہے، البتہ طواف کی جگہ خالی ہو تو بوسہ دے سکتی ہے، چاہے دن میں ہو یا رات میں۔

یہ بھی سنت ہے کہ ہر اس طواف میں رمل کرے جس کے بعد سعی ہو، رمل یہ ہے کہ قریب قریب قدم ڈال کر ذرا تیز چلے، جو دوڑنے کے معنی میں نہ ہو، طواف کے پہلے تین شوط یعنی چکر میں رمل مسنون ہے۔

یہ بھی سنت ہے کہ آخری چار شوط میں عام چال چلی جائے۔

اضطباع بھی سنت ہے؛ یعنی اپنے چادر کے درمیانی حصہ کو اپنے داہنے مونڈھے کے نیچے ڈالا جائے کہ اس کی وجہ سے دایاں مونڈھا کھلا رہ جائے، اور اپنی چادر کے دونوں سروں کو اپنے بائیں کندھے پر ڈال دے۔ عورتوں کے لیے نہ رمل ہے اور نہ اضطباع ہے۔

مرد، عورت اور بچے کے لیے مسنون ہے کہ وہ جب بھی مسجد حرام میں داخل ہوں تو سب سے پہلے کعبۃ اللہ کا طواف کریں؛ البتہ کوئی فرض نماز امام کے پیچھے ادا کی جارہی ہو یا نماز کے لیے اقامت کہی جارہی ہو اور کوئی آئے تو طواف مسنون نہیں ہے، یا طواف کرنے کی وجہ سے کوئی سنت موکدہ چھوٹنے کا اندیشہ ہو مثلاً صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعتیں، یا اس پر کسی فرض نماز کی قضا ہو۔ ان تمام صورتوں میں نماز پہلے ادا کی جائے گی۔

جو عورت خوبصورت ہو یا جس کا تعلق صلاح وتقوی اور شرف وعزت والے خاندان

سے ہو اور وہ مردوں کے سامنے آنے کی عادی نہ ہو تو اس کے کے لیے رات کے وقت طواف کرنا مسنون ہے۔

ہر طواف کے بعد سنتِ طواف کی دو رکعتیں ادا کرنا مسنون ہے، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد ''قل یا أیھا الکافرون'' اور دوسری رکعت میں ''قل ھواللہ أحد'' تلاوت کی جائے۔

حرم میں زیادہ سے زیادہ طواف کرنا، عمرہ کی ادائیگی، تلاوتِ قرآن اور نماز پڑھنا مسنون ہے، کیوں کہ حرم میں ہر وقت نماز جائز ہے، اور وہاں کوئی بھی مکروہ وقت نہیں ہے، اسی طرح حرم میں مستحقین پر کثرت سے صدقہ کرنا بھی مستحب ہے، کیوں کہ وہاں رہنے والے شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو صدقہ طلب نہیں کرتے ہیں۔

دیگر سنتیں:

پیدل طواف کرے، سوار طواف نہ کرے، عذر ہو تو الگ بات ہے، اگر معذور نہ ہو تو سوار طواف کرنا مکروہ ہے۔ (امام ماوردی نے اس کو مکروہ کہا ہے، دیکھا جائے: نہایۃ المحتاج ۶۰۲/۲)

جو طواف حج یا عمرہ کے ارکان میں سے ہے تو احرام کی نیت میں وہ بھی شامل ہے، اگر طواف حج یا عمرہ کا ایک جزء نہیں ہے تو ہر مرتبہ طواف کرتے وقت الگ سے نیت کرنا ضروری ہے۔

طواف کے سات شوط کو تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر کرنا مسنون ہے، البتہ عذر ہو تو الگ بات ہے، مثلاً جماعت کھڑی ہو جائے تو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے گا پھر اپنا طواف پورا کرے گا، یا اپنی ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے رکے گا اور دوبارہ وضو کر کے اپنا طواف مکمل کرے گا۔

کعبہ کے قریب طواف کرنا سنت ہے، اگر وہ کعبہ سے قریب طواف کرنے کی وجہ سے رمل نہ کر سکتا ہو تو دور جائے گا تاکہ رمل کر سکے، اگر کعبہ سے ہٹ کر دور طواف کرنے کی صورت میں عورتوں کو چھونے اور وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو قریب طواف کرے گا اور رمل نہیں کرے گا۔

حج کے واجبات جن کے ترک کرنے پر فدیہ واجب ہے:

ا۔ میقات سے احرام؛ میقات کی تفصیلات اس کی جگہ پر آرہی ہیں، جب میقات

سے دور جگہ پر احرام پہنے تو اس پر فدیہ نہیں ہے، اگر میقات سے تجاوز کر لے اور اس سے قریب احرام باندھے تو اس پر ایک بکری فدیہ ہے۔

۲۔منیٰ کی راتوں میں وہاں رات گزارنا: گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں ذی الحجہ کی راتوں کا اکثر حصہ منیٰ میں گزارنا واجب ہے، اگر وہ منیٰ سے بارہویں ذی الحجہ کا سورج غروب ہونے سے پہلے نکل جائے تو اس پر تیرہویں ذی الحجہ کی رات گزارنا واجب نہیں ہے؛ اور تیرہویں ذی الحجہ کی رمیِ جمرات بھی اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔اگر بارہویں ذی الحجہ کا سورج غروب ہونے سے پہلے منیٰ سے نکلنے کے ارادہ سے گاڑی پر سوار ہو جائے، اگر بھیڑ کی وجہ سے تاخیر ہو جائے یا منیٰ میں ہی گاڑی خراب ہو جائے اور عشاء کی نماز تک وہاں رہے تو اس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے۔

۳۔مزدلفہ میں شب گزاری؛ عیدالاضحیٰ کی رات کے نصف اخیر میں مزدلفہ میں رہنا چاہیے ایک لحظہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو یا وہاں سے گزرنا واجب ہے، مزدلفہ میں شب گزاری عام طور پر منیٰ میں شب گزاری سے پہلے ہے، البتہ منیٰ میں مزدلفہ میں رات گزارنے سے پہلے رات گزاری جاتی ہے، کیوں کہ یہ فقہاء اور امت کے اجماع سے ثابت ہے۔حجاج کو پانی پلانے اور انتظامات کی ترتیب کرنے والے ذمہ داروں سے منیٰ اور مزدلفہ میں رات گزارنا معاف ہے (یہ روایت نسائی نے کی ہے: کتاب المناسک، باب رمی الرماۃ ۴۰۶۰، یہ روایت ابوالبدّاح بن عاصم بن عدی سے ہے جو انھوں نے اپنے والد سے کی ہے) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا جو حجاج کو پانی پلانے کے ذمہ دار تھے، آپ نے ان کو مزدلفہ اور منیٰ میں رات گزارنے سے رخصت دی۔

۴۔طوافِ وداع: حاجی اور عمرہ کرنے والے کے لیے مسنون ہے کہ وہ مکہ سے نکل کر اپنے گھر واپس جانے سے پہلے طواف کرے، شرط یہ ہے کہ اس طواف کے بعد پھر مکہ میں نہ رکے، صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی اس وقت تک نہ نکلے جب تک کہ اس کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہو“۔(مسلم: کتاب الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطہ عن الحائض ۲۴۲۵) اگر کوئی طواف کیے بغیر مکہ سے نکلے اور ۱۶ فرسخ (۸۸ کلومیٹر) کی

مسافت کو پار کر لے تو اس پر ایک بکری کو ذبح کرنا اور حرم کے فقراء کو کھلانا واجب ہے۔

حائضہ کے لیے طواف وداع نہیں ہے، اور نہ حرم کے باشندوں پر طواف وداع واجب ہے، اور نہ اس اجنبی کے لیے جو مکہ میں ہمیشہ رہنے اور وہاں سے نہ نکلنے کی نیت کرے۔البتہ جس حائضہ عورت نے طواف افاضہ نہیں کیا ہے جو حج کا ایک رکن ہے، اس کے لیے پاک ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے تاکہ اپنے وطن لوٹنے سے پہلے اس طواف کو ادا کرے، یہ شوافع کی رائے ہے۔اگر وہ انتظار نہ کر سکتی ہو، مثلاً اس کا شوہر یا محرم سفر کرنا چاہتا ہو تو امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ طواف کے لیے طہارت شرط نہیں ہے، وہ حیض کی حالت میں طواف کر سکتی ہے، اس صورت میں اس پر ایک اونٹ فدیہ دینا ضروری ہے جس کو وہ ذبح کر کے حرم کے فقراء میں تقسیم کرے گی، کیوں کہ شوہر یا محرم کے سفر کرنے کی وجہ سے اس کو مکہ میں رہنا مشکل ہے۔

۵۔رمیِ جمرات؛ عیدالاضحیٰ کے دن جمرہ عقبہ کے پاس سات کنکریاں مارے، اور جمرہ اولی، جمرہ ثانیہ یعنی وسطی اور جمرہ عقبہ کو تین دنوں تک کنکریاں مارے، ان میں سے ہر ایک کو ایام تشریق میں سات سات کنکریاں مارے یعنی گیارہوں، بارہویں اور تیرہویں ذی الحجہ کو، یعنی ہر دن ۲۱ کنکریاں مارے، یعنی گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو ۴۲ کنکریاں مارے، جب وہ بارہویں ذی الحجہ کا سورج غروب ہونے سے پہلے منی سے نکلے تو اس کے لیے ۴۲ کنکریاں کافی ہیں، اگر تیرہویں ذی الحجہ کو منی میں رکے تو اس پر ۶۳ کنکریوں کو مکمل کرنا واجب ہے، ہر دن اکیس (۲۱) کنکریاں، اور ہر جمرہ کو سات کنکریاں۔

رمی جمار کا وقت عیدالاضحیٰ کے دن عید کی آدھی رات سے شروع ہوتا ہے، اور یہ وقت ایام تشریق کے آخر تک رہتا ہے، اور ایام تشریق کے تین دنوں میں رمی کا وقت زوال کے بعد سے ان دنوں یعنی ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کے اخیر تک ہے۔

حج کی سنتیں

تلبیہ (دیکھا جائے: ”الإیضاح فی مناسک الحج والعمرۃ“ امام نووی ۱۴۲۔مرد کے لیے تلبیہ پڑھتے وقت

آواز بلند کرنا مسنون ہے جب اس کو نقصان نہ ہوتا ہو……البتہ عورت اپنی آواز بلند نہیں کرے گی، بلکہ صرف خود کو سنانے کی حد تک آواز نکالے گی، آواز بلند کرنا اس کے حق میں مکروہ ہے، حرام نہیں۔نووی نے یہ بات ''الإیضاح'' میں کہی ہے ص۱۴۴) تلبیہ کے الفاظ یہ ہیں: ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ''۔تلبیہ کے بعد متعدد بار نبی ﷺ پر درود بھیجا جائے اور اپنے لیے، اپنے گھر والوں، والدین اور سیدنا محمد ﷺ کی امت کے لیے دنیا وآخرت کی بھلائی کی دعا کی جائے، اسی طرح مسلمانوں کے ذمہ داروں کے حق میں دعا کی جائے، یہاں تک کہ اللہ سبھوں کی اصلاح فرمائے۔

حج اور عمرہ کا احرام پہننے کے بعد تلبیہ پڑھنا سنت موکدہ ہے، حج میں تلبیہ احرام کے وقت سے عید الاضحیٰ کی صبح جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے تک پڑھنا مسنون ہے، جب جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنا شروع کرے تو تلبیہ پڑھنا بند کردے، عمرہ میں احرام سے تلبیہ کی ابتدا ہوتی ہے اور عمرہ کا طواف شروع کرنے تک تلبیہ پڑھا جاتا ہے، جب عمرہ شروع کرے تو تلبیہ پڑھنا بند کردے۔

حاجی اور عمرہ کرنے والے کے لیے کثرت سے تلبیہ پڑھنا اور کثرت سے درود بھیجنا اور اللہ سے جنت عطا کرنے اور جہنم سے بچانے کی دعا کرنا مسنون ہے، اسی طرح اللہ سے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کرے، اور مسلمانوں کے ذمہ داروں اور امراء کے لیے استقامت اور صلاح کی دعائیں کرے؛ کیوں کہ ان کی صلاح میں پوری امت کی صلاح ہے۔

ہم نے یہ بات کہی ہے کہ حج میں تلبیہ کی ابتدا احرام سے ہوتی ہے اور انتہا عید الاضحیٰ کے دن جمرہ عقبہ کو رمی کرنے پر ہوتی ہے، طواف اور سعی کے درمیان تلبیہ نہیں ہے، کیوں کہ طواف اور سعی کے مخصوص اذکار اور دعائیں ہیں، اور عمرہ میں تلبیہ کی ابتدا احرام سے ہوتی ہے اور طواف شروع کرنے تک اس کا وقت باقی رہتا ہے۔

طواف قدوم: یہ مکہ میں داخل ہونے کا طواف ہے، یہ کعبہ کے گرد سب سے پہلا طواف ہے، طوافِ قدوم اس حاجی کے لیے سنت ہے جو عرفہ جانے سے پہلے مکہ آئے، البتہ عرفہ میں

وقوف کے بعد والا طواف حج کے ارکان میں ہے، اس وقت طواف قدوم چھوٹ جاتا ہے۔

سعی میں تیز تیز چلنا؛ سعی کے دوران میلین اخضرین کے درمیان تیز تیز چلنا مسنون ہے، ان میں سے ایک ہری نشانی حرم کی دیوار سے ملی ہوئی ہے اور دوسری عباس کے گھر سے، جس کو بعد میں نکال کر حرم میں شامل کیا گیا۔آج ان کی جگہ دوہرے رنگ کی لائٹ لگی ہوئی ہے، تاکہ سعی کے دوران دوڑی جانے والی مسافت کی تعین ہو، ایک مرتبہ صفا سے مروہ جاتے وقت دوڑا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ مروہ سے صفا آتے وقت، اس طرح ہر مرتبہ کیا جاتا ہے۔

صفا پہاڑی کے اوپر چڑھنا مسنون ہے، آج بھی اس پہاڑی کے پتھر ویسے ہی اپنی جگہ پر ہیں، اسی طرح مروہ پہاڑی کے پاس بھی، پے در پے سعی کرنا مسنون ہے، سعی کے چکروں کے درمیان فصل نہ کیا جائے، البتہ جماعت کھڑی ہوجائے تو فرض نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوجائے اور جماعت سے نماز ادا کرکے اپنی سعی مکمل کرے۔

طواف کے فوراً بعد سعی کرنا مسنون ہے، اور مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان واقع وادی محسر کے درمیان تیزی سے دوڑنا مسنون ہے، اس وادی کی لمبائی ۵۴۵ ذراع ہے۔

حج میں مسنون غسل کی قسمیں (''الإیضاح''النووی ص۱۲۴،''اللباب'' محاملی ۱/۱۹۰)

مکہ میں داخل ہوتے وقت، منی میں داخل ہوتے وقت، وقوفِ عرفہ سے پہلے، مزدلفہ میں داخل ہوتے وقت اگر وقوف عرفہ کے لیے غسل نہ کیا ہو، منی میں ایام تشریق کے تینوں دن رمی جمار کے لیے غسل کرنا مسنون ہے۔

امام کی طرف سے دیے جانے والے مسنون خطبے: (''روضۃ الطالبین'' ۹۳/۳)

پہلا خطبہ: مکہ میں؛ یہ سنت ہے کہ امام سات ذی الحجہ کو ظہر کی نماز کے بعد لوگوں میں خطبہ دے تاکہ ان کو بتائے کہ وہ آٹھ ذی الحجہ کو منی جائیں، وہاں نو ذی الحجہ کو رہیں، جہاں سے وہ وقوف عرفہ کے لیے جائیں، اور ان کے سامنے اعمالِ حج کی وضاحت کرے، یہ خطبہ جمعہ کی نماز پڑھی جانے والی مسجد کے منبر سے دیا جائے۔

دوسرا خطبہ: مسجد نمرہ میں دے، یہ بھی مسنون ہے کہ امام مسجد نمرہ میں

وقوفِ عرفہ کے لیے جانے سے پہلے خطبہ دے، امام دو خطبے دے، جس میں لوگوں کے سامنے عرفہ کے دن وقوفِ عرفہ کے دوران ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں بتائے، اسی طرح مزدلفہ میں عید الاضحیٰ کی رات کے اعمال اور منیٰ میں عید کے دن کے احکام کے بارے میں بتائے۔ لوگ ظہر اور عصر کی نماز نمرہ میں پڑھیں اور اس کے بعد عرفہ چلے جائیں اور وہ غروب کے بعد تک ٹھہرے رہیں؛ تاکہ وہ عرفہ میں دن کا ایک حصہ بھی رہیں اور رات کا ایک حصہ بھی، مسجد نمرہ میں دو خطبے ظہر کی نماز سے پہلے دیے جائیں گے۔

تیسرا خطبہ: منیٰ میں دیا جائے، امام یہ خطبہ عید الاضحیٰ کے دن ظہر کی نماز کے بعد منیٰ میں دے، اس میں لوگوں کو منیٰ میں کیے جانے والے اعمال کے بارے میں بتائے۔

چوتھا خطبہ: یہ خطبہ ۱۲ ذی الحجہ کو دیا جائے، اس میں تیرہ ذی الحجہ کی عصر تک منیٰ میں رہنے والے حاجیوں کی ذمہ داریوں کی وضاحت کی جائے، اس کا وقت ظہر کی نماز کے بعد ہے، امام پر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے وضاحت کرے کہ مردوں پر اپنے سر مونڈھنا یا بال کاٹنا ضروری ہے، اور عورتوں صرف اپنے بال نکالے گی۔

یہ بھی سنت ہے کہ مشعرِ حرام کے پاس وقوف کیا جائے، یہ مزدلفہ کے آخری حد میں ایک پہاڑ ہے، یہ صبح کی نماز کے بعد کیا جاتا ہے، جب حجاج کرام اللہ کے ذکر اور اس کے حضور گڑگڑانے میں مشغول ہوجاتے ہیں، اسفار ہونے تک ذکر کرتے رہیں، پھر جمرہ عقبہ کو سات کنکریاں مارنے کے لیے سورج طلوع ہونے کے بعد منی کی طرف چلے۔

یہ بھی سنت ہے کہ سات ذی الحجہ کو حاجی منیٰ ہی میں رہیں، اور یہ بھی سنت ہے کہ وہ منی میں تیرہویں ذی الحجہ کی رات گزارے، اور منیٰ سے بارہ ذی الحجہ کو نہ نکلے، حالانکہ اس دن منیٰ سے چلے جانے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

یہ بھی سنت ہے کہ محصب کے علاقہ میں اترا جائے اور وہاں چودہ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کی جائیں، اسی طرح پندرہ ذی الحجہ کو مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھی جائیں، پندرہ ذی الحجہ کے دن صبح کی نماز کی ادائیگی کے بعد مکہ چلے جائیں، جہاں کعبہ کا

طوافِ وداع ادا کیا جائے، طواف کے بعد حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان ملتزم کے ساتھ کھڑا ہوجائے، اور اللہ کی طرف متوجہ ہوکر دعائیں کرے، کیوں کہ ملتزم ان جگہوں میں سے ہے جہاں اللہ تعالی دعائیں قبول کرتے ہیں۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد حاجی زمزم کے پاس جائے اور پانی پیے، زمزم پینے کے دوران قبلہ کی طرف رخ کرے اور اپنے لیے جو چاہے دنیا وآخرت کی بھلائی کی دعائیں کرے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ماءِ زمزم اس کے لیے ہے جس کے لیے پیا جائے''۔ (مسند امام احمد، یہ روایت مسند بنی ہاشم اور مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ میں ہے ۱۴۷۰۶، سنن ابن ماجہ: کتاب المناسک، باب الشرب ۳۰۵۹، حافظ ابن حجر نے اس کو حسن کہا ہے)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب ماءِ زمزم پیتے تو یہ دعا کیا کرتے تھے: ''**اَللّٰهُمَّ إِنِّی أَسْأَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا، وَعَمَلاً مُّتَقَبَّلاً، وَرِزْقًا حَلَالاً وَاسِعًا، وِشَفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ**''۔ اے اللہ! میں تیرے حضور علم نافع، مقبول عمل، حلال اور وسیع رزق اور ہر بیماری سے شفایابی مانگتا ہوں۔

یہ بھی سنتوں میں سے ہے کہ حاجی وہیں اترے جہاں زمزم کا پانی ہو اور پانی لے کر اپنے سر پر ڈالے اور جتنا پی سکتا ہے پیے۔

چند منتخب ادعیہ ماثورہ

حج اور عمرہ کی ادائیگی کے دوران مختلف موقعوں پر پڑھی جانے والی نبی ﷺ سے ثابت چند دعائیں ذیل میں پیش ہیں:

۱۔ کعبہ کو دیکھتے وقت، اور جب بھی کعبہ کو دیکھے تو یہ دعا کرنا مسنون ہے: ''**اَللّٰهُمَّ زِدْ بَیْتَکَ هٰذَا تَشْرِیْفًا وَّتَعْظِیْمًا وَّتَکْرِیْمًا وَّمَهَابَةً وَّأَمْنًا، وَزِدْ مَنْ شَرَّفَهُ وَعَظَّمَهُ مِمَّنْ حَجَّهُ أَوِ اعْتَمَرَهُ تَشْرِیْفًا وَبِرًّا، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ، فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ**''۔ (امام نووی نے اس کو ''الإیضاح'' میں تحریر کیا ہے ۲۰۱)

ترجمہ: اے اللہ! اس گھر کی عزت، عظمت، احترام اور ہیبت میں اضافہ فرما، اور حج یا عمرہ کے ارادے سے اس گھر کا قصد کرنے والوں میں سے جو اس کو عزت اور عظمت دے

ان کی عزت، احترام اور نیکی میں اضافہ فرما، اے اللہ! تو سلام ہے، اور تجھ ہی سے سلامتی ہے، چناں چہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ۔

۲۔طواف کے وقت پہلے شوط میں یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ إِيمَانًا بِكَ، وَتَصْدِيقًا بِكِتَابِكَ، وَوَفَاءً ا بِعَهْدِكَ، وَاتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم''۔ (أيضاً ص۲۹۳) اے اللہ! تجھ پر ایمان لاتے ہوئے، اور تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے، تیرے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہوئے اور تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرتے ہوئے میں طواف شروع کرتا ہوں۔

۳۔کعبہ کے دروازہ کے پاس حاجی یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْبَيْتَ بَيْتُكَ وَالْحَرَمُ حَرَمُكَ، وَالْأَمْنُ أَمْنُكَ، وَهٰذَا مُقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ''۔اے اللہ! کعبۃ اللہ تیرا گھر ہے، اور حرم تیرا حرم ہے، اور امن تیرا امن ہے، اور یہ تیرے حضور جہنم کی آگ سے پناہ مانگنے کی جگہ ہے۔

حج اور عمرہ کرنے والے پر ضروری ہے کہ اپنے دل میں یہ یاد رکھے کہ یہ اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے۔

۴۔جب رکن عراقی پر پہنچے تو یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّكِّ وَالشِّرْكِ، وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْأَخْلَاقِ، وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ''۔اے اللہ! میں تیرے حضور شک اور شرک سے، دشمنی، نفاق اور بدترین اخلاق سے اور اہل وعیال، مال اور اولاد میں بدترین منظر سے پناہ مانگتا ہوں۔

۵۔جب میزاب رحمت کے پاس پہنچے تو یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ أَظِلَّنِي فِي ظِلِّكَ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّكَ، وَاسْقِنِي بِكَأْسِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم مَشْرَبًا هَنِيئًا لَا أَظْمَأُ بَعْدَهُ أَبَدًا، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ''۔اے اللہ! مجھے اپنے سایہ تلے اس دن سایہ نصیب فرما جس دن تیرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا، اور مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جام سے خوش گوار مشروب پلا کہ مجھے اس کے بعد کبھی پیاس نہ لگے، اے جلال واکرام والے!۔

۶۔رکن شامی اور رکن یمانی کے درمیان یہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا، وَذَنْبًا مَّغْفُوْرًا، وَسَعْيًا مَّشْكُوْرًا، وَعَمَلاً مُّتَقَبَّلاً، وَتِجَارَةً لَنْ تَبُوْرَ، يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ''۔(امام شافعی نے اس کو''الأم'' میں مستحب کہا ہے ۲/۲۳۰، اور نووی نے اس کو''الإیضاح'' میں نقل کیا ہے ۲۴۰)

ترجمہ: اے اللہ! تو اس کو نیکیوں والا حج بنا، گناہوں کی مغفرت کا سبب بنا، قابل قدر کوشش بنا، مقبول عمل بنا، اور ایسی تجارت بنا جس میں کبھی گھاٹا نہ ہو، اے عزیز، اے غفور!۔

۷۔رکن یمانی اور رکن حجر اسود کے درمیان یہ دعا کرے: ''رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' (اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بہتری عطا فرما اور آخرت میں بہتری عطا فرما، اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا) (امام شافعی نے پورے طواف میں اس دعا پڑھنے کو مستحب کہا ہے، بخاری: کتاب الحج، باب ''ومنهم من يقول ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار'' ۴۵۲۲، یہ روایت حضرت انس سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ''ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار''۔)

۸۔رمل کے وقت تینوں شوط میں یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا، وَذَنْبًا مَّغْفُوْرًا، وَسَعْيًا مَّشْكُوْرًا''۔اے اللہ! تو اس کو نیکیوں والا حج بنا، گناہوں کی مغفرت کا سبب بنا، قابل قدر کوشش بنا، مقبول عمل بنا۔

۹۔جب پہلی مرتبہ صفا پہاڑی پر چڑھے تو یہ دعا کرے: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا، اَللّٰهُ أَكْبَرُ عَلٰى مَا أَوْلَانَا، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَيُمِيْتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' (اس کا تذکرہ امام شافعی نے ''الأم'' میں کیا ہے، یہ مختلف حدیثوں سے ماخوذ ہے جن کو امام مسلم، ابوعوانہ اور نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الإیضاح'' نووی ۲۵۳) اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اللہ نے جو ہمیں ہدایت دی ہے میں اس پر اللہ کی کبریائی بیان کرتا ہوں، اللہ نے ہمیں جو کچھ عطا کیا ہے اس پر میں اللہ کی کبریائی

کے گن گاتا ہوں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پھر اس کے بعد اپنے لیے، اپنے گھر والوں اور تمام مسلمانوں کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی میں سے جو چاہے دعا کرے، ذکر، دعا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو تین مرتبہ دہرائے۔

۱۰۔ سعی کے دوران یہ دعا کرے: ''رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، إِنَّکَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَکْرَمُ''۔ اے میرے پروردگار! مغفرت فرما، رحم فرما، اور جو کچھ تو جانتا ہے اس سے تجاوز فرما، یقیناً تو سب سے طاقت ور اور باعزت ہے۔

یہ بھی سنت ہے کہ احرام کا لباس نیا ہو، اگر یہ میسر نہ ہو تو دھویا ہوا صاف ہو، اور اس کا رنگ سفید ہو، احرام سے پہلے خوشبو لگائے، چاہے یہ خوشبو احرام کی نیت کے بعد باقی رہے یا اس کے بدن سے احرام کے کپڑے میں منتقل ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

احرام سے پہلے خوشبو لگانا سنت ہے، البتہ کپڑے میں خوشبو لگانا مسنون نہیں ہے، کیوں کہ اس کی حرمت کے سلسلہ میں بڑا اختلاف ہے۔ اگر احرام کے کپڑے میں خوشبو لگائے اور احرام کی نیت کرے پھر اس کو اتارے اور خوشبو کا اثر ابھی باقی ہو تو اس کے لیے اس کپڑے کو پہننا حرام ہے، البتہ احرام کے بعد حاجی اور عمرہ کرنے والے کے لیے خوشبو کا استعمال کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

مُحرم پر ضروری ہے کہ ہر سلا ہوا کپڑا اتارے، اور اس کے احرام کا کپڑا صرف ایک لنگی اور چادر ہو۔

تنبیہ: جو بھی عمل حج میں سنت ہے وہ عمرہ میں بھی سنت ہے، سوائے عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ سے متعلق سنتیں، کیوں کہ یہ صرف حج کے ساتھ ہی مخصوص ہیں۔

☆☆☆☆☆

مُحرم کے لیے حرام چیزیں

(امام نووی نے ان محرمات کو اپنی مفید کتاب ''الإیضاح فی مناسک الحج والعمرۃ'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ص ۱۴۶۔۱۸۹، اسی طرح دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۲/۶۴۴)

مُحرم پر جماع کرنا حرام ہے، اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے جس سے حج اور عمرہ باطل ہو جاتا ہے، جب جماع کرے تو اس پر ایک اونٹ بطور فدیہ ذبح کرنا ضروری ہے۔

محرم کے لیے شہوت کے ساتھ اپنی بیوی کو بوسہ دینا حرام ہے، اسی طرح لپٹنا بھی، چھونا بھی اور دیکھنا بھی حرام ہے، اگر شہوت پائی جائے، اگر کسی حائل کے ساتھ بوسہ دے اور شہوت کے ساتھ دیکھے تو ان دونوں صورتوں میں اس پر فدیہ نہیں ہے، چاہے منی نکل جائے، البتہ بغیر جماع کے لپٹے اور منی نکالے تو ان دونوں صورتوں میں فدیہ ہے، فدیہ ایک بکری ذبح کرنا اور اس کا گوشت حرم کے فقراء میں تقسیم کرنا ہے۔

مُحرم کے لیے مرد اور عورت کے لیے عقدِ نکاح کرنا حرام ہے اور حج میں نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''نہ مُحرم نکاح کرائے گا اور نہ نکاح کرے گا''۔ مسلم: کتاب النکاح، باب تحریم نکاح المحرم ۱۴۰۹، ابن حبان ۴۱۲۳، یہ روایت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہے) البتہ مُحرم ایسے مرد اور عورت کی شادی میں گواہ بن سکتا ہے جو احرام پہنے ہوئے نہ ہوں۔

جسم اور لباس میں خوشبو کا استعمال حرام ہے، اسی طرح مشک اور کافور وغیرہ کھانا حرام ہے جس کی خوشبو پاکیزہ رہتی ہے، اگر ایسا ہو تو ایک بکری ذبح کرنا یا تین روزے رکھنا یا تین صاع حرم کے فقیروں میں سے چھ لوگوں میں تقسیم کرنا واجب ہے، لیکن خوشبودار پھل یا خوشبودار کھانے کھانا حرام نہیں ہے، ان تمام محرمات کے لیے شرط یہ ہے کہ ان کے بارے میں علم ہو، وہ عاقل ہو اور صاحبِ اختیار ہو یعنی اس کو کھانے پر مجبور نہ کیا گیا ہو، پاکیزہ خوشبو

کے تعلق سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ وہ بدن یا لباس پر باقی رہتی ہے۔

اسی طرح مرد اور عورت پر دستانے پہننا حرام ہے، اور مرد اور عورت دونوں پر فدیہ واجب ہے، اسی طرح مرد پر سلے ہوئے کپڑے پہننا، جوتے پہننا اور سر ڈھانکنا، عمامہ پہننا اور چغہ وغیرہ پہننا حرام ہے، اگر ان میں سے کسی چیز کو پہنے تو اس پر فدیہ ہے۔

مرد پر اپنا سر ڈھانکنا حرام ہے اور عورت کے لیے اپنا چہرہ ڈھانکنا حرام ہے، مرد کے لیے اپنا چہرہ ڈھانکنا حرام نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کو دھوپ کا چشمہ پہننا جائز ہے۔

ہر ماکول اللحم جنگلی جانور کا شکار کرنا حرام ہے (کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَحَرَّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدَ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ''المائدة ٩٦) مثلاً ہرن، نیل گائے، جنگلی بیل وغیرہ، اور حاجی کے لیے سمندر کی مچھلیوں کا شکار کرنا جائز ہے۔ شکار کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس میں فدیہ ہے، حاجی کے لیے شکار کی طرف رہنمائی کرنا اور شکار کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔

مُحرم کے لیے سر کے بال منڈھانا یا کاٹنا حرام ہے، چاہے ایک بال ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح داڑھی اور جسم کے بال نکالنا بھی حرام ہے، ہر بال نکالنے پر فدیہ ہے، اسی طرح حاجی کے لیے ناخن تراشنا بھی حرام ہے، چاہے ایک ناخن تراشے، حاجی کے لیے سر کے بال اور داڑھی کے بال میں تیل لگانا بھی حرام ہے، اور اس صورت میں فدیہ واجب ہوجاتا ہے، اور یہ صغیرہ گناہوں میں سے ہے، کبیرہ گناہ جماع کرنا اور حرم میں شکار کرنا ہے۔

جب حاجی ان محرمات میں سے کسی کو بھول کر یا نیا نیا مسلمان ہونے کی وجہ سے حرمت سے ناواقف رہنے کی وجہ سے کرے، یا وہ اہلِ علم سے دور رہتا ہو، اگر اس کا یہ عمل کسی چیز کو ضائع کرنے سے متعلق ہو مثلاً بال مونڈھنا یا کاٹنا یا ناخن تراشنا یا شکار کرنا تو وہ گنہ گار نہیں ہوگا اور اس پر فدیہ لازم ہوگا، مگر یہ کہ وہ پاگل ہو، اگر پاگل ہے تو اس پر فدیہ نہیں ہے۔

بھول کر یا حرمت سے ناواقفیت کی بنا پر خوشبو لگائے یا سلے ہوئے کپڑے پہنے تو وہ نہ گنہ گار ہوگا اور نہ اس پر فدیہ ہے۔

جب کسی کا ناخن ٹوٹے اور اس ٹوٹے ہوئے حصے کو ہٹائے تو اس پر فدیہ نہیں ہے، اسی

طرح اگر اپنی آنکھ سے بال نکالے تو اس پر فدیہ نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی وحشی جانور کو اپنے اوپر حملہ کرنے کی وجہ سے دفاع کرتے ہوئے مار ڈالے تو وہ نہ گنہ گار ہوگا اور نہ اس پر فدیہ ہے۔

اگر کسی شکار کو کسی حیوان یا پرندہ کے منہ سے علاج کی خاطر نکالے اور یہ شکار اس کے ہاتھ میں مر جائے تو نہ وہ گنہ گار ہوگا اور نہ اس پر فدیہ ہے۔

ان تمام حالات میں فدیہ ایک بکری ہے جس کا گوشت مکہ کے فقراء کو کھلایا جائے گا، البتہ جماع کا فدیہ ایک اونٹ ہے، اگر شکار جنگلی گائے ہے تو اس کا فدیہ ایک گائے ذبح کرنا ہے، اگر شکار شترمرغ ہو تو اس کا فدیہ ایک اونٹ ہے۔

حرم مکی کا درخت کاٹنا یا گھاس اکھاڑنا مُحرم اور غیر مُحرم دونوں کے لیے حرام ہے، بڑے درخت کا فدیہ چھوٹے درخت کے فدیہ سے الگ ہے۔

☆☆☆☆☆

حج اور عمرہ سے حلال ہونے کا طریقہ

حج یا عمرہ کے احرام سے حلال ہونے کے چار طریقے ہیں: (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۱۹۲، ''الإیضاح فی مناسک الحج والعمرۃ'' ص ۳۵۱، ''عجالۃ المحتاج'' ۲/۶۶۴)

پہلا طریقہ: یہ ہے کہ محرم حج اور عمرہ سے فارغ ہوجائے، یا صرف حج یا صرف عمرہ سے فارغ ہوجائے، اور اشہرِ حج کے علاوہ میں صرف عمرہ کا احرام ہو اور اس کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد حلال ہوجائے۔ اس میں اس حج اور عمرہ کی تکمیل بھی ہے جس کو جماع کے ذریعہ فاسد کردیا ہو، کیوں کہ اس پر دوسرے سال اس کی قضا کرنا واجب ہے۔ یہ شرعی حکم اس کے ساتھ مخصوص ہے جو تحلل اول سے پہلے اپنا حج جماع کے ذریعہ فاسد کردے۔ جو اسلام سے مرتد ہوجائے تو اس کا احرام فوراً باطل ہوجاتا ہے اور وہ اپنا حج مکمل بھی نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ ارتداد سے اس کے تمام کیے ہوئے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں۔

احرام سے حلال ہونے کی دو قسمیں ہیں: تحلل اول اور تحلل ثانی:

تحلل اول عیدالاضحیٰ کے دن ہوتا ہے، جب حاجی جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارتا ہے اور طواف افاضہ کرتا ہے اور اس کے بعد سعی کرتا ہے اگر اس نے طواف قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو، اس کے بعد اپنا سر منڈھاتا ہے یا بال نکالتا ہے، جب یہ تین اعمال کرتا ہے یعنی رمی جمار، طواف کے ساتھ سعی اور حلق یا ان میں سے کوئی دو کام کرتا ہے یعنی رمی اور حلق، یا طواف اور حلق تو اس وقت تحلل اول ہوجاتا ہے اور اس کے لیے جماع کے علاوہ سبھی احرام کے محرمات حلال ہوجاتے ہیں۔

تحلل ثانی اس وقت حاصل ہوتا ہے جس سے بشمول جماع کے سبھی محرمات حلال ہوجاتے ہیں جب طوافِ افاضہ سے حاجی فارغ ہوتا ہے اور طواف قدوم کے ساتھ

طواف نہ کیا ہو تو اس کے بعد سعی سے فارغ ہوجاتا ہے، جب یہ تینوں اعمال یعنی رمی، حلق اور طواف ادا کرتا ہے تو اس کے لیے تمام محرمات حلال ہوجاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ کوئی حج کا احرام پہنے، لیکن اس کو وقوف عرفہ چھوٹ جائے، مثلاً وہ کسی بھی وجہ سے عیدالاضحیٰ کے دن طلوع فجر سے پہلے پہلے عرفہ پہنچ نہ پائے، اس صورت میں وہ عمرہ کے اعمال یعنی طواف، سعی اور حلق کرے گا اور اپنے حج کے احرام سے حلال ہوجائے گا، یہ بات ہم نے پہلے بتادی ہے کہ عمرہ کے لیے کوئی مخصوص وقت نہیں ہے، اس کی ادائیگی پورا سال ممکن ہے، مگر یہ کہ کوئی حج کی ادائیگی میں مشغول ہو، کیوں کہ وہ عمرہ کے اعمال کو اپنے حج میں داخل اور شامل نہیں کرسکتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ ہے کہ احرام کی نیت کے وقت ہی یہ نیت کرے کہ اگر وہ بیمار ہوگیا یا زادِ راہ ختم ہوگیا یا حج کی ادائیگی میں مد مال ختم ہوگیا، یا راستہ بھول گیا یا حج کی تکمیل میں دوسری کوئی رکاوٹیں حائل ہوجائیں تو احرام سے نکل جائے گا، ان صورتوں میں وہ اپنے بال منڈھا کر احرام سے نکلنے کی نیت کرکے حلال ہوجائے گا، جب وہ حج یا عمرہ کی نیت کے وقت کہے: اگر میں بیمار ہوگیا تو میں حلال ہوں۔ تو وہ بیمار ہوتے ہی احرام سے نکل جائے گا اور اس کو تحلل کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھا طریقہ: یہ ہے کہ احصار کی وجہ سے حلال ہوجائے، یعنی جب اس کو حج کی ادائیگی یا حج کو مکمل کرنے سے یا مکہ میں داخل ہونے یا طواف کرنے سے روک دیا جائے تو اس صورت میں وہ تحلل کی نیت سے ایک بکری فدیہ میں دے گا اور اپنا سر منڈھائے گا اور اپنے احرام سے نکل جائے گا۔

جب کسی متعین راستے سے مکہ میں داخل ہونے سے روکا جائے اور وہاں پہنچنے کا دوسرا راستہ ہو تو دوسرا راستہ اختیار کرے گا، اگر اس کو عرفہ جانے سے روک دیا جائے تو وہ عمرہ کرے گا اور اپنے احرام سے حلال ہوجائے گا، اگر دوسرا راستہ طویل اور دشوار ہو تو اور وہ عرفہ پہنچ نہ سکتا ہو تو وہ عمرہ ادا کرے گا اور اپنے احرام سے حلال ہوجائے گا، اس صورت میں اس پر قضا نہیں ہے۔

دشمن حاجی کو حج کے مناسک ادا کرنے سے روک دے تو یہ بھی احصار ہے، یا حاجی اپنے والد کی اجازت کے بغیر احرام کی نیت کرے پھر والد اس کو منع کر دے، یا عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر احرام کی نیت کرے اور شوہر اس کو منع کر دے تو ان دونوں صورتوں میں احرام سے نیت اور بکری کو ذبح کرنے اور حلق کرنے سے حلال ہو جائے گا۔

جب اس کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ حج کے وقت میں یا عمرہ میں تین دنوں کے اندر احصار اٹھ جائے گا تو وہ اپنے احرام سے حلال نہیں ہو سکتا ہے، کیوں کہ باپ، آقا اور شوہر بیٹے، غلام اور بیوی کو احرام اتارنے پر مجبور کر سکتے ہیں جب انھوں نے اجازت کے بغیر احرام کی نیت کی ہو۔

جب قرض دار قرض خواہ کی اجازت کے بغیر احرام کی نیت کرے تو قرض خواہ اس کو حج کے لیے نکلنے سے روک سکتا ہے، چاہے قرض خواہ نے قرض دار کو احرام کی اجازت دی ہو، کیوں کہ وہ قرض دار کو اپنی جگہ سے نکلنے سے روک سکتا ہے، اور اس صورت میں قرض دار اپنے احرام سے حلال ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حج کے دوران یا حرم میں شکار کا فدیہ

شکار کی قسمیں:

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۳۲۷، ''اللباب'' محاملی ۱/ ۱۹۵)

شکار کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ پانی میں رہنے والے جانوروں کا شکار، اگر وہ پانی سے نکلے تو مر جائے، مثلاً مچھلی، چاہے وہ سمندر کی ہو یا کنویں کی یا نہر کی، اس طرح کا شکار، اس کو مارنا، اس کا کھانا محرم کے لیے جائز ہے، اور اس پر کوئی فدیہ بھی نہیں ہے، مُحرم اور غیر مُحرم دونوں کے لیے اس کا جواز یکساں ہے، حرمِ مکی میں بھی ہو تو اس کا حکم یہی ہے۔ (کیوں کہ یہ فرمانِ الٰہی گزر چکا ہے: ''حرم علیکم صید البر ما دمتم حرما'' المائدۃ ۹۶ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الأم'' ۲/ ۱۹۹)

۲۔ خشکی کا شکار، اس کی مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں:

الف: پہلی قسم: جس کا شکار مُحرم کے لیے بھوک کی ضرورت کے لیے جائز ہے، اور اس پر بدلہ لازم ہے، مثلاً اپنے کھانے کے لیے موت سے بچنے کی خاطر ہرن کا شکار کرے، اس صورت میں اسی طرح کا جانور فدیہ میں دیا جائے گا، وہ حرمِ مکی میں بکری ذبح کرے اور وہاں کے فقراء میں تقسیم کرے۔

ب: دوسری قسم یہ ہے کہ اس جانور کا قتل حلال ہے اور اس پر دم بھی نہیں ہے، یہ ہر وہ جانور ہے جو زہریلا ہو، مثلاً سانپ، اژدہا، زہریلی مکڑی، بچھو، گوشت خور کوے، آوارہ کتّے اور خونخوار جانور جو لوگوں پر حملہ کرتے ہیں، چیتے، عقاب وغیرہ ہر موذی جانور اور پرندے جو انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور راہ روکتے ہیں۔

ج: تیسری قسم جس کا قتل جائز نہیں ہے، اگر قتل کیا جائے تو دم نہیں ہے، مثلاً شہد کی مکھی، چیونٹی، بندر اور بلی۔

د: چوتھی قسم: جس کا قتل حرام ہے اور اس میں دم ہے، یہ ہر وہ حیوان ہے جس کا گوشت کھانا حلال ہے، مثلاً ہرن، نیل گائے، شتر مرغ، جنگلی گدھا، اس کا دم یہ ہے کہ اسی طرح کا جانور ذبح کیا جائے، شتر مرغ کا دم ایک اونٹ ہے، نیل گائے کا فدیہ گائے ہے، ہرن کا شکار کرنے کا فدیہ ایک بکری یا مینڈھا ہے، خرگوش کو شکار کرنے کا فدیہ ایک سال سے کم والی بکری ہے، لومڑی کو مارنے کا فدیہ ایک بکری ہے، گوہ کا شکار کرنے کا فدیہ بکری کا چار ماہ کا بچہ ہے، فاختہ کو قتل کرنے کا فدیہ ایک بکری ہے۔ (بیہقی نے ''السنن الکبری'' میں روایت کیا ہے کہ قریش کے ایک لڑکے نے مکہ میں ایک کبوتر مار ڈالا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک بکری فدیہ میں دینے کا حکم دیا۔ کتاب الحج، باب حج الصبی ۱۸۲/۵) جس پرندے یا جانور کا مثل نہ پایا جاتا ہو تو اس کی قیمت صدقہ کی جائے گی، قیمت کا اندازہ تجربہ کار لگائیں گے۔

فدیہ کا جانور حرم مکی میں ہی ذبح کیا جائے، قیمت بھی مکہ میں ہی نکالی جائے اور وہاں کے فقراء میں تقسیم کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

رمیِ جمار

(یہ حج کے واجبات میں سے ہے، دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۳۱۹/۱)

منیٰ میں تین جمرات؛ جمرہ اولی، جمرہ وسطی اور جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔

جمرہ عقبہ کو رمی کرنے کا وقت عید الاضحیٰ کی آدھی رات سے شروع ہوتا ہے، اس کا سب سے افضل وقت عید الاضحیٰ کا سورج غروب ہونے تک ہے، جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کا وقت تیرہ ذی الحجہ کے غروب تک ہے۔

منی میں تین جمرات؛ جمرہ اولی، جمرہ ثانیہ اور جمرہ عقبہ کو ایام تشریق گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ میں رمی کرنے کا وقت سورج کے زوال کے بعد سے ہے، یہ شوافع کا قولِ معتمد ہے، کسی دن زوال شمس سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں ہے، (کیوں کہ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرہ اس وقت کرتے تھے جب سورج کو زوال ہوتا۔ ابو داود نے یہ روایت کی ہے: کتاب المناسک، باب فی رمی الجمار ۱۹۷۳، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۳۸۵۷) ان تین دنوں کا وقت تیرہویں ذی الحجہ کا سورج غروب ہونے تک جاری رہتا ہے، یہ ایام تشریق کا آخری دن ہے، چاہے رمی رات میں کی جائے یا دن میں زوال سے پہلے ہو تو جائز ہے، رمی جمار کی مجموعی کنکریوں کی تعداد جس میں عید کے دن کی رمی اور ایام تشریق کے تینوں دنوں کی رمی شامل ہے ستّر ہے۔

عید الاضحیٰ کے دن صرف جمرہ عقبہ کو سات کنکریاں ماری جائیں گی، ایام تشریق میں تینوں جمرات کو سات سات کنکریاں ہر دن ماری جائیں گی، یعنی ہر دن اکیس کنکریاں، جو جمرہ اولی، جمرہ ثانیہ اور جمرہ عقبہ کو ماری جائیں گی۔

رمی میں ترتیب کی رعایت کرنا واجب ہے، (اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے، اگر ترتیب کا لحاظ نہ رکھے تو صرف جمرہ اولی کا شمار ہوگا، دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ۶۳۱/۲)؛ اس کا مطلب

یہ ہے کہ جمرہ اولی سے ابتدا کی جائے گی جو مسجد خیف سے قریب ہے، یہ عرفہ سے آتے وقت پہلا جمرہ ہے، اس کے بعد جمرہ وسطی پڑتا ہے، اور اس کے بعد جمرہ عقبہ ملتا ہے۔

یہ سنت ہے کہ جمرہ اولی اور وسطی کے پاس کھڑا ہو اور اللہ سے سورہ بقرہ کی تلاوت کے بقدر وقت دعا کرے، اگر اس مدت کے دوران خشوع باقی رکھنا ممکن ہو، ورنہ وہاں کنکریاں مارنے اور جتنا ہو سکے دعا کرنے تک رکا رہنا کافی ہے۔ البتہ جمرہ عقبہ کے پاس ٹھہرنا سنت نہیں ہے، بلکہ وہاں سے کنکریاں مارنے کے فوراً بعد ہٹ جائے گا، جمرہ اولی اور ثانیہ کو رمی کرتے وقت قبلہ رخ ہونا چاہیے، اور جمرہ عقبہ کی رمی کے وقت اسی کی طرف رخ رہنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

میقات

میقات کی دو قسمیں ہیں: (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الإیضاح'' نووی ۱۱۳، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۳۱۸)

میقاتِ زمانی: حج کے احرام کے لیے میقاتِ زمانی شوال اور ذی قعدہ کے دو مہینے اور ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں، البتہ عمرہ کے احرام کے لیے میقات زمانی سال کے تمام دن ہیں۔

میقات مکانی: حج اور احرام کے لیے جو جگہیں متعین ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اہلِ مدینہ کی میقات: یہ ذو الحلیفہ ہے جس کو أبیار علی بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ مصر، شام اور مغرب والوں کی میقات، یہ جحیفہ ہے، اب اس علاقہ کو رابغ کہا جاتا ہے، چونکہ مصر، شام اور مغرب والے اپنے آنے اور جانے میں مدینہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں؛ اس لیے ان کی میقات بھی مدینہ والوں کی ہی میقات بن گئی ہے، جو ذوالحلیفہ یا أبیار علی ہے۔

۳۔ نجدِ یمن اور نجدِ حجاز والوں کی میقات، یہ قرن المنازل ہے۔

۴۔ عراق والوں کی میقات ذاتِ عرق ہے، افضل یہ ہے کہ عراق والے مقامِ عقیق سے احرام کی نیت کریں، یہ ذات عرق سے دور ہے۔

حج اور عمرہ کے احرام کے لیے یہ میقات مکانی ہیں، ان علاقوں کے لیے جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور یہی میقات ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو دنیا کے کسی علاقہ سے ان میں سے کسی جگہ سے ہو کر آتے ہوں۔ جو میقات اور حرم مکہ کے درمیان رہتے ہیں تو ان کے احرام کی جگہ ان کا گھر ہے، جس کا گھر میقات سے دور ہو تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام کی نیت کر سکتا ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ میقات سے احرام پہنے۔

مکہ مکرمہ اور ان میں سے ہر میقات کے درمیان کی مسافت ۱۶ فرسخ (تقریباً ۸۸ کلومیٹر) ہے، صرف رابغ مکہ سے پچاس فرسخ دور ہے، ذوالحلیفہ یا أبیار علی مکہ سے اسّی فرسخ دور

ہے، یہ سبھی میقاتِ مکانی شریعت میں منصوص ہیں، اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

مکہ میں مقیم کے لیے حج کے احرام کی میقات مکہ ہی ہے، اور مکہ میں مقیم کے لیے عمرہ کے احرام کی میقات سب سے قریبی حِل ہے، اور سب سے قریب مسجدِ عائشہ ہے جس کو تنعیم کہا جاتا ہے، یہ مکہ سے باہر کا علاقہ ہے۔

☆☆☆☆☆

ہدی

اصل میں ہدی ہر وہ جانور ہے جو حرم کے باشندوں کے لیے بطور ہدیہ پیش کیا جاتا ہے؛ اونٹ، گائے اور بکری، جن کو مکہ میں ذبح کیا جاتا ہے اور گوشت حرم مکی کے باشندوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

فقہ کی اصطلاح میں ہدی سے مراد ہر وہ حیوان ہے جس کا گوشت حلال ہے اور جس کو حرم مکی میں ذبح کرنا واجب ہے، اس کی دو قسمیں ہیں؛ واجب ہدی اور نفل ہدی۔

واجب ہدی: ہر وہ ہدی ہے جس کو ذبح کرنا کسی حرام فعل کے ارتکاب کی وجہ سے واجب ہے، مثلاً احرام کی حالت میں شکار کرے، یا احرام کے واجبات میں سے کسی واجب کو چھوڑ دے، مثلاً میقات سے احرام کی نیت چھوڑ دے۔

ان دو قسموں کے ہدی کا گوشت ہدی پیش کرنے والے لیے کھانا جائز نہیں ہے۔

نفل ہدی: یہ ہر اس حیوان کی قربانی ہے جس کا گوشت کھانا حلال ہے اور ذبح کرنے والے نفلی طور پر قربانی دیتا ہے، اس پر ذبح واجب نہیں ہوتا اور مکہ کے باشندوں میں اس کا گوشت تقسیم کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس صورت میں ہدی کا جانور قربانی کرنے والے کے لیے اس میں سے کھانا اور حرم کے فقراء میں تقسیم کرنا جائز ہے، افضل یہ ہے کہ وہ اپنے کھانے کے لیے ایک تہائی رکھے، ایک تہائی ہدیہ دے اور ایک تہائی فقراء میں تقسیم کرے۔

احرام کی حالت میں مُحرم پر واجب دم:

(دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۳۳۱)

اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ واجب دم جن کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے:

یہ جملہ چار دم ہیں:

۱۔حجِ تمتع کرنے والے پر واجب دم

۲۔شکار کا فدیہ

۳۔تکلیف دور کرنا مثلاً جوؤں سے چھٹکارا پانے کے لیے سر منڈھانا

۴۔احصار

حج تمتع کرنے والے پر لازم دم میں یہ اصول ہے کہ جب اس کو ذبح کرنے کے لیے بکری نہ ملے تو دس دن کے روزے رکھے؛ تین حج ہی میں، پانچ، چھ اور سات ذی الحجہ کو، یا چھ، سات اور آٹھ ذی الحجہ کو، اور سات روزے اپنے گھر واپس ہونے کے بعد، اگر وہ مکہ ہی میں رہے اور حج کے بعد اس کو اپنا وطن بنالے تو اس پر مکہ ہی میں سات روزے رکھنا واجب ہے۔

احرام کی حالت میں شکار کرنے والے پر واجب دم یہ ہے کہ اسی طرح کا جانور ذبح کرے، اس صورت میں اس کو اسی طرح کا جانور ذبح کرنے یا اس کی قیمت کے بقدر مسکینوں کو کھلانے یا روزے رکھنے کے درمیان اختیار ہے، مثلاً کوئی احرام کی حالت میں ہرن کو قتل کرے تو بکری کو اس کا مثل مانا جائے گا، اس صورت میں اس کے لیے اختیار ہے کہ وہ ایک بکری ذبح کر کے حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرے، یا بکری کی قیمت سے غلہ خرید کر حرم کے فقراء میں تقسیم کرے، ہر ایک کو ایک مد دے (ایک مد تین پاؤ کا ہوتا ہے)، یا ہر مد کے بدلہ ایک روزہ رکھے، اگر بکری کی قیمت پچاس مد غلہ کے برابر ہو تو اس پر پچاس روزے رکھنا فرض ہے، اور اس روزے کو صوم تعدیل کہا جاتا ہے، کیوں کہ ان روزوں کی تعداد فقراء کو دیے جانے والے مد کی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔

مُحرم نے جس جانور کو قتل کیا ہے اس کا کوئی مماثل جانور موجود نہ ہو، مثلاً چھوٹی چڑیا، تو اس کو اختیار ہے کہ وہ اس کی قیمت لگائے اور اس کے برابر غلہ خرید کر حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرے، یا ہر مد کے بدلے ایک روزہ رکھے۔

تکلیف دور کرنے یعنی سر میں موجود جوؤں کو صاف کرنے کے لیے حلق کرے، یا

ناخن تراشے تو اس فدیہ میں مُحرم کو اختیار ہے کہ وہ ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت مکہ کے فقراء میں تقسیم کرے، یا تین روزے رکھے، یا بارہ مد غلہ مکہ کے چھ فقیروں میں تقسیم کرے، یعنی ہر فقیر کو دو مد غلہ دے۔

احصار کا فدیہ یہ ہے کہ قربانی میں ذبح کے قابل بکری کی قربانی دی جائے، اگر یہ نہ ملے تو اس کی قیمت کے برابر غلہ تقسیم کرنا ضروری ہے، ہر فقیر کو ایک مد دیا جائے یا ہر مد کے بدلے ایک روزہ رکھا جائے۔

دوسری قسم: وہ واجب دم جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے

اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ دم جو اس وقت واجب ہوتے ہیں جب محرم حج کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کر دے، مثلاً میقات سے احرام پہننا چھوڑ دے، چاہے حج میں ہو یا عمرہ میں، مزدلفہ میں رات نہ گزارے، منیٰ میں رات نہ گزارے، منیٰ میں تین جمرات میں سے کسی جمرہ کی رمی نہ کرے، طواف وداع چھوڑ دے۔

دوسری قسم: وہ لطف اندوز ہونے کی صورت میں واجب ہونے والا دم ہے، اس کی پانچ صورتیں ہیں: حج کو فاسد نہ کرنے والا جماع، یعنی تحلل اول کے بعد تحلل ثانی سے پہلے جماع کرے، چاہے اگلی شرمگاہ میں جماع کرے یا پچھلی شرمگاہ میں، عورت کے بدن کو شہوت کے ساتھ چھونا، شہوت کے ساتھ بوسہ دینا، چاہے منی نہ آئے، خوشبو کا استعمال کرنا، سلے ہوئے کپڑے پہننا۔

خلاصہ کلام یہ کہ حج یا عمرہ میں لازم دم کی چار مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

۱۔ **دم ترتیب وتقدیر**: یہ حج تمتع، قران، حج چھوٹنے، پانچ واجبات میں سے کسی واجب کو چھوڑنے کا دم ہے یعنی میقات سے احرام کی نیت نہ کرے، مزدلفہ میں رات نہ گزارے، منیٰ میں رات نہ گزارے، منی کے جمرات میں سے کسی جمرہ کی رمی نہ کرے، یا تمام جمرات کو چھوڑ دے، طواف وداع چھوڑ دے۔

۲۔**دم ترتیب تعدیل**: یہ حج کو فاسد کرنے والے جماع کا دم ہے، اور احصار کا دم ہے یعنی حج کی ادائیگی سے حاجی کو روک دیا جائے۔

۳۔**دم تخییر وتقدیر**: یہ سلے ہوئے کپڑے پہننے، خوشبو استعمال کرنے، سر اور داڑھی میں تیل لگانے، بال نکالنے اور ناخن تراشنے، حج کو فاسد نہ کرنے والے جماع، عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے، شہوت کے ساتھ بوسہ دینے، منی نکالنے کا دم ہے، منی نکالنے میں شرط یہ ہے کہ منی آجائے۔

۴۔ **دم تخییر وتعدیل**: یہ شکار اور حرم کا درخت کاٹنے کا دم ہے، اس کی تفصیلات ہم نے بیان کردی ہیں۔

☆☆☆☆☆

حج اور عمرہ فاسد کرنے والے امور

اس باب میں ان اعمال اور امور کی تفصیلات بیان کی جارہی ہیں جن سے حج اور عمرہ فاسد ہوجاتا ہے، وہ اعمال مندرجہ ذیل ہیں: (دیکھا جائے: ''الإیضاح'' نووی ص۱۶۹)

جماع: چاہے تحلل اول سے پہلے حاجی جماع انسان کی شرمگاہ میں کرے یا کسی دوسرے جانور کی شرمگاہ میں، مثلاً کسی عورت یا حیوان کی شرمگاہ میں عمداً اس کی حرمت کو جانتے ہوئے اپنے اختیار سے جماع کرے، یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور اس سے جماع کرنے والے اور جس کے ساتھ جماع کیا جائے دونوں کا حج فاسد ہوجاتا ہے، البتہ فدیہ صرف جماع کرنے والے پر ہے، مفعول بہ پر دم نہیں ہے۔

جب شوہر اپنی بیوی سے حج میں تحلل اول سے پہلے جماع کرے تو دونوں کا حج فاسد ہوجاتا ہے، اور ان دونوں پر ضروری ہے کہ اپنا حج پورا کریں اور ان دونوں پر حج کی قضا بھی ہے، اور شوہر پر فدیہ واجب ہے، اسی طرح شرمگاہ میں جماع کرنے سے شوہر اور بیوی دونوں کا عمرہ باطل ہوجاتا ہے اور ان دونوں پر قضا ہے، البتہ صرف شوہر پر فدیہ ہے۔

حج اور عمرہ کو فاسد کرنے والے جماع کا فدیہ

حج اور عمرہ کو فاسد کرنے والے جماع کا فدیہ ایک اونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرنا ہے۔ اگر اونٹ نہ ملے تو ایک گائے ذبح کرکے اس کا گوشت مکہ کے فقراء میں تقسیم کیا جائے، اگر گائے نہ ملے تو اس پر سات بکریاں ذبح کرنا واجب ہے، اگر سات بکریاں نہ ملیں تو ضروری ہے کہ اونٹ کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور اس کی قیمت سے غلہ خریدے جس سے زکوۃ فطر جائز ہے، اور اس کو فقراء میں تقسیم کرے؛ ہر فقیر کو ایک مد دیا جائے، یا ہر مد کے بدلے ایک روزہ رکھے، اگر سات بکریوں کی قیمت ایک سو

پچاس مد غلہ ہوتا ہوتو ایک سو پچاس روزے رکھنا ضروری ہے۔

حج کو فاسد نہ کرنے والے جماع کا فدیہ

اگر کوئی تحلل اول اور تحلل ثانی کے دوران اپنی بیوی سے جماع کرے تو ایک بکری ذبح کرنا واجب ہے جس کا گوشت مکہ کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا۔

فدیہ کے طور پر ذبح کیے جانے والے اونٹ کی عمر اتنی ہی ہونی چاہیے جو قربانی کے لیے کافی ہو۔ البتہ شتر مرغ کے شکار کے بدلہ اونٹ ذبح کرنا بطور فدیہ واجب ہے، اس میں قربانی جائز ہونے کی عمر کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس فدیہ میں شتر مرغ کی عمر کے مطابق ہونا کافی ہے، اگر شکار کیا ہوا شتر مرغ چھوٹا ہو تو چھوٹی اونٹ کافی ہے۔

☆☆☆☆☆

حج کے مکروہات

حج اور عمرہ میں مندرجہ ذیل چیزیں مکروہ ہیں:

۱۔ ساتھ میں رہنے والوں کے ساتھ جھگڑا اور خادموں کے ساتھ گالی گلوج، یہ حج اور عمرہ کے علاوہ عام دنوں میں بھی مکروہ ہے، لیکن حج اور عمرہ میں اس کی کراہت شدید ہو جاتی ہے۔

۲۔ شہوت سے دیکھنا؛ کیوں کہ حج یا عمرہ کے احرام پہننے والے کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔

۳۔ رمیِ جمرات کے لیے مسجد سے کنکریاں جمع کرنا، کیوں کہ یہ پہلے مسجد کے فرش کا حصہ تھیں، اسی طرح کنکریاں نجس جگہ سے نہیں لی جائیں گی۔

۴۔ رمی کی کنکریاں جمرات سے متصل جگہ سے جمع کرنا، یا اس سے پہلے رمی میں استعمال کردہ کنکریوں کو جمع کرنا۔

۵۔ یوم عرفہ کو حاجی روزہ رکھے، بعض فقہاء نے اس دن کا روزہ رکھنا ترکِ اولی کہا ہے۔

۶۔ حرم کے باہر سے رمی جمار کے لیے کنکریاں جمع کرنا۔

۷۔ گداگری کے ارادہ سے حج اور عمرہ کا سفر کرنا۔

۸۔ ناخن سے سر کھجانا، یہ مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے سر کے بال جدا نہ ہوں۔

۹۔ سر اور داڑھی میں کنگھی کرنا؛ کہیں احرام کے دوران بال نہ گر جائے۔

۱۰۔ زیب وزینت کے لیے استعمال کیا جانے والا سرمہ استعمال کرنا، یہ پتھر سے بنایا ہوا سرمہ ہے، البتہ توتیاء سرمہ لگانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جس میں نہ پاکیزہ خوشبو رہتی ہے اور نہ اس کو زینت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ طواف کے دوران کھانا یا پینا مکروہ ہے۔

ہدی وغیرہ کی نذر

اس باب میں ہدی کے جانور؛ اونٹ، گائے اور بکری ذبح کرنے اور مکہ کے فقراء پر اس کا گوشت تقسیم کرنے کی نذر ماننے کے احکام بیان کیے گئے ہیں، اسی طرح حج اور عمرہ کے سفر کی نذر ماننے کے احکام اور نفل روزوں کے نذر کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

نذر کے لغوی معنی: اس کے معنی وعدہ کرنا ہے چاہے اچھا وعدہ ہو یا برا وعدہ۔

شریعت میں نذر کے معنی: غیر واجب طاعتوں میں سے کسی طاعت کی پابندی کا عہد کرنا، مثلاً ہر دن صدقہ نکالنے کا عہد کرے۔

نذر کی تین قسمیں ہیں: (اس کی مزید تفصیلات أیمان اور نذور کے باب میں آرہی ہیں) نذر لجاج وغضب، نذر مجازات، نذر تبرر، ان تینوں کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔ **نذر لجاج**: مثلاً کوئی کہے: ''اگر میں نے فلان سے بات کی تو اللہ کی خاطر مجھ پر ایک دن کا روزہ واجب ہے''، اگر اس نے مذکورہ شخص سے بات کی تو اس پر اپنی قسم کا کفارہ دینا واجب ہے کہ ایک دن کا روزہ رکھے۔ اس طرح کی نذر عام طور پر غصہ کے وقت کھائی جاتی ہے، یہ مکروہ نذر ہے، افضل یہ ہے کہ وہ اس نذر میں کھائی ہوئی قسم توڑ دے اور حانث ہوجائے، اگر مذکورہ شخص مسلمان ہے تو اس کے ساتھ بات کرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے، معصیت اور گناہ میں نذر منعقد نہیں ہوتی ہے۔

مثلاً؛ اگر کوئی کہے: ''میں نے نذر مانی کہ میں فلاں کو گالی دوں گا'' تو یہ نذر منعقد نہیں ہوتی ہے، اسی طرح کسی ایسی چیز کی نذر منعقد نہیں ہوتی جس کا وہ مالک نہ ہو، مثلاً نذر مانے کہ وہ احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے گا۔

۲۔ **نذر مجازات**: اللہ کی نعمتوں میں سے کسی نعمت کے حاصل ہونے پر نذر

ماننے، یا کسی مسلمان کی مصیبت دور ہونے پر نذر ماننے، مثلاً کہے: ''اگر اللہ میرے مریض کو شفا دے تو مجھ پر ضروری ہے کہ میں ایک ہزار درہم فقیروں پر صدقہ کروں گا''۔ جب یہ مریض شفایاب ہوجائے تو اس پر ایک ہزار درہم فقیروں پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

۳۔ **نذر تبرر**: مثلاً یہ کہنا: ''اللہ تعالی کی خاطر مجھ پر ایک دن کا روزہ فرض ہے''۔ یہ نذر کے الفاظ کہتے ہی اس کے ذمہ روزہ فرض ہوجاتا ہے، لیکن اس نذر کو فوراً پورا کرنا شرط نہیں ہے، کیوں کہ نذر تبرر اطاعت ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے وقت میں وسعت ہے، اگر اس نے اپنے دل میں کوئی دن متعین کیا ہو تو اسی متعین کردہ دن میں روزہ رکھنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی کہے: ''اللہ کی خاطر مجھ پر ہدی کا جانور قربان کرنا ضروری ہے''، یعنی اس کو مکہ بھیجے گا، کسی جنس کی تعین نہ کرے، اس صورت میں اس پر مکہ میں ایک بکری ذبح کرنا اور وہاں کے فقیروں میں اس کا گوشت تقسیم کرنا ضروری ہے، حرم کے لیے ہدیہ کیا جانے والا ہدی کا جانور اونٹ یا گائے یا بکری سے کم ہونا کافی نہیں ہے، مثلاً مرغی ہدیہ میں بھیجے تو جائز نہیں ہے اگر اس پر بکری کی ہدی واجب ہو، اگر کسی پر اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ ہدی میں دینا فرض ہو تو اس پر ضروری ہے کہ مکمل جانور ذبح کرے اور اس کا ساتواں حصہ حرم کے فقیروں میں تقسیم کرے، اور وہ باقی حصوں میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے، اور ان حصوں میں سے کھا بھی سکتا ہے۔

جو کسی ہدی کی نذر مانے تو اس میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے، مثلاً اس کو بیچ دے یا اس سے دست بردار ہوجائے وغیرہ، البتہ وہ اس کا دودھ ذبح کرنے سے پہلے تک پی سکتا ہے، اور سواری بھی کرسکتا ہے، اور اس پر اپنا سامان لاد بھی سکتا ہے، اسی طرح دوسروں کو اس پر سوار ہونے کی اجازت بھی دے سکتا ہے، اگر اس پر سامان لادنے کی وجہ سے کوئی کمی آجائے مثلاً لنگڑا ہوجائے تو اس پر ضروری ہے اس کمی کے بدلے میں قیمت کا جو فرق ہوا ہے اتنا مال فقراء میں تقسیم کرے۔

☆☆☆☆☆

استطاعت کا مفہوم

اس باب میں استطاعت کے احکام بیان کیے جارہے ہیں جو حج اور عمرہ کی ادائیگی واجب ہونے کے لیے شرط ہے۔

استطاعت کی دو قسمیں ہیں:(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے:''الوسیط'' غزالی ۲/۵۸۱، ''کفایۃ الأخیار''۱/۳۱۲،''الإیضاح''نووی ۹۵)

۱۔مسلمان خود سے مستطیع ہو؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود سے حج کے لیے جانے، ہوائی جہاز یا کشتی یا اونٹ یا کسی بھی دوسرے وسیلہ پر سوار ہونے کی طاقت رکھتا ہو جس کے ذریعہ سفر کرے، یا اس کے پاس جانے اور واپس آنے کا وسیلۂ سفر ہو، اور وہ واپس آنے تک اپنے اور اپنے اہل وعیال کا نفقہ رکھتا ہو، اس کے پاس حج کے دوران پینے کے لیے پانی ہو، جس پر سفر کررہا ہو اس کا زادِراہ ہو، یا گاڑی پر جارہا ہو تو پٹرول کے اخراجات ہوں، اس کا گزر جہاں سے بھی ہونے والا ہو، وہاں کھانے پینے کے لیے رقم موجود ہو، کیوں کہ کسی بھی بڑے سفر کے لیے اپنے ساتھ آدمی زادِراہ اور پانی لے نہیں جاسکتا ہے، جس کا گھر ۱۶ فرسخ کی مسافت کے فاصلہ پر ہو تو سواری نہ رہنے کی صورت میں پیدل حج کرنا لازم ہے، البتہ عذر ہو تو الگ بات ہے، اس کے لیے زادِسفر یا پانی ساتھ رکھنا ضروری نہیں ہے۔

توشہ، قیام اور گاڑی کے پٹرول وغیرہ کے اخراجات کا اعتبار سعودی عرب کی قیمت کے مطابق ہوگا، استطاعت میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کو سفر حج اور عمرہ میں اپنی جان، مال اور عزت پر امان ہو، حج یا عمرہ کا ارادہ رکھنے والی عورت کے ساتھ محرم بھی پایا جانا ضروری ہے، مثلاً اس کا شوہر یا بیٹا یا بھائی ہو، ان میں سے کوئی بھی ایک ہو تو کافی ہے تاکہ اس کا دفاع کرسکے، اسی طرح فرض حج میں عورت کے ساتھ دو قابل بھروسہ عورتوں کا پایا جانا کافی

ہے، ہم نے عورت کے دفاع کی قدرت کی شرط رکھی ہے، کیوں کہ حج کی ادائیگی میں بچہ ساتھ رہے تو کافی نہیں ہے۔(اسی وجہ سے قفال کا خیال یہ ہے کہ ثقہ عورتیں ساتھ ہوں تو عورت پر حج کے لیے جانا لازم نہیں ہے، جب تک کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ محرم نہ ہو، کیوں کہ جب ان پر کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ محرم سے تعاون لینے کی ضرورت مند ہوجاتی ہیں۔ دیکھا جائے:''الوسیط'' ۲/۵۸۶) ہم نے یہ بات کہی ہے کہ عورتوں کی رفاقت صرف فرض حج یا فرض عمرہ میں جائز ہے، لیکن سنت یہ ہے کہ حج اور عمرہ میں محرم ساتھ ہو، چاہے اس کے ساتھ دس عورتیں موجود کیوں نہ ہوں۔

۲۔دوسرے کے ذریعہ استطاعت: اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود حج یا عمرہ کا فریضہ ادا نہ کرسکے، البتہ دوسرے شخص کے ذریعہ ادا کرسکے، جو اس کی نیابت میں یہ فریضہ انجام دے، مثلاً کسی کو گاڑی یا جانور پر سوار ہونے کی صورت میں ایسی بیماری لاحق ہونے کا اندیشہ ہو جس سے ہلاکت کا خطرہ ہو، یا کوئی اپاہج ہو، حج کے سفر پر نہ جاسکتا ہو، لیکن وہ اپنی طرف سے کسی کو حج کرنے کے لیے اجرت پر لے سکتا ہو، یا اس کی نیابت میں تطوعاً کوئی حج یا عمرہ کرنے کے لیے راضی ہو۔

دوسرے سے یہ بات کہنا صحیح ہے:''میں نے اپنے بدلہ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے تم کو ایک ہزار درہم اجرت پر رکھا''۔البتہ شرط یہ ہے کہ سامنے والا قبول کرلے۔

اگر یہ کہے:''میں نے حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے تمہارے خرچ کیے جانے والے نفقات پر اجرت پر رکھا''۔تو یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس عبارت میں نفقہ کی مقدار معلوم نہیں ہے، البتہ یہ کہنا صحیح ہے:''جاؤ اور میری طرف سے حج ادا کرو، میں تمہارا نفقہ برداشت کروں گا''۔اس کا حج اور عمرہ اس کی طرف سے نیابتاً صحیح ہوجائے گا، اور دوسرے کو دیے ہوئے نفقہ اور اجرت کے مقابلہ میں اس کا حج یا عمرہ ساقط ہوجائے گا۔

☆☆☆☆☆

جس نے اپنا فرض حج ادا نہ کیا ہو وہ دوسرے کی طرف سے یہ فریضہ ادا نہیں کرسکتا

جس نے اپنا فرض حج یا عمرہ ابھی ادا نہ کیا ہو تو اس کے لیے دوسرے کی طرف سے حج یا عمرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا: شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا: میرا بھائی ہے۔ آپ نے دریافت کیا: کیا تم نے کبھی حج کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اس حج کو اپنی طرف سے کرو، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا''۔ ابن ماجہ: کتاب المناسک، باب الحج عن المیت ۲۹۰۳، ابوداود: کتاب المناسک، باب الرجل یحج عن غیرہ ۱۸۱۱، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۳۹۸۸) جو نذر مان کر یا دوسرے کی طرف سے حج یا عمرہ کا احرام پہنے، جب کہ اس نے اسلام کا فرض حج یا عمرہ ابھی ادا نہ کیا ہو تو اس کا یہ احرام نذر کے حج یا عمرہ، یا دوسرے کی نیابت میں کرنے والے حج کے لیے منعقد نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کا فرض حج اور عمرہ شمار ہو جاتا ہے۔ ایک ہی سال کئی لوگ ایک ہی کی طرف سے حج اور عمرہ ادا کر سکتے ہیں اور یہ جائز ہے، مثلاً کوئی بچہ ہو جس نے اپنا حج یا عمرہ احرام پہننے کے بعد فاسد کر دیا ہو اور یہ تحلل اول سے پہلے ہو اور اپنے والدین کی اجازت سے حج پر گیا ہو، پھر اس نے آئندہ سال حج کی نذر مانی ہو، لیکن اسی سال اس کی وفات ہو جائے تو اس صورت میں اس کے والدین کے لیے جائز ہے کہ تین لوگوں کو اجرت پر لیں، ایک کو اپنے بیٹے کی طرف سے فرض حج کی ادائیگی کے لیے، دوسرے کو اس کے نذر مانے ہوئے حج کی ادائیگی کے لیے اور تیسرے کو قضا کا حج ادا کرنے

کے لیے، اس طرح تین لوگ اس کی طرف سے ایک ہی سال حج ادا کریں گے۔

حج بھی اس معاملہ میں عمرہ کی طرح ہے کہ جو فرض عمرہ ادا نہیں کر سکتا تو کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا کر سکتا ہے، اگر کوئی حج کا احرام پہنے لیکن عرفہ میں ٹھہر نہ سکے اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے تو یہ اس نے جو عمرہ کیا ہے وہ فرض عمرہ شمار نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شخص احرام پہنے پھر بھول جائے کہ اس نے حج کا احرام پہنا تھا یا عمرہ کا، یا دونوں کا ایک ساتھ، اس صورت میں اس پر ضروری ہے کہ وہ حج قران کی نیت کرے یا صرف حج کی نیت کرے، جب وہ حج قران ادا کرے یا صرف حج ادا کرے تو وہ پہلے اپنا حج مکمل کر سکتا ہے، جب وہ حج سے فارغ ہو جائے تو پھر عمرہ ادا کرے گا، کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس نے صرف حج کا احرام پہنا ہو، اور اس وجہ سے وہ عمرہ کی نیت کو اپنے حج کی نیت میں شامل نہیں کر سکتا ہے، اگر اس نے عمرہ کی نیت کی ہو اور حج ادا کرے تو ایسا ہوگا جیسے اس نے نہ حج کیا اور نہ عمرہ کیا؛ کیوں کہ اس نے حج کا احرام پہنا ہی نہیں کہ وہ صحیح حج ادا کرے، اور عمرہ کا احرام بھی صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس نے جس کی نیت کی ہو اس کو بھول گیا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ حج کی نیت ہو۔

جس کا حج قبول نہیں ہوتا وہ کافر ہے، کیوں کہ وہ مومنوں میں سے نہیں ہے، اسی طرح مجنون، غیر ممیّز بچہ اور ممیّز بچہ جو اپنے والدین کی اجازت کے بغیر حج پر گیا ہو؛ ان سبھوں پر حج لازم نہیں ہے، کیوں کہ مجنون اور غیر ممیّز بچہ؛ دونوں کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، اسی طرح ممیّز بچہ جس کے ولی نے حج پر موافقت نہ کی ہو اس کو اپنے ولی کے مال میں تصرف کا حق نہیں ہے، وہ حج میں اپنے ولی کی موافقت، رضامندی اور اجازت کے بغیر خرچ کر رہا ہے، البتہ ولی کے لیے مجنون اور غیر ممیّز اور ممیّز بچہ کی طرف سے حج کا احرام پہننے کی اجازت ہے اور ان کی طرف سے اس کا احرام صحیح ہو جائے گا، اور وہ حج میں ان کے ساتھ رہنے کا ذمہ دار ہوگا، اور ان کا احرام بھی صحیح ہوگا، جس طرح غلام کا احرام اپنے آقا کی اجازت سے اور ممیّز بچہ کا احرام اپنے ولی کی اجازت سے صحیح ہوتا ہے۔

جب غلام اپنے آقا کی اجازت سے حج کا احرام پہنے پھر وقوفِ عرفہ سے پہلے اس کو آزاد کر دیا جائے، یا ممیّز بچہ اپنے ولی کی اجازت سے حج کا احرام پہنے اور وقوفِ عرفہ سے پہلے وہ بالغ ہو جائے تو ان دونوں کا فرض حج ادا ہو جائے گا، البتہ شرط یہ ہے کہ وقوفِ عرفہ مکمل ہونے سے پہلے یا وقوف کے دوران غلام کو آزاد کیا گیا ہو یا ممیّز بچہ بالغ ہوا ہو، چاہے ایک لحظہ پہلے ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

مکہ میں داخل ہونے کے آداب

جو مکہ میں حج یا عمرہ کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے داخل ہو تو اس پر حالتِ احرام میں داخل ہونا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ حرم مکہ میں داخل ہونے کے لیے احرام سنت ہے، جیسے کہ تحیۃ المسجد کا حکم ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے احرام سنت ہے، جب حج کے موسم کے علاوہ اوقات میں حج یا عمرہ کے ارادہ کے بغیر داخل ہو، اگر اس کا ارادہ اسی سال حج کرنے کا ارادہ ہو تو مکہ میں داخل ہونے کے لیے احرام واجب ہے۔

حرم مکہ کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وہاں شکار کرنا حرام ہے۔

۲۔ وہاں کا درخت کاٹنا حرام ہے۔

۳۔ وہاں قربانی کا جانور ذبح کرنا واجب ہے اور اس کا گوشت وہیں کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا، ہر واجب کھانا یعنی حج کے فدیوں کو حرم مکی کے فقراء میں تقسیم کرنا ضروری ہے، اس سے بس وہ مستثنیٰ ہے جس کو گھیرا جائے یعنی احصار ہو جائے، یعنی حج کے لیے جانے سے روک دیا جائے، تو وہ اسی جگہ احرام اتار کر ذبح کرے گا اور حلق یا قصر کرے گا۔

۴۔ جو پیدل حج کی نذر مانے تو اس کے لیے پیدل حج کرنا واجب ہے۔

۵۔ احرام سے نکلنا مکہ ہی میں ہوگا، مگر یہ کہ احصار ہو تو وہ حرم کے باہر احرام اتار سکتا ہے۔

۶۔ مکہ میں قتل خطا کی دیت؛ دیتِ مغلظہ ہے۔

۷۔ وہاں کا لقطہ یعنی گرا پڑا ملا ہوا سامان اٹھانے والے کے لیے حلال نہیں ہے۔

۸۔ وہاں کوئی مشرک یا کافر داخل نہیں ہوگا اور نہ وہاں اس کی تدفین کی جائے گی۔

۹۔ وہاں عمرہ کا احرام پہنا نہیں جائے گا، بلکہ عمرہ کا احرام پہننے کے لیے حرمِ مکہ سے

نکلنا واجب ہے۔

۱۰۔ اگر مکہ والے حج تمتع یا حج قران کریں تو ان پر دم نہیں ہے۔

۱۱۔ وہاں کی مٹی یا پتھر مکہ سے باہر لے جانا حرام ہے، اسی طرح حرم مدینہ کی مٹی یا پتھر وہاں سے لے جانا حرام ہے، اسی طرح مکہ میں شکار کرنا اور وہاں کے درختوں کو کاٹنا حرام ہے، البتہ مدینہ میں شکار یا درخت کاٹنے پر فدیہ نہیں ہے۔

مدینہ منورہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دار الہجرہ ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے فتح مکہ سے پہلے وہاں ہجرت کی۔

اسی طرح مدینہ منورہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں، اور وہیں اسلام طاقت ور اور مضبوط ہوا، اور وہیں سے اسلام کی کرنیں ہر جگہ پہنچی، والدین پر اولاد کے ممیّز ہونے کے بعد اس کی تعلیم دینا ضروری اور فرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے، اور وہاں آپ کو رسالت ملی یعنی رسول بنا کر بھیجے گئے، اور وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ گئے، مدینہ میں وفات ہوئی اور وہیں آپ ﷺ کی قبر ہے، ان امور کی مکمل تفصیلات میری کتاب ''غایۃ المأمول فی سیرۃ الرسول ﷺ'' میں ہے۔

مدینہ کی سرزمین دو حروں کے درمیان ہے، اس کو عیر اور ثور پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں، جبلِ ثور ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو جبلِ احد کے پیچھے ہے۔

☆☆☆☆☆

عورت کے حج کا طریقہ

حج کے جتنے احکام، ارکان، واجبات، سنتیں، مکروہات اور مفسدات ہیں؛ سب عورتوں پر بھی منطبق ہوتے ہیں، البتہ بعض چیزوں میں عورتوں کا حکم مردوں سے مختلف ہیں:

۔عورت کے لیے تلبیہ میں اپنی آواز بلند کرنا مکروہ ہے۔

۔اس کے لیے سلے ہوئے کپڑے اور پورے جسم کو ڈھانکنے والے کپڑے پہننا جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس پر شرعی اصول منطبق ہوتا ہو یعنی اس کا لباس اتنا چست نہ ہو کہ جسم کی ساخت سمجھ میں آجاتی ہو، یا اتنے باریک نہ ہوں کہ بدن جھلکتا ہو، وہ اپنا سر ڈھانک سکتی ہے، اس کے لیے جوتے چپل پہننا جائز ہے، اس کے لیے سنت ہے کہ وہ حج سے پہلے اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے، اس کے لیے سنت ہے کہ وہ حتی الامکان طواف اور سعی رات کے وقت کرے، کیوں کہ رات کے وقت زیادہ ستر پوشی ہوتی ہے۔

۔عورتوں کے لیے نہ رمل ہے اور نہ اضطباع، یہ صرف مردوں کے لیے سنت ہیں۔

۔احرام کی حالت میں عورت کے لیے اپنا چہرہ ڈھانکنا جائز نہیں ہے۔

ان میں سے بعض احکام کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

حج سے واپس ہونے والے مسافر کے لیے مسنون ہے کہ وہ اپنے ساتھ بعض ہدایا اور انعامات لے آئے، اس زمانہ میں فون سے رابطہ رکھنا آسان ہوگیا ہے، بہتر یہ ہے کہ اپنے گھر والوں سے رابطہ کرے اور ان کو اپنے آنے کی اطلاع دے۔ یہ مستحب ہے کہ حاجی کے پہنچنے پر استقبال کیا جائے اور واپسی کی مبارک باد دی جائے، اور یہ کہا جائے: ''قَبِلَ اللّٰهُ حَجَّکَ، وَغَفَرَ ذَنْبَکَ، وَأَخْلَفَ نَفَقَتَکَ'' اللہ تمہارا حج قبول فرمائے، تمہارے گناہ معاف فرمائے اور تمہارے اخراجات کا بدل عطا فرمائے۔ جب مجاہد اپنے جہاد سے

واپس آئے تو اس کو یہ کہتے ہوئے مبارک باد دینا مسنون ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَصَرَکَ وَأَکْرَمَکَ وَأَعَزَّکَ'' اللہ ہی کے لیے تعریف ہے جس نے تمھیں فتح نصیب فرمائی، تمھاری عزت کی اور تمھارا اکرام کیا۔

مسافر کے لیے سنت ہے کہ واپس ہوتے ہی سب سے قریبی مسجد جا کر دو رکعت سفر سے واپس ہونے کی سنت نماز ادا کرے، ملنے آنے والے دوست احباب اور رشتے داروں میں سے مبارک بادی دینے کے لیے آنے والوں کے لیے کھانا تیار کرے اور ان کے آنے پر پیش کرے، اور اس کے دوست بھی کھانا پکائیں اور اس کو اپنے پاس بلائیں۔

مسافر کے لیے مسنون ہے کہ وہ اللہ سے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مغفرت کی دعا کرے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اے اللہ حاجی کی مغفرت فرما اور اس کی مغفرت فرما جس کے لیے حاجی مغفرت کی دعا کرے''۔ (اللهم اغفر للحاج ولمن استغفر له الحاج) (مستدرک حاکم: ۱/ ۶۰۹ حدیث ۱۶۱۲، انھوں نے کہا کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ بیہقی: ۵/ ۲۶۱)

مسافر کے اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استقبال کرنا اور مصافحہ کرنا اور اس سے اپنے لیے اللہ سبحانہ وتعالی سے مغفرت کی دعا کرنے کے لیے کہنا مسنون ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ حج سے واپسی کے بعد چالیس دنوں تک حاجی سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی أعلم۔

☆☆☆☆☆

کتاب البیوع

(دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/ ۲۰۱، ''التھذیب'' بغوی ۳/ ۲۸۲، ''کفایۃ الأخیار'' ۲/ ۳۳۹، ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۲/ ۶۷۰)

اس باب میں خرید وفروخت کی قسمیں بیان کی جائیں گی، مثلاً وہ خرید وفروخت جس میں مبیع اور ثمن دونوں موجود ہوں، وہ بیع جس میں ثمن تو موجود ہو لیکن مبیع موجود نہ ہو، جس کو ایک مدت کے بعد ادا کیا جائے مثلاً بیعِ سَلَم، بیع مرابحہ، بیع محاطّہ، ان تمام بیوع کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آرہا ہے، اسی طرح صحیح بیع اور فاسد بیع کا تذکرہ کیا جائے، جن کی تفصیلات اپنے اپنے موقع پر آرہی ہیں۔

بیع کے لغوی معنی: ایک چیز کے مقابلہ میں دوسری چیز کا تبادلہ کرنا۔

شرعی معنی: مخصوص طریقہ پر یعنی ایجاب وقبول کے ساتھ، ثمن (قیمت) اور مبیع (بیچی جانے والی چیز)، بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدنے والا) کی موجودگی میں مال کا تبادلہ مال سے کرنا، یہ سبھی بیع کے ارکان ہیں۔

بیع کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ''وَأَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ'' (البقرۃ ۲۷۵) (اور اللہ نے خرید وفروخت کو حلال کر دیا) حاکم کی روایت میں ہے جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے: نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا: کون سے کمائی سب سے پاکیزہ ہے؟ آپ نے جواب دیا: ''اپنے ہاتھ کی کمائی اور ہر مبرور بیع'' (مستدرک حاکم: کتاب البیوع ۲۰۹۹، مسند امام احمد: مسند المکیین، حدیث ابو بردہ بن نیاز ۱۵۵۳۲) یعنی جس میں دھوکہ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے ابتدا ہاتھ کی کمائی سے کی ہے، چاہے وہ زراعت ہو یا صناعت یا ان کے مشابہ کوئی دوسرا کام۔ کیوں کہ ہاتھ کی کمائی انتاج اور پیداوار ہے، اور

پیداوار کو اولیت حاصل ہے۔ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے تو یہ استعمال ہے، اسی وجہ سے اس کا مرتبہ دوسرا ہے۔ جس قوم کی بھی پیداوار استعمال سے کم ہوتی ہے تو وہ غیر ملکی ساز وسامان کی تجارتی منڈی بن جاتی ہے، اس کی عزت پامال ہوجاتی ہے اور اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے، کیوں کہ اس کو اپنی غذا، کپڑا وغیرہ ضرورت چیزوں کو منگانے کے لیے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے، بلکہ وہ غیر ضروری امور میں بھی دوسروں کے محتاج بن جاتے ہیں!

بیع کے مشروع ہونے کی تیسری دلیل امت کا اجماع ہے۔

بیع کے ارکان:

بیع کے ارکان تین ہیں: عقد کرنے والے (عاقد)، جس پر عقد کیا جائے (معقود علیہ) اور صیغہ یعنی ایجاب وقبول، اس کی تفصیل کی جائے تو چھ ارکان بن جاتے ہیں: کیوں کہ عقد کرنے والے دو ہیں؛ بائع اور مشتری، اور جس پر عقد کیا جاتا ہے وہ بھی دو ہیں؛ ثمن اور مبیع، اور صیغہ بھی دو ہیں؛ ایجاب وقبول۔

عقد؛ یعنی کسی کام کی ادائیگی کی پابندی کرنا، اس میں بیع اور بیع کے علاوہ دوسرے عقود بھی شامل ہیں، اس وجہ سے اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: انفرادی عقد، مثلاً نذر، قسم، حج اور عمرہ کا احرام، جمعہ کے علاوہ دوسری نمازیں، اور روزے۔

نذر ایک ہی طرف سے کیا جانے والا ایک عقد ہے، یہ وہ شخص ہے جو نذر پورا کرنے کا عہد کرتا ہے، اور وہی خود سے اس نذر کو پورا کرنے کی نگرانی کرتا ہے، اور نذر قسم کی طرح ہے جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ البتہ جمعہ کی نماز انفرادی عقد سے مستثنی ہے، کیوں کہ جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ ہی ادا کی جاتی ہے، اور اس کے صحیح ہونے کے لیے امام اور مسلمانوں کی جماعت کا ہونا شرط ہے جو تعداد میں چالیس سے کم نہ ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے اعمال بھی ہیں جن کو انفرادی عمل کی قبیل میں سے شمار کیا جاتا ہے، مثلاً طلاق، آزاد کرنا، مطلقہ یا متوفی عنہا کی عدت، لیکن یہ عقود نہیں ہیں، بلکہ عقد کو فسخ کرنا ہے، مثلاً طلاق عقدِ

زواج کو فسخ کرنا ہے، اور آزادی غلامی کے عقد کو فسخ کرنا ہے، البتہ عورت کی عدت نہ عقد ہے اور فسخ ہے، بلکہ عورت مادرِ رحم کا نطفہ یا حمل سے صاف ہونے کی تاکید حاصل کرنے کے لیے ایک متعین مدت تک انتظار کرتی ہے۔

دوسری قسم: جس میں عقد کرنے والے دو رہتے ہیں، اور یہ عقد اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ یہ دونوں فریق نہ پائے جائیں، اور جن عقود کا اس باب میں تذکرہ کیا ہے، وہی عقود ہیں جن میں دو فریق پائے جاتے ہیں۔

عقود کی قسمیں: (محاملی نے ان کا تذکرہ ''اللباب'' میں کیا ہے ۱/۲۰۱)

وہ عقود جن میں دو فریق رہتے ہیں تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم:

وہ عقد جو دونوں طرف سے جائز عقد ہے، یعنی عقد کو دونوں میں سے کوئی ایک فسخ کرسکتا ہے، یہ شراکت (پارٹنرشپ)، وکالت، عاریت، قراض، امانت، جعالہ (یعنی کسی چیز کے ڈھونڈ لانے پر انعام مقرر کرنا)، وصیت، وصایۃ، تحکیم، قبضہ سے پہلے ہبہ، اور قرض ہیں۔

دونوں فریق میں سے کوئی بھی جب چاہے پارٹنرشپ کا عقد فسخ کرسکتا ہے، وکالت میں بھی دونوں میں سے کوئی عقد فسخ کرسکتا ہے، عاریت میں عاریت پر دینے والا عاریت پر دی ہوئی چیز جب چاہے واپس لے سکتا ہے، مگر یہ کہ عاریت قرض کے مقابلہ میں ہو تو واپس نہیں لے سکتا ہے، اس صورت میں عاریت پر دینے والا ضروری ہے کہ عاریت میں دی ہوئی چیز کو واپس لینے سے پہلے قرض کو ادا کرے، اگر زمین کسی میت کو دفن کرنے کے استعمال میں لانے کے لیے عاریت پر دی جائے تو اس کو میت کا جسم گلنے سے پہلے واپس لینا جائز نہیں ہے۔

امانت میں بھی امین جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس وقت تک اپنے پاس موجود امانت کو واپس نہیں کرسکتا ہے جب تک کہ اس چیز کی حفاظت کرنے والا کوئی دوسرا امین نہ ملے۔ اسی طرح وصایہ کے عقد میں وصی عقدِ وصایہ کو اسی وقت فسخ کرسکتا ہے جب کوئی ایسا شخص ملے جو اس وصی کے بدلہ یتیموں کا خیال رکھ سکتا ہو اور ان کی حفاظت کرسکتا

ہو، اسی طرح قاضی قضاءت کا عقد اس وقت تک فسخ نہیں کرسکتا ہے جب کہ لوگوں کے درمیان فیصلوں کا کام انجام دینے کے لیے کوئی دوسرا قاضی نہ ملے۔ اسی طرح قرض کی صورت میں، قرض دینے والا اپنا دیا ہوا مال اس وقت واپس لے سکتا ہے جب اس کا مال قرض دار کے پاس موجود ہو، اگر قرض لینے والا قرض لیے ہوئے مال میں تصرف کر چکا ہو تو قرض دینے والا اپنے قرض میں اسی وقت میں رجوع کرسکتا ہے جب قرض لینے والا قرض میں لیے ہوئے مال کے مساوی اور برابر مال واپس کردے۔

دوسری قسم:

وہ عقد جو دونوں فریق کے لیے لازم ہے۔ اور دونوں میں سے کسی کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، مثلاً خرید وفروخت، بیعِ سلم، صلح، حوالہ، اجارہ، مساقات، قبضہ کے بعد ہبہ، قبول کیے جانے کے بعد وصیت، نکاح، صداق، خلع، کوئی بدلہ لے کر آزاد کرنا، دونوں فریق کی طرف سے مسابقہ، قرض جب قرض میں دیے ہوئے مال میں تصرف کیا جا چکا ہو، رہن کے مقابلہ میں عاریت، اور میت کو دفن کرنے کے لیے جگہ عاریت پر دی جائے۔ ان تمام عقود کی تفصیلات ان کی جگہوں پر آرہی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب بیع ایجاب وقبول کے ساتھ مکمل ہوجائے تو بیع میں رجوع کا حق نہ بائع (بیچنے والے) کو ہے اور نہ مشتری (خریدنے والے) کو، یعنی اپنا عقد فسخ نہیں کرسکتے ہیں۔

بیعِ سلم یہ ہے کہ پہلے ہی خریدا جائے، مثلاً کوئی ایک ہزار کلو گیہوں کسان سے اس شرط پر خریدے کہ وہ کٹائی کے موسم میں گیہوں اس کے حوالہ کرے گا، جب ایجاب وقبول ہوجائے اور پہلے ہی خریدنے جانے والے گیہوں کی قیمت بائع کے حوالے کی جائے تو کسی کو بھی یہ عقد فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

صلح کے عقد میں بھی یہی حکم ہے، کیوں کہ جب کوئی ایک ہزار درہم کا قرض دار ہو اور دونوں اس بات پر صلح کرلیں کہ قرض دار قرض خواہ کو پانچ سو درہم دے گا، اور اس کی ادائیگی بھی ہوجائے تو پھر ان میں سے کسی کو بھی صلح فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔

یہی حال حوالہ کے عقد میں ہے، جب کوئی شخص دوسرے شخص کی طرف سے حوالہ قبول کرنے پر متفق ہوجائے تو اس کے لیے اس حوالہ کو فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔

اجارہ (کرایہ) میں بھی جب ایجاب وقبول ہوجائے اور کرایہ پر لینے والے کے حوالہ وہ گھر کردیا جائے جس کو اس نے اجرت پر لیا ہو تو اجرت پر لینے والے کے لیے عقدِ اجارہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ اجرت پر دینے والے کے لیے حق ہے۔

مساقات، نخلستان اور کھجوروں کے باغ کی سینچائی کے عقود میں جب ایجاب وقبول کیا جائے اور کسان آدھے پھل کے مقابلہ میں نخلستان اور باغ کی سینچائی اور خدمت پر موافقت کرلے تو عقد کو فسخ کرنے کا حق نہ مالک کو ہے اور نہ عامل کو۔

ہبہ کے عقد میں بھی جب کوئی شخص دوسرے کو ایک سو درہم ہبہ میں دے اور ایجاب وقبول ہوجائے اور ہبہ حوالہ کردیا جائے تو نہ ہبہ کرنے والے کو اس عقد کو فسخ کرنے کا حق ہے اور نہ جس کو ہبہ کیا گیا ہو، اس سے مستثنیٰ یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا والد یا دادا ہو، اور جس کو ہبہ کیا گیا ہے وہ بیٹا یا پوتا ہو، کیوں کہ اس صورت میں اپنے ہبہ میں ہبہ کرنے والا رجوع کرسکتا ہے اور اس عقد کو فسخ کرسکتا ہے۔

اسی طرح یتیموں کا وصی وصایہ کا عقد ایجاب وقبول کے ذریعہ مکمل ہونے کے بعد فسخ نہیں کرسکتا ہے، اسی وقت فسخ کرسکتا ہے جب یتیموں کے مفادات کا خیال رکھنے اور ان کی حفاظت کرنے والا کوئی اس کا قائم مقام مل جائے۔

نکاح میں جب ایجاب وقبول کے ذریعہ عقدِ نکاح مکمل ہوجائے تو شوہر یا بیوی کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح مہر کی مقدار کا مسئلہ ہے جب میاں بیوی اس پر راضی ہوجائیں اور اس پر عقدِ نکاح ہوجائے؛ تو ان دونوں کو اس میں رجوع کا حق نہیں ہے۔

خلع میں جب میاں بیوی اس شرط پر راضی ہوجائیں کہ ایک ہزار درہم کے بدلہ شوہر اپنی بیوی کو خلع دے گا اور ایجاب وقبول کے ذریعہ یہ عقد مکمل ہوجائے، بیوی شوہر کے حوالہ ایک ہزار درہم کردے تو نہ شوہر خلع کا عقد فسخ کرسکتا ہے اور نہ بیوی۔

معاوضہ لے کر آزاد کرنے میں فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے: ایک ہزار درہم معاوضہ پر اپنے غلام کو آزاد کردو، یہ مبلغ میں ادا کروں گا''۔ جب اس آزاد کرنے پر ایجاب وقبول ہوجائے اور غلام کا مالک ایک ہزار درہم حاصل کرلے تو ان دونوں میں سے کسی کو اپنے کیے ہوئے عقد سے رجوع کرنے کا حق نہیں ہے، اور جس غلام کو آزاد کردیا گیا ہے وہ دوبارہ غلام نہیں بنے گا، عوض کے بدلہ آزادی کو ضمنی بیع کا حکم ہے، اسی وجہ سے اس کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔ جہاں تک بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کرنے کا تعلق ہے تو یہ عقد نہیں ہے بلکہ یہ عقد کو فسخ کرنا ہے۔

گھوڑے کی دوڑ میں اور ہر اس چیز کے مقابلہ میں جس کا استعمال جنگ اور جہاد میں ہوتا ہے؛ جب دو فریق اس پر راضی ہوجائیں کہ ان میں سے ہر ایک ایک سو درہم دے گا جس کا مستحق جیتنے والا ہوگا، اور اپنے ساتھ کسی تیسرے شخص کو کچھ دیے بغیر شامل کرلیں، جب ایجاب وقبول کے ذریعہ اس شرط پر مقابلہ پر اتفاق ہوجائے تو ان میں سے کسی کو یہ عقد فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

قرض میں جب ایجاب وقبول کیا جائے اور قرض لینے والا قرض کا مبلغ قرض دینے والے کی طرف سے حاصل کرلے تو ان دونوں میں سے عقد فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، اس صورت میں مال قرض لینے والے کے ذمہ میں رہتا ہے، اور اس پر ضروری ہے کہ مقررہ مدت جب آجائے تو اس کا مثل واپس کردے۔

عاریت میں بھی یہی حکم ہے، جب کوئی اپنے دوست سے ایک سو مثقال سونا لے تاکہ اس کو دوسرے شخص کے پاس بطور رہن رکھ کر کچھ مبلغ قرض لے تو جب عاریت میں ایجاب وقبول ہوجائے اور عاریت لینے والا ایک سو مثقال سونا رہن کے طور پر رکھ دے اور اپنے لیے ضروری مبلغ لے لے؛ تو سونا عاریت میں دینے والا عقدِ عاریت کو فسخ نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح عاریت پر لینے والے کو بھی فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، اور سونے کے مالک پر ضروری ہے کہ وہ رہن کے ختم ہونے تک صبر کرلے۔

زمین اگر میت کو دفن کرنے کے لیے عاریت پر دی جائے تو عاریت پر دینے والے میت کا بدن گلنے سے پہلے واپس نہیں لے سکتا ہے، اور زمین عاریت پر لینے والا بھی عقدِ عاریت فسخ نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ اس عقد سے میت کا حق متعلق ہوجاتا ہے، اور وہ اپنے جسم کے گلنے تک اس زمین کا حق دار بن جاتا ہے۔

تیسری قسم:

یہ ایک طرح سے لازم عقد ہے اور ایک طرح سے جائز ہے، اس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

رھن: رہن دینے والا عقد فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ رہن لینے والا رہن میں لیا ہوا مال واپس کرسکتا ہے۔

ضمان: ضامن یعنی وہ شخص جو قرض دار کی طرف سے قرض ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہنے کی صورت میں قرض کی ادائیگی کا ضامن ہوتا ہے؛ اپنی ضمانت فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ قرض خواہ جس کے لیے ضامن نے مال کی ادائیگی کی ضمانت لی ہے وہ عقدِ ضمان فسخ کرسکتا ہے اور ضامن نے جو ضمانت اپنے ذمہ لی ہے اس سے دست بردار ہوسکتا ہے۔

جزیہ: جب امام اور مالدار کافر کے درمیان اس بنیاد پر جزیہ کا عقد ہوجائے کہ مالدار کافر مسلم خلیفہ کو سالانہ اپنے مال اور جان کے دفاع کی خاطر ایک دینار سونا ادا کرے گا تو امام اس جزیہ کے عقد کو فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ کافر چاہے تو یہ عقد فسخ کرسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ذمہ سے نکلے گا اور ان کا علاقہ چھوڑ دے گا۔

ھدنہ یعنی صلح: یعنی جنگ بندی کی صلح کی جائے۔ جب امام اور کافروں کے درمیان چھ سالوں کے لیے مثلاً جنگ بندی ہوجائے جس کے دوران کوئی بھی جھگڑا اور قتال نہیں ہوگا؛ اس صورت میں خلیفہ یہ عقد فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ کافر یہ عقد فسخ کرسکتے ہیں اور دوبارہ مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کرسکتے ہیں۔

امان؛ جب امام کسی کافر کو امان دے کہ وہ چار مہینوں کے لیے امان میں رہے گا

جس کو کوئی بھی مسلمان نہیں چھیڑے گا تو امام یہ عقد فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ کافر اپنے کو حاصل امان کا عقد فسخ کرسکتا ہے اور مسلمانوں کے امان سے نکل جائے گا۔ ہدنہ مسلمانوں کے خلیفہ کا حق ہے، کوئی دوسرا مسلمان یہ عقد نہیں کرسکتا ہے، البتہ امان کسی بھی مسلمان کے اختیار میں ہے، وہ کسی کافر کو امان دے سکتا ہے۔ اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ ہدنہ کے عقد اور امان کے عقد کا پاس ولحاظ رکھنا اس وقت تک امام پر ضروری ہے جب تک کہ کافر کی طرف سے خیانت کا اندیشہ نہ ہو، جب کافر کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تو امام ھدنہ اور امان کا عقد فسخ کرسکتا ہے۔ ہم نے یہ بات کہی ہے کہ امام پر اپنے عہود اور عقود کا لحاظ رکھنا اس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ خیانت کا اندیشہ نہ ہو، کیوں کہ امام کا پورا کا پورا معاملہ طاقت پر منحصر ہے، اور عہد کی پابندی ہمیشہ طاقت ور لوگوں کی صفات میں سے ہے۔

امامت عظمی یعنی خلافت: جب مسلمانوں کے قائدین اور عظیم لوگ خلافت کی بیعت کسی کے ہاتھوں پر کرلیں تو وہ بیعت کا عقد فسخ نہیں کرسکتے ہیں۔ البتہ خلیفہ چاہے تو خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے معذرت کرسکتا ہے اور یہ عقد فسخ کرسکتا ہے۔

وہ دن کیا ہی خوشگوار اور مبارک تھے جب عادلانہ خلافت موجود تھی جس میں پوری اسلامی سرزمین کے امور کی تدبیر کی جاتی تھی، اس کی ہیبت سے کافروں کے جسموں میں جھرجھری پیدا ہوجاتی تھی، اس کے ہاتھوں اور قبضہ میں اللہ کے دین اور کلمہ کو بلند کرنے کے سبھی ضروری وسائل موجود تھے۔ لیکن آج کیا حال ہے، اسلامی سرزمین ستّر ملکوں میں تقسیم ہوگئی ہے، اور مسلمان ہی آپس میں جنگیں کررہے ہیں، اب مسلمانوں کی طرف سے کافروں کے دل مطمئن ہیں، اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مٹھی بھر یہودی جن کا کوئی وطن نہیں اور وہ کسی بھی عزت اور شرافت سے محروم تھے؛ آج انھوں نے فلسطین کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا ہے اور مسجدِ اقصی پر قبضہ کرلیا ہے، جب کہ مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زائد رہنے کے باوجود وہ یہودیوں کے ظلم وستم کے سامنے تماشائی بن کر کھڑے ہیں!!!

مکاتبہ: یہ وہ معاہدہ ہے جو غلام اپنے آقا کے ساتھ تحریر کرتا ہے کہ وہ جب اپنے

آقا کو ایک ہزار درہم ادا کرلے تو وہ آزاد ہوجائے گا، جب یہ معاہدہ لکھا جائے تو اس کو مالک فسخ نہیں کرسکتا ہے، البتہ غلام خود سے اپنے اوپر لازم مبلغ کو ادا کرنے سے عاجز ہوجائے تو یہ عقد فسخ کرسکتا ہے۔

کوئی اصل اپنی فرع کو کوئی چیز ہبہ میں دے: یعنی کوئی باپ اپنے بیٹے کو گھر دے، اور ہبہ کا عقد مکمل ہوجائے، اور بیٹا گھر اپنے قبضہ میں لے، تو باپ جب چاہے یہ عقد فسخ کرکے اپنے بیٹے سے گھر واپس لے سکتا ہے، لیکن بیٹا ہبہ کا عقد فسخ نہیں کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس ہبہ کا حکم میراث کی طرح قہری ملکیت کا ہے جس کو بیٹے کی طرف سے قبول کرنا واجب ہے، اور اس کو میراث میں سے اپنے حصے کو قبول کرنے سے انکار کرنے کا حق نہیں ہے؛ اس کے بعد وہ جس کو چاہے دے سکتا ہے۔

ان سبھی عقود کے تذکرہ کے بعد اب بیع کے مسائل اور احکام بیان کیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بیع کی قسمیں

(دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی، اس میں محاملی نے صحیح، فاسد اور مکروہ ہونے کے اعتبار سے خرید وفروخت کی قسموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے: ۱/۲۰۳)

بیع کی قسمیں

بیع کی تین قسمیں ہیں: صحیح بیع، فاسد بیع، اور حرام بیع؛ اگرچہ کہ یہ بیع صحیح ہوتی ہے۔

صحیح بیع: یہ وہ بیع ہے جس میں بیع کی تمام شرطیں اور ارکان پائے جائیں، مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے: میں نے یہ دکان ایک ہزار درہم میں تمہیں بیچ دی۔ اور خریدنے والا کہے: میں نے مطلوبہ قیمت پر اس خریداری کو قبول کیا۔ پھر قیمت ادا کی جائے اور اس کو بیچنے والا اپنے قبضہ میں لے اور خریدنے والا دکان اپنے قبضہ میں لے۔

فاسد بیع: یہ وہ بیع ہے جس میں صحیح بیع کی بعض شرطیں پوری نہ ہوں، مثلاً آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے کی بیع۔

حرام بیع؛ چاہے اس میں صحیح بیع کی تمام شرطیں پائی جائیں: مثلاً زید اپنی دکان عمرو کو بیچے اور یہ شرط رکھے کہ وہ تین دنوں کے اندر جب چاہے بیع کو فسخ کر سکتا ہے، پھر بکر آئے اور زید سے کہے: عمرو سے کی ہوئی اپنی بیع فسخ کر دو اور مجھے اس کو دی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت میں بیچو۔ باوجود اس کے کہ زید کو عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے، البتہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس نے ایک حرام کا ارتکاب کیا، باوجود یہ کہ اس کی بیع صحیح ہو جاتی ہے۔

حرام بیع؛ لیکن بیع بھی فاسد ہو جاتی ہے: مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے: میں نے اپنی دکان تمہیں ایک لاکھ درہم میں بیچی، اور میں تم سے دس ہزار درہم ایڈوانس لوں گا، جب تم باقی قیمت ادا کرو گے تو دکان تمہاری ہوگی، اگر مکمل قیمت ادا نہیں کی گئی تو دکان

میری ہوئی اور ایڈوانس دیا ہوا مبلغ دس ہزار درہم بھی میرے ہی ہوں گے، واپس نہیں ہوں گے۔ یہ بیع حرام بھی ہے اور فاسد بھی ہوتی ہے۔

صحیح بیع کی قسمیں:

۱۔موجود سامان کی بیع جس کو دیکھنا ممکن ہو، ایک معلوم قیمت کے بدلے، ایجاب وقبول کے ساتھ، اس شرط پر کہ بائع اس سامان کا مالک ہو، اور مشتری قیمت کا مالک ہو، اور بائع مشتری کو خریدی ہوئی چیز حوالے کر دے اور مشتری قیمت بائع کے حوالے کر دے۔

۲۔بائع کے ذمہ میں موجود چیز کی بیع، اس کا طریقہ یہ ہے کہ مشتری کسان سے ایک ہزار ٹن گیہوں ایک ہزار درہم کے عوض اس شرط پر خریدے کہ وہ گیہوں کٹائی کے وقت حاصل کر لے گا، اور مشتری بیع کے وقت ہی بائع کو قیمت ادا کرے گا۔

۳۔بیع صرف: یہ ایک ہزار درہم کرنسی کو چودہ ہزار روپیوں سے تبدیل کرنا ہے۔

۴۔بیعِ مرابحہ: یہ ایک ہزار درہم میں خریدی ہوئی چیز کو مثلاً دس فیصد منافع کے ساتھ بیچنا ہے، اس صورت میں مشتری اس سے سامان لیتا ہے اور اس کو گیارہ سو درہم ادا کرتا ہے۔

۵۔بیعِ خیار: ایک چیز کو دوسری چیز کے بدلہ بیچا جائے اور خیار کی شرط رکھی جائے جو خیار بائع اور مشتری دونوں کو بیع فسخ کرنے کے لیے تین دنوں کے اندر رہے گا۔

۶۔ایک جانور کو دوسرے جانور کے بدلے خریدنا: مثلاً کوئی ایک بکری کو دوسری بکری کے بدلہ خریدے، یا پانچ بکریوں کو ایک گائے کے بدلے خریدے، مشتری پانچ بکریوں کو لے اور بائع ایک گائے کو لے۔

۷۔تفریقِ صفقہ کی بیع: مثلاً کوئی سرکہ اور شراب کو ایک ساتھ بیچے، اس صورت میں سرکہ کی بیع صحیح ہو جائے گی، اور شراب کی بیع باطل ہو جائے گی، یا اپنا گھر اور اپنے پڑوسی کا گھر اس کی اجازت کے بغیر ایک ساتھ بیچے، تو اس کے گھر کی بیع صحیح ہو جائے گی اور اس کے پڑوسی کے گھر کی بیع باطل ہو جائے گی؛ اس کو بیع تفریق صفقہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع کا ایک حصہ صحیح ہوتا ہے، جب کہ دوسرا حصہ باطل ہو جاتا ہے۔

۸۔آزاد کرنے کی شرط پر بیع: مثلاً کوئی دوسرے سے کہے: میں نے یہ غلام تمہیں ایک ہزار درہم میں اس شرط کے ساتھ بیچا کہ تم اس کو آزاد کرو۔

۹۔عیوب سے پاک ہونے کی شرط پر بیع: مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے: میں نے یہ جانور اس شرط کے ساتھ بیچا کہ میں اس کے تمام عیوب سے بری ہوں۔اس صورت میں بائع پر ضروری ہے کہ وہ اس میں موجود کسی عیب سے واقف ہے تو اس کا اعلان کرے، اگر نہیں جانتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔

۱۰۔ایک ہی قیمت سے دو چیزوں کی اس شرط پر بیع کہ ان میں سے کسی ایک میں خیار ہو؛ مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے: میں نے یہ گھر اور یہ دکان ایک لاکھ درہم میں بیچی، اور مجھے تین دنوں کے اندر دکان میں رجوع کرنے کا اختیار ہے۔ یہ بیع صحیح ہے۔ اگر دکان کا عقد فسخ نہ کیا جائے تو مشتری گھر اور دکان دونوں کا مالک ہو جائے گا، اگر دکان کا عقد فسخ کیا جائے تو ایک لاکھ درہم میں سے دکان کے بقدر قیمت کم کی جائے گی۔

۱۱۔بیع محاطّہ یا بیع حطیطہ: مثلاً بائع کہے: میں نے یہ چیز اپنی خریدی ہوئی قیمت سے دس فیصد کم کرکے بیچ دی۔ یا مشتری بائع سے کہے: مجھے یہ چیز تمہاری خریدی ہوئی قیمت سے دس فیصد کم کرکے بیچو۔

۱۲۔بیعِ تولیہ: مثلاً بائع کہے: میں نے تمہارے ساتھ اسی قیمت پر عقد کیا جس قیمت پر میں نے خریدا ہے۔اس کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ دونوں کو خریدی ہوئی قیمت معلوم ہو۔

۱۳۔بیعِ اشراک: مثلاً کوئی شخص کہے: میں نے تمہیں عقد میں اپنی خریدی ہوئی قیمت کے ایک تہائی کے ذریعہ شریک کیا۔ یا کوئی دوسرے شخص سے کہے: مجھے اس عقد میں آپ کی طرف سے ادا کردہ ایک تہائی قیمت کے بدلہ شریک کیجئے۔

فاسد بیع کی قسمیں:

(ان قسموں کو امام محاملی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بیس قسمیں نقل کی ہے ''اللباب'' ۱/۲۰۳)

اس کی شکلیں بہت زیادہ ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔جو چیز اپنے قبضہ میں نہ ہو اس کی بیع: مثلاً ایسی چیز بیچنا جس پر ابھی اس کا قبضہ نہ ہوا ہو، کیوں کہ مشتری سب سے پہلے مبیع اپنے حوالہ لینا چاہتا ہے، پھر اس کے بعد وہ چاہے تو یہ چیز دوسرے کو بیچتا ہے۔

۲۔ایسی چیز کی بیع جس پر مشتری قبضہ نہ کرسکتا ہو: مثلاً بیچی جانے والی چیز پر غاصب کا قبضہ ہو اور مشتری اس کو غاصب سے لے نہ سکتا ہو۔ یا کوئی ایسی چیز بیچی جائے جس کو پہلے ہی مالک نے رہن میں رکھا ہو اور مشتری اس کو رہن رکھنے والے سے لے نہ سکتا ہو، کیوں کہ قرض لینے والے نے ابھی اپنا قرض ادا نہیں کیا ہے۔

۳۔حاملہ جانور کے حمل کے بچے کی بیع: یعنی کسی حیوان کے جنین کے بچہ کی بیع، یہ مجہول چیز کی بیع ہے جس کا علم ابھی غیب میں ہے اور ابھی اس کا وجود بھی نہیں ہوا ہے، کیوں کہ بیع اس وقت ہو رہی ہے جب کہ ابھی حیوان نے جنا نہیں ہے، پھر اس جانور کے بچے کے بچے کی بیع کے سلسلہ میں کیا خیال ہے! یہ معدوم اور مجہول کی بیع ہے جس کو حوالے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نبی ﷺ نے ایسی بیع سے منع کیا ہے؛ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حمل کے بچے کی بیع سے منع کیا، اس طرح کی بیع زمانہ جاہلیت میں لوگ کیا کرتے تھے، آدمی اونٹ کو خریدتا تھا یہاں تک کہ اونٹنی کو بچہ ہو جائے پھر اس کے پیٹ میں موجود بچہ کو بچہ ہو جائے۔ (بخاری: کتاب البیوع، باب بیع الغرر، وحبل الحبلۃ ۲۱۴۳، مسلم: کتاب البیوع، باب تحریم بیع حبل الحبلۃ ۱۵۱۴)

۴۔بیع المضامین: یہ جانوروں میں سے پیدا ہونے جانوروں کی بیع ہے جو ابھی بیل کی پیٹھ میں ہوں، یعنی سانڈھ کی پیٹھ میں موجود بچوں کی بیع! یہ اس چیز کی بیع ہے جو ابھی علمِ غیب میں ہے۔

۵۔بیعِ ملاقیح: یہ ان جانوروں کی بیع ہے جو ابھی مادہ جانوروں کے پیٹ میں ہو، اور ابھی معلوم نہ ہو کہ اس کی تعداد کتنی ہے، یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کی پیدائش زندہ ہوگی یا مردہ۔

۶۔بیعِ منابذہ: مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے: پھینکو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ

میں تمہاری طرف یہ کپڑا پھینکتا ہوں۔ یہ مبیع کے قائم مقام ہو جائے گا، اور تم میری طرف اپنا کپڑا پھینکو، یہ قیمت کے قائم مقام ہو جائے گا، جب کہ ان دونوں کو اختیار نہ ہو، اسی طرح کوئی کہے: میں معلوم قیمت پر اس کو تمہاری طرف پھینکتا ہوں۔

۷۔ بیعِ ملامسہ: مثلاً کوئی شخص کہے: میری دکان میں جو بھی سامان ہے؛ اس میں سے کسی کو بھی چھو لو تو یہ میری طرف سے بیچنا ہوگا اور تمہاری طرف خریدنا ہو جائے گا۔

بیعِ منابذہ اور بیعِ ملامسہ کی حدیث میں صریح ممانعت آئی ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے دو بیع اور دو کپڑوں سے منع کیا، دو بیع ؛ ملامسہ اور منابذہ ہے، دو کپڑے یہ ہیں: اشتمال الصماء یعنی چادر کو پہلے دائیں ہاتھ اور بائیں مونڈھے پر اور پھر بائیں ہاتھ اور دائیں مونڈھے پر ڈال کر لپیٹنا، اور ایک کپڑے آدمی اپنی شرمگاہ کو کھولے حبوہ (حبوہ بنا کر بیٹھنے کی شکل یہ ہے کہ آدمی سرین کے بل بیٹھ کر اپنی دونوں رانوں سے پنڈلیاں ملا کر گھٹنے کھڑے کر لیتا ہے۔ یا یہ کہ مذکورہ طریقہ پر بیٹھ کر کمر اور پنڈلیوں کے گرد کوئی کپڑا وغیرہ باندھ لیا جائے) بنا کر بیٹھے یا اس کی شرمگاہ پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ (ابوداود: کتاب البیوع، باب بیع الغرر ۳۳۷۷، نسائی: کتاب البیوع، باب بیع المنابذۃ ۷/۲۶۱، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۴۹۷۶)

۸۔ بالی میں ہی گیہوں بیچنا: گیہوں، جو اور ان کے حکم میں موجود چیزوں کو اس حال میں بیچنا کہ ابھی وہ بالی میں ہی ہوں، یہ فاسد بیع ہے؛ کیوں کہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اس میں کچھ ملے گا یا کسی آفت کی وجہ سے ضائع ہو جائے گا، غلہ کم ملے گا یا زیادہ۔ اس بیع کو بیعِ محاقلہ بھی کہا جاتا ہے، اور یہ پختہ ہونے سے پہلے کھیتی کو بیچنا ہے۔

۹۔ سودی کاروبار: ہر سود باطل ہے، مثلاً ایک درہم کو ایک درہم اور ایک پیسہ کے بدلہ بیچا جائے، پوسٹ اسٹامپ کو اس کی قیمت سے زیادہ بیچا جائے، کیوں کہ اس کا حکم بھی نقد کی طرح ہی ہے، جس خرید و فروخت میں سود ہو تو وہ بیع باطل ہے۔

۱۰۔ ایسی چیز بیچنا جو اس کی ملکیت میں نہ ہو: مثلاً کسی دوسرے کی چیز کو اس کی

اجازت کے بغیر بیچنا۔

۱۱۔ جانور کے بدلہ گوشت بیچنا: مثلاً دس کلو گوشت زندہ گائے کے بدلے بیچے۔

۱۲۔ بیعِ حصاۃ: مشتری کہے کہ میں کنکری مارتا ہوں اور جس سامان کو بھی کنکری لگے تو وہ میرا ہے۔

۱۳۔ صرف پانی بیچنا: زمین کے بغیر صرف وہاں موجود پانی کو بیچنا، کیوں کہ پانی زیادہ ہوتا ہے اور مسلسل نیا پانی نکلتا ہے، اور اس میں مبیع غیرِ مبیع کے ساتھ مل جاتا ہے، جو پانی چشمہ سے نہیں نکلتا ہے مثلاً جما ہوا پانی تو اس کا بیچنا جائز ہے، کیوں کہ نہ وہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم پڑتا ہے۔

۱۴۔ پختہ ہونے سے پہلے کاٹنے کی شرط کے بغیر پھل بیچنا: اگر اسی وقت کاٹنے کی شرط لگائی جائے تو یہ بیع جائز ہے، کیوں کہ لینے والا اس کو اسی حال میں اپنے جانور کی غذا وغیرہ کے لیے چاہتا ہے، اگر بیچنے والا اس کو پختہ ہونے تک درخت میں باقی رکھنے کی اجازت دے تو یہ بہتر ہے، اگر اجازت نہ دے تو مشتری نے پختہ ہوئے بغیر خریداری پر موافقت کر لی ہے۔

۱۵۔ ہر نجس چیز کی بیع؛ چاہے شکار کے لیے کتا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۶۔ سانٹھ کے نطفہ کی بیع: سانٹھ کی منی مادہ جانور کے مالک کو بیچی جائے، مثلاً وہ اپنے سانٹھ کو مادہ جانور پر چڑھنے کی اجازت دے تاکہ وہ حاملہ ہو جائے۔

۱۷۔ بیعِ غرر یعنی دھوکہ کی بیع: یہ ہر مجہول کی بیع ہے، مثلاً ہوا میں اڑتے پرندے کی بیع، جس کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ وہ ہاتھ آئے گا یا نہیں، سمندر میں پائی جانے والی مچھلی کی بیع، اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ وہ جال میں پھنسے گی یا نہیں، ہرن کے نافہ میں پائے جانے مشک کی بیع، بکری کی پیٹھ پر موجود اون کی بیع، البتہ چھتے میں موجود شہد کی بیع اس وقت جائز ہے جب یہ چھتہ بیچنے والے کی ملکیت میں ہو۔

۱۸۔ ایسی چیز کی اندھے سے بیع جس کا دیکھنا ضروری ہو، مثلاً کوئی ایسا گھر اندھے کے ہاتھ بیچے جس کو دیکھنا ضروری ہو، یہ بیع فاسد ہے؛ کیوں کہ جس نے گھر نہیں دیکھا ہے وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہے، اندھے کی طرف سے ذمہ میں موجود چیز کی خرید و فروخت جائز

ہے؛ مثلاً بیع سلم، اس میں چیز پہلے ہی خریدی جاتی ہے، اور وہ اپنی طرف سے کسی کو حاصل کرنے کے لیے وکیل بنائے گا، اگر اندھا کرایہ پر لے یا رہن میں رکھے تو جائز نہیں ہے، البتہ اندھا اپنی چیز کرایہ پر دے سکتا ہے، اور اپنے غلام سے مکاتبہ کا عقد کر سکتا ہے، اور غلام کو آزاد کرنے کی شرط پر اس کو خرید سکتا ہے، اندھے کے لیے خرید وفروخت اور اجرت پر لینے میں وکیل بنانا ضروری ہے، البتہ باقی تین مسالک میں اندھے کی خرید وفروخت جائز ہے۔

۱۹۔ خیار رؤیہ کی بیع: یہ بیع ایسی چیز کی ہے جس کو مشتری نے نہ دیکھا ہو، اور یہ شرط رکھی جائے کہ جب مشتری یہ چیز دیکھے گا اور اس کو پسند نہیں آئے گی تو اس کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے، کیوں کہ مشتری نے نہ دیکھی ہوئی چیز خریدی ہے؛ اور اس کو اس بیع کا انجام معلوم نہیں ہے۔

۲۰۔ وقف کی ہوئی چیز کی بیع چاہے وہ خراب ہونے کے قریب ہو: کیوں کہ وقف کردہ زمین اور وقف کردہ جائیداد کسی صورت میں بیچی نہیں جائے گی، البتہ مسجد کی حصیریں بوسیدہ ہونے کی صورت میں اس شرط کے ساتھ بیچنا جائز ہے کہ اس کی قیمت مسجد کی اصلاح ومرمت میں صرف کی جائے گی۔ البتہ وقف کی ہوئی زمین جس پر مسجد ہو یا اس میں قبرستان ہو کسی بھی صورت میں بیچنا جائز نہیں ہے۔

۲۱۔ مسلمان غلام کافر کے ہاتھ بیچنا: کیوں کہ اس میں مسلمان کو ذلیل کرنا ہے، البتہ آزاد کرنے کی شرط کے ساتھ بیچنا جائز ہے، مثلاً کوئی کافر باپ اپنے مسلمان بیٹے کو اس شرط کے ساتھ خریدے کہ وہ خریدتے ہی آزاد ہو جائے گا، یہ اصول اصل اور فرع دونوں پر منطبق ہو جاتا ہے، چاہے اصل اپنی فرع کو خریدے یا فرع اپنی اصل کو، خریدتے ہی آزاد ہو جاتا ہے؛ اگر کوئی اپنے باپ یا ماں کو خریدے تو دونوں خریدتے ہی آزاد ہو جاتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی اپنے بیٹے یا بیٹی یا پوتے کو خریدے تو خریدتے ہی یہ سب آزاد ہو جاتے ہیں، چاہے اصل جتنی بھی اوپر کی ہو، یا فرع جتنے بھی نیچے کا ہو۔

۲۲۔ اس شرط کے ساتھ غلام خریدنا کہ حق ولاء مشتری کے علاوہ دوسرے کے لیے ہوگا۔

۲۳۔ مجہول رہن کی شرط پر بیع: مثلاً کوئی کہے: میں نے یہ گھر اس شرط پر تمہیں بیچا

کہ تم میرے پاس کوئی چیز رہن رکھو۔ معلوم نہ ہو کہ یہ چیز کیا ہے، اگر رہن میں رکھی جانے والی چیز معلوم ہو تو بیع صحیح ہے، مثلاً کہے: میں نے تمہیں اپنی دکان اس شرط پر بیچی کہ تم اپنا گھر میرے پاس قیمت کی ادائیگی تک رہن رکھو۔

۲۴۔ مجہول کفیل کی شرط کے ساتھ بیع: مثلاً کوئی کہے: میں نے اپنی کار تمہیں ایک لاکھ درہم میں اس شرط کے ساتھ بیچی کہ تم میرے پاس کوئی کفیل لے آؤ۔ اور یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کفیل کون ہے۔ اگر کفیل کا نام متعین کیا جائے تو یہ بیع صحیح ہے، اور یہ کفیل ضامن بن جائے گا جو مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی صورت میں قیمت ادا کرے گا، کفیل کی ذمہ داری قرض دار کو اس وقت حاضر کرنا ہے جب وہ بھاگ جائے تاکہ وہ قرض ادا کر دے، ورنہ کفیل اس کے بدلے قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

۲۵۔ پانچ وسق یا اس سے زیادہ میں بیع عرایا: بیعِ عرایا یہ ہے کہ تازہ کھجور کو کھجور کے درخت پر موجودگی کے وقت ہی اندازہ لگا کر سوکھے کھجور کے ساتھ بیچا جائے، یا زمین پر موجود کشمش کو بیل پر موجود انگور کے ساتھ بیچا جائے، جب پھل درخت پر پختہ ہو چکا ہو۔ پانچ وسق ۹۰۰ کلو ہوتا ہے، پانچ وسق سے کم میں بیع عرایا میں فقیروں کے مفاد کی رعایت کی گئی ہے، (یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبِ عریہ (تازہ کھجور والے) کو اس کا اندازہ لگا کر سوکھے کھجور سے بیچنے کی رخصت دی۔ بخاری: کتاب البیوع، باب بیع المزابنۃ ۲۱۸۸، مسلم: کتاب البیوع، باب تحریم بیع الرطب بالتمر إلا فی العرایا ۱۵۳۹) کیوں کہ فقیر کے پاس سوکھا کھجور رہتا ہے اور تر کھجور نہیں رہتا، اس لیے وہ ساٹھ کلو کھجور نخلستان لے جاتا ہے اور اس کے مالک سے کہتا ہے: میں نے یہ ساٹھ کلو کھجور تمہارے نخلستان میں موجود اس کے برابر تر کھجور کے بدلہ تمہارے ہاتھ بیچ دیا۔ اور باغ کا مالک اس بیع پر رضامند ہو جائے، اور فقیر کو دو یا تین کھجور کے درخت بیچ دے، اس بیع کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ پانچ وسق سے کم ہو، یہ تین صاع کے برابر ہوتا ہے یعنی ۹۰۰ کلو، اگر پانچ وسق تک پہنچ جائے یا اس سے زیادہ ہو تو یہ بیع صحیح نہیں ہے۔

ایسی حرام بیع کی قسمیں جو صحیح ہو جاتی ہیں:

۱۔دیہاتی سے شہری کی بیع:(اس کی نہی بخاری اور مسلم کی روایت میں آئی ہے: بخاری: کتاب البیوع، باب لایبیع علی بیع أخیہ ۲۱۴۰، مسلم: کتاب البیوع ۱۵۲۱، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے) یعنی کوئی شہری اس سامان کو خریدے جو دیہاتی شہر میں بیچنے کے لیے لاتا ہے، یہ قدیم زمانہ سے عادت رہی ہے کہ دیہاتی لوگ شہر آکر اپنا سامان آج کی قیمت پر بیچتے ہیں، اور اس سے شہر اور دیہات والے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن کوئی شہری دیہاتی سے کہتا ہے: جو تمہارے پاس سامان ہے وہ نہ بیچو، وہ مجھے دے دو، میں اس کو تمہارے لیے زیادہ قیمت پر بیچتا ہوں، اس وقت گناہ شہری پر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ سستے سامان کی قیمت بڑھاتا ہے اور لوگوں کو ضرورت کی چیزوں میں تکلیف پہنچاتا ہے، اس صورت میں وہ عام لوگوں کے مفادات پر ظلم کر کے اپنے اور دیہاتی کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔

۲۔قافلوں کے پاس جاکر مال خریدنا: کوئی دلال قافلہ کے پاس جائے اور ان کے پاس موجود مال کے بارے میں بازار پہنچنے اور اس کی قیمت جاننے سے پہلے دریافت کرے، اس کو جواب ملے: قافلہ میں گیہوں ہے۔ وہ اس کے جواب میں کہے: شہر کے بازار میں بہت سا گیہوں آچکا ہے، اور وہاں کوئی گیہوں خریدنے والا نہیں ہے، گیہوں کی قیمت بہت ہی زیادہ گر گئی ہے۔ اس کا مقصد قافلہ والوں کو دھوکہ دے کر ان سے کم قیمت میں گیہوں خریدنا ہوتا ہے، اور وہ مثال کے طور پر آدھی قیمت پر خریدتا ہے، وہ یہ کام صرف اپنے فائدہ کے لیے کرتا ہے، چاہے دوسروں کو اس کا نقصان ہو جائے، اور اس دھوکہ کا گناہ دلال کے سر ہوتا ہے۔ (اس کی ممانعت بھی صحیح روایت میں آئی ہے، بخاری: کتاب البیوع، باب النھی للبائع أن لا یحفل الإبل ۲۱۵۰، مسلم: کتاب البیوع، باب تحریم تلقی الجلب ۱۵۱۹، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

۳۔ بیعِ نجش: خریدنے والے کو دھوکہ دینے کے مقصد سے یہ وہمی خرید وفروخت ہے، مثلاً دکان والا چند لوگوں کے ساتھ خریداروں کو دھوکہ دینے پر اتفاق کر لے کہ وہ خرید وفروخت کے اوقات میں دکان پر آئیں اور ان میں سے ایک کسی سامان کی

قیمت پوچھے، دکان والا اس کو ایک ہزار قیمت بتائے، دوسرا آئے اور کہے: میں اس کو ایک ہزار دو سو میں خریدوں گا، اس طرح سادہ لوح مشتری دھوکہ کھا جائے گا اور وہ چھ سو کی قیمت والی چیز کو دگنی قیمت دے کر خریدے گا، یہ حیلہ ان دکانوں میں ہوتا ہے جہاں قیمت کے لیے بولی لگائی جاتی ہے، یا جس کو نیلامی کہا جاتا ہے، اس کے شکار بہت سے سادہ لوح اور خرید وفروخت میں کم تجربہ رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع سے بھی منع فرمایا ہے، بخاری: کتاب البیوع، باب النجش ۲۱۴۲، مسلم: کتاب البیوع، باب تحریم بیع الرجل ۱۵۱۶، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

۴۔اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرنا: اس کی مثال یہ ہے کہ زید کوئی سامان عمرو سے خریدے یا بیچے اور یہ شرط رکھے کہ اس کو تین دنوں کے اندر بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، پھر بکر آئے اور کہے: تم نے کتنے میں بیچا ہے؟ وہ کہے: میں نے ایک ہزار میں بیچا ہے۔ بکر کہے: اس بیع کو فسخ کرو، میں تم سے گیارہ سو میں خریدتا ہوں۔ یا کہے: یہ بیع فسخ کر دو، میں تمہیں یہ چیز نو سو میں دیتا ہوں۔ ان دونوں صورتوں میں بیع حرام ہے، اگرچہ کہ یہ بیع صحیح ہو جاتی ہے۔ (اس کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ہے: ”تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے“۔ بخاری: کتاب البیوع، باب لایبیع علی بیع أخیہ ۲۱۳۹، مسلم: کتاب البیوع ۱۴۱۲، یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

۵۔ بیع مصرّاۃ: اس جانور کی بیع جس کا دودھ دو تین دنوں سے دوہا نہ گیا ہو اور اس کے تھن میں جمع کر کے رکھا گیا ہو، اس کو تصریہ کہا جاتا ہے، اس کا مقصد مشتری کو دھوکہ میں رکھنا اور اس وہم میں رکھنا ہوتا ہے کہ یہ جانور بہت زیادہ دودھ دینے والا ہے، جب مشتری کو خریدتے وقت معلوم ہو کہ وہ دھوکہ کا شکار ہو گیا ہے تو اس کو اپنی خریدی ہوئی چیز بائع کو واپس کرنے کا اختیار ہے۔ (اس سے صحیح حدیث میں ممانعت ہے، بخاری: کتاب البیوع، باب النھی للبائع أن لا یحفل الإبل والبقر والغنم ۲۱۵۰، مسلم: کتاب البیوع، باب حکم بیع المصراۃ ۱۵۲۴، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

فقہی اصول یہ ہے کہ خرید وفروخت میں ہر دھوکہ حرام ہے، اسی طرح کسی عیب کو چھپانے کے لیے ہر قسم کی تدلیس حرام ہے، باندی کے بال کالے کرنا اور اس کو منجمد کرنا حرام ہے، اسی طرح چہرے کو لال کرنا بھی حرام ہے۔

۶۔ **شراب بنانے والے کے ہاتھ انگور بیچنا**: اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن سے شراب بنائی جاتی ہے، کوئی شراب بنانے والا شراب بنانے کی غرض سے ان چیزوں کو خریدتا ہے تو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں ہے، مثلاً کھجور اور جو وغیرہ۔

۷۔ اس شخص کے ہاتھوں تلوار بیچنا جو دوسرے کو ظلماً قتل کرنے والا ہو: اسی طرح ہر قسم کے ہتھیار حربی کافر کے ہاتھوں بیچنا حرام ہے، اور اس کی بیع فاسد ہے اور یہ بیع منعقد نہیں ہوتی ہے۔

۸۔ اس شخص کے ہاتھ جال بیچنا جس کے ذریعہ وہ حرم میں شکار کرے۔

۹۔ اس شخص کے ہاتھ لکڑی بیچنا جس سے وہ حرام آلاتِ موسیقی بناتا ہو۔

۱۰۔ اس شخص کے ہاتھوں امرد غلاموں کو بیچنا جس کے بارے میں فسق وفجور مشہور ومعروف ہو، امرد سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی ابھی داڑھی نہ نکلی ہو، اس طرح کے فاجروں کے پاس چھوٹے بچوں کو کام پر رکھنا بھی حرام ہے۔

۱۱۔ **بیعِ عربون**: اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ایک سو درہم میں کوئی سامان خریدے اور بائع اس سے دس درہم ایڈوانس لے اور کہے: اگر تم نے باقی قیمت دو دنوں میں ادا کی تو سامان تمہارا ہے، اگر باقی قیمت تم نے ان دو دنوں میں نہیں دی اور تم نے بیع فسخ کردی تو میں بیع کی فسخ کے بدلے ایڈوانس دیے ہوئے دس درہم اپنے پاس رکھوں گا۔ یہ بیع حرام ہے، اور یہ بیع فاسد بھی ہے، منعقد نہیں ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

عین چیزوں کی خرید وفروخت

ملکیت والی عین چیزوں کی بیع تین طریقوں سے صحیح ہے: موجود عین چیز، غائب یعنی غیر موجود عین چیز، اور بائع کے ذمہ میں عین چیز۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۳/۲۸۲؛ ''اللباب'' محاملی ۱/۳۷۶)

۱۔ **عین سامنے موجود چیز**: اس کی بیع صحیح ہے، بیع کے صحیح ہونے میں مطلوبہ معاینہ دیکھنے سے الگ ہے، کیوں کہ سمندر میں موجود کشتی کو ساحل پر لانا ضروری ہے، تاکہ پانی میں چھپے ہوئے حصے کو بھی دیکھا جائے، اس سے بغیر معائنہ نہیں ہوتا ہے۔ بیع صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بیچی جانے والی چیز پاک ہو، اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو اور وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو۔

۲۔ **غیر موجود عین چیز**: اگر بائع اور مشتری نے اس کو پہلے نہ دیکھا ہو تو اس کی بیع صحیح نہیں ہے، اگر بائع اور مشتری نے اس کو پہلے دیکھا ہو اور ان چیزوں میں سے ہو جس میں تیزی کے ساتھ تبدیلی نہ آتی ہو مثلاً زمین اور کپڑے وغیرہ، اگر اس چیز کو انھوں نے مثال کے طور پر ایک مہینہ پہلے دیکھا ہے تو اس کی بیع صحیح ہے۔ اس عین چیز کی بیع بھی صحیح ہے جس میں ایک مہینہ کے درمیان تبدیلی ہو بھی سکتی ہو اور نہ بھی ہو سکتی ہو مثلاً جانور، اگر عین چیز ایسی ہو جس میں عام طور پر تیزی کے ساتھ تبدیلی آتی ہو مثلاً پختہ پھل تو اس کی بیع دیکھے بغیر صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں بیع کے وقت اس کی حالت مجہول رہتی ہے۔ مبیع کے صحیح ہونے کے لیے اس کے بعض حصے کو دیکھنا کافی ہے جب اس سے پوری چیز پر دلالت ہوتی ہو، مثلاً گیہوں کی ایک مٹھی دیکھی جائے جس سے باقی غلے پر دلالت ہوجاتی ہو تو یہ بیع صحیح ہے۔

۳۔ **بائع کے ذمہ میں عین چیز**: بائع کے ذمہ میں کسی چیز کی بیع اس

وقت صحیح ہوتی ہے جب اس کے نام اور صفات کا باریکی کے ساتھ تذکرہ کیا جائے، مثلاً کہے: ''میں نے تم کو ایک حبشی غلام بیچا جس کی لمبائی ساڑھے تین ذراع ہے، اور وہ مرد ہے اور اس کے صفات اس اس طرح کے ہیں، میں اس کو ایک مہینہ کے اندر تمہارے حوالے کردوں گا، اور میں نے یہ غلام تمہارے ہاتھوں ایک ہزار درہم میں بیچ دیا''۔ مشتری کہے: میں نے خریداری پر موافقت کر لی۔

اس بیع کو فی الذمہ عین چیز کی بیع کہتے ہیں، کیوں کہ یہ لفظی بیع ہے، اسی وجہ سے بائع اور مشتری کے چلے جانے سے پہلے اس بیع میں قیمت کی ادائیگی ضروری نہیں ہے، اگر بائع یہ کہے: ''میں نے تم کو ایک حبشی غلام بیعِ سلم کے طور پر بیچ دیا''۔ اس صورت میں بیع کو بیعِ سلم کا حکم ہے، بائع کے ذمہ میں عین چیز کی بیع میں بائع اور مشتری کے درمیان قیمت کی تحدید اور اس پر اتفاق ضروری ہے، تاکہ قرض کی بیع قرض میں نہ ہو، ایسی بیع باطل ہے، قرض کے ذریعہ قرض کی بیع یہ ہے کہ بائع کہے: ''میں نے تم کو میرے پاس موجود تمہارے مطلوبہ قرض کو میرے ذمہ تمہارے لیے موجود مطلوبہ قرض کے بدلہ بیچ دیا''۔

☆☆☆☆☆

بیع کب لازم ہوتی ہے؟

جب بائع کی طرف سے ایجاب ہو، مثلاً وہ کہے: میں نے تمہیں یہ چیز بیچی۔ اور مشتری قبول کرے، مثلاً کہے: میں نے خریدا۔ بائع اور مشتری دونوں عاقل ہوں، آزاد ہوں، کامل اہلیت والے ہوں یعنی ان پر بیوقوفی کی وجہ سے پابندی نہ لگی ہو، اور بیچی جانے والی چیز پاک ہو اور اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو، اسی طرح ثمن یعنی قیمت بھی حلال اور پاک ہو، مبیع بائع کی ملکیت ہو اور قیمت مشتری کی ملکیت ہو، مبیع اور قیمت دونوں بائع اور مشتری کے لیے معروف ہوں یعنی ان کو جانتے ہوں، اور بائع مبیع کو حوالہ کر سکتا ہو اور مشتری اس کو اپنے قبضہ میں لے سکتا ہو، بائع کا مبیع پر قبضہ ہو اور مشتری کے قبضہ میں قیمت ہو، اور بائع مبیع مشتری کے حوالہ کرے اور اس سے قیمت لے، اور خیارِ مجلس ختم ہو جائے اور دونوں مجلس سے اٹھ کر چلے جائیں، اور حوالگی کی مدت بھی گزر جائے تو اس صورت میں بیع ہو جاتی ہے اور بائع اور مشتری پر لازم ہو جاتی ہے، اس صورت میں مشتری مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، اور بائع قیمت کا مالک ہو جاتا ہے، اور ان دونوں کو بیع فسخ کرنے کا حق نہیں رہتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے بغیر بیع نہیں ہوتی ہے، اگر بائع کہے: میں نے تمہیں یہ چیز بیچ دی۔ اور مشتری کہے: میں نے خرید لی۔ تو یہ ایجاب وقبول ہے۔ اسی وقت بیع مکمل ہوتی ہے جب بائع اور مشتری دونوں عاقل، آزاد ہوں اور تصرف کی اہلیت رکھتے ہوں، اسی طرح بغیر مبیع اور قیمت کے بیع نہیں ہوتی، اور ان دونوں کے لیے ملکیت، پاک اور قابلِ انتفاع ہونا ضروری ہے، اسی طرح مبیع کا بائع کے ہاتھ میں ہونا اور قیمت کا مشتری کے ہاتھ میں ہونا بھی ضروری ہے۔

جو چیز اپنی ملکیت کی نہ ہو اس کو بیچنا صحیح نہیں ہے، (کیوں کہ حکیم بن حزام سے روایت ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تمہارے پاس نہیں ہے اس کو نہ بیچو''۔ ابوداود: کتاب البیوع، باب لا تبع مالیس عندک ۳۵۰۵، ابن ماجہ: کتاب البیوع، باب النھی عن بیع مالیس عندک ۲۱۸۷) کیوں کہ اس کو ایسی چیز بیچنے کا حق ہی نہیں ہے۔ نجس چیز بیچنا بھی جائز نہیں ہے مثلاً کتّا، ایسی چیز بیچنا بھی جائز نہیں ہے جس میں کوئی فائدہ نہ ہو، مثلاً اژدہا، ایسی چیز بیچنا بھی صحیح نہیں ہے جس کو حوالہ کرنے کی قدرت نہ ہو، مجہول چیز بیچنا بھی صحیح نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے ان دو کپڑوں میں سے ایک بیچا''۔ ان میں سے کسی ایک کپڑے کی تعین نہ کرے تو یہ بیع صحیح نہیں ہے۔ دوسرے کی ملکیت کی چیز بیچنا بھی جائز نہیں ہے، یہ باطل بیع ہے۔

مذکورہ تمام شرطوں کے ساتھ مکمل ہونے والی بیع کو فسخ کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ مذکورہ شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو صحیح ہے۔

ام ولد کو بیچنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ مکمل ملکیت والی چیز نہیں ہے، اور وہ اپنے آقا کی موت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ قربانی کا گوشت بیچنا بھی جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ فقراء کے لیے مخصوص ہے، عین وقف کو بیچنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ وقف کرنے والے کی ملکیت سے نکل جاتا ہے، رہن میں دیے ہوئے آدمی کی اجازت کے بغیر رہن بیچنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ رہن میں دیے ہوئے شخص کا حق ہے۔

بائع اور مشتری دونوں بیع میں خیار لیں تو خیار کی مدت کے دوران مدت ختم ہونے تک ملکیت معلق رہے گی، اگر کوئی ایک اپنے خیار سے دست بردار ہو جائے تو صرف دوسرے کو خیار کا اختیار باقی رہتا ہے، اور ملکیت ثابت ہونے کے لیے خیار کی مدت گزرنا ضروری ہے، اگر بیع فسخ کیے بغیر یہ مدت گزر جائے تو مبیع مشتری کی ملکیت ہو جاتی ہے اور قیمت بائع کی۔

جب بیع معلق ہو تو اس کی قیمت کی ملکیت بھی معلق ہی رہتی ہے، جب مبیع کی ملکیت مشتری کی ہو جاتی ہے تو قیمت کا مالک بائع بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بیعِ سلم

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/ ۲۰۵، ''التھذیب'' بغوی ۳/ ۵۶۸، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۲۶۳، ''مغنی المحتاج'' ۳/ ۶۱)

سلم ذمہ میں وصف بیان کردہ چیز پر عقد ہے جس کو مجلس میں ہی قیمت دے کر بدلہ جاتا ہے۔ (یہ تعریف امام بغوی نے ''التھذیب'' میں ۳/ ۵۶۹، اور امام نووی نے ''روضۃ الطالبین'' ۳/ ۲۹۶ میں کی ہے) عقدِ سلم کو عقدِ سلف بھی کہا جاتا ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ '' (البقرۃ ۲۸۲) (اے ایمان والو! جب تم آپس میں کوئی ادھار کا معاملہ کرو) صحیح حدیث میں ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے، جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی چیز میں سلف کرے تو وہ معلوم کیل میں اور معلوم وزن میں معلوم مدت تک کے لیے سلف کرے''۔ (بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم ۲۱۴۷، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب السلم ۳۰۹۵، یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے)

بیعِ سلم میں بیع کے لیے مذکورہ تمام شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے، ان کے علاوہ مزید پانچ شرطیں ہیں جو بیع سلم کے ساتھ مخصوص ہیں، کیوں کہ بیعِ سلم میں معائنہ یعنی دیکھنے کی شرط مفقود ہو جاتی ہے جو بیع صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے، مزید پانچ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بائع اور مشتری کے جدا ہونے سے پہلے ہی مجلسِ بیع میں قیمت بائع کے حوالے کی جائے، چاہے قیمت متعین ہو اور موجود ہو، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے یہ دینار ایک سو کلو گیہوں میں تمہارے حوالہ کیا جو تم مجھے ایک مہینہ بعد دو گے''۔ یا قیمت متعین ہو اور مشتری کے ذمہ میں ہو، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے تمہارے حوالہ ایک سو کلو گیہوں کے بدلہ ایک دینار دیا جو تم مجھے ایک مہینہ بعد لا کر دو گے''۔ ان دونوں صورتوں میں مجلس میں ہی بائع کے حوالہ

ایک دینار دینا ضروری ہے۔

۲۔مبیع مجلس میں موجود نہ ہو، کیوں کہ ایک ہی مجلس میں مبیع اور قیمت موجود ہو تو بیعِ سلم صحیح نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے یہ کپڑا اس غلام کے بدلہ تمہارے حوالہ کیا''۔

۳۔حوالگی کے مقررہ وقت مبیع کا پایا جانا ممکن ہو، اس لیے ٹھنڈی میں پہلے ہی ایک ہزار کلو تر کھجور خریدی نہیں جائے گی، کیوں کہ عام طور پر تر کھجور ٹھنڈی میں نہیں ملتا ہے، اگر ٹھنڈی میں ملے تو وہ تازہ نہیں ہوتا ہے، اور دس ہزار کلو رطب پہلے ہی ایسی مدت میں خریدے نہیں جائیں گے جب کہ اس وقت رطب تیار نہ ہوتا ہو، یا اس کو چھوٹے سے باغ والے یا چھوٹے سے گاؤں سے خریدا جائے جہاں کھجور کی پیداوار اتنی بڑی مقدار میں نہ ہوتی ہو۔

۴۔حوالگی کی جگہ کی مکمل تعین کی جائے کہ کس شہر میں، کس بازار میں اور کس محلّہ میں ادا کیا جائے گا، اگر عقدِ سلم ایسی جگہ کیا جا رہا ہو جہاں مقررہ چیز حوالہ کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً سمندر میں کشتی پر یا ہوائی جہاز پر عقدِ سلم کیا جائے، اگر عقدِ سلم بازار میں ہو تو چیز کی حوالگی اسی بازار میں ہوگی۔

۵۔بیچی جانے والی چیز کا مکمل وصف بیان کیا جائے جس سے اس کے تعلق سے کوئی بھی شک اور ناواقفیت باقی نہ رہے۔مقدار اور نوعیت کی تعین بھی ضروری ہے، اس میں پانچ چیزیں شامل ہیں: ناپ، وزن، ذراع، عدد اور سال متعین ہو۔

مثلاً گیہوں کی مقدار وزن میں متعین کی جائے، کپڑوں کی مقدار ذراع میں متعین کی جائے، جانور کی عمر متعین کی جائے، غلہ میں یہ واضح کیا جائے کہ یہ نیا مال ہے یا پرانا، چاول میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کی بالی سمیت ہے یا بالی کے بغیر، اسی طرح چاول کا رنگ اور حجم بھی متعین کیا جائے، شہد ہو تو یہ متعین کیا جائے کہ پہاڑی ہے یا جنگل کا، گرمیوں کا ہے یا سردیوں کا، اس کا رنگ پیلا ہے یا سفید، یہ ضروری نہیں ہے کہ کوالیٹی کا گریٹ متعین کیا جائے؛ کیوں کہ یہ بات طے رہتی ہے کہ اچھی قسم کا ہونا ضروری ہے، اگر سب سے بہترین کوالیٹی کی شرط رکھے تو بیع باطل ہو جائے گی۔اسی طرح حوالگی کی تاریخ سال،

مہینے اور دن کے ساتھ مقرر کرنا ضروری ہے۔

ان چیزوں میں بیعِ سلم صحیح نہیں ہے جو ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے ہیں، مثلاً موتی جس کے دانے وزن، شکل اور رنگ میں مختلف رہتے ہیں، البتہ موتی کے پاوڈر میں بیعِ سلم صحیح ہے جس کا استعمال دواؤں میں ہوتا ہے۔میوہ جات میں بیعِ سلم جائز نہیں ہے جب اس کا تعداد میں حساب کیا جائے، البتہ وزن اور ناپ کی صورت میں جائز ہے، ناریل، ناشپاتی، انار اور انڈے میں بیع سلم جائز نہیں ہے جب تعداد کے ذریعہ اس کا حساب کیا جائے، البتہ وزن کے ذریعہ ہو تو بیعِ سلم ان چیزوں میں جائز ہے۔

چمڑے کے چھوٹے چمڑوں میں بیعِ سلم وزن کے ساتھ جائز ہے،، اور یاسمین، عرقِ گلاب اور قیمتی عطریات میں بیعِ سلم صحیح ہے جو مشک، عنبر، عود اور کافور سے بنائے جاتے ہیں، رنگین سجادہ یا ایسے سیے ہوئے کپڑے میں بھی جائز ہے جس میں کسی دوسرے کپڑے کے بیل بوٹے بنائے گئے ہوں جب شکل ایک ہی ہو، شمع اور شہد سے بنائے ہوئے شہد میں بھی بیعِ سلم صحیح ہے، گھٹلی والے کھجور میں بیعِ سلم صحیح ہے، اسی طرح مکھن اور اقط (مٹھائی) میں بھی بیعِ سلم صحیح ہے جو دودھ، نمک اور کھوئے سے بنایا جاتا ہے، نمک لگا کر سکھائی ہوئی مچھلی میں، گنے کے سرکہ میں اور انگور کے سرکہ میں بھی بیعِ سلم جائز ہے جب اس کے اوصاف ثابت ہوں اور ان میں استعمال کی جانے والی چیزیں معلوم ہوں۔

اس جائے نماز میں بیعِ سلم صحیح نہیں ہے جس کو بننے کے بعد رنگا گیا ہو، اسی طرح جانور کے اعضاء میں بیعِ سلم جائز نہیں ہے، جیسے کہ جانور کے ہاتھ اور سر۔ایسے دودھ میں بیعِ سلم صحیح نہیں ہے جس میں پانی کا فیصد معلوم نہ ہو، پکے ہوئے اور تلے ہوئے کھانے کی چیزوں میں بیعِ سلم صحیح نہیں ہے۔

اینٹ اور شکر میں بیعِ سلم صحیح ہے، اور سکر النبجر میں بھی صحیح ہے جب اس میں آگ کے اثر کی مقدار معلوم ہو۔

ہم نے یہ بات کہی ہے کہ سلم کا مطلب مشتری کے لیے پہلے ہی خریداری ہے، اور

بائع کے لیے پہلے ہی بیع ہے، اوراس کے ارکان یہ ہیں: مسلم یعنی بیع سلم کرنے والا یعنی پہلے ہی خریدنے والا، مسلم اِلیہ یعنی پہلے ہی بیچنے والا۔ راس المال، یہ بیچی جانے والی چیز کی قیمت ہے، مسلم یعنی مشتری کی طرف سے ایجاب اور مسلم الیہ کی طرف سے قبول۔

دوسرے الفاظ میں سلم کے ارکان یہ ہیں: دو عقد کرنے والے یعنی مسلم اور مسلم اِلیہ، دو عوض یعنی راس المال اور مسلم فیہ، صیغہ یعنی مسلم کی طرف سے ایجاب اور مسلم الیہ کی طرف سے قبول۔

☆☆☆☆☆

ربا یعنی سود

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۳/۳۳۲، ''مغنی المحتاج'' شربینی ۲/۳۸۱، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/۳۴۹، ''روضۃ الطالبین'' ۳/۹۸)

رِبا کے لغوی معنی زیادہ ہونے کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں ربا سے مراد وہ عقد ہے جو عقد کے وقت شریعت کے معیار میں غیر معلوم مماثلت والے مخصوص عوض پر کیا جائے یا دونوں بدل یا ان میں سے ایک بدل میں تاخیر کے ساتھ کیا جائے۔

مثلاً ایک ہزار درہم اور ایک ہزار درہم دونوں ایک ہے، لیکن شریعت کے میزان میں مماثل نہیں ہیں، اور ان میں سے ایک دوسرے سے ایک درہم کسی سبب کے بغیر زیادہ ہے، اسی طرح شریعت کی نگاہ میں ایک روٹی دوسری روٹی کے مماثل نہیں ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک میں پانی کی مقدار اور آگ کا اثر معلوم نہیں ہے۔

سود کے حرام ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''**وحرم الربا**'' (البقرۃ ۲۷۵) مسلم (کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا وموکلہ ۳۰۸۰) کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، اس کا وکیل بننے والے، اس کو لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت کی ہے۔ اسی طرح سود کے حرام ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

اسلامی شریعت میں سود کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں کسی کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کی دھمکی نہیں دی ہے، سوائے سود خور کے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ**'' (البقرۃ ۲۷۸-۲۷۹) اے ایمان

والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو، اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ، پھر اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے مالوں کا اصل حصہ تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

علماء نے کہا ہے: سود کھانا برے خاتمہ کی نشانی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی میں اللہ رب العزت سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا: ''جو میرے کسی دوست کی دشمنی کرے تو میں نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا''۔ (بخاری: کتاب الرقاق، باب التواضع ۶۵۰۲، صحیح ابن حبان ۳۴۷، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

شریعت میں اللہ اور اس سے رسول کے خلاف جنگ کی عقوبت ان دو موقعوں کے علاوہ کسی دوسرے موقعہ پر نہیں آئی ہے، ایک سود خوری ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے اور دوسرے اللہ کے دوستوں کی دشمنی اور ان کو تکلیف دینا ہے جیسا کہ حدیث رسول ﷺ میں آیا ہے۔

نقدی اور کھانے پینے کی چیزوں میں سود ہوتا ہے، نقدی سے مراد سونا، چاندی اور کرنسی ہے، اور ہر کھائی جانے والی چیز چاہے وہ کبھی کبھار کھائی جاتی ہو، مثلاً شاہ بلوط کا پھل جس کو صرف قحط کے موقع پر کھایا جاتا ہے۔

جب ان دو اجناس میں سے کسی ایک کی خرید وفروخت ہو تو اس کی بیع صحیح ہونے کے لیے مندرجہ ذیل تین شرطیں ہیں:

۱۔ **حلول** یعنی مبیع اور قیمت دونوں موجود ہوں، یعنی فروخت اور حوالگی کے درمیان کوئی زمانہ فارق نہ ہو۔

۲۔ **جدائیگی سے پہلے قبضہ**؛ یعنی مجلسِ عقد سے اٹھنے سے پہلے مبیع اور ثمن دونوں پر قبضہ ہو۔

۳۔ **یقینی طور پر مماثلت ہو**؛ جب سونے کو سونے کے ذریعہ بیچا جائے تو وزن میں مماثلت پر یقین ہونا چاہیے، اگر گیہوں کو گیہوں سے بیچا جائے تو کیل

میں مماثلت یقینی طور پر پائی جانی چاہیے۔

اسی وجہ سے چیک دے کر سونے کی خریداری جائز نہیں ہے اور نہ چیک دے کر جو کی خریداری صحیح ہے، چاہے سونے کے بدلہ سونا ہو، یا گیہوں کے بدلہ گیہوں، کیوں کہ شرعی اصول یہ کہتا ہے کہ مماثلت سے ناواقفیت کمی زیادتی کی حقیقت کی طرح ہے۔

جب دو جنس ہوں اور دونوں ربوی ہوں مثلاً سونا اور کھانا تو اس بیع کے صحیح ہونے کے لیے حلول اور قبضہ شرط ہے، مثلاً سونے کو چاندی سے یا گیہوں کو جو سے بیچا جائے، اس صورت میں ایک کا دوسرے سے زیادہ ہونا جائز ہے، مثلاً ایک مثقال سونے کو گیارہ مثقال چاندی سے بیچنا جائز ہے، یا ایک کلو گیہوں کو دو کلو جو سے بیچنا جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ دونوں اجناس موجود ہوں، اور اسی مجلس میں قبضہ ہو۔

اگر دو اجناس میں ربوی سبب مختلف ہو تو یہ تینوں شرطیں ساقط ہو جاتی ہیں، مثلاً کھانے کو نقدی سے بیچا جائے، اس لیے دس من گیہوں کو ایک مثقال سونے سے بیچنا جائز ہے، جب گیہوں کو فوراً دیا جائے اور ایک مثقال سونا دس دنوں کے بعد دیا جائے، کیوں کہ ان دونوں اجناس میں ربوی سبب مختلف اور الگ ہے، ایک کا سبب کھانا ہونا ہے اور دوسرے کا سبب نقدی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''سونے کو سونے سے، چاندی کو چاندی سے، گیہوں کو گیہوں سے، جو کو جو سے، کھجور کو کھجور سے، نمک کو نمک سے برابر برابر، مماثل ہاتھوں ہاتھ بیچا جائے، جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جیسے چاہو بیچو جب ہاتھوں ہاتھ ہو''۔ (بخاری: کتاب البیوع، باب ما یذکر فی بیع الطعام والحکرۃ ۲۰۴۵، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذهب بالورق نقداً۔ ۳۰۵۵)

فی زمانہ معاملات میں سونے کی جگہ کرنسیوں نے لے لی ہے، اس وجہ سے کرنسی کا حکم سونے کے شرعی حکم کی طرح ہے، اسی طرح کرنسی کی جگہ چیک نے لی ہے، اس لیے چیک کا حکم بھی کرنسی کی طرح ہے۔

حدیث میں کھجور کا تذکرہ ہے، اس کی طرح تمام فواکہ ہیں، مثلاً انجیر، سیب اور انگور

ہے، گیہوں اور جو کا تذکرہ حدیث میں ہے۔ مقصود تمام قسم کے غلے ہیں جن کو بطورِ غذا استعمال کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس میں چاول، بھٹا، دال وغیرہ غلے شامل ہیں۔

حدیث میں نمک کا تذکرہ ہے، اس سے مراد کھانے میں ذائقہ پیدا کرنے والی چیزیں ہیں، مثلاً زعفران، ادرک، دارچینی وغیرہ، کیوں کہ کھانے میں اس کا بہترین اثر ہوتا ہے، اس وجہ سے ان چیزوں کو نمک کا حکم ہے، چونکہ کھانے کو عمدہ بنانے والی چیزیں ربوی سامان ہے، اس لیے بدن کو درست کرنے والی تمام دوائیوں کا بھی یہی حکم ہے، کیوں کہ غذا انسان کی صحت کی حفاظت کرتی ہے اور اس کے جسم کو طاقت ور بناتی ہے، اور دوا انسان کی صحت بنائے رکھتی ہے اور اس کی بیماری دور کرتی ہے۔

ان ربوی سامانوں میں سے ہر ایک میں مماثلت کی شرط سے مراد کمال کی حالت میں بھی مماثلت ہے، یعنی کھجور کو کھجور سے، کشمش کو کشمش سے بیچا جائے گا، لیکن یہ حکم رطب کھجور پر منطبق نہیں ہوتا ہے، اسی وجہ سے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رطب کو رطب سے بیچا جائے، کیوں کہ رطب سوکھنے کے بعد کتنا کھجور ہوگا ہمیں معلوم نہیں ہے، اسی طرح ہمیں معلوم نہیں ہے کہ انگور سوکھنے کے بعد کتنا کشمش ہوگا، اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ دودھ کے عوض دودھ، تیل کے عوض تیل، دہی کے عوض دہی، یا مکھن کے عوض مکھن۔

جانور کو جانور کے عوض بیچنا جائز ہے، چاہے ایک جانور دودھ والا ہو اور دوسرا بغیر دودھ کا ہو، کیوں کہ جانور مذکورہ ربوی چیزوں میں سے نہیں ہے۔

ایک دودھ والی گائے کو کئی بکریوں کے عوض بیچنا جائز ہے کیوں کہ دونوں کی جنس الگ الگ ہے، ایک دودھ والے مینڈھے کو دوسرے دودھ والے مینڈھے کے عوض بیچنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں ہم یہ اصول منطبق کرنے والے ہو جائیں گے: ''**مد عجوۃ ودرھم**'' ایک مد عجوہ اور درہم۔ (اس سے مراد یہ ہے جیسا کہ امام نووی نے کہا ہے کہ عقد دونوں جانب سے ربوی پر مشتمل ہو، اور دونوں عوض یا دو میں سے ایک جنس یا نوعیت یا صفت میں مختلف ہو۔ دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین'' حاشیہ بلقینی ۳/۱۰۶) کیوں کہ ایک مد عجوہ اور درہم کو دو مد عجوہ کے عوض بیچنا جائز

نہیں ہے، اسی طرح ایک مد عجوہ اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے۔

اگر بیع ایک ربوی صنف میں ہو اور اس میں ادا کی جانے والی قیمت اسی جنس سے ہو تو جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان میں سے کسی ایک کی طبیعت میں اختلاف ہونا صحیح نہیں ہے، مثلاً دو سو مثقال خالص سونے کو ایک سو مثقال خالص سونے اور ایک سو مثقال غیر خالص سونے کے عوض بیچا جائے، یا دو سو مثقال خالص سونے کو دو سو مثقال غیر خالص سونے کے عوض بیچا جائے تو یہ دونوں معاملات شرعی اعتبار سے حرام ہیں۔

امام مسلم نے فضالہ بن عبید سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے خیبر کے دن ایک ہار بارہ دینار میں خریدا، جس میں سونا اور منکے تھے، میں نے ان کو الگ کیا تو میں نے اس میں بارہ دینار سے زیادہ پایا، اس کا تذکرہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا، آپ نے فرمایا: ''ہار جدا کیے جانے سے پہلے بیچا نہیں جائے گا''۔ (مسلم: کتاب المساقاۃ، باب بیع القلادۃ فیھا خرز وذھب ۳۰۶۴، ابوداود: کتاب البیوع، باب فی حلیۃ السیف ۳۳۵۲، ترمذی: کتاب البیوع، باب ماجاء فی شراء القلادۃ ۱۲۵۵) کیوں کہ مبیع اور ثمن میں سے کوئی راس المال دو مختلف اجناس سے بنا ہوا ہو تو ان دو مختلف اجناس پر دوسرے راس المال کو تقسیم کرنا ان میں سے ہر جنس کے دوسرے جنس پر زیادہ مقدار کے مطابق ہوگا، اور یہی سود ہے۔

اگر بیع میں مختلف قسم کے مال کو استعمال کیا جائے مثلاً تین کلو گیہوں اور تین کلو جو کے عوض میں دینار اور درہم دیے جائیں؛ تو تین کلو گیہوں یا تین کلو جو کے عوض ایک دینار اور ایک درہم قیمت ادا کی جائے تو یہ شرعی طور پر جائز اور صحیح ہے، لیکن ایک جائے نماز اور ایک درہم کو ایک جائے نماز اور ایک درہم کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کے فرمان: ''**یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبَا**'' (اللہ سود کو مٹا دیتا ہے) میں زندہ دل لوگوں کے لیے عبرت اور نصیحت ہے، فقہائے کرام نے سود کے موضوع کو مکمل تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے، کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ بڑی زبردست مصیبت ہے، اس لیے اللہ نے اس کو تمام سابقہ شریعت میں حرام کیا ہے، اور اللہ تعالی امریکہ اور یورپ وغیرہ میں

سودی معاملات کرنے کی وجہ سے معاشرے جن مصائب کا شکار ہے ہر کوئی جانتا ہے، یہاں کے بینک دیوالیے ہو چکے ہیں اور تاجروں اور دیگر لوگوں کا مال ضائع ہو گیا ہے، اخبارات میں اعلانات ہوتے ہیں کہ فلاں شخص یا فلاں ادارے سے معاملہ کرنے میں چوکنا رہا جائے کیوں کہ اس کا دیوالیہ ہو گیا ہے، فلاں بینک میں اپنا مال رکھنے سے چوکنا رہو کیوں کہ وہ کھوکھلا ہو چکا ہے، ہم اللہ کی ہی تعریف کرتے ہیں کہ روشن وتابناک اسلامی شریعت نے سود کو حرام قرار دیا تاکہ مسلمانوں کو ان مصائب سے محفوظ رکھے۔

دنیا میں بینکوں کے ذریعہ سودی کاروبار کو رواج دینے میں یہودیوں کا ہی ہاتھ ہے، کیوں کہ ان کی فطرت میں ہی خباثت اور خیانت ہے، وہ پوری دنیا کے لیے اپنے دل میں برائی چھپائے ہوئے ہیں، اگر اب تک ان کو بدلہ نہیں ملا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ قریب میں ہی اپنے اعمال کا بدترین بدلہ پائیں گے اور دنیا ان کی برائی سے اسی وقت محفوظ ہو جائے گی جب دوبارہ یہود اپنی ذلت میں لوٹ جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

مرابحہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اسنی المطالب'' شیخ الإسلام زکریا ٩٢/٢، ''اللباب'' محاملی ٢٠٧/١، ''التھذیب'' بغوی ٤٨٠/٣، ''روضۃ الطالبین'' ٥٢٦/٣)

مرابحہ ایک ایسا عقد ہے جس میں دوسری بیع کی قیمت کی بنیاد پہلی بیع کی قیمت پر بطور امانت اس میں شامل ہونے والے اضافہ کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔ مثلاً مشتری بائع کے پاس جائے اور سامان کی قیمت کے بارے میں پوچھے، بائع اس سے کہے جو سامان کا مالک ہے: اس سامان پر مجھے ایک لاکھ خرچ آیا ہے، اور میں اس کو اسی قیمت پر دس فیصد منافع کے ساتھ بیچتا ہوں؛ مشتری اس کو قبول کرے۔ یا بائع اس سے کہے: میں نے اس کو اپنی خریدی ہوئی قیمت اور دس فیصد منافع کے ساتھ بیچ دیا، اور مشتری کہے: میں نے تم سے اس بیع کو قبول کیا۔ اور مشتری بائع کو گیارہ سو درہم حوالہ کرے اور اس کا سامان لے۔

جب بیع مکمل ہونے کے بعد بائع آئے اور کہے: میں نے قیمت کا حساب لگانے میں غلطی کی تھی، میں نے اس کو ٩٠ درہم میں خریدا تھا، اگر ہم متفقہ منافع کا اضافہ کریں تو مبیع کی قیمت ٩٩ درہم ہوتی ہے، اس صورت میں مشتری کو قیمت کا فرق لینے کا حق ہے۔

اگر بائع کہے: میں نے قیمت کا حساب لگانے میں غلطی کی ہے، میں نے اسے زیادہ قیمت دے کر خریدا تھا۔ مشتری اس کو جھوٹا کہے تو بائع پر ضروری ہے کہ وہ اپنے دعوی کو دستاویزات سے ثابت کرے، اگر ایسا نہیں کر سکتا ہے تو اپنے دعوی کے صحیح ہونے پر قسم کھائے گا۔

☆☆☆☆☆

محاطّہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۷/ ۱۸۸، ''روضۃ الطالبین'' نووی ۱/ ۵۲۹، ''أسنی المطالب'' ۲/ ۹۲)

محاطّہ مرابحہ کے عکس ہے، وہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے: یہ سامان میں نے فلاں قیمت میں خریدا ہے اور اب تم کو دس فیصد ڈسکاونٹ کرکے بیچتا ہوں۔ اس صورت میں بائع ایک سو درہم میں خریدی ہوئی چیز ۹۰ درہم میں بیچتا ہے۔

اس کا صیغہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے: میں نے تمھیں یہ چیز اپنی خریدی ہوئی قیمت پر دس فیصد کم کرکے بیچ دی۔ اس کے جواب میں مشتری کہے: میں نے تم سے یہ بیع اس مبلغ میں قبول کی۔

☆☆☆☆☆

خیار کے مسائل

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۳/ ۲۹۰، ''کفایۃ الأخیار'' تقی حصنی ۱/ ۳۵۴، ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۱/ ۱۶۸)

خیار یہ ہے کہ عقد کرنے والے دو فریق میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو متعین مدت کے دوران عقدِ بیع فسخ کرنے کا حق ہو، خرید وفروخت میں مشروع خیار کی سولہ قسمیں ہیں، جن کی تفصیلات ذیل میں پیش ہیں۔ (''اللباب'' محاملی ۱/ ۲۰۸)

۱۔ **خیارِ مجلس**: یہ اس مجلس کا خیار ہے جہاں بیع ہوئی ہے، بائع اور مشتری دونوں کو مجلسِ عقد میں موجود رہنے کے دوران عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے، یہ حق ان کو شریعت نے دیا ہے، اس حق کے سلسلہ میں بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تک جدا نہ ہوں خرید وفروخت کرنے والوں کو اختیار ہے، یا ایک دوسرے سے کہے: خیار لو''۔ (بخاری: کتاب البیوع، باب إذا لم یوقت فی الخیار ۲۰۲۰، مسلم: کتاب البیوع، باب ثبوت خیار المجلس للمتبایعین ۲۹۰۰) یعنی ان میں سے کوئی اپنے خیار والے حق سے دست بردار ہوجائے اور دوسرے کا حق باقی رہے۔

۲۔ **خیار شرط**: یہ ہے کہ بایع اور مشتری یا ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنے لیے تین دنوں کے اندر بیع فسخ کرنے کے حق کی شرط رکھے، بیہقی (السنن الکبری: کتاب البیوع، باب الدلیل علی أن لا یجوز شرط الخیار فی البیع أکثر من ثلاثۃ أیام ۵/ ۲۷۳) وغیرہ نے صحیح حدیث حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان کو خرید وفروخت میں بہت زیادہ دھوکہ ہوتا تھا، اس لیے وہ ہر خریدی جانے والی چیز میں قیمت سے زیادہ ادا کرتے تھے، انھوں نے اپنی یہ کمزوری رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی، اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے

فرمایا: ''جب تم خریدو تو یہ کہو کہ دھوکہ نہیں، پھر تم کو ہر خریدے ہوئے سامان میں تین دنوں کا خیار ہے''۔ اگر تین دنوں سے زیادہ کی شرط رکھے تو بیع باطل ہو جائے گی۔

۳۔ **خیار عیب** جب اس کا علم ہو: اس کی شکل یہ ہے کہ مشتری کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے اگر مبیع میں کوئی عیب ظاہر ہو جائے، عیب کا اصول یہ ہے کہ عیب عینِ مبیع میں نقص اور کمی پیدا کرنے والا ہو، مثلاً خصی جانور، بیمار جانور، یا مبیع کی قیمت میں کمی آتی ہو، مثلاً غلام چور یا جھوٹا ہو، یا بستر پر پیشاب کی بیماری ہو۔

حیوان کی خصی کرنا حرام ہے، اگر بچپن میں کیا جائے یا معتدل گرمی کے موسم میں گوشت کو عمدہ بنانے اور جانور کو موٹا بنانے کے لیے کیا جائے تو جائز ہے۔ (دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین''، نووی ۲/۳۳۷)

جس باندی کی عمر جماع کے لائق ہو اور وہ ثیبہ ہو تو باکرہ باندی کے مقابلہ میں اس کی قیمت کم رہتی ہے، لیکن اس کے بیچنے کے عقد میں فسخ کا اختیار نہیں ہے، کیوں کہ بڑی عمر میں باکرہ باندی کا پایا جانا نادر ہوتا ہے۔

۴۔ **خیار تدلیس**: یہ ہے کہ مبیع کی حقیقت چھپائی جائے، مثلاً تھن کو کچھ مدت دوہے بغیر چھوڑا جائے تا کہ مشتری کو لگے کہ یہ جانور بہت زیادہ دودھ دینے والا ہے، یا غلام باندی کے بال میں کالا خضاب لگایا جائے تا کہ مشتری اس کو جوان سمجھے، ان کے علاوہ دھوکہ کی دوسری صورتوں میں مشتری کو مبیع لوٹانے کا حق ہے۔

۵۔ **خیار تلقی الرکبان**: یہ خیار ان لوگوں کو ہے جو قافلے میں اپنا سامان لے کر شہروں میں آتے ہیں اور کوئی ان کو شہر میں آنے سے پہلے ہی دور کسی جگہ استقبال کرتا ہے اور ان کو دھوکہ دے کر سامان موجودہ قیمت سے کم قیمت پر خریدتا ہے، جب وہ شہر پہنچتے ہیں اور ان کو حقیقی قیمت معلوم ہو جاتی ہے اور ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کو دھوکہ دیا گیا ہے تو ان کو پہلے کیا ہوا عقدِ بیع فسخ کرنے کا خیار ہے۔

۸۔ **خیار تفریقِ صفقہ**: مثلاً کوئی ایک ہی بائع سے دو گدھے خریدے،

ان کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے کوئی ایک گدھا مر جائے، چونکہ مشتری نے ان دونوں کو الگ الگ خریدا ہے اس لیے اس کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص سرکہ کے دو ڈبے خریدے، پھر اس کے بعد معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ایک میں سرکہ کے بجائے شراب ہے، تو اس صورت میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے، کیوں کہ مبیع کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس میں ایک حکم لگانا صحیح ہے، جب کہ واقعہ جو رونما ہوا ہے اس کی وجہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، کیوں کہ ایک ڈبہ کی بیع صحیح ہے، اور دوسرے کی بیع باطل ہے، اور مشتری کو اس بارے میں معلوم نہیں ہے، اس لیے مشتری جس ڈبے کی بیع صحیح ہے اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے اور جس کی بیع باطل ہے اس کی قیمت بیع سے کم کر سکتا ہے، اگر پہلے ہی معلوم تھا تو اس صورت میں بیع فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔

۷۔ **بیان کردہ وصف کی عدم موجودگی کی وجہ سے خیار**: مثلاً کوئی اس شرط کے ساتھ گائے خریدے کہ وہ حاملہ ہے یا وہ دودھ والی ہے، پھر معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے یا وہ دودھ والی نہیں ہے، اس صورت میں عقدِ بیع فسخ کرنے کا حق ہے۔

۸۔ **غصب سے ناواقفیت کی وجہ سے خیار**: مثلاً کوئی گھر دیکھ کر یہ نہ جانتے ہوئے خریدے کہ کسی دوسرے شخص نے اس کو غصب کیا ہے، وہ غصب کرنے والے سے لے بھی سکتا ہو تو بھی اس کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے، یا زید سے گھر خریدے اور اس کو معلوم ہو کہ دوسرے شخص نے اس گھر کو غصب کیا ہے، اور وہ گمان کرے کہ غصب کرنے والے سے وہ گھر لے سکتا ہے، پھر اس کے بعد معلوم ہو جائے کہ وہ غاصب پر حاوی ہونے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور اس گھر کو اس سے نہیں لے سکتا ہے، تو اس صورت میں اس کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے، یا بائع انکار کر دے کہ اس نے بیچا ہے اور مشتری کے پاس کوئی بھی دستاویز نہ ہو کہ جس سے خریداری پر دلالت ہو جائے، اور وہ عدالت کے ذریعہ اپنا حق ثابت کر سکتا ہے تب بھی اس کو فسخ کرنے کا اختیار ہے؛ کیوں کہ حاکم سے ملاقات، فیصلہ کے لیے کارروائیاں کرنے اور بائع کو قسم کھانے کا مکلّف بنانے میں مشتری کے لیے مشقت ہے۔

۹۔ **خیارِ جہل**: یہ ہے کہ جو خریدا ہے اس میں کوئی دوسرا کرایہ پر ہو، یا خریدی ہوئی زمین کسی دوسرے شخص کے ذریعہ جوتی گئی ہو، اور خریدنے والے کو اس بارے میں معلوم نہ ہو، اور بائع اس بارے میں نہ بتائے، اس صورت میں مشتری کو عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

۱۰۔ **کسی صحیح شرط کی پاسداری سے منع کرنے کا خیار**: مثلاً عقدِ بیع میں یہ شرط ہو کہ مشتری اپنے ذمہ موجود قیمت کے مقابلہ میں رہن رکھے گا، یا کوئی کفیل لائے گا، لیکن مشتری یہ شرط پوری نہ کرے کہ نہ کوئی چیز رہن میں رکھے اور نہ کوئی کفیل لائے، تو اس صورت میں بائع کو عقدِ بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر شرط یہ ہو کہ مشتری اپنا خریدا ہوا غلام آزاد کرے گا تو اس صورت میں خیار نہیں ہے، اور مشتری کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس شرط کے مطابق خریدے ہوئے غلام کو آزاد کردے۔

اسی طرح اگر عقد میں یہ شرط ہو کہ مشتری پھل پختہ ہونے سے پہلے نخلستان یا درختوں سے نکال لے گا، اور وہ ایسا نہ کرے، تو مشتری کو پھل توڑنے پر مجبور کیا جائے گا، مگر یہ کہ نخلستان یا پھل دار درخت مشتری کی ملکیت میں منتقل ہو چکا ہو، اس صورت میں اس کو توڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ اب وہ درخت کا بھی مالک ہے اور پھل کا بھی، چاہے یہ ملکیت پھل خریدے جانے کے بعد خرید کر حاصل ہوئی ہو یا وراثت کے ذریعہ، یا ہبہ کی وجہ سے ملکیت منتقل ہوئی ہو۔

جب غلام آزاد کرنے کی شرط پر خریدا گیا ہو اور وہ ایسا نہ کرے تو حاکم اس کو آزاد کرنے پر مجبور کرے گا، اسی طرح حاکم کو حق ہے کہ وہ پختہ ہونے سے پہلے پھل توڑنے کی شرط پر بیچے ہوئے پھل کو توڑنے پر مجبور کرے، ہم نے اس کا حکم ابھی تھوڑی دیر قبل تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

۱۱۔ **خیارِ تحالف**: یہ خیار اس وقت پیش آتا ہے جب ایسے حالات پیش آئیں کہ بائع اور مشتری کا قسم کھانا واجب ہوجائے کہ انھوں نے بیع کی تمام شرطوں؛ ایجاب وقبول کو پورا کرلیا ہے، لیکن وہ قیمت کے سلسلہ میں اختلاف کریں، مثلاً بائع کہے: میں نے تم کو یہ چیز ایک ہزار درہم میں بیچی ہے۔ اور مشتری کہے: بلکہ میں نے تم سے پانچ سو درہم میں خریدی ہے۔ اس صورت میں مناسب یہ ہے کہ دونوں اپنی بات صحیح ہونے پر قسم کھائے، یا تو خود اپنے ارادہ سے

بیع فسخ کردیں یا حاکم اس بیع کو فسخ کردے گا۔ اگر بائع کہے: میں نے تمھیں یہ چیز بیچ دی۔ دوسرا کہے: بلکہ تم نے مجھے ہبہ کیا ہے۔ تو اس صورت میں ہر ایک اپنا قول صحیح ہونے پر قسم کھائے گا، قسم کے بعد اختلافی چیز اس شخص کے حوالے کی جائے گی جس نے کہا ہے کہ میں نے تم کو یہ چیز بیچی ہے، اس کے ساتھ ہر اضافہ بھی شامل ہوگا مثلاً پھل یا بچہ یا انڈا وغیرہ۔

۱۲۔ **خیار بائع**: یہ مرابحہ کی صورت میں اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ چیز کی خرید ایک سو درہم ہے، اور ہر دس درہم پر ایک درہم منافع ہے، پھر بائع آئے اور کہے: اس کی خریدی ہوئی چیز ایک سو بیس درہم کی ہے۔ مشتری کہے: تم نے سچ کہا۔ لیکن وہ بائع کو یہ زائد قیمت ادا نہ کرے تو اس صورت میں بائع کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

۱۳۔ **خیار مشتری**: یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب خریدے ہوئے پھل دوسرے پھلوں کے ساتھ ملائے جائیں، مثلاً مشتری لیموں خریدے، اور بائع کے پاس اتنی مقدار میں لیموں نہ ہوں جس کو مشتری نے خریدا ہو، اس لیے بائع ڈبوں میں دوسرے پھل رکھ کر لیموں کے ساتھ ملادے، تو اس صورت میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے۔

۱۴۔ **مشتری کی عاجزی کا خیار**: جب مشتری اپنی خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت ادا کرنے سے عاجز ہو، اور وہ بائع کا قرض دار بن جائے، تو قاضی کو حق ہے کہ مشتری کو اس کے مال اور ملکیت کی چیزوں میں قرض کی ادائیگی کرنے کی خاطر روک دے، اور اس صورت میں بائع کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے۔

۱۵۔ **مبیع بدلنے کا خیار** اگر خریدنے سے پہلے نہ دیکھا ہو: مثلاً کوئی گھر دیکھا ہو اور چھ مہینوں بعد اس کو دوبارہ دیکھنے سے پہلے یہ سمجھتے ہوئے خریدے کہ گھر میں اس مدت کے دوران کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، لیکن جب گھر اپنے قبضہ میں لینے کے لیے جائے تو اس کو ویران دیکھے، تو اس صورت میں اس کو بیع فسخ کرنے کا خیار ہے۔

۱۶۔ **پھلوں میں عیب کی موجودگی کی وجہ سے خیار**: مثلاً کوئی بائع اپنے پھل بیچے، لیکن اپنے باغ کے درختوں کی سینچائی نہ کرے، اور درختوں کی پیاس کے نتیجہ میں اس کے پھل سوکھے اور غیر معیاری پیدا ہوں تو اس صورت میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق ہے۔

باطل بیع کی قسمیں

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۲۰۹)

باطل بیع بہت سی ہیں، ان میں سے متعدد قسموں کا بیان اس وقت گزر چکا ہے جب فاسد بیع کا تذکرہ ہوا تھا، کیوں کہ ہمارے مسلک میں باطل اور فاسد دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، ہم یہاں سابقہ باطل شکلوں کے ساتھ مزید چند شکلوں کا تذکرہ کررہے ہیں:

۱۔ایسی چیز کی بیع جس پر ابھی قبضہ نہ ہوا ہو:

کیوں کہ کسی بھی چیز کی خریدی کے وقت پہلے اس کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور اس کو اپنے قبضہ میں لیا جاتا ہے، اس کے بعد وہ یہی چیز دوسرے کو بیچ سکتا ہے، اگر خریدی ہوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ لے اور اس کو بیچ دے تو یہ بیع باطل ہے، البتہ شریعت نے اس سے چند شکلوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جن میں قبضہ سے پہلے بیچنے کی اجازت ہے، وہ شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔**میراث**: جو کسی چیز کا وارث بن جائے اور ابھی اس پر قبضہ نہ کیا ہو تو بیچ سکتا ہے، البتہ اپنی میراث پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو اس کے وارث اس چیز کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے بیچ نہیں سکتے ہیں۔

۲۔**موصی به** یعنی وہ چیز جس کی کسی کے لیے وصیت کی گئی ہو: کسی کے حق میں کسی چیز کی وصیت کی جائے اور ابھی اس نے اس چیز پر قبضہ نہ کیا ہو تو اس کے لیے یہ چیز قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۳۔**سلطان** کی طرف سے حاصل ہونے والا رزق: کسی کے لیے حاکم یا سلطان یا حکومت کسی حق کی وصیت کرے تو وہ یہ حق قبضہ کرنے سے پہلے بیچ سکتا ہے۔

۴۔**مالِ غنیمت**: کسی کو کافروں کے خلاف جہاد میں کوئی چیز ملے تو اس کے

لیے مالِ غنیمت کا اپنا حصہ قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۵۔**وقف** سے حاصل ہونے والے منافع: وقف سے حاصل ہونے والے منافع یا غلہ اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا جائز ہے، چاہے یہ وقف جانوروں میں سے کوئی ہو، یا باغ کے پھل ہوں یا دکان کا کرایہ ہو۔

۶۔**وہ ہبہ** جو واپس لینا جائز ہو: مثلاً کوئی باپ اپنے کسی بیٹے کو گھر ہبہ کرے پھر اپنے ہبہ میں رجوع کرے تو اس کے لیے بیٹے کی طرف سے گھر واپس ملنے سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۷۔**قید کیا ہوا شکار**: جال میں پھنسے ہوئے شکار کو اس سے نکالنے سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۸۔**مُسلم فیه**: یہ وہ مبیع ہے جس کو بیعِ سلم کے طور پر بیچنا طے ہوا ہے، اس میں مبیع اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۹۔**مشترک چیز**: مثلاً کوئی مشترکہ گھر کے آدھے حصہ کا مالک ہو، تو وہ اس گھر میں سے اپنا حصہ بیچ سکتا ہے، چاہے اس کو یہ حصہ اپنے شریک سے نہ ملا ہو، البتہ مشتری کے لیے اپنے حصہ کی حوالگی شریک کی اجازت سے ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ جب وہ شریک کی اجازت کے بغیر مشتری کے حوالے کرے گا تو اس بیع میں شریک کے حصہ کی وجہ سے نقصان ہوگا؛ اس صورت میں وہ شریک کو ہونے والے نقصان کی بھرپائی کرے گا۔

۱۰۔**کرایہ پر دی ہوئی چیز**: کوئی مالک اپنی چیز کرایہ پر دے تو کرایہ پر لینے والے سے اپنے قبضہ میں لیے بغیر دوسرے کے ہاتھ بیچ سکتا ہے۔ مثلاً کسی کے پاس زمین یا جائیداد ہو اور وہ اس کو کسی دوسرے کو کرایہ پر دے تو مالک کے لیے صحیح ہے کہ کرایہ دار سے واپس لیے بغیر بیچے۔

۱۱۔**مالِ قراض**: مالِ قراض کو اس شخص سے واپس اپنے قبضہ میں لیے بغیر بیچنا جائز ہے جس کے حوالہ مالک نے تجارت یا بڑھانے کی غرض سے کیا ہو۔

۱۲۔**رہن میں رکھی ہوئی چیز**: جس رہن میں رکھی ہوئی چیز کو چھڑا لیا گیا ہو تو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

۲۔اس چیز کی بیع جس کو فی الحال حوالہ کرنا ممکن نہ ہو:

اس کی ہم نے کئی مثالیں پہلے پیش کی ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندہ کو بیچا جائے، یہاں ہمارا مقصد اس باب سے مستثنی امور کو بیان کرنا ہے، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: جو چیز بیع کے فوراً بعد حوالہ کرنا ممکن نہ ہو تو وہ باطل ہو جاتی ہے، اس سے چھ مندرجہ ذیل چیزیں مستثنی ہیں: (محاملی نے ان میں سے پانچ شکلوں کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے "اللباب" ۱/۲۱۱)

۱۔**کرایہ پر دی ہوئی جائیداد**: مثلاً کوئی اپنی ملکیت کا گھر کرایہ پر ایک سال کے لیے دے پھر اس گھر کے منافع کو بیچ دے یعنی اس کے ملحقات کو، اور ان ملحقات کو فوراً حوالہ کرنا ممکن نہ ہو، کیوں کہ گھر کو کرایہ پر لینے والا اس گھر کو صحیح کرایہ کے عقد سے استعمال کر رہا ہے۔

۲۔**بیعِ سلم**: یہ وہ بیع ہے جس میں بائع سے پہلے ہی سامان خریدا جاتا ہے، کیوں کہ مشتری اس کو عقدِ سلم میں متعین مدت کے ختم ہونے سے پہلے اپنے قبضہ میں نہیں لے سکتا ہے، اس کے باوجود مشتری قبضہ سے پہلے یہ چیز بیچ سکتا ہے۔

۳۔**کثیر مقدار میں غلہ**: اس میں قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے؛ کیوں کہ ناپ یا وزن میں اس کی مقدار جاننے کے لیے طویل وقت درکار رہے، اسی وجہ سے اس میں قبضہ سے پہلے بیع صحیح ہے۔

۴۔**غصب کیا ہوا مال**: کسی چیز کا مالک اپنا غصب کیا ہوا مال غاصب سے نہیں لے سکتا ہے تو ایسے شخص کے ہاتھوں یہ مال بیچ سکتا ہے جو غاصب سے اس کو واپس لے سکتا ہو۔ (یہ مسلک میں دو اقوال میں قولِ اصح ہے، دیکھا جائے: "المجموع شرح المھذب" ۹/۲۸۵)

۵۔**بھگوڑا غلام**: ایسے شخص کے ہاتھوں اس کو بیچنا جائز ہے جس کو تلاش کر سکتا ہو اور واپس لا سکتا ہو۔

۶۔**دوسرے شہر میں موجود عین چیز**: اس پر قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے؛ کیوں کہ وہ بیع کے وقت اس چیز کو مشتری کے حوالہ نہیں کر سکتا ہے، اور اس کی بیع دوسرے شہر میں موجود اس سامان تک مشتری کے پہنچنے تک کی ضروری مدت تک ہی صحیح ہے۔

۳۔کسی شرط کے ساتھ بیع کی جائے تو باطل ہے:

مثلاً کوئی دوسرے سے کہے: میں نے اپنا گھر اس شرط کے ساتھ بیچا کہ تم مجھے اپنا گھر بیچو۔ یا کہے: میں اپنا گھر اس شرط کے ساتھ تمہیں بیچتا ہوں کہ تم مجھے ایک مبلغ قرض دو۔ اس طرح کی شرطوں سے بیع باطل ہوتی ہے۔ یہاں اس سے مستثنی امور کو بیان کرنا مقصود ہے، اس وجہ سے کہتے ہیں: شرط کے ساتھ کی جانے والی بیع بعض ان صورتوں میں صحیح ہے جن کو شریعت نے مستثنی کیا ہے، اور ان کا شمار صحیح بیع میں ہوتا ہے، یہ شکلیں مندرجہ ذیل ہیں: (دیکھا جائے: "روضۃ الطالبین" ۳/۱۲۳، "اسنی المطالب" ۲/۳۳)

۱۔**رھن رکھنے کی شرط پر بیع کرنا**: مبیع کی قیمت کی مکمل ادائیگی کے وقت تک کے لیے کوئی چیز رہن میں رکھنے کی شرط پر بیع کی جائے تو بیع صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: "میں نے تمہیں اپنا گھر اس شرط پر بیچا کہ تم تین مہینوں کے بعد اس کی قیمت ادا کرنے تک میرے پاس کوئی چیز رہن رکھو"۔

۲۔**کفیل کی شرط کے ساتھ بیع**: مثلاً کہے: "میں نے اپنی دکان اس شرط کے ساتھ بیچی کہ تم میرے پاس کوئی کفیل لے آؤ جو ضمانت دے کہ تم اس کی قیمت بعد میں ادا کرو گے"۔

۳۔**گواہ بنانے کی شرط پر بیع** کہ عقد مکمل ہونے کو اس پر گواہ بنانے پر موقوف کیا جائے۔

۴۔**خیار کی شرط کے ساتھ بیع**: تین دنوں کے اندر بیع کو فسخ کرنے کے خیار کی شرط کے ساتھ بیع کی جائے تو صحیح ہے۔

۵۔**متعین مدت کی شرط کے ساتھ بیع**: مثلاً کوئی کہے: میں نے تم سے تمہاری دکان اس شرط کے ساتھ خریدی کہ میں تمہیں اس کی قیمت تین مہینوں بعد ادا کروں گا۔

۶۔**آزاد کرنے کی شرط پر بیع**: اس کی شکل یہ ہے کہ آزاد کرنے کی شرط پر غلام بیچا جائے۔

۷۔**عیوب سے بری ہونے کی شرط پر بیع**: مثلاً کوئی کہے: "میں

نے تمہیں یہ جانور اس شرط پر بیچ دیا کہ میں اس جانور میں موجود ہر عیب سے بری ہوں''۔ یہ ہر اس عیب میں صحیح ہے جس کا بائع کو علم نہ ہو، اگر اس کو معلوم ہے تو وہ بری نہیں ہوگا۔

۸۔**مبیع منتقل کرنے کی شرط پر بیع**: مثلاً بائع کہے: ''میں نے تمہیں یہ گاڑی اس شرط پر بیچی کہ جب بیع مکمل ہو جائے تو یہ گاڑی یہاں سے منتقل کی جائے اور شوروم سے باہر لے جائی جائے''۔

۹۔**پھل کاٹنے کی شرط پر بیع**: مثلاً بائع مشتری سے کہے: ''میں نے یہ پھل تمہیں اس شرط پر بیچے کہ تم ان پھلوں کو پختہ ہونے سے پہلے توڑو گے''۔

۱۰۔ **پھل باقی رکھنے کی شرط پر بیع**: باغ میں پھل درختوں پر باقی رکھنے کی شرط پر پھل بیچے جائیں تاکہ لینے والا اس کو آہستہ آہستہ جمع کرے۔

۱۱۔**مطلوبہ وصف کی شرط پر بیع**: مثلاً کوئی کہے: ''میں نے تم سے یہ غلام اس شرط پر خریدا کہ وہ لکھنا جانتا ہے''۔ یا کہے: ''میں نے تم سے یہ گائے حاملہ ہونے کی شرط پر خریدی''۔ یا کہے: ''میں نے تم سے یہ باندی اس شرط پر خریدی کہ وہ کھانا پکانا جانتی ہے''۔

۱۲۔ **قیمت پر قبضہ کرنے** کے بعد ہی مبیع حوالہ کرنے کی شرط پر بیع۔

مذکورہ بالا شکلوں میں بیع کرنا صحیح ہے۔

بعض باطل بیع مندرجہ ذیل بھی ہیں جن کا تذکرہ ابھی نہیں کیا گیا ہے:

(دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۲۰۳)

۱۔ جانور کے عوض گوشت بیچنا باطل ہے: مثلاً کوئی بکری کے گوشت کے عوض گائے خریدے، یا گائے کے گوشت کے بدلے گدھا خریدے، یا دوسرے جانوروں کے گوشت کے اجزاء کے بدلہ کوئی جانور خریدے، یہ سب بیع باطل ہیں۔

البتہ جانور کو دودھ کے بدلہ بیچنا جائز ہے، اس صورت میں دودھ جانور کی قیمت ہو جائے گا، البتہ اس بیع کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ مبیع دودھ دینے والا جانور نہ ہو۔

۲۔ دودھ والی بکری کو دودھ والی بکری کے عوض بیچنا: دودھ والی بکری کی طرح دوسرا دودھ والا جانور ہے، اسی طرح کے دوسرے دودھ والے جانور کے عوض بیچنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح انڈے دینے والی مرغی کو انڈے دینے والی مرغی کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ کاٹنے کی شرط کے بغیر پھل کے پختہ ہونے سے پہلے بیچنا: یہ باطل ہے، البتہ پختہ ہونا شروع ہو رہا ہو تو کاٹنے کی شرط کے بغیر بھی بیع صحیح ہے۔

۴۔ نخلستان کو بیچنے کی صورت میں جب اس پر کھجور لگا ہو: اگر تلقیح (نر اور مادہ کو ملا کر بارآور کرنے کے عمل کو تلقیح کہا جاتا ہے جو عام طور پر کھجور کے درخت میں کیا جاتا ہے) سے پہلے نخلستان بیچا جائے تو پھل مشتری کے ہوں گے، اگر تلقیح کے بعد ہو تو پھل بائع کے ہوں گے۔

۵۔ بھیگے ہوئے گیہوں کو اسی طرح کے بھیگے ہوئے یا سوکھے گیہوں کے عوض بیچنا: یہ بھی باطل بیع ہے، گیہوں کی طرح دوسرے غلے بھی ہیں: مثلاً چاول، جو، بارلی وغیرہ۔

۶۔ تازہ گوشت کو اسی طرح کے تازہ گوشت یا سوکھے گوشت کے عوض بیچنا: البتہ ہڈی نکالا ہوا سکھایا ہوا گوشت اسی طرح کے گوشت سے بیچنا صحیح ہے۔

۷۔ سوکھے گوشت کو سوکھے گوشت سے کمی زیادتی سے بیچنا: جب ایک کا وزن کم اور دوسرے کا زیادہ ہو اور ایک ہی جانور کا ہو، مثلاً گائے کا سوکھا گوشت گائے کے گوشت ہی کے عوض بیچا جائے۔

گوشت، دودھ، تیل، چربی، مچھلی، روٹی اور سرکہ مختلف انواع واقسام ہیں۔ (یہی بات بغوی نے ''التھذیب'' میں ۳/۳۶۲، غزالی نے ''الوسیط'' میں کہی ہے ۳/۵۷، یہ مزنی اور ابوحنیفہ کا مسلک ہے) اسی وجہ سے ایک کلو بکری کے گوشت کو دو کلو گائے کے گوشت کے عوض بیچنا جائز ہے، اور ایک لیٹر گائے کے دودھ کو دو لیٹر بکری کے دودھ کے عوض بیچنا صحیح ہے، ایک لیٹر گنّے کے سرکہ کو دو لیٹر سیب کے سرکہ کے عوض بیچنا جائز ہے، گیہوں کی دو کلو روٹی کو جو کی ایک کلو روٹی کے عوض بیچنا جائز ہے، ایک کلو صاف مچھلی کو دو کلو بھنی ہوئی مچھلی کے عوض بیچنا جائز ہے، ایک کلو اونٹ کی چربی کو دو کلو گائے کی چربی کے عوض بیچنا جائز ہے۔

۸۔ ایسی نجس چیز بیچنا جس کو پاک کرنا ممکن نہ ہو: باطل ہے، چاہے نجاست عینِ نجاست ہو مثلاً کتا اور خنزیر، یا نجاست متصل ہوئی ہو مثلاً سیال چیزیں جس میں نجاست گری ہو، مثلاً تیل

جس میں چوہا گر کر مر گیا ہو۔ البتہ کپڑا، جائے نماز اور برتن کو پاک کرنا ممکن ہے اگر نجاست گر جائے، اس لیے اس کی بیع بھی صحیح ہے، کیوں کہ پانی سے دھو کر اس کو صاف کرنا ممکن ہے۔

۹۔ آزاد انسان کی بیع، اسی طرح مسلمان غلام کو کافر کے ہاتھوں بیچنا: یہ دونوں بیع باطل ہیں، مسلمان کافر کی ملکیت میں صرف چھ حالات میں پہنچ سکتا ہے:

۱۔ وراثت: مثلاً کوئی کافر غلام مسلمان ہو جائے، اور اس کے آقا سے لیے جانے سے پہلے ہی آقا کا انتقال ہو جائے اور اس کا بھائی غلام کا وارث بن جائے، اس صورت میں مالک کو حکم دیا جائے گا کہ اس غلام کو کسی مسلمان کے ہاتھ بیچ دے۔

۲۔ مشتری کے مفلس ہونے کی وجہ سے غلام کو واپس لیا جائے: مثلاً کوئی کافر اپنے مسلمان ہونے والے غلام کو بیچ دے، جب مشتری سے وہ قیمت کا مطالبہ کرے تو اس کی قیمت افلاس کی وجہ سے مشتری ادا نہ کر سکے، اس صورت میں مسلمان غلام کو کافر آقا واپس لے گا۔

۳۔ کافر اپنے بچہ کو ہبہ کرے اور واپس لے: اس کی شکل یہ ہے کہ کافر اپنا غلام اپنے بیٹے کو ہبہ کرے، پھر کافر کے بیٹے کے پاس غلام مسلمان ہو جائے پھر وہ کافر اپنے بیٹے سے ہبہ کیا ہوا غلام واپس لے۔

۴۔ خریدنے والا کسی عیب کی وجہ سے اس مسلمان غلام کو واپس کر دے: مثلاً کوئی غلام خریدے اور غلام مشتری کے پاس آنے کے بعد مسلمان ہو جائے، لیکن مشتری کو اس میں کوئی عیب نظر آئے اور وہ بائع کو لوٹا دے۔

۵۔ وہ کسی مسلمان سے کہے: اپنا غلام میری طرف سے آزاد کر دو۔ اس صورت میں مسلمان غلام کافر کی ملکیت میں داخل ہوتا ہے، پھر اس کو آزادی ملتی ہے۔ اس صورت میں مسلمان غلام چند لمحات کے لیے کافر کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

۶۔ کافر کسی ایسے شخص کو خریدے جو خریدتے ہی آزاد ہو جاتا ہے: اس کی صورت یہ ہے کہ کافر اپنے اصول مثلاً باپ یا ماں، یا اپنے فروع مثلاً بیٹا یا بیٹی میں سے کسی کو خریدے، ان میں سے کسی کو خریدتے ہی وہ آزاد ہو جاتا ہے، اس صورت میں باپ جو غلام تھا کافر کے پاس تھا، پھر اس کے بیٹے نے اس کو خریدا تو وہ کافر کی ملکیت میں چند لمحات کے لیے داخل ہوتا ہے۔

صلح

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۲۳۶، ''التھذیب'' بغوی ۴/۱۴۱، ''مغنی المحتاج'' ۳/۱۷۵)

صلح کے لغوی معنی دشمنی دور کرنے کے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں صلح ایک ایسا عقد ہے جس کے ذریعہ دشمنی دور ہوتی ہے۔

چونکہ صلح بہت سے معاملات میں ہوتی ہے، اس لیے اس کو سید الاحکام کہا جاتا ہے۔

صلح کی دلیل میں بہت سی آیتیں ہیں، مثلاً میاں بیوی کے درمیان صلح کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ'' (النساء ۱۲۸) (اور صلح بہتر ہے) لوگوں کے درمیان صلح کے سلسلہ میں اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ'' (البقرۃ ۲۲۴) (اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان اصلاح کرو)۔ دو آپس میں جھگڑنے والی جماعتوں کے درمیان صلح کے تعلق سے خالق کا فرمان ہے: ''فَأَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا'' (الحجرات ۹) (تو ان دونوں کے درمیان اصلاح کرو) مسلمانوں اور دشمنان اسلام کے درمیان صلح کے تعلق سے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وَإِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ'' (الأنفال ۶۱) (اگر وہ امان کے لیے جھک جائیں تو آپ بھی اس (گروہ) کے لیے جھک جایئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے)

فقہاء کرام نے صلح کی ہر قسم کو اس سے متعلق باب میں بیان کیا ہے، اس لیے میاں بیوی کے درمیان صلح کو تقسیم اور نشوز کے باب میں بیان کیا ہے، مسلمانوں اور کافروں کے درمیان صلح کے احکام کو ھدنہ کے باب میں بیان کیا ہے، امام اور باغیوں کے درمیان صلح کو باغیوں کے باب میں بیان کیا ہے۔ ہم یہاں جس صلح کے احکام کو بیان کر رہے ہیں وہ خرید وفروخت اور قرض جیسے معاملات میں صلح سے متعلق ہیں، اس قسم کی صلح کا اصول یہ ہے کہ صلح

سے پہلے کوئی جھگڑا یا نزاع ہوا ہو، اور صلح کرنے والا اپنے فریق کے حق کا اقرار کر رہا ہو، جو ہونے والی صلح میں فریقِ ثانی ہے۔

صلح کی مشروعیت پر دلالت کرنے والی آیتیں ہم نے بیان کی ہیں، احادیث مبارکہ میں بھی اس کے دلائل کثرت سے ملتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال کرے یا حلال کو حرام کرے''۔ (ابوداود: کتاب الاقضیۃ، باب فی الصلح ۳۵۹۴، مسند امام احمد: ۲/۳۶۶، ابن حبان ۵۰۹۱، مستدرک حاکم ۲/۴۹، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

حرام صلح کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان اس شرط پر صلح ہو کہ قرض دار اپنا قرض قرض خواہ کو شراب کی شکل میں دے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ قرض خواہ اور قرض دار اس پر صلح کر لیں کہ قرض دار قرض خواہ کو اپنے قرض کے بدلہ قرض خواہ کو اپنا گھر اس شرط پر دے کہ اس میں قرض خواہ کو تصرف کا حق نہیں ہے۔

اسی طرح صلح کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

صلح کو ہبہ کا حکم ہوتا ہے: جب عین چیز کے بعض حصہ پر صلح کر لے، مثلاً زید عبید کے گھر پر اپنی ملکیت کا دعوی کرے، پھر اس کے بعد کہے: میں نے اس گھر کے آدھے حصہ پر تمہارے ساتھ مصالحت کی۔ اس صورت میں وہ اس آدھے حصہ کو لے گا جس کا اقرار اس نے اپنے فریق کے لیے کیا ہے، اگر صلح کے لیے ہبہ کا لفظ استعمال کرے تو صلح صحیح ہو جاتی ہے، مثلاً کہے: میں نے تمہیں آدھا گھر ہبہ کیا اور باقی پر تمہارے ساتھ صلح کی۔ اگر صلح کا لفظ استعمال کرے تو پہلے جھگڑے کا ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ اگر مطلقاً ہبہ کا لفظ استعمال کرے تو کسی بھی شرط کا وجود نہیں ہے، صیغہ مکمل ہو جائے گا اور قبضہ حاصل ہو جائے گا۔

صلح بیع ہوتی ہے: مثلاً کوئی دعوی کردہ عین کے بدلہ کسی دوسری چیز پر صلح کر لے، مثلاً گھر کی ملکیت کے بارے میں جھگڑے کے بعد دوسرے فریق سے کہے: ''میں نے تم سے میری ملکیت والے گھر پر ایک گاڑی کے بدلے صلح کی جس کی نوعیت فلاں ہے اور

اس کے اوصاف فلاں فلاں ہیں''، اگر دوسرا فریق قبول کر لے تو وہ گھر کا مالک ہو جائے گا اور اس کے عوض میں اپنے فریقِ مخالف کو مذکورہ گاڑی دے گا، اس کو بیع کا حکم ہے، اس میں حلال بیع کے ارکان؛ ایجاب وقبول اور قبضہ پایا جانا ضروری ہے، اور اس میں شفعہ، عیب کی وجہ سے واپس کرنے اور قبضہ سے پہلے تصرف سے روکنے جیسے دوسرے احکام منطبق ہو جائیں گے۔

قرض پر صلح صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے تمہارے ساتھ گھر کے تعلق سے ایک ہزار دینار پر صلح کی جو میرے لیے تمہارے ذمہ میں رہیں گے''۔ یعنی میں یہ مبلغ جب چاہے تم سے لوں گا۔

جب کسی عین چیز یا قرض پر صلح مکمل ہو جائے تو اس کو بیع کا حکم ہے، اور اس پر بیع کے تمام احکام منطبق ہوتے ہیں جیسا کہ ہم نے بتایا کہ حق شفعہ، عیب کی وجہ سے واپس کرنے، خیارِ مجلس، خیار شرط کا حق اور قبضہ سے پہلے تصرف کرنے کا حق نہ ملنا وغیرہ احکام نافذ ہوں گے، اگر جس چیز پر صلح کی جا رہی ہو وہ ربوی ہو یعنی نقدی یا کھانا ہو تو اس میں حلول، قبضہ اور مماثلت بھی شرط ہے۔

صلح کو کرایہ کا حکم ہوتا ہے: دعوی کردہ عین چیز کے تعلق سے کسی منفعت یا اس چیز کی منفعت کو کسی دوسری چیز کی منفعت پر صلح کر لے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے اس گھر کے تعلق سے تمہارے ساتھ دوسرے گھر کی متعین مدت تک منفعت پر صلح کی''۔ اگر دونوں اس بات پر صلح کر لیں کہ وہ مختلف فیہ گھر میں ایک مدت رہیں گے تو یہ جائز نہیں ہے، دوسرے گھر کی منفعت کے تعلق سے صلح یہ ہے کہ کوئی کہے: ''میں نے اس گھر کے تعلق سے تمہارے ساتھ صلح کی کہ تم یہاں اس کے عوض ایک متعین مدت رہو گے کہ تم میرے لیے ایک غلام پیش کرو گے''۔ اس صورت میں اس گھر میں مثلاً دس سال رہنا کرایہ ہوگا اور کرایہ ایک غلام ہے۔

صلح بری کرنا ہوتا ہے: کوئی قرض کے ایک حصہ پر صلح کر لے، مثلاً کہے: ''میں نے تم کو دس درہم میں سے پانچ درہم سے بری کر دیا جو تمہارے ذمہ میرے ہیں، اور میں نے باقی پر تم سے صلح کر لی''۔

صلح جعالہ ہوتی ہے: مثلاً کوئی کہے: ''میں نے تم سے میرے ذمہ

تمہارے موجود دس درہم کے تعلق سے صلح کی کہ تم میرے بھاگے ہوئے غلام کو واپس لے آؤ''۔ جب وہ بھاگے ہوئے غلام کو واپس کردے گا اور آقا اپنے غلام کو قبضہ میں لے گا تو اس کا ذمہ قرض سے بری ہوجائے گا جو دس درہم ہیں۔

صلح کبھی خلع ہوتی ہے: مثلاً بیوی اپنے شوہر سے کہے: ''میں نے تمہارے ذمہ معلوم مہر کے تعلق سے تم سے یہ صلح کی کہ تم مجھے ایک طلاق دو''۔ اگر شوہر طلاق دے گا تو مہر سے اس کا ذمہ بری ہوجائے گا۔

صلح کبھی خون کا معاوضہ ہوتی ہے: مثلاً عمرو نے زید کے والد کو قتل کیا، اور زید کے لیے اس پر قصاص کا حق ہے، اور زید ایک گھر کی ملکیت کا دعوی کرے اور عمرو اس حق کا اقرار کرے، پھر زید عمرو سے کہے: ''میں نے تم سے اپنے قصاص کے حق کے تعلق سے اس گھر پر صلح کی''۔ پھر عمرو گھر زید کے حوالے کردے تو زید کے قصاص کا حق ساقط ہوجائے گا۔

صلح کبھی فدیہ ہوتی ہے: مثلاً کوئی مسلمان کسی حربی کافر کے ہاتھ قید ہوجائے، اور کافر حربی اس کو شہر لے آئے، اور اس کی ملاقات زید سے ہوجائے جس کا دارالحرب میں ایک گھر ہے، زید اس حربی سے کہے: ''میں نے گھر کے تعلق سے تم سے صلح کی اور میں نے قیدی لیا''۔ اس طرح زید قیدی کا فدیہ دینے والا ہوجائے گا اور دارالحرب میں موجود اپنے گھر سے قید سے مسلمان کو آزاد کرنے کے لیے دستبردار ہوجائے گا۔

صلح عاریت ہوتی ہے: مثلاً زید عمرو سے کہے: ''میں نے دعوی کردہ گھر سے متعلق تم سے اس بات پر صلح کی کہ تم وہاں ایک سال کی مدت رہو''۔ یہ ایسی صلح ہے جس کو گھر میں ایک سال رہنے کے لیے عاریت پر دینے کا حکم ہے، جس کو ایک سال کی مدت گزرنے کے بعد مالک کے حوالہ کیا جائے گا۔

صلح فسخ ہوتی ہے: مثلاً ایک ہزار کلو گیہوں ایک ہزار درہم کے عوض پہلے ہی خرید لے، پھر گیہوں کے بدلہ اپنے درہم کو واپس لینے پر صلح کرلے، یہ صلح ایسی ہے جس کو بیعِ سلم فسخ کرنے کا حکم ہے۔

ہم نے یہ بات کہی ہے کہ صلح میں اس سے پہلے جھگڑا ہونا شرط ہے، اور اپنے ذمہ میں اس کے حق کا اقرار کرنا بھی شرط ہے، اگر اقرار نہ ہو تو صلح کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

حوالہ

حوالہ کے لغوی معنی ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا ہے، مثلاً قیمت کبھی بڑھتی ہے اور کبھی گھٹتی ہے۔

شریعت میں حوالہ ایک عقد ہے جس میں قرض ایک کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ (خطیب شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں ۳/۱۹۹ یہی تعریف کی ہے، مکمل تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۲۳۶، ''روضۃ الطالبین'' ۳/۵۱۵)

اس کی مشروعیت کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، جب تم میں سے کسی کو مالدار کے پیچھے لگایا جائے تو وہ پیچھے رہے''۔ (بخاری: کتاب الحوالات، باب الحوالۃ ۲۱۸۸، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب تحریم مطل الغنی ۳۰۰۸) بیہقی کی روایت میں ہے: ''جب تم میں سے کسی کو مالدار کے حوالہ کیا جائے تو وہ حوالہ قبول کرے''۔ (السنن الکبری بیہقی: کتاب الحوالۃ، باب من اُحیل علی ملیی فلیتبع ولا یرجع علی المحیل ۱۰۶۴۸)

حدیث میں حوالہ کو قبول کرنے کا حکم مسنون ہے جب مالدار، وفادار اور شبہ سے خالی شخص کے حوالہ کیا جائے۔ حوالہ کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

حوالہ میں دو قرض دار اور قرض خواہ ہوتے ہیں، ایک آدمی ایک قرض دار رہتا ہے اور دوسرے کا قرض خواہ، اس کی مثال یہ ہے کہ زید عمرو کا قرض خواہ ہے، اور عمرو زید کا قرض دار اور بکر کا قرض خواہ، عمرو اپنے اوپر موجود قرض کو زید کے حوالہ کرتا ہے جس کا قرض بکر پر ہے، حوالہ صحیح ہونے کے لیے محیل اور محتال کی رضامندی شرط ہے، اسی طرح حوالہ میں ایجاب وقبول بھی شرط ہے، مثلاً کہے: ''میں نے تم کو فلاں کے حوالہ کیا اس قرض کے لیے جو مجھ پر تمہارا ہے''۔ محتال کی طرف سے حوالہ قبول کرتے ہی محیل کا ذمہ قرض سے بری ہوجاتا

ہے اور قرض محتال علیہ کے ذمہ منتقل ہو جاتا ہے۔

حوالہ کے ارکان

حوالہ کے ارکان چھ ہیں: محیل یعنی حوالہ کرنے والا؛ یہ وہ شخص ہے جو حوالہ کا عمل کرتا ہے۔
محتال: یہ حوالہ پر قبضہ کرنے والا ہے۔ ان دونوں کی رضامندی حوالہ کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے، اور تیسرا فریق محال علیہ ہے یعنی وہ جس پر حوالہ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے، حوالہ صحیح ہونے کے لیے اس کی رضامندی شرط نہیں ہے، اسی طرح دو قرض اور ایجاب وقبول کا پایا شرط ہے۔

حوالہ کے لفظ سے ایجاب ضروری نہیں ہے، بلکہ اس پر دلالت کرنے والے کسی بھی لفظ سے حوالہ صحیح ہو جاتا ہے، مثلاً کہے: میں نے تمہارا حق فلاں کی طرف منتقل کیا۔

حوالہ اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب محال علیہ قرض دار ہو اور محیل قرض خواہ ہو، ورنہ حوالہ باطل ہے، اسی طرح مطالبات قرض دار، قرض خواہ اور محال علیہ کے لیے متعین اور معلوم ہونا بھی ضروری ہے، مقدار، اوصاف اور نوعیت میں بھی یکساں ہونا ضروری ہے، ان کی مدت متعین یا غیر متعین ہونا ضروری ہے، حوالہ مطلوبہ قرض سے کم ہو تو صحیح ہے، حوالہ کو پورا کرنے کی ضمانت کے لیے رہن اور کفیل کا مطالبہ صحیح ہے، کیوں کہ حوالہ قرض کی بیع قرض کے عوض ہے، اور اس کو لوگوں کی ضرورت کی خاطر مشروع کیا گیا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

وصیت

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''اللباب'' محاملی ۱/۲۳۷، ''التھذیب'' بغوی ۶۲/۵، ''مغنی المحتاج'' ۴/۶۷۱، ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۲/۱۳)

وصیت کے لغوی معنی پہنچانے کے ہیں، یہ ''وصل الشیئ بالشیئ'' سے مشتق ہے، کیوں کہ وصیت کرنے والا اپنی دنیا کی بھلائی کو اپنی آخرت سے ملاتا ہے۔

شریعت میں وصیت سے مراد اپنی موت کے بعد حقوق میں سے کسی حق کو دوسرے کو دینے کے ہیں۔

وصیت ایک تہائی مال میں جائز ہے، البتہ عتق اور آزادی کا باب مستقل آرہا ہے، مال میں وصیت اور غلام کو آزاد کرنے میں وصیت کے درمیان فرق ہے، کیوں کہ وصیت سے لفظاً رجوع کرنا جائز ہے، البتہ آزاد کرنے میں وصیت سے رجوع کرنا لفظ کے ذریعہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کو بیچنا یا دوسرے طریقہ سے اس میں تصرف کرنا صحیح ہے، اس کے برخلاف مال کی وصیت میں لفظاً بھی رجوع جائز ہے اور تصرف کے ذریعہ بھی۔

وصیت کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ'' (النساء۱۱) وصیت کے بعد جس کی وصیت کی گئی ہو یا قرض کے بعد۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت اسی وقت تقسیم کی جائے گی جب مرنے والے کی وصیت پوری کی جائے اور اس کا قرض ادا کر دیا جائے؛ سب سے پہلے میراث میں سے قرض ادا کیا جائے گا، پھر ایک تہائی میں وصیت پوری کی جائے گی، پھر شریعت اسلامی کے اصول وضوابط کے مطابق میراث تقسیم کی جائے گی۔

وصیت کا تذکرہ قرض والی آیت میں گزر چکا ہے، جس میں اس کی اہمیت کی طرف

اوراس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی شخص کو وصیت کے بغیر نہیں مرنا چاہیے، امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی مسلمان شخص کے پاس کوئی چیز جس کے بارے میں وصیت کرنی ہو تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ دو راتیں ایسی گزاریں جس میں اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی نہ ہو''۔ (بخاری: کتاب الوصایا، باب الوصایا وقول النبی ﷺ: وصیۃ الرجل مکتوبۃ عندہ ۲۶۰۶، مسلم: کتاب الوصیۃ ۳۱۵۹) اسی بنیاد پر وصیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے: جو وصیت نہ کرے تو عالمِ برزخ میں بول نہیں سکے گا۔ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ وصیت مریض کو شفا دینے والے وسائل میں سے ہے۔

اگر آدمی قرض دار ہو یا اس کے پاس دوسروں کی امانتیں ہوں تو اس پر وصیت کرنا واجب ہے، اگر اس پر موجود قرض یا اس کے پاس موجود امانتوں کے بارے میں لوگوں کو معلوم نہ ہو تو اس پر ضروری ہے کہ اپنی وصیت میں اپنے اوپر ضروری قرض اور اپنے پاس موجود دوسروں کے مال کا تذکرہ کرے، اور اپنے ذمہ میں موجود امانتوں کا تذکرہ امانت رکھنے والوں اور قرض خواہوں کے نام کے ساتھ تحریر کرے، اسی طرح اپنی امانتیں جس کے پاس رکھی ہوئی ہوں اور جن پر اس کا قرض ہے ناموں کے ساتھ تحریر کرے۔

وصیت سنت ہے اگر آدمی قرض دار نہ ہو، اور اس کے ذمہ قرض یا امانتیں نہ ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی وصیت میں اس کا تذکرہ کرے، اگر اس کے چھوٹے بچے ہوں اور زیادہ مال نہ ہو تو اپنی چیز میں کوئی وصیت نہ کرے، تا کہ اس کی اولاد اس کے مال سے فائدہ اٹھائے، اگر اس پر قرض یا امانتیں نہ ہوں اور اس کے بچے بھی ہوں تو اپنے ایک تہائی مال کی وصیت نیک کاموں کے لیے کرے جن کی لوگوں اور عوام کو ضرورت پڑتی ہے، مثلاً مدارس، ہسپتال، قرآن کریم کی تعلیم دینے کے مکاتب، مسجدوں کی تعمیر اور دیگر رفاہی کاموں کے لیے وصیت کرے۔

ایک تہائی سے زیادہ مال میں وصیت مکروہ ہے۔ (کیوں کہ یہ صحیح روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا جب انھوں نے اپنے دو تہائی مال کی وصیت کرنی چاہی اور ان کی وارث سوائے ایک بیٹی کے کوئی نہیں تھی: ''ایک تہائی اور ایک تہائی بہت ہے''۔ بخاری: کتاب الجنائز، باب رثاء النبی ﷺ سعد ۱۲۹۵، مسلم: کتاب الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث ۱۶۲۸) اگر وارث کی اجازت کے بغیر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی جائے تو وصیت نافذ نہیں کی جائے گی۔

وصیت حرام ہے جب وارثین میں سے کسی کو محروم کرنے کے مقصد سے ظلماً کیا جائے، مثلاً وہ کسی شخص کے لیے قرض کا اقرار کرے حالانکہ وہ اس کا قرض دار نہ ہو، اسی بنیاد پر ایک تہائی یا اس سے کم میں وصیت مستحب ہے اور وصیت غیر وارث کے لیے ہوتی ہے۔

وصیت کے ارکان:

وصیت کے ارکان چار ہیں: (دیکھا جائے: ''فتح الوهاب'' شیخ الاسلام زکریا ۲/۱۳)

۱۔ مُوصی یعنی وصیت کرنے والا: اس کے لیے شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل، آزاد اور تصرف کا اہل ہو، اور اس کو مجبور نہ کیا گیا ہو۔

۲۔ موصی لہ یعنی جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو: اس کے لیے شرط ہے کہ کسی گناہ میں وصیت نہ ہو۔ (دیکھا جائے: کفایۃ الأخیار ۲/۴۳)

۳۔ موصی بہ یعنی جس کے سلسلہ میں وصیت کی جائے، اس کے لیے شرط ہے کہ وہ حلال اور حوالگی کے قابل ہو۔

۴۔ وصیت کا صیغہ: اس میں شرط یہ ہے کہ وصیت کے معنی پر دلالت کرنے والا لفظ ہو، صریح وصیت یہ ہے کہ کہے: ''میں اپنے مال کے ایک تہائی کی وصیت میری وفات کے بعد اعمالِ خیر کے لیے کرتا ہوں جس میں نفع عام ہو''۔ یا کہے: ''میں وصیت کرتا ہوں کہ تم زید کو میرے بعد ایک ہزار درہم دو''۔ موصی لہ کی طرف ملکیت اسی وقت منتقل ہو گی جب موصی کی وفات کے بعد موصلی لہ اس پر راضی ہو جائے۔

وصیت میں عبارت متعین ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ عبارت ''میں اپنے پاس موجود نقد میں سے ایک تہائی کی وصیت کرتا ہوں''۔ اس عبارت سے مختلف ہے: ''اپنی ملکیت کے ایک تہائی کی

وصیت کرتا ہوں''۔ دوسری عبارت میں اس کی کل میراث شامل ہے یعنی نقدی، مال، جائیداد اور منقولہ مال، تا کہ موصی اپنی وفات کے بعد اپنے ورثاء کے لیے تکلیفات کا سبب نہ بنے۔

جس مال کے سلسلہ میں وصیت کی جاتی ہے وہ وقف ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی ملکیت میت سے چھینی جاتی ہے جو اب کسی چیز کا مالک نہیں ہے، وارثین کو میت کے مال میں حق ملتا ہے جب قرض اور وصیت پوری کی جاتی ہے، موصی لہ کے پاس ملکیت اسی وقت منتقل ہوتی ہے جب وہ وصیت کو قبول کرے، البتہ عمومی نفع اور مصالح عامہ کے لیے کی جانے والی وصیت میں قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک تہائی کے حدود میں کی گئی وصیت کو الگ کرنا ہی کافی ہے، اور وصیت اس کی راہوں میں صرف کرنا ضروری ہے۔

وصیت صحیح ہونے کی شرطیں:

وصیت صحیح ہونے کے لیے شرط ہے کہ کسی معصیت میں نہ ہو، اگر وصیت کسی معصیت میں ہو تو وہ باطل ہے، یہ بھی شرط ہے کہ اس کے لیے کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو مثلاً کوئی ایسی چیز کی وصیت کرے جو اس کی ملکیت میں نہیں ہے۔

وصیت کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے کہ موصی لہ موجود ہو۔ (دیکھا جائے: ''الحاوی'' ماوردی ۸/۵۲۰، ''روضۃ الطالبین'' ۶/۱۵۵، ''کفایۃ الأخیار'' ۲/۴۳) یا اس کے لیے وصیت کی جائے جو موصی کے انتقال کے بعد چھ مہینوں سے کم مدت میں اس کی بیوی سے پیدا ہو، جو موصی کی وفات کے چھ مہینوں بعد پیدا ہو تو اس کے لیے وصیت صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ احتمال ہے کہ وصیت کے بعد پیدا ہوا ہو اگر عورت شوہر کا بستر ہو یا آقا کا بستر ہو، اگر موصی کی وفات کے چار سالوں کے بعد پیدا ہو تو اس کی وصیت صحیح نہیں ہے، یہ بات معلوم ہے کہ شرعی حمل سے جنین مادر رحم میں چار سالوں تک باقی رہنا ممکن ہے پھر اس کے بعد پیدائش ہوتی ہے۔

مستقبل میں پیدا ہونے والی چیز کی وصیت کرنا صحیح ہے مثلاً! کوئی مستقبل میں ہونے والے باغ کے پھلوں کی وصیت کرے۔

اپنی اولاد میں سے کسی کا قرض معاف کرنے کی وصیت کرنا صحیح ہے، البتہ شرط یہ

ہے کہ مطلق تصرف کرنے والے باقی ورثہ اس پر راضی ہوں۔

ہر وارث کو وراثت میں اس کے حصے کے بقدر وصیت کرنا صحیح ہے۔

کسی گھر میں وارثین میں سے ہر ایک کے لیے وصیت کرے تو صحیح ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ گھر ترکہ میں اس کے حصہ کے بقدر ہو۔

اپنے ایک تہائی مال کی وصیت اس طور پر صحیح ہے کہ اس کو تمام ورثہ پر تقسیم کیا جائے جوان میں سے ہر ایک کو وراثت کے حصے کے بقدر ملے، وہ اس وصیت کو باطل نہیں کر سکتے ہیں۔

جس کا قرض اس کی ملکیت کے برابر ہو تو وہ اس بنیاد پر وصیت کر سکتا ہے کہ کوئی ایک قرض خواہ اس کا قرض معاف کر دے، یا یہ احتمال ہے کہ کوئی اس کے قرض کو اپنی طرف سے ادا کرے، اگر کوئی قرض خواہ معاف نہ کرے اور کوئی بھی اس کا قرض ادا نہ کرے تو اس کی وصیت وفات کے بعد باطل ہو جائے گی، اور قرض خواہ اس کے ترکہ میں سے اپنا قرض لیں گے۔

وفات کے فوراً بعد وصیت نافذ کرنا ضروری ہے جب کہ وارثین کی اجازت لینے کی ضرورت نہ ہو یعنی جب ایک تہائی کے اندر ہو، سب سے پہلے ام ولد کو آزاد کیا جائے گا، اور اس کی قیمت ترکہ سے کم کی جائے گی، ام ولد وہ باندی ہے جس کو اپنے آقا سے بچہ ہوا ہو، اسی طرح اس غلام کو آزاد کیا جائے گا جس کی آزادی آقا کی موت یا کسی شرط پر معلق ہو، مثلاً کوئی کہے: ''اگر میرا بیٹا کامیاب ہو گیا اور وہ اپنے سفر سے واپس آ گیا تو تم آزاد ہو''۔ بیٹا جب اپنی کامیابی کے بعد واپس لوٹ آئے تو باپ مرض الموت میں ہو پھر اس کی وفات ہو جائے تو یہ غلام آزاد ہو جائے گا، چاہے اس کے پاس اس غلام کے علاوہ کوئی بھی ملکیت کی چیز نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

ایصاء

ایصاء کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اپنے قرض کی ادائیگی، اپنی وصیت نافذ کرنے اور اپنی موت کے بعد اپنے بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کا ذمہ دیا جائے۔ (دیکھا جائے: ''اُسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۳/ ۶۷)

ایصاء سنت ہے، کبھی ایصاء واجب ہوتا ہے۔ (مثلاً مظالم کو واپس کرنے اور ایسے حقوق کی ادائیگی میں جن کی ادائیگی سے فی الحال عاجز ہو، دیکھا جائے: ''اُسنی المطالب'' ۳/ ۶۷) جب کوئی مومن بچوں پر وصی بننے کے لیے کفو شخص پایا جائے، اسی طرح جب اس کو اندیشہ ہو کہ اگر اس نے وصی نہیں بنایا تو چھوٹے بچوں کے مال پر کوئی خائن مسلط ہو جائے گا اور اس کو ضائع کر دے گا یا چھین لے گا۔

قرض کی ادائیگی، وصیت کو نافذ کرنے اور بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے وصی بنانا مسنون ہے، موصی وصی سے یہ کہے تو صحیح ہے: ''تم میرے وصی ہو یہاں تک کہ میرا بیٹا بڑا ہو جائے، جب میرا بیٹا عقل مند ہو جائے تو وہ خود اپنا وصی ہے''۔

وصی میں مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: (دیکھا جائے: ''کفایۃ الأخیار'' ۲/ ۴۹، ''فتح الوهاب'' ۲/ ۲۰)

وصی کے لیے شرط ہے کہ مرنے والے نے اپنی وفات سے پہلے اس کو وصی بنایا ہو، اور اس کے لیے بالغ، عاقل اور آزاد ہونا شرط ہے، اس لیے بیوقوف کو وصی نہیں بنایا جائے گا اور نہ غلام کو، اس کے لیے عادل ہونا اور متقی ہونا ضروری ہے، کیوں کہ فاسق کو ذمہ داری نہیں دی جاتی، اسی طرح وصی کو جو ذمہ داری دی گئی ہے اس کی اہلیت اور صلاحیت پایا جانا شرط ہے، مسلمان ہونا بھی شرط ہے، کیوں کہ کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے، ذمی پر ذمی کی وصیت صحیح ہے، اگر کوئی اندھا ہے تو باقی مذکورہ شرطوں کی موجودگی میں اس کو وصی بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے،

کیوں کہ وہ ایسے امور میں دوسروں کو وکیل بنا سکتا ہے جن کو وہ خود انجام نہیں دے سکتا ہے۔

مرد ہونا شرط نہیں ہے، کیوں کہ ماں اپنے بچوں کی وصی بننے کی زیادہ حق دار ہے، جب اس میں تمام شرطیں پائی جائیں یعنی وہ بالغ ہو، عاقل ہو، آزاد ہو، مسلمان ہو اور باصلاحیت ہو۔

وصی فاسق ہو جائے تو اس کو معزول کیا جائے گا جس طرح قاضی کو فسق کی وجہ سے معزول کیا جاتا ہے، کہا گیا ہے کہ صرف ایک ہی شخص ایسا ہے جس کو فسق کی وجہ سے معزول نہیں کیا جائے گا، وہ خلیفہ ہے، البتہ اکثر علماء نے کہا ہے کہ خلیفہ کو بھی فسق کی وجہ سے معزول کیا جائے گا۔ (شیخ الاسلام زکریا انصاری نے کہا ہے: فسق کی وجہ سے خلیفہ معزول نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کے معزول ہونے کی صورت میں فتنوں کے پیدا ہونے اور حالات کے بگڑنے کا خطرہ ہے، اور اس کی ولایت سے کلی مصالح اور مفادات وابستہ ہیں، البتہ امنِ فتنہ ہو تو اس کو تبدیل کر دیا جائے گا۔ ''اُسنی المطالب'' ۳/ ۶۸)

قرضوں کی ادائیگی اور حقوق کو حق داروں کے پاس واپس کرنے کے لیے اور وصیت نافذ کرنے کے لیے ہر آزاد بالغ عاقل اور مختار شخص کو وصی مقرر کرنا صحیح ہے۔

بچوں کا وصی بنانے کے لیے سابقہ شرطوں کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کو بچوں پر ولایت حاصل ہو یعنی جو وصی مقرر کرے وہ بچوں کا ولی ہو، مثلاً باپ دادا، ماں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچوں پر کسی کو وصی بنائے، اسی طرح باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے قریبی رشتے داروں کو یہ حق نہیں ہے کہ بچوں پر وصی مقرر کریں۔

جس کو باپ یا دادا بچوں کا وصی بنائے تو وہ کسی دوسرے کو وصی نہیں بنا سکتا ہے، البتہ باپ اور دادا اس کی اجازت دے تو بنا سکتا ہے، بچے کے بالغ ہونے کے وقت وصی مقرر کرنا صحیح ہے، جب بچہ بالغ ہو جائے گا تو وصی معزول ہو جائے گا۔

متعین مدت کے لیے وصی مقرر کرنا صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: ''تم زید کے آنے تک وصی ہو''۔ جب زید پہنچ جائے تو وصی معزول ہو جائے گا اور زید وصی بن جائے گا، دادا کی موجودگی میں کسی دوسرے کو وصی بنانا صحیح نہیں ہے جب دادا میں باقی تمام شرطیں پائی جائیں۔

بچہ یا بچی کی شادی کے لیے وصی مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، نکاح کے باب میں آئے گا

کہ بیوقوف اپنے ولی کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتا ہے۔

اگر کوئی بیوقوف بچہ کا وصی ہے تو اس کو ولی کا اختیار حاصل ہے کہ جب بیوقوف بچہ بڑا ہو جائے تو اس پر ضروری ہے کہ ولی کی غیر موجودگی میں وصی کی اجازت لے، سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو بے فائدہ چیزوں میں اپنا مال خرچ کرتا ہو، اگر اس کو مال پر اختیار دیا جائے تو مال کو ضائع کردے گا۔

ایصاء کے الفاظ یعنی صیغہ یہ ہے: ”میں نے تم کو قرضوں پر وصی بنادیا“۔ یا کہے: ”میں نے تم کو اولاد کا وصی بنادیا“۔ دوسرے کسی بھی لفظ سے ایصاء صحیح ہے، مثلاً کہے: ”میں نے تم کو میری وفات کے بعد اپنے قرضوں کی ادائیگی کی ذمہ داری دی“۔ یا کہے: ”میں نے تم کو اپنی موت کے بعد اپنے قرضوں کی ادائیگی کا قائم مقام بنایا“۔ اگر کوئی ایصاء کا لفظ استعمال نہ کرے تو میری موت کے بعد کہنا واجب ہے۔

ایصاء میں موقت کرنا جائز ہے، مثلاً کہے: میں نے تم کو میری اولاد کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک سال وصی بنایا۔

ایصاء میں معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً کہے: ”جب میں مرجاؤں تو میں نے تم کو اپنا وصی بنایا“۔ یا کہے: ”جب میرا وصی مرجائے تو تم میری اولاد کی دیکھ ریکھ کے لیے وصی ہو“۔

جس چیز کے سلسلہ میں وصی بنایا جارہا ہے اس کو بیان کرنا شرط ہے، مثلاً کہے: ”میں نے تم کو اپنے قرض کی ادائیگی کا وصی بنایا“۔ یا کہے: ”میں نے اپنے بچوں کے معاملات میں تصرف کے لیے تم کو وصی بنایا“۔ یا کہے: ”میری امانتوں کو لوٹانے کا وصی بنایا“۔ اس صورت میں جن جن کی امانتیں ہیں ان کے نام ذکر کیے جائیں، اگر موصی اس بات کی وضاحت نہ کرے کہ کس معاملہ میں وصی بنارہا ہے تو یہ ایصاء باطل ہے، مثلاً کہے: ”میں نے تم کو وصی بنایا“۔ اس کو لغو مانا جائے گا۔

ایصاء کے صحیح ہونے کے لیے موصی لہ کا قبول کرنا شرط ہے، چاہے الفاظ کے ذریعہ قبول کرے یا عمل کے ذریعہ، موصی کی زندگی میں قبول کرنے یا انکار کرنے کا اعتبار نہیں

ہے، کیوں کہ موصی لہ کی طرف سے قبول کرنا وصی کی موت کے بعد شرط ہے۔

جب موصی دو کو وصی بنائے تو ان میں سے ایک کا تصرف شمار نہیں ہوگا، مگر یہ کہ موصی ان دونوں کے سلسلہ میں اس کی صراحت کی ہو کہ کسی ایک کا تصرف جائز ہے۔

موصی اور وصی دونوں میں سے جو چاہے اس عقد کو فسخ کرسکتا ہے۔ اگر وصی کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نہ ہو یا جب وہ خود کو معزول کردے تو یتیموں کا مال کسی ظالم کی طرف سے لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوجانے کا اندیشہ ہو تو وصی کے لیے خود کو معزول کرنا جائز نہیں ہے۔

جب بچہ بالغ ہوجائے اور وہ وصی سے اپنے اوپر خرچ کرنے کے سلسلہ میں جھگڑا کرے تو وصی کی بات سچ مانی جائے گی جب اس میں تقوی اور کفو ہونے کی تمام شرطیں پائی جائیں گی، البتہ وصی قسم کھائے گا کہ اس نے بچہ کے بالغ ہونے سے پہلے اس پر خرچ کرنے کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اگر وصی میں تمام شرطیں نہ پائی جائیں تو بچہ کی بات سچ مانی جائے گی اور اس پر قسم کھانا ضروری ہے کہ وصی نے وصایت کی ذمہ داری ویسے ادا نہیں کی جیسے کرنی چاہیے تھی۔

جب بچہ سنِ رشد کو پہنچ جائے اور کہے: اس نے اپنا مال وصی سے حاصل نہیں کیا ہے تو اس کی بات سچ مانی جائے گی، البتہ اس پر قسم کھانا ضروری ہے؛ کیوں کہ بالغ ہونے کی صورت میں وہ گواہی کا اہل بن جاتا ہے۔

اگر وصی کہے: اس نے مال کی زکوۃ نکالی ہے۔ اور بچہ انکار کردے تو بچے کی بات قسم لے کر سچ مانی جائے گی، یہ ضروری ہے کہ وصی قاضی کے سامنے وصایت کی مدت کے دوران بچوں پر کیے گئے اخراجات کی تفصیلات پیش کرے، اسی طرح موصی کے قرضوں کی ادائیگی اور موصی کی وصیت کو نافذ کردہ امور کی تفصیلات بھی پیش کرے۔

☆☆☆☆☆

مساقاۃ اور مزارعہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۴/ ۱۳۵، ''کفایۃ الأخیار'' تقی حصنی ۱/ ۴۲۵، ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۱/ ۲۴۴)

مساقاۃ ''سقی'' سے ماخوذ ہے جس کی انسان کو عام طور پر ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ یہ اس کے اعمال میں سب سے زیادہ نفع بخش اور سب سے زیادہ خرچ ہونے والا عمل ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں مساقات ایک عقد ہے جو درخت کا مالک ایک مزدور سے کرتا ہے کہ وہ درختوں کی سینچائی اور دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اس شرط پر لے کہ نکلنے والا پھل دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اس باب میں مساقات اور مزارعہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں جو زمین و باغات کے مالکوں اور کھیتی باڑی اور پھلوں کی دیکھ ریکھ کرنے والوں کے درمیان عقد ہوتا ہے، جو سینچائی، کھیتی باڑی، انگور اور کھجور کے درختوں کی دیکھ ریکھ کا کام کرتے ہیں جس سے باغات کی اصلاح اور درستگی ہوتی ہے، یہ عقد زمین کی پیداوار اور باغات سے حاصل ہونے والے پھلوں میں متفقہ حصہ پر ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت نے مساقات اور مزارعت کی اجازت دی ہے، تاکہ مزدور پانی سے سینچائی کرے، انگور اور کھجور کے درختوں میں تلقیح کرے، کیاریوں کو صاف ستھرا رکھے اور ہر اس بات کا خیال رکھے جس سے درخت اور کھیت درست رہتے ہوں، اس کے عوض میں مزدور کو کھیت یا باغ میں ہونے والی پیداوار کا آدھا حصہ ملتا ہے، شرط یہ ہے کہ باغ یا زمین کا مالک بیج دے تاکہ عامل اس کو بوئے اور اس کی سینچائی کرے۔

مساقات اور مزارعہ کے مشروع ہونے کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے

جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے، جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کے ساتھ وہاں پیدا ہونے والے پھل یا غلہ کے آدھے حصہ پر معاملہ کیا۔

(بخاری: کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ ۲۲۲۴، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب المساقاۃ ۲۹۷۹)

مساقات اور مزارعہ کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

مساقات کے ارکان: (''أسنی المطالب'' ۲/ ۲۹۳)

مساقات کے ارکان چھ ہیں: مالک، عامل یعنی مزدور، پھل، عمل، صیغہ یعنی ایجاب وقبول، اور اتفاق کا موضوع یعنی کھیت یا باغ۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس کھجور، انگور اور دوسرے درختوں کا باغ ہو، اور وہ خود سے اس پر توجہ نہ دے سکتا ہو، اور ان کاموں کی انجام دہی کے لیے اسے کسی عامل کی ضرورت ہو، اس وقت دوسرا ایسا شخص ہو جس کے پاس زراعت کے لیے کھیتی نہ ہو اور وہ کسی باغ کا مالک نہ ہو کہ اس کی دیکھ ریکھ کرے، اور اس کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے پھلوں اور غلوں کی ضرورت ہو، اور وہ یہ تمام کام کرسکتا ہو، اسلام نے ان دونوں کی بھلائی کے لیے عقدِ مساقات کو مشروع کیا ہے۔

مساقات میں شرط یہ ہے کہ مالک اور عامل دونوں نخلستان، انگور اور درختوں کے پھل میں شریک ہوں، اور ہر ایک کو اپنا حصہ معلوم ہو، درخت متعین ہوں اور دونوں نے ان کو دیکھا ہو، اور اس عقد کی مدت کے دوران پھل لگتے ہوں، اور عامل کے لیے ایسے کسی کام کی شرط نہ رکھی جائے جو اس کی شان کے خلاف ہو، مثلاً اس سے کنواں کھودنے یا کھیت کے اطراف میں باڑھ لگانے کا مطالبہ کیا جائے، اس عامل کا کام صرف سینچائی کرنا اور زراعت کے دوسرے کاموں کی ادائیگی ہو، جن امور کے سلسلہ میں عقد میں اتفاق نہیں ہوا ہے ان میں اعتبار اس میدان کے عرفِ عام کا ہوگا، کھجور اور انگور کے درختوں کے علاوہ دوسرے درختوں میں مساقات جائز نہیں ہے، البتہ دوسرے درخت ان دونوں کے تابع ہو تو جائز ہے، اسی طرح مزارعہ بھی اگر ان دونوں کے تابع ہو تو جائز ہے۔ (امام نووی نے تمام پھل دینے

والے درختوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے، یہ امام شافعی کا قولِ قدیم ہے، سبکی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اگر عمل
اور جگہ کی ضرورت ہو، شیخ الاسلام زکریا نے یہ بات ''اُسنی المطالب'' میں تحریر کی ہے۔۲/۳۹۳)

اگر کھجور اور انگور کے درختوں کے سلسلہ میں عقد ہو جائے تو ان کے ساتھ باغ میں موجود دوسرے تمام پھل دار درخت بھی شامل ہوں گے، اگر انگور اور کھجور کے باغ کے تابع زمین پر مزارعت ہو رہی ہو تو ہر قسم کی سبزی کی کھیتی جائز ہے۔

مساقات اور مزارعہ دوسرے عقود کے مقابلہ میں چار چیزوں میں مختلف ہیں:

۱۔خرص میں یعنی اندازہ لگانا: کھجور اور انگور کے پختہ ہونا شروع ہوتے ہی باغ سے حاصل ہونے والی پیداوار کا اندازہ لگایا جاتا ہے، تا کہ اس سے حاصل ہونے والے کھجور اور انگور کی مقدار کو معلوم کیا جائے، مالک اس کی زکوۃ نکالے گا، اندازہ لگائے جانے سے پہلے اس میں کسی بھی طرح کا تصرف جائز نہیں ہے۔

۲۔اس میں زکوۃ واجب ہوتی ہے: کھجور اور انگور میں اس وقت زکوۃ واجب ہوتی ہے جب اندازہ لگائی ہوئی مقدار زکوۃ کے نصاب کو پہنچ جائے۔

۳۔ان پھلوں میں بیعِ عرایا جائز ہے، جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

۴۔کھجور کے درخت میں انگور کے مقابلہ میں ایک کام زیادہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ کھجور کے درختوں میں تلقیح کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح کھجور بیع میں نخلستان کے تابع نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کی تلقیح نہ کی گئی ہو۔

مزارعہ:

مزارعہ یہ ہے کہ زمین کا مالک کسان سے یہ عقد کرے کہ اس میں سے نکلنے والے معلوم اور متعین حصہ پر وہ اس زمین پر سینچائی کرے گا، بیج مالک کی طرف سے ہونی چاہیے، عامل کو کام اور بیج کی فراہمی دونوں کا مکلّف بنانا حرام ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری: کتاب المساقاۃ، باب الرجل یکون لہ ممر أو شرب فی حائط أو نخل ۴/ ۲۲۷، مسلم: کتاب البیوع، باب النھی عن المحاقلۃ والمزابنۃ ۲۹۳۹، الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ، محاقلہ اور

مزابنہ سے منع فرمایا.................) مزارعہ کو مخابرہ بھی کہا جاتا ہے۔ (مزارعہ کے احکام کے سلسلہ میں امام بدرالدین بن جماعہ الشافعی نے ایک بہترین رسالہ تحریر کیا ہے، جس کا نام ''تنقیح المناظرۃ فی تصحیح المخابرۃ''، یہ کتاب مطبوع ہے، اور امام تقی الدین سبکی نے اپنے فتاوی میں اس پر مفصل بحث کی ہے ۱/ ۳۹۹۔۴۳۸)

اگر اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ عامل مالک کی طرف سے زمین لے گا اور وہی بیج بھی لائے گا اور کام بھی کرے گا تو پوری پیداوار عامل کی ہوگی، اور عامل پر ضروری ہوگا کہ وہ زمین والے کو اس زمین کا کرایہ ادا کرے، اس میں اجرتِ مثل کا اعتبار ہوگا اور جتنے مہینے کھیتی میں لگے ہیں اس کا حساب کیا جائے گا۔

اگر مزارعہ پر اس بنیاد پر اتفاق ہو جائے کہ مالک زمین اور بیج دے گا اور عامل صرف کام کرے گا، اور مزارعہ مساقات کے عقد کے ساتھ نہ ہو تو پوری پیداوار مالک کی ہوگی، اور عامل زمین کے مالک سے اپنے کام کی اجرت لے گا، اور اس کو اجرتِ مثل دی جائے گی۔

اگر کھجور اور انگور کے درختوں کی سینچائی اور مزارعہ کے درمیان فصل کرنا مشکل ہو تو عقدِ مساقات کے تابع مزارعہ ہوگا، پھر کھیتی کی پیداوار کی تقسیم مالک اور عامل کے درمیان ہوئے اتفاق کے مطابق ہوگی۔ مساقات اور مزارعہ کی صورت میں سب سے پہلے زکوۃ نکالی جائے گی، پھر پیداوار اس کے اور عامل کے درمیان تقسیم کی جائے گی، کیوں کہ زکوۃ مالک اور عامل پر واجب ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے دونوں پہلے اپنا حصہ لیں تو مالک صرف اپنے اوپر واجب زکوۃ کا ذمہ دار ہوگا۔

مزارعہ کا عقدِ مساقات کے تابع ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں: (دیکھا جائے: ''فتح الوھاب''، شیخ الاسلام زکریا ۱/ ۲۴۵)

۱۔نخلستان کی سینچائی کو عقدِ مساقات سے الگ کرنا دشوار ہو۔

۲۔مساقات کا عامل بھی وہی ہو جو مزارعہ کا عامل ہو، یعنی دونوں جگہ کام کرنے والے افراد ایک ہی ہوں، چاہے ان کی تعداد ایک سو یا اس سے زائد ہو۔

۳۔دونوں عقد ایک ہی ساتھ ایک ہی وقت میں ہوئے ہوں، یعنی عقدِ مساقات

اورعقدِ مزارعہ کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔

عقد کا صیغہ یہ ہے کہ مالک عامل سے کہے: ''میں نے نخلستان میں تمہارے ساتھ مساقات کی اور اس زمین پر مزارعت کی، اور بیج میری طرف سے ہوگا کہ جو بھی پیداوار ہوگی وہ ہمارے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی جائے گی''۔ اگر مالک کا حصہ یا کسان کا حصہ زیادہ ہو تو صحیح ہے، البتہ دونوں کا حصہ عقد کے وقت ہی متعین رہنا ضروری ہے، مساقات پر اتفاق ہونے سے پہلے ہی مزارعت پر بھی اتفاق ہو جو مساقات کے تابع ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کے ساتھ اسی طرح عقد کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرایہ

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۴/ ۴۱۷، ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۹۲۷، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۴۳۱)

متعین عوض کے بدلہ معلوم ومقصود خرچ کرنے کے قابل جائز منفعت پر عقد ہے۔

شریعت نے کرایہ کے لیے مندرجہ ذیل سات شرطیں رکھی ہیں:

۱۔منفعت پر عقد ہو، اس کی وجہ سے بیع نکل جاتی ہے جو عین چیز پر عقد ہے۔

۲۔مقصود ہو، اس وجہ سے وہ منفعت نکل جاتی ہے جو مقصود نہ ہو، مثلاً پھول سونگھنا۔

قصد کا مطلب یہ ہے کہ منفعت کی کوئی قیمت ہو۔

۳۔معلوم ہو، اس وجہ سے قراض اور جعالہ کا عقد نکل جاتے ہیں، کیوں کہ قراض میں منفعت غیر معلوم ہے، اور جعالہ میں معلوم نہیں ہے کہ بھاگا ہوا غلام واپس ملے گا یا نہیں۔

۴۔وہ خرچ کرنے کے قابل ہو، یعنی دیے جانے کے لائق ہو، نہ کہ کتے کی طرح، کیوں کہ وہ نجس العین ہے، اور اس میں خرچ کرنا صحیح نہیں ہے۔

۵۔وہ حلال ہونے کے قابل ہو؛ یعنی وہ عزت کی طرح نہ ہو جس کو جائز کرنا ممکن نہیں ہے۔

۶۔عوض کے بدلہ ہو؛ اس کی وجہ سے ہبہ، وصیت اور عاریت نکل جاتے ہیں، ان سبھوں میں کوئی عوض نہیں ہوتا۔

۷۔اس کا عوض معلوم ہو؛ اس لیے ایسے عوض پر عقد اجرت صحیح نہیں ہے جو معلوم نہ ہو یعنی مجہول ہو، عقدِ مساقات میں عوض معلوم نہیں ہے، کیوں کہ عامل کو اپنی کوشش کے بدلہ غیر معلوم مقدار حاصل ہوتی ہے، غیر معلوم عوض صرف عقدِ مساقات میں صحیح ہے۔

اجرت اور کرایہ کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' (الطلاق ۶) پس اگر وہ (عورتیں) تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو۔

امام بخاری نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنو دیل کے ایک آدمی کو کرایہ پر لیا جس کا نام عبداللہ بن اریقط تھا کہ وہ مدینہ منورہ کے راستے کی رہنمائی کرے، یہ ہجرت کے وقت غار ثور سے نکلنے کے بعد ہوا، وہ ان کو غیر معروف راستہ سے لے جائے تاکہ قریش کو ان کا علم نہ ہو۔ (بخاری: کتاب الإجارة، باب استئجار المشركين عند الضرورة ۲۱۶۶)

کرایہ کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

کرایہ سے فرد کی ایک مشروع مصلحت پوری ہوتی ہے، اور اس کی بہت سے لوگوں کو ضرورت پڑتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ بعض لوگ گھر کرایہ پر لینے کے ضرورت مند رہتے ہیں، کسی کو سواری کی ضرورت رہتی ہے، کسی کو اپنا سامان اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ (قیاس یہ ہے کہ کرایہ صحیح نہ ہو، کیوں کہ کرایہ منافع کے لیے ہے، اور منافع معدوم ہیں، اور معدوم پر عقد کرنا دھوکہ ہے، لیکن اس کی بڑی ضرورت ہے، چونکہ سخت ضرورت کرایہ پر لینے کی پڑتی ہے، کسی کے پاس گھر نہیں رہتا، گاڑی نہیں رہتی، خادم نہیں رہتا، اس لیے کرایہ کو جائز قرار دیا گیا۔ انتھی ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۴۲۹)

کرایہ کے ارکان:

کرایہ کے ارکان چھ ہیں: کرایہ پر دینے والا، کرایہ پر لینے والا، کرایہ پر دینے والے کی طرف سے ایجاب اور کرایہ پر لینے والے کی طرف سے قبول، کرایہ اور منفعت، اس کو مختصراً تین ارکان میں منحصر کیا جا سکتا ہے: عقد کرنے والے یعنی اجرت پر دینے والا اور لینے والا، صیغہ یعنی ایجاب وقبول، عوض یعنی کرایہ پر لینے والے کی طرف سے اجرت اور کرایہ پر دینے والے کی طرف سے منفعت۔

کرایہ میں شرط ہے کہ منفعت کی مدت متعین کی جائے، کرایہ پر لی جانے والی چیز گھر ہو تو وہاں رہنے کی مدت متعین کرنا ضروری ہے۔ اگر منفعت کوئی کام ہو؛ مثلاً کسی کو کپڑا سینے کے لیے اجرت پر لے تو ایک ہی عقد میں کام اور مدت کو جمع کرنا صحیح نہیں ہے، مثلاً اس

عقد میں شرط رکھے کہ ایک دن میں کپڑا سی کر دے؛ کیوں کہ کپڑے سینے میں ایک دن سے کم بھی لگتا ہے یا زیادہ بھی۔ کرایہ کے عقد میں کام کی حوالگی کے لیے وقت مقرر کیا جائے تو اس کا کوئی بھی اثر نہیں ہے۔

کرایہ صحیح ہونے کے لیے مدت متعین رہنا اور کرایہ کی قیمت اجرت پر دینے والے اور لینے والے دونوں کو معلوم رہنا شرط ہے، عقدِ اجارہ کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ عقد ہوتے ہی اجرت پر دی ہوئی چیز سے اجرت پر لینے والا فائدہ اٹھانا شروع کرے۔

اس اصول سے چند امور مستثنی ہیں، جن میں اجرت پر لی ہوئی چیز سے فوراً استفادہ کرنا شرط نہیں ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کوئی شخص گھر اپنے حوالہ ہونے سے چھ مہینے پہلے کرایہ پر لے اور اس کے بعد مثلاً ایک سال کی مدت کے لیے کرایہ پر اپنے قبضہ میں لے۔

۲۔ دو لوگ ایک گاڑی ایک مہینہ کے لیے کرایہ پر لیں؛ دونوں پندرہ دنوں کے لیے۔

۳۔ کوئی شخص زمین کرایہ پر لے جس میں پانی بھرا ہوا ہو جہاں پانی کے اترنے سے پہلے کھیتی کرنا ممکن نہ ہو۔

۴۔ کوئی شخص خود کو حج بدل کرنے کے لیے کرایہ پر دے، وہ فوراً سفر نہیں کر سکتا ہے، کیوں کہ حج کا ایک وقت مقرر ہے، جو حج کے لیے آنا ضروری ہے، ذمہ کو اجرت پر دینے کی صورت میں وقت متعین کرنا چاہیے۔

اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے کہ اجرت پر دی جانے والی چیز کرایہ پر لینے والے کے پاس بطور امانت ہے، اور اس پر اس چیز کی حفاظت ضروری ہے یہاں تک کہ اجرت پر دینے والے کے پاس اس کو حوالگی کا وقت آجائے، اگر اس چیز کو کوئی نقصان پہنچے تو کرایہ پر لینے والا اس نقصان کا ضامن ہوگا، اجرت پر دینے والا اجرت پر دی جانے والی عین چیز اور اس کی منفعت کا ضامن ہے، اگر وہ گھر کرایہ پر دے پھر وہ گھر گر جائے تو اس پر

واجب ہے کہ کرایہ پر لینے والے کوکوئی دوسرا گھر دے تاکہ وہ وہاں رہے۔

اگر کوئی شخص گاڑی کرایہ پر لے جس کی طاقت ایک ٹن اٹھانے کی ہو اور کرایہ پر لینے والا اس پر ایک ٹن سے زیادہ مال چڑھائے جس کی وجہ سے گاڑی کو نقصان پہنچے تو اس نقصان کی بھرپائی کرایہ پر لینے والے کے ذمہ ہے۔

کرایہ پر لینے والا چیز کو کرایہ پر لی ہوئی غرض کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرے تو اس کے نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

عاریت

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۴/ ۲۷۸، ''کفایۃ الأخیار'' ۱/ ۴۰۶، ''فتح الوھاب'' ۱/ ۲۲۸)

عاریت اس چیز کا نام ہے جو عاریت پر دی جاتی ہے، یہ لفظ ''تعاور'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی تداول کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں عاریت سے مراد کسی چیز کو عین کے باقی رکھتے ہوئے فائدہ اٹھانے کے لیے دینا، مثلاً قالین کو گھر میں بچھانے کے لیے ایک ماہ کے لیے عاریت پر دے، جس پر بیٹھا جاتا ہے اور مدت ختم ہونے کے بعد واپس کر دیا جاتا ہے، اسی طرح گھر کے برتن ؛ ہانڈی، پلیٹ، پتیلی وغیرہ ہیں جو فائدہ اٹھانے کے لیے دیے جاتے ہیں پھر واپس کر دیے جاتے ہیں، عاریت میں لی ہوئی چیز کے لیے شرط ہے کہ اس کی اصل باقی رہے، اس میں استعمال کی وجہ سے کمی نہ آئے یا بالکل ختم نہ ہو۔

عاریت کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' (المائدۃ ۲) (اور ایک دوسرے کا تعاون کرو بھلائی اور تقوی کے کاموں میں) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ'' (الماعون ۷) (اور وہ ماعون سے روکتے ہیں) جمہور علماء نے اس آیت میں ''ماعون'' کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو پڑوسی ایک دوسرے سے لیتے ہیں، مثلاً ہانڈیاں، چھری، چمچ، ڈول، سوئی وغیرہ۔ اسی طرح بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ انصاری سے ایک گھوڑا عاریت پر لیا اور اس پر سوار ہو کر جہاں جانا تھا گئے۔ (بخاری: کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا، باب من استعار من الناس الفرس والدابۃ وغیرھا ۲۵۰۵، مسلم: کتاب الفضائل، باب فی شجاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقدمہ للحرب ۴۳۶۷)

عاریت کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

عاریت کے ارکان:

عاریت کے چار مندرجہ ذیل ارکان ہیں:

۱۔ عاریت پر دینے والا: اس کے لیے شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل، آزاد اور رشید ہو، مجبور نہ کیا گیا ہو، ان شرائط کی وجہ سے بچہ، پاگل، مکاتب غلام اور وہ شخص نکل جاتا ہے جس پر پابندی عائد کی گئی ہو، کیوں کہ ان میں سے کوئی دوسرے کو کوئی چیز عاریت پر نہیں دے سکتا ہے۔

۲۔ عاریت پر لینے والا: وہ عاریت پر لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس کو عاریت میں لی ہوئی چیز کسی دوسرے کو عاریت پر دینے کا حق نہیں ہے اور اجازت نہیں ہے، البتہ عاریت کا مالک اجازت دے تو دے سکتا ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ وہ سفیہ یعنی بیوقوف نہ ہو، کیوں کہ سفیہ مالی عقد نہیں کر سکتا ہے۔

۳۔ عاریت پر دی جانے والی چیز: اس کے لیے شرط ہے کہ اس کے باقی رہتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن بھی ہو اور جائز بھی ہو اور اس کو کوئی نقصان نہ ہو یا وہ چیز تلف اور ضائع نہ ہو، اور مالک کو لوٹانا ممکن ہو، کھائی جانے والی چیز عاریت پر دینا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ کھانے کے بعد وہ باقی نہیں رہتی ہے۔

۴۔ عاریت کا صیغہ: مثلاً کہے: ’’میں نے تم کو یہ کتاب پڑھنے کے لیے عاریت پر دی‘‘۔ عاریت پر لینے والا اس کو قبول کرے کہ اس کو اپنے قبضہ میں لے، الفاظ کے ذریعہ قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔

اگر عاریت پر لینے والا کوئی چیز ضائع کر دے تو عاریت پر لینے والے پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے، اور قیمت میں اعتبار واپس کیے جانے والے دن کا ہوگا، امام ابوداود نے صحیح حدیث روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے حنین کے دن صفوان بن امیہ سے چند زرہیں عاریت پر لی، اس پر صفوان نے پوچھا: محمد! کیا یہ غصب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’نہیں، بلکہ یہ قابلِ ضمانت عاریت ہے‘‘۔ (ابوداود: کتاب البیوع، أبواب الاجارۃ، باب فی تضمین العور ۱۳۰۹)

اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنے قرض خواہ کے پاس رہن رکھنے کے لیے عاریت پر لے، تا کہ اس کے پاس قرض کی ادائیگی تک رہے، اور یہ چیز رہن لینے والے کے پاس ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان عاریت پر لینے والے پر لازم نہیں ہے، کیوں کہ اس کے ضائع ہونے سے عاریت پر لینے والا قرض معاف نہیں ہوتا اور قرض اس کے ذمہ میں ہی رہتا ہے۔

قرض کے تمام اوصاف کی وضاحت کرنا واجب ہے کہ قرض کی مقدار کیا ہے، اس کی صفت کیا ہے، اس کی مدت کتنی ہے، یا اس کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہے، جس کے پاس رہن رکھنا ہے اس شخص کا نام بتایا جائے، اگر ان میں سے کوئی بھی شرط مفقود ہو جائے یا عاریت پر لینے والے کے پاس ہی یہ چیز ضائع ہو جائے تو عاریت پر لینے والے پر تاوان لازم ہے۔

اگر مقررہ اور متعین طریقہ اور انداز کے مطابق ہی عاریت پر دی ہوئی چیز کا استعمال ہو اور ضائع ہو جائے تو عاریت پر لینے والے پر تاوان نہیں ہے، کوئی گھر کرایہ پر لے تو دوسرے کو عاریت پر دے سکتا ہے، اگر کسی کوتاہی کے بغیر ضائع ہو جائے تو اس پر گھر کا تاوان لازم نہیں ہے، کیوں کہ اجرت پر لینے والے کے پاس اجرت میں لی ہوئی چیز بطور امانت رہتی ہے، اس لیے زیادتی ہونے کی صورت میں ہی تاوان ہے۔ عاریت پر لینے والے سے عاریت پر لینے والا کا حکم بھی پہلے عاریت پر لینے والے کی طرح ہے، اس کو عین چیز میں تصرف کیے بغیر عاریت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

عاریت پر لینے والے عاریت سے مالک کی اجازت کے مطابق ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، مثلاً کوئی زمین کے مالک سے زمین گیہوں کی کھیتی کرنے کے لیے عاریت پر لے تو اس میں چاول بونا جائز نہیں ہے، اگر کوئی کھانے کے لیے برتن عاریت پر لے تو اس کو کھانا پکانے میں استعمال نہیں کر سکتا ہے۔

اگر کوئی میت کی تدفین کے لیے زمین عاریت پر لے تو مالک اس وقت تک زمین واپس نہیں لے سکتا ہے جب تک کہ میت کا جسم مکمل طور پر بوسیدہ نہ ہو جائے، اگر دونوں طرف سے عاریت لازمی ہو تو دونوں میں سے کسی کو اس میں رجوع کرنے کا حق نہیں ہے۔

کسی ایک کے انتقال سے عاریت فسخ ہوجائے گی، اسی طرح کوئی پاگل ہوجائے یا اپنا ہوش کھو بیٹھے یا اس پر پابندی عائد کی جائے، سفیہ بن جائے یا اہلیت کے ناقابل بنانے والا کوئی عارضہ لاحق ہوجائے تو عاریت فسخ ہوجائے گی۔ اگر عاریت پر دینے والے کا انتقال ہوجائے تو عاریت کو فوراً اس کے وارثین کے حوالہ کرنا واجب ہے، اگر عاریت پر لینے والا انتقال کرجائے تو اس کے وارثین پر ضروری ہے کہ وہ یہ چیز مالک یا اس کے وارثین کے حوالہ کریں۔

اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ اس کا گھر وفات کے بعد زید کو ایک سال کے لیے عاریت پر دے تا کہ وہ اس میں رہے تو اس کے وارثین کو سال مکمل ہونے سے پہلے واپس لینے کا حق نہیں ہے، اگر کوئی شخص گھر کسی عورت کو عدت گزارنے کے لیے دے تو اس عاریت میں رجوع کا حق نہیں ہے، یہاں تک کہ اس عورت کی عدت مکمل ہوجائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اَعلم

☆☆☆☆☆

ودیعہ یعنی امانت

ودیعہ کے معنی وہ چیز جس کو مالک کے علاوہ دوسرے شخص کے پاس حفاظت کے لیے رکھا جائے۔ کہا جاتا ہے: ''اِسۡتَوۡدَعۡتُهُ مَالاً'' جب کسی کے پاس حفاظت کی خاطر کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے۔

ودیعہ کے شرعی معنی: اس عین چیز کو کہتے ہیں جس کو اس کا مالک دوسرے کے پاس اس غرض سے رکھتا ہے کہ وہ اس کی مخصوص انداز میں حفاظت کرے۔ یہ اسلامی شریعت کے محاسن میں سے ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپس میں تعاون کی روح کو عام کرنے اور ان سے تنگی کو دور کرنے کے لیے اس کو مشروع کیا۔

یہ اس شخص کی طرف سے ہی صحیح ہے جس کے لیے مال میں تصرف جائز ہے، اس لیے اگر کوئی بچہ یا سفیہ امانت میں رکھے تو اس امانت کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

امانت کے مشروع ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''إِنَّ اللّٰهَ يَأۡمُرُكُمۡ أَنۡ تُؤَدُّوا الۡأَمَانَاتِ إِلٰى أَهۡلِهَا'' (النساء۵۸) (یقیناً اللہ تم کو حکم دے رہا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے حق داروں تک پہنچاؤ) صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''امانت اس شخص کو ادا کرو جس نے تم پر بھروسہ کیا ہے، اور اس کے ساتھ خیانت نہ کرو جس نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے''۔ حاکم نے مسلم کی شرط پر اس کو روایت کیا ہے۔ (المستدرک ۲۲۳۷، مسند امام احمد: ۱۵۴۲۴، ابوداود ۳۰۸۴، المعجم الأوسط للطبرانی ۳۵۸۵، حاکم نے اس کو مسلم کی شرط پر کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الأحادیث المختارۃ'' ضیاء مقدسی ۱۷۹/۳)

ودیعہ کے چار ارکان ہیں:

۱۔ امانت میں رکھنے والا۔

۲۔امانت رکھنے والا۔

۳۔ودیعہ یعنی امانت میں رکھنے والی چیز۔

۴۔عقد یعنی عقد کرنے والوں کی طرف سے ایجاب وقبول۔

اگر امین عمداً یا غلطی سے زیادتی کرے تو وہ ضامن ہوگا، کیوں کہ یہ حفاظت اور امانت میں امین کی ذمہ داری کے منافی ہے، اگر امانت میں ایک تھیلی رکھی جائے جس میں ایک ہزار درہم ہوں اور امین اس میں سے ایک درہم لے تو اس پر ضروری ہے کہ اس کو پورے مبلغ کے ضمن میں لوٹائے، اگر ایک درہم لے اور اس کو استعمال میں نہ لائے بلکہ اسی درہم کو واپس کردے تو صرف اسی درہم کا ضامن ہوگا۔

جب کسی شخص کے پاس امانت رکھی ہو، اور وہ اس کو کسی عذر کے بغیر اور مالک کی اجازت کے بغیر دوسرے کے پاس منتقل کرے تو وہ ضامن ہوگا، اگر وہ ضائع ہوجائے تو اس پر قیمت کی ادائیگی ضروری ہے؛ اگر وہ امانت میں دیا ہوا مال ایک ہی صندوق میں اپنے مال کے ساتھ رکھے تو اس صورت میں بھی ضامن ہوگا، کیوں کہ اس نے ملا کر زیادتی کی ہے، یا اس نے دوسرے کے ساتھ ملا کر کوتاہی کی ہے، یہ اس وقت ہے جب امانت میں رکھا ہوا مال دوسرے مال سے الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

اگر کسی عذر کی وجہ سے امانت منتقل کی جائے مثلاً گھر میں آگ لگ جائے، اور وہ ضرورت کی خاطر امانت منتقل کرکے کسی دوسرے بھروسہ مند شخص کے حوالے کرنے پر مجبور ہو تاکہ اس کو مامون جگہ محفوظ رکھا جائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔

اگر کوئی سفر کا ارادہ کرے اور امانت کا مالک موجود نہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ امانت کسی دوسرے امین کے پاس رکھے۔ (اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جو ہجرت کے وقت پیش آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن کے پاس مکہ والوں کی امانتیں رکھی، اور ان امانتوں کو علی رضی اللہ عنہ کے پاس دینے کا حکم دیا تاکہ وہ مالکوں کے حوالہ کریں۔ مسند امام احمد: ۱/ ۴۴۶، بیہقی: السنن الکبری ۶/ ۲۸۹، ابن حجر نے اس روایت کو ''التلخیص الحبیر'' میں قوی کہا ہے ۳/ ۹۸) جو اس امانت کو اپنے قبضہ میں لے تو اس پر ضروری

ہے کہ کسی محفوظ جگہ پر رکھے، اگر امانت سونا ہو تو اس کو گزرنے والوں کی آنکھوں سے چھپانا اور لوہے کے صندوق میں رکھنا واجب ہے تاکہ وہ مامون حفاظت میں ہو۔

اگر امین کی کوتاہی کی وجہ سے امانت ضائع ہوجائے تو اس پر تاوان واجب ہے، اگر کوئی شخص کسی جانور کو بطور امانت اپنے پاس رکھنے پر راضی ہوجائے اور وہ اس کو نہ کھلائے اور نہ پلائے اور اس وجہ سے جانور مر جائے تو وہ اس کی قیمت کا ضامن ہوگا، جانوروں کے بدلنے سے حکم بھی بدلتا ہے، اس سلسلہ میں تجربہ کار لوگوں سے رجوع کیا جائے۔

اگر کوئی شخص کسی کے پاس صندوق امانت میں رکھے اور اس سے کہے: اس کے اوپر نہ سونا۔ لیکن وہ اس کے اوپر سو جائے جس کی وجہ سے صندوق ٹوٹ جائے اور وہ ضائع ہوجائے تو اس پر صندوق اور اس میں موجود چیزوں کا تاوان ہے، کیوں کہ مخالفت کو کوتاہی مانا جاتا ہے؛ اگر اس کے بغیر ضائع ہوجائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔

کسی شخص کے پاس امانت رکھی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس پر دو تالے لگاؤ، اور وہ دو تالے لگائے، پھر بھی وہ ضائع ہوجائے تو اس پر تاوان نہیں ہے، کیوں کہ اس نے اس امانت کی حفاظت کے لیے اپنی پوری کوشش کی اور اسی طرح کیا جیسے امانت میں رکھنے والے نے درخواست کی تھی۔

اگر کسی کے پاس کپڑے امانت میں رکھے جائیں اور وہ ان کپڑوں کو پہن لے تو اس کی قیمت کا ضامن بن جائے گا، اگر کسی شخص کے پاس جانور امانت میں رکھا جائے اور وہ اس پر سوار ہو یا اپنا سامان اس پر لاد دے تو اس کا ضامن ہوگا، اسی طرح امانت میں رکھی ہوئی گاڑی کا مسئلہ ہے جب اس پر سوار ہونے کی ضرورت نہ ہو، ضرورت کی مثال یہ ہے کہ اس کو رجسٹریشن وغیرہ کے لیے لے جائے۔

اگر امانت رکھنے والا واپس لینے کے لیے نہ آئے اور اس کی جگہ معلوم نہ ہو، اور اس کی واپسی سے مایوسی ہوجائے تو اس کو بیت المال میں شامل کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کے مفادات میں تقسیم کیا جائے، یہ اس وقت ہے جب امانت رکھنے والے کے وارثین موجود نہ

ہوں، اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ اس کو کیسے خرچ کیا جائے تو متقی اور صالح علماء سے رجوع کیا جائے، علماء ان کو فقیر مسلمانوں پر خرچ کرنے یا تعمیر مسجد میں لگانے کی طرف رہنمائی کریں، اگر امانت میں رکھنے والا واپس آئے تو یہ چیز اس کے پاس لوٹانا یا اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''ہاتھ پر ذمہ داری ہے جو لے یہاں تک کہ اس کو ادا کرے''۔ (مسند امام احمد ٢٠٠٨٦، ابوداود: کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ ٣٥٦١، ترمذی: کتاب البیوع، باب ماجاء فی أن العاریۃ موداۃ ١٢٦٦، یہ روایت حضرت سمرہ سے ہے، ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے) دوسری روایت میں ہے: ''یہاں تک کہ لوٹا دے''۔

☆ کوئی سامان خرید کر دکان میں چھوڑ کر چلا جائے تو کیا حکم ہے؟

ایسا بہت ہوتا ہے کہ کوئی سامان خریدتا ہے اور اس کی قیمت بھی ادا کرتا ہے، پھر اس کو دکان میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد آ کر لے جائیں گے، لیکن وہ کبھی نہیں آتے۔

اس صورت میں تاجر کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت کرے اور اپنے پاس اس وقت تک باقی رکھے جب تک کہ واپسی سے ناامیدی نہ ہو، اگر خریدار کی واپسی سے ناامید ہو جائے تو یہ مال بیت المال میں شامل کیا جائے گا، اگر بیت المال موجود نہ ہو تو مسلمانوں کے مفادات میں اس کو خرچ کرنا واجب ہے، اگر اس مال کے خرچ کرنے کے سلسلہ میں معلوم نہ ہو تو مسلم علماء سے پوچھا جائے، یہی حکم ان سامانوں کا ہے جو ایئرپورٹ، بس اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس سامان کا مالک معلوم ہو، اگر مالک معلوم نہ ہو تو اس کو لقطہ مانا جائے گا، اگر اس کا مالک واپس آئے اور اس کی سچائی کا یقین ہو جائے تو اس کے حوالہ کیا جائے گا یا اس کی قیمت یا اسی طرح کا دوسرا سامان دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

قراض یعنی مضاربہ

قراض قرض سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی اہل حجاز کی لغت میں کاٹنے کے ہیں اور اس کو اہلِ عراق مضاربہ کہتے ہیں۔ پہلا اس لیے کہ مالک عامل کو اپنے مال کا ایک حصہ تصرف کرنے کے لیے دیتا ہے، اور دوسرا ''اَلضَّرْبُ فِی الْأَرْضِ'' سے ہے یعنی تجارت کی خاطر زمین میں سفر کرنا۔

قراض کے شرعی معنی یہ ہیں کہ مالک عامل کو کوئی مال تجارت کرنے کی غرض سے دے کہ دونوں منافع میں شریک رہیں گے، اسی لیے قراض کی حقیقت یہ ہے کہ وہ منافع میں دونوں کی شراکت ہے۔

اسی بنیاد پر قراض مال کے مالک اور عامل کے درمیان عقد ہے جس کی رو سے مالک اپنے مال کا ایک حصہ عامل کے حوالہ کرتا ہے کہ وہ اس میں تجارت کرے اور فائدہ دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ (دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ٣٧٧/٤، ''مغنی المحتاج'' ٣٠٩/١)

قراض کی مشروعیت کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَآخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْأَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ'' (المزمل ٢٠) اور دوسرے لوگ اللہ کی روزی تلاش کرتے ہوئے زمین میں سفر کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے خدیجہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مضاربہ کیا اور ان کا مال لے کر شام گئے۔ (''دلائل النبوۃ'' بیہقی ٦٦/٢، سیرت ابن ہشام ١٨٧/١-١٨٨) یہ بھی روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے منافع میں نصف کی شرط پر قراض کے طور پر مال دیا۔ (موطأ امام مالک ٦٨٧/٢)

ابن منذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ (''الاجماع'' ابن منذر ٥٨۔ ابن حزم نے

''مراتب الاجماع'' ۹۱ میں بیان کیا ہے کہ فقہ کا کوئی بھی باب ہو تو اس کی اصل قرآن اور حدیث میں ہے جس کو ہم جانتے ہیں، سوائے قراض کے، ہم نے قرآن وسنت میں اس کی کوئی اصل نہیں پائی، البتہ یہ خالص صحیح اجماع ہے، ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ نبی ﷺ کے زمانہ میں تھا اور آپ نے اس کو جانا اور اس کا اقرار کیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو جائز نہ ہوتا۔ انتہی)

قراض کے ارکان:

قراض کے ارکان سات ہیں: دو عقد کرنے والے یعنی مالک اور عامل، صیغہ یعنی ایجاب وقبول، مال، عمل اور فائدہ، ان میں سے ہر رکن کی شرطیں ہیں جن کی تفصیلات فقہ کی طویل کتابوں میں موجود ہیں۔

عقد کرنے والے :یعنی مال کا مالک اور عامل جو مال کو تجارت کی غرض سے لیتا ہے، اسی کو تجارت اور منافع کمانے کی غرض سے مال میں تصرف کا حق رہتا ہے، ان دونوں کا بالغ، عاقل، آزاد اور تصرف کا اہل ہونا شرط ہے۔

صیغہ :یعنی ایجاب وقبول، مالک کی طرف سے ایجاب مثلاً کہے: میں نے اس ایک ہزار پر تمہارے ساتھ مضاربہ کیا تا کہ تم اس میں اس شرط پر تجارت کرو کہ فائدہ ہمارے درمیان آدھا آدھا ہوگا''۔ قبول عامل کی طرف سے ہوتا ہے مثلاً وہ کہے: ''میں نے تم سے اس شرط پر یہ عقدِ قراض قبول کیا''۔ مالک اور عامل کئی ہوں تو بھی صحیح ہے مثلاً ایک شخص دو عامل کے ساتھ قراض کا عقد کرے، یا دو مالک ایک عامل کے ساتھ مضاربہ کا عقد کریں۔

راس المال: یہ وہ مال ہے جس کو مالک عامل کے حوالہ کرتا ہے۔

عمل : یہ وہ جدوجہد اور کوشش ہے جو عامل تجارت میں لگاتا ہے کہ فائدہ حاصل ہو، اس کے لیے چار شرطیں ہیں: تجارت، مطلقاً ہو، کوئی وقت مقرر نہ ہو، آزادی ہو۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کی تفصیل بیان کی ہے، اس کی طرف رجوع کیا جائے کیوں کہ یہ بہت ہی مفید ہے۔

قراض میں درہم، دینار یا کوئی بھی کرنسی ہونا ضروری ہے یا سونا چاندی ہو، تجارتی

سامان ہونا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کی قیمت کو استقرار نہیں رہتا یعنی قیمتیں بدلتی رہتی ہیں، معلوم مقدار میں نقدی ہو مثلاً ایک ہزار، جنس بھی معلوم ہو مثلاً دینار اور ریال وغیرہ۔ وہ متعین ہو، اس لیے اس کے ذمہ میں یا کسی دوسرے کے ذمہ میں ہونا صحیح نہیں ہے، یہ شرط ہے کہ راس المال عامل کے حوالہ کیا جائے اور وہ تنہا اس میں تصرف کرے، پورا مال مالک کی طرف سے ہی ہو، کوئی بھی چیز عامل کی نہ ہو۔ (دیکھا جائے: ''أسنی المطالب'' ۲/۳۸۰)

مالک اور عامل کے درمیان فائدہ عقد میں طے کردہ تناسب کے اعتبار سے تقسیم ہوگا، دونوں میں سے کوئی ایک ہی پورا فائدہ نہیں لے سکتا ہے، کیوں کہ قراض میں شراکت ہوتی ہے، اسی طرح کوئی تیسرا بھی اس عقد کا فائدہ نہیں لے سکتا ہے، اگر مالک نقد کے ساتھ اپنی جگہ یا دکان تجارت کے لیے دے تو منافع تقسیم ہونے سے پہلے فائدہ کا ایک حصہ مالک کے لیے مخصوص کرنا جائز ہے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ مثال کے طور پر سو میں سے پانچ فیصد سامان منتقل کرنے والی کشتی یا حمالیوں کے لیے مخصوص کیا جائے۔

عقدِ قراض کو کسی مدت کے ساتھ متعین کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ مقررہ مدت میں فائدہ ہی نہ ہو، اور قراض کا مقصد ہی فائدہ ہے، اور اس کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا جائز نہیں ہے: میں نے اس مبلغ پر تمہارے ساتھ عقدِ قراض کیا تا کہ تم اس میں تین مہینے تجارت کرو اور اس کے بعد مجھے واپس کردو، کیوں کہ ان تین مہینوں میں فائدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

عقدِ قراض جائز عقد ہے، یعنی مال کا مالک اور عامل؛ دونوں میں سے کوئی بھی اس کو فسخ کرسکتا ہے جب چاہے، دوسرے کی غیر موجودگی میں اور دوسرے کی رضامندی کے بغیر۔

اگر کوئی کہے: چھ مہینوں کے لیے خریدو اور بیچو، اور اس کے بعد خریدو نہیں، صرف بیچو۔ تو قولِ اصح کے مطابق یہ جائز ہے، تا کہ بیع کے ذریعہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ (دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۴/۳۸۳-۳۸۴۔ بغوی نے یہ علت بیان کی ہے کہ قراض کا تقاضا یہ ہے کہ مال کا مالک خریدنے سے عامل کو جب چاہے منع کرسکتا ہے، البتہ وہ بیچنے سے منع نہیں کرسکتا تا کہ مال میں بڑھوتری ہو)

اگر متعین مدت کے لیے عقدِ قراض کیا جائے تو وہ فاسد ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے تمہارے ساتھ عقد قراض اس مال پر ایک سال کے لیے اس شرط پر کیا کہ ہمارے درمیان منافع تقسیم ہوگا''۔ اس صورت میں اگر فائدہ ہوجائے تو مال مالک کا ہوگا، البتہ عامل کو اجرتِ مثل دی جائے گی، کیوں کہ عقدِ قراض جائز عقد ہے، اس لیے دونوں میں سے کسی کو بھی جب چاہے صرف اپنے تنہا ارادہ سے فسخ کرنے کا اختیار ہے، اس لیے وقت متعین کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اگر عقدِ قراض صحیح شکل میں ہوجائے، تو اس مال میں عامل امین ہوگا، اور عامل کی بات قسم لے کر صحیح مانی جائے گی کہ اس نے مالک کو اس کا مال دیا ہے، یا وہ کہے کہ مال ضائع ہوگیا، یا یہ کہ اس نے یہ مال قراض کے لیے خریدا ہے، یا اس کو اپنے لیے خریدا ہے، یہ اس وقت ہے جب عامل کی طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اگر وہ قراض کے احکام کی مخالفت کرے اور عمل میں کوتاہی کرے تو وہ ضامن ہوجائے گا۔ (دیکھا جائے: ''مغنی المحتاج'' ۲/۳۲۱، ''حاشیۃ القلیوبی'' ۳/۵۹)

عامل کے لیے مالک کی اجازت کے بغیر سفر پر قراض کے مال میں سے خرچ کرنا جائز نہیں ہے، یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اخراجات میں قراض کا مال استعمال کرے، اس کے لیے یہ جائز ہے کہ خود سے نفع کو تقسیم کرے، اگر قراض کے مال سے درخت خریدے تو اس کا پھل مالک کے لیے ہوگا، اگر جانور خریدے تو اس کا دودھ مالک کے لیے ہوگا۔

قراض کے مال کو کوئی نقصان پہنچے تو فائدہ سے اس کی بھرپائی کی جائے گی، اگر قراض کے مال میں تجارت کرنے سے ایک لاکھ درہم فائدہ ہوجائے، پھر دس ہزار درہم نقصان ہوجائے تو خسارہ کا مبلغ فائدہ سے کم کیا جائے گا، اس طرح فائدہ نوّے ہزار درہم ہوجائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

وکالت

وکالت کے لغوی معنی حوالہ کرنے کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں وکالت کہتے ہیں کسی ایسے شخص کا اپنے مال کو دوسرے کے حوالہ کرنا جس کا کام نیابت کو قبول کرتا ہو، تاکہ وہ اس کی زندگی میں وہ یہ کام کردے۔ (یہ عبارت شربینی الخطیب کی ہے ''مغنی المحتاج'' ۲/۲۱۷)

وکالت کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''**فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا**'' (النساء۲۵) (پس اس (مرد) کے گھر والوں میں سے کسی ایک کو حکم بنا کر بھیجو اور اس (عورت) کے گھر والوں میں سے کسی ایک کو حکم بنا کر) بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مالداروں سے زکوۃ لے کر فقیروں میں تقسیم کرنے کے لیے ساعیوں یعنی زکوۃ جمع کرنے والوں کو بھیجا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو ام حبیبہ کا نکاح نجاشی کے ملک میں قبول کرنے کے لیے وکیل بنایا۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ ۱۳۹۵، مسلم: کتاب الإیمان، باب الدعاء إلی الشھادتین ۱۹، یہ روایت حضرابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) خالد بن سعید بن عاص نے ام حبیبہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نکاح پڑھایا، اور نجاشی نے ام حبیبہ کا مہر چار سو مثقال سونا ادا کیا اور ان کو ہجرت کے ساتویں سال شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ (مسند امام احمد: ۶/۴۲۷، نسائی: کتاب النکاح، باب القسط فی الأصدقۃ ۶/۱۹۹، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التلخیص الحبیر'' ۴/۲۹۱)

فائدہ: امام ماوردی نے کہا ہے: ''وکالت جائز ہونے کی اصل قرآن اور حدیث ہے اور اجماع ہے اور اعتبار ہے''۔ (''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۶/۴۹۳)

میں کہتا ہوں: ان کا کہنا ''اعتبار''، اس میں شریعت میں وکالت کی حکمت کی طرف

اشارہ ہے، اور اس جانب کہ لوگوں کو اس کی سخت ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ بہت سے لوگ اپنا کام خود سے کرنے سے عاجز ہیں، اس لیے وکالت سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور مفادات کی تکمیل ہوتی ہے اور معاشرہ کے افراد کے درمیان تعاون انجام پاتا ہے۔

وکالت کے ارکان:

وکالت کے ارکان پانچ ہیں:

۱۔موکل: یہ وہ شخص ہے جو کسی دوسرے شخص کو اپنا کوئی ایسا کام کرنے کے لیے وکیل بناتا ہے جس میں نائب بنانا جائز ہو، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ملکیت یا ولایت کی وجہ سے وہ یہ کام خود کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۲۔وکیل: یہ وہ شخص ہے جو دوسرے شخص کی طرف سے نیابت میں کوئی کام کرنے کو قبول کرتا ہے۔

موکل اور وکیل دونوں کے لیے شرط یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بالغ، عاقل، آزاد اور تصرف کی اہلیت رکھتا ہو، اور وکالت جائز کام میں ہو جس میں وکالت جائز ہو، اس لیے مسلمان عورت کی شادی میں کافر کو وکیل بنانا صحیح نہیں ہے، اور کافر کو اپنے لیے شادی کرنے کی خاطر بھی وکیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

۳۔موکل فیہ: یہ وہ عمل یا محلِ تصرف ہے جو وکیل انجام دیتا ہے، اس میں شرط یہ ہے کہ اس میں نائب بنانا جائز ہو، اور بعض وجوہ سے معلوم ہو، کیوں کہ عمومی وکالت باطل ہے، اور موکل کو وکیل بناتے وقت اس میں تصرف کا حق ہو۔

۴۔اجر: جس کام میں نائب بنانا جائز ہو اس کی انجام دہی کے عوض میں وکیل کے لیے موکل کی طرف سے اجر مقرر کیا جائے، یہ اس صورت میں جب موکل اپنے لیے اجرت پر وکیل اختیار کرے، مثلاً کسی کو اس لیے وکیل بنائے کہ اس کے لیے دس بوریاں چاول خریدے، ہر بوری ایک سو درہم میں، اور اس کے لیے خریدی جانے والی نوعیت اور کوالیٹی کو متعین کرے، اور اس کام کی انجام دہی کے عوض اس کے لیے دس درہم مقرر کرے، یہ بات

معلوم ہے کہ وکالت اجر کے ساتھ اور بغیر اجر کے صحیح ہے، اور جعالہ اسی وقت صحیح ہے جب کہ معلوم ہو۔ (''الحاوی الکبیر''۶/۵۲۹)

۵۔ایجاب وقبول: موکل اور وکیل کی طرف سے ایجاب وقبول ہوتا ہے جس سے ان کی رضامندی معلوم ہوتی ہے۔ جب تک ایجاب وقبول نہ ہو وکالت صحیح نہیں ہے، کیوں کہ بیع اور اجارہ کی طرح یہ ایک عقد ہے، مثلاً موکل کہے: ''میں نے تم کو وکیل بنایا کہ تم میرے لیے ایک ہزار درہم میں گھر خریدو''۔ وکالت کا لفظ استعمال کرنا شرط نہیں ہے، بلکہ اس پر دلالت کرنے والا کوئی بھی لفظ استعمال کرنا جائز ہے۔

لکھ کر یا وصیت کے ذریعہ وکالت جائز ہے اور وکیل بننے کی درخواست کرنا بھی صحیح ہے، موکل فیہ موجود ہو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں خریدی جانے والی چیز کو بیچنے کے لیے کسی کو وکیل بنائے، وکیل کی طرف سے قبول کرنا واجب ہے، البتہ لفظاً قبول کرنا شرط نہیں ہے، بلکہ یہ کافی ہے کہ وکیل وکالت کو قبول کرنے سے انکار نہ کرے۔

تمام عقود؛ بیع، ہبہ، ضمانت، وصیت وغیرہ میں وکالت صحیح ہے، اسی طرح عقود کے علاوہ دوسرے امور مثلاً بیع کو فسخ کرنے، بیچی ہوئی چیز کی قیمت لوٹانے یا مبیع میں کسی عیب کی بنیاد پر مبیع واپس کرنے، اور قرض وغیرہ کو قبضہ میں لینے کے لیے وکیل بنانا صحیح ہے۔

مجہول چیز میں وکالت جائز نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: میں نے اپنے تمام امور؛ چھوٹے اور بڑے ہر معاملہ میں تم کو وکیل بنایا، یا اپنے تمام حقوق میں وکیل بنایا، اس طرح کی توکیل باطل ہے، کیوں کہ اس میں بڑے خطرات ہیں اور اس میں جہالت ہے اور دھوکہ ہونے کے اندیشے ہیں۔

اگر یہ کہے: ''میں نے تم کو اپنی تمام جائیدادوں اور گھروں کو بیچنے کا وکیل بنایا'' تو یہ جائز ہے، کیوں کہ اس میں دھوکہ کم ہے۔

اگر کوئی شخص دوسرے کو اپنے لیے گھر خریدنے کے لیے وکیل بنائے تو توکیل میں گھر کا پتہ بھی بتانا ضروری ہے کہ علاقہ کا نام اور محلّہ کا نام بتایا جائے، البتہ گھر کی قیمت کی

وضاحت ضروری نہیں ہے، بلکہ ثمنِ مثل کی رعایت کی جائے گی، یعنی گھر کی قیمت اسی طرح کے گھروں کے برابر ہو۔

سزا پانے میں وکیل بنانا صحیح نہیں ہے، مثلاً کوئی کسی دوسرے شخص کو کوڑے کھانے کے لیے وکیل بنائے، اگر کسی شخص پر قصاص کا حکم لگایا جائے تو اپنی طرف سے قصاص کی سزا پانے کے لیے وکیل بنانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح ظہار، ایلاء، لعان اور قسموں میں وکیل بنانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں اللہ تعالی کی قسم کھائی جاتی ہے اور اس میں اللہ تعالی کی تعظیم رہنے کی وجہ سے عبادت کے قریب ہے۔

گواہی، تقسیم اور اقرار میں بھی وکالت صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کسی حق کی خبر دینا اور گواہی کے لفظ شرط ہے۔

عبادت کی ادائیگی میں وکالت نہیں ہے، اس سے حج اور عمرہ مستثنی ہیں، ان میں اپنی طرف سے یا اپنے گھر والوں میں سے کسی میت کی طرف سے وکیل بنانا جائز ہے، جب موکل کو کوئی شرعی عذر رہو، مثلاً اپاہج ہو کہ سفر نہ کر سکتا ہو۔

فقراء کو زکوۃ پہنچانے کے لیے وکیل بنانا جائز ہے، قربانی اور عقیقہ کا جانور ذبح کرنے اور اس کا گوشت تقسیم کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے، اسی طرح کفارہ اس کے مستحقین تک پہنچانے کے لیے بھی وکیل بنایا جا سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی أعلم۔

☆☆☆☆☆

شراکت یعنی پارٹنرشپ

شراکت کے معنی ملانے اور شیوع (اس کے معنی عمومیت کے ہیں یعنی چیز کے ہر ہر حصہ میں شراکت رہتی ہے) کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں یہ ایک عقد ہے جس سے کسی ایک ہی چیز میں دو یا دو سے زائد لوگوں کے لیے شیوع کے طور پر حق ثابت ہو جاتا ہے۔ (دیکھا جائے: ''مغنی المحتاج'' ۲/۲۱۱)

اس کی مثال یہ ہے کہ چند لوگ مل کر زمین خریدیں جس میں سب شریک ہوں، اس صورت میں ان میں سے ہر ایک کو اس زمین کے ہر حصہ میں حق ہے، یعنی زمین میں ان میں سے کسی کا حق ممتاز کرنا اور دوسروں سے اس کو الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ'' (الأنفال ۴۱) (اور اس بات کو جان لو کہ تم کو جو بھی چیز بطور غنیمت ملے تو اللہ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدین اسلامی دعوت کو عام کرنے کی خاطر کیے جانے والے جہاد سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کے ہر ہر حصہ میں شریک ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ فرماتا ہے: میں دو شریکوں کا تیسرا ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی دوسرے سے خیانت نہ کرے، جب خیانت کرے تو میں ان دونوں کے درمیان سے نکل جاتا ہوں''۔ (ابوداود: کتاب البیع، باب فی الشرکۃ ۳۳۸۳، مستدرک حاکم ۲۳۲۲، السنن الکبری۔ بیہقی ۶/۷۸، حاکم نے اس روایت کو بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ اس باب میں سائب بن ابی السائب اور براء بن عازب وغیرہ سے روایتیں ہیں، دیکھا جائے: ''التلخیص الحبیر'' ۳/۴۹)

جو شراکت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوجائے تو اس میں کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔
شراکت مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

شراکت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ملکیتوں کی شراکت؛ وہ یہ ہے کہ ایک سے زائد اشخاص اپنے کسی اختیار کے بغیر کسی ایک چیز کی ملکیت میں شریک ہوجائیں، مثلاً وراثت کی ملکیت میں شرکاء، یا اپنے ارادہ سے شریک ہوجائیں مثلاً چند لوگ مل کر کوئی جائیداد مشترکہ طور پر خریدے۔اس قسم کی شراکت کا حکم یہ ہے کہ ان کو مال پر ملکیت شیوع کے طور پر حاصل رہتی ہے یعنی ہر ہر حصہ میں سبھی پارٹنر رہتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا حصہ دوسرے کے لیے اجنبی رہتا ہے، اس لیے کسی کو دوسرے کے حصہ پر ولایت حاصل نہیں رہتی۔اور اس میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔

دوسری قسم: شرکتِ عقد ہے: جو نفع اور تصرف کے ارادہ سے اپنے اختیار کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس باب میں یہی شراکت مقصود ہے، اس کی مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں: (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب فی الفقہ'' بغوی ۴/۱۹۳، ''مغنی المحتاج'' ۳/۲۲۷، ''کفایۃ الأخیار'' تقی حصنی ۱/۳۹۳)

الف: **شرکت ابدان**: مثلاً دو حمالی یا درزی یا مستری اس پر متفق ہوجائیں کہ جو وہ ایک دن میں کمائیں گے اس میں آپس میں شریک رہیں گے چاہے ان میں سے ہر ایک کی کمائی برابر ہو یا کم یا زیادہ۔

ب: **شرکت وجوہ**: یہ ہے کہ قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں سے دو لوگ اس بات پر متفق ہوجائیں کہ ان میں سے دونوں ایک چیز بعد میں قیمت ادا کرنے کی شرط پر خریدیں گے، اور دونوں خریدی ہوئی چیز میں شریک ہوں گے، جب بیچیں گے تو ادا کی جانے والی قیمتوں سے جو بچ کر فائدہ ہوگا وہ دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

ج: **شرکت مفاوضہ**: یہ ہے کہ دو لوگ اس بات پر متفق ہوجائیں کہ وہ دونوں کمائیں گے چاہے تجارت کے ذریعہ کمائیں یا محنت مزدوری کرکے، اور حاصل ہونے والی

کمائی میں دونوں شریک ہوجائیں گے، اگر نقصان ہوا تو دونوں اس کی بھرپائی کریں گے، اس شراکت کو مفاوضہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔

شراکت کی یہ تینوں قسمیں ہمارے نزدیک باطل ہیں، کیوں کہ ان میں مال مشترک نہیں ہے، اس وجہ سے بھی کہ دونوں شریکوں میں سے ہر ایک اپنے جسم اور منافع کی وجہ سے ممتاز ہیں، اس لیے اس کے حاصل کردہ فائدے اسی کے ساتھ مخصوص رہیں گے، ابن منذر نے اس کی وضاحت یوں کی ہے: علماء کا اجماع ہے کہ صحیح شراکت وہ ہے جس میں ہر شریک اپنے پارٹنر کی طرح مال نکالا ہو یا درہم، پھر دونوں اپنا مال ملائیں یہاں تک کہ ایک ہی مال بن جائے، کوئی امتیاز نہ رہے، شرط یہ ہو کہ دونوں اپنی صوابدید پر خریدیں گے اور فروخت کریں گے کہ جو منافع ہوگا ان دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، کوئی نقصان ہوگا تو دونوں بھرپائی کریں گے، جب اس طرح دونوں کریں تو شراکت صحیح ہے۔(دیکھا جائے: ''الإجماع'' ابن منذر ۵۶)

د: **شرکت عنان**: یہ شرعی طور پر صحیح شراکت ہے، اس کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

ا۔راس المال مثلی ہو، مثلاً سونا، چاندی، کرنسی اور گیہوں وغیرہ، ایسی چیز میں بھی شراکت صحیح ہے جس کی قیمت لگائی جاتی ہو مثلاً جانور، جب وہ اس کی ملکیت میں شراکت کے عقد سے پہلے شریک ہوں، اسی طرح وزن کی جانے والی چیزوں میں بھی صحیح ہے مثلاً لوہا، ناپی جانے والی چیزوں میں بھی مثلاً گیہوں، اور کپڑے وغیرہ۔

۲۔جنس اور صفت میں دونوں مال اس طرح متحد ہو کہ جب دونوں کو ملایا جائے تو ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

۳۔شراکت کے عقد سے پہلے دونوں مثلی مال کو ملایا جائے تاکہ اس کی ملکیت میں حقیقی شراکت مکمل ہوجائے، البتہ دونوں کے مال کی مقدار یکساں رہنا شرط نہیں ہے۔

۴۔شراکت راس المال کے فیصد کے اعتبار سے نفع نقصان ہوگا کہ جس کا زیادہ مال ہوگا اس کو منافع میں اسی قدر حصہ ملے گا، اور نقصان کی صورت میں اس کا زیادہ نقصان ہوگا۔

جب شرکاء ان شرطوں کے خلاف عقد کریں تو شراکت فاسد ہو جاتی ہے، مثلاً اس بات پر متفق ہو جائیں کہ دونوں کا راس المال کم زیادہ رہنے کے باوجود منافع برابر برابر ہوگا۔

شراکت کے ارکان:

شراکت کے تین ارکان ہیں:

عقد کرنے والے: یعنی دو یا دو سے زیادہ پارٹنر، چاہے ایک ہزار پارٹنر ہوں۔

راس المال: یہ وہ مال ہے جس کو شریک شراکت بنانے کے لیے ملاتے ہیں۔

صیغہ: اس کا مطلب ایجاب وقبول کے ذریعہ اتفاق اور رضامندی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر شریک دوسرے کو مال میں تجارت کی اجازت دیتا ہے، مثلاً ہر شریک کہے: ہم تجارت میں اپنے مال سے شریک ہوئے اور ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو تصرف کی اجازت دی۔

شرکاء کے لیے شرط ہے کہ ان میں وکیل اور موکل میں پائے جانے والی تمام شرطیں پائی جائیں، کیوں کہ شراکت درحقیقت وکالت ہے، اس میں ہر شریک راس المال میں دوسرے کو وکیل بناتا ہے، اسی وجہ سے ضروری ہے کہ ہر شریک بالغ، عاقل، آزاد، رشید اور تصرف کی اہلیت رکھنے والا ہو، بچہ، پاگل، سفیہ، بے ہوش، غلام اور محجور علیہ (جس پر اسراف کی وجہ سے پابندی عائد کی گئی ہو) کی شراکت قبول نہیں ہے۔

کافر اور ذمی کو شریک بنانا مکروہ ہے کیوں کہ وہ لوگ سود اور شراب وغیرہ محرمات سے احتراز نہیں کرتے ہیں۔ (دیکھا جائے: ''مغنی المحتاج'' ۲/۳۱۳، ''حاشیۃ القلیوبی'' ۲/۳۳۴)

ہر پارٹنر دوسرے پارٹنروں کے مال میں تصرف کرنے میں امین ہے، یعنی اس کی تصدیق اس شرط کے ساتھ کی جائے گی کہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے شراکت کا مال استعمال نہ کرے۔

ہم کہتے ہیں: شراکت کا محور اس کا راس المال ہے، اگر مال نہ ہو تو شراکت نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص چوپایہ لے آئے اور دوسرا برتن لائے جس میں پانی رکھا جاتا ہے، اور تیسرا آکر کہے: میں برتن کو پانی سے بھرتا ہوں، اور چوپایہ پر رکھ کر اس کو بیچتا ہوں، اور تینوں

اس بات پر متفق ہو جائیں کہ فائدے میں شریک ہوں گے، اگر وہ اس پر اتفاق کرلیں تو یہ مشروع شراکت مانی نہیں جائے گی، کیوں کہ انھوں نے ایک ہی قسم کا مال پیش نہیں کیا ہے کہ اس کو اس طرح ملانا ممکن ہو کہ پھر الگ کرنا ممکن نہ ہو، اور ان میں سے ہر ایک منافع کا ایک حصہ پائے یا اپنی ادا کردہ مقدار کے مطابق نقصان کو برداشت کرے، سابقہ مثال میں صحیح یہ ہے کہ جو پانی بیچنے والا ہے اس کا حق ہے کہ مال کو حاصل کرے اور اپنے دو ساتھیوں کو چوپائے اور پانی بھرنے کے برتن کی اجرت ادا کرے۔

باطل شراکت کی مثالوں میں سے یہ ہے کہ کوئی ایک شخص مال دے اور دوسرا خرید وفروخت کرے، اور تیسرا بیچے، اور سبھی اس پر متفق ہوں کہ جو نفع یا نقصان ہوگا سبھی اس میں شریک ہوں گے۔

اس شکل میں صحیح یہ ہے کہ مال کا مالک ہی فائدہ لے اور خریدنے اور بیچنے والے کو اجرت دے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

ہبہ

ہبہ کے لغوی معنی عطیہ کے ہیں۔

شریعت میں کسی عوض کے بدلہ احسان کرنے والے عقد کو ہبہ کہتے ہیں جو ہبہ کے لفظ سے ہوتا ہے یا اس معنی کو ادا کرنے والے کسی بھی دوسرے لفظ سے ہوتا ہے۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا '' (النساء۴) اگر وہ خوش دلی سے تمہارے لیے کچھ چھوڑ دیں تو اسے ذوق شوق سے کھاؤ۔

اس آیت کریمہ میں مولی عزوجل نے کہا ہے کہ عورت شوہر کے لیے اپنے مہر کے ایک حصہ کو ہبہ کردے۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ جانے چاہے بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو''۔ (بخاری: کتاب الھبۃ، باب الحض علی الھبۃ ۲۰۱۷، مسلم: کتاب الصدقۃ، باب الحث علی الصدقۃ ۲۴۲۶) یہاں نبی کریم ﷺ پڑوسیوں کی طرف سے دیے جانے والے ہدایا کو قبول کرنے کی رہنمائی کررہے ہیں تاکہ مسلم معاشرہ میں پڑوسیوں کے حقوق پختہ ہوجائیں۔

ہبہ کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ (دیکھا جائے: ''الإجماع'' ابن منذر ۶۵)

ہبہ کے ارکان

ہبہ کے تین ارکان ہیں:

صیغہ: اس سے مراد ایجاب وقبول ہے، مثلاً ہبہ کرنے والا کہے: ''میں نے تمہیں ہبہ کیا، تم کو مالک بنایا یا تم کو عطا کیا''۔ یہ ہبہ کرنے والے یا مالک کی طرف سے ایجاب ہے، اور موہوب

لہ (جس کو ہبہ کیا جارہا ہو) کی طرف قبول یہ ہے کہ کہے: ''میں نے قبول کیا، میں راضی ہوگیا''۔

ہبہ، ہدیہ اور صدقہ احسان کی قسموں میں سے ہے، ان تینوں کے درمیان مندرجہ ذیل فرق ہیں:

اگر ہبہ آخرت کے ثواب کی نیت سے فقیر کے لیے ہو تو صدقہ ہے، اگر ہبہ مالدار کے لیے ہو اور اس کو خود پہنچائے تو ہدیہ ہے، اگر غیر ضرورت مندوں کو آخرت کے ثواب کی امید میں اور غیر مالداروں کو بطور اکرام کے دیا جائے تو ہبہ ہے۔ (''المنھاج'' نووی، ''مغنی المحتاج'' ۴/۶۳)

ہبہ میں موہوب لہ کی طرف سے قبول کرنا واجب ہے، کیوں کہ ہبہ دوسرے کو زندگی میں مالک بنانے کی طرح ہے (فوراً قبول کرنا شرط ہے، دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۴/ ۵۲۷، غزالی نے ابن سراج سے روایت کیا ہے کہ وہ بعد میں قبولیت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ غزالی نے کہا ہے: یہ بعید ہے۔ انتہی ''الوسیط'' ۴/ ۲۶۵) یہ بیع کی طرح ہے جس میں بولنے والے کی طرف سے قبول کرنا اور گونگے کی طرف سے اشارہ ضروری ہے۔

اسی بنیاد پر اگر باپ اپنی کسی بیٹی کو زیور پہنائے یا کوئی دوسری چیز دے اور زبان سے یہ نہ کہے کہ میں نے تم کو ہبہ کیا۔ اور بیٹی کہے: میں نے قبول کیا، تو بیٹی اس ہدیہ کی مالک نہیں ہوتی ہے، یہ مشہور ہے کہ صدقہ، ہدیہ اور ہبہ کسی عوض کے بغیر مالک بنانا ہے، اگر عوض کی شرط کے ساتھ ہو تو یہ بیع ہوجائے گی۔

۲۔ عقد کرنے والے: یہ واہب اور موہوب لہ ہیں۔

۳۔ ہبہ، یہ وہ چیز ہے جس کا کسی عوض کے بغیر موہوب لہ کو مالک بنایا جاتا ہے۔

ہبہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قیمت والی چیز ہو، بلکہ جائز ہے کہ انسان انگور کا ایک دانا ہبہ کرے۔ اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ جس چیز کو بیچنا جائز ہے اس کا ہبہ کرنا جائز ہے۔ البتہ بعض حالات ایسے ہیں جن میں ہبہ جائز ہے لیکن اس کی بیع جائز نہیں ہے، مثلاً پختہ ہونے سے پہلے پھل ہبہ کرنا۔

ہم نے یہ بات کہی ہے: ہبہ ارکان کے اعتبار سے بیع کی طرح ہے، وہ یہ ہیں: ہبہ

کرنے والا، موہوب لہ، موہوبہ چیز، اگر ہبہ کے ساتھ عوض ہو تو یہ بیع ہو جاتی ہے، اگر غیر معلوم عوض کے ساتھ ہو تو یہ باطل ہبہ ہے، اگر کوئی اپنے دوست سے کہے: میں نے اپنا گھر تمہیں ایک ہزار درہم کے بدلہ ہبہ کیا تو یہ بیع ہے۔ اگر کوئی اپنے ساتھی سے کہے: میں نے اپنا گھر تم کو اس کے عوض ہبہ کیا جو تم مجھے دو۔ یہ باطل ہے، کیوں کہ یہاں مطلوبہ عوض متعین نہیں کیا گیا ہے، اگر متعین کیا جائے تو بیع ہوگی، ہبہ کے سلسلہ میں قولِ معتمد یہ ہے کہ عوض کے بغیر ہو۔ (بلا عوض کہنے سے بیع نکل جاتی ہے۔ دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۹۸۲/۲)

ہبہ میں یہ شرط ہے کہ موہوب لہ اس پر قبضہ کرے، اگر قبضہ نہ کرے تو وہ مالک کی ملکیت میں ہی رہے گا، اور اس کو رجوع کرنے کا حق ہے۔

اگر موہوب لہ ہبہ پر قبضہ کرلے تو اس کی ملکیت ہو جائے گا، اور اس میں رجوع کرنا ممکن نہیں ہے، اور ہبہ کرنے والا اس میں کسی بھی طرح تصرف نہیں کر سکتا ہے، ہاں اگر ہبہ کرنے والا باپ یا ماں ہو، اور موہوب لہ بیٹا ہو تو ان دونوں کو موہوب لہ بیٹے کی ملکیت میں اس چیز کے رہنے تک رجوع کرنے کا اختیار ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''کسی آدمی کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کوئی عطیہ کرے یا کوئی ہبہ کرے تو اس میں رجوع کرے، مگر یہ کہ والد اپنے بیٹے کو دے''۔ (ترمذی: کتاب البیوع، باب الرجوع فی الھبۃ ۱۲۵۷، مستدرک حاکم ۲۲۳۹، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۵۱۲۳، یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے، ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے)

لیکن واپس لینا اس وقت مکروہ ہے جب بچہ پاک دامن اور فرماں بردار ہو۔ (ابن ملقن ''عجالۃ المحتاج'' ۹۸۸/۲)

عمریٰ اور رُقبیٰ

ہبہ عمر یہ یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا کہے: ''میں نے تم کو اپنا گھر بطور عمریٰ دیا، اگر تم مجھ سے پہلے مرجاؤ تو یہ گھر میرے پاس واپس ہوگا''۔ یا کہے: ''یہ زید کے لیے ہے یا وقف ہے''۔ اس کا حکم ویسے ہی ہوگا جیسے کہ ہبہ کرنے والے نے شرط رکھی ہے۔ اگر وہ اپنے

دوست سے کہے: ''میں نے تم کو اپنا گھر بطور عمریٰ دیا''۔ پھر اس کا دوست اپنے قبضہ میں لے تو وہ اس کی ملکیت ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس کے وارثین کی ملکیت ہو جائے گا۔ (صحیح بخاری: باب ما قال فی العمریٰ والرقبیٰ ۲۶۲۶ میں اور مسلم: کتاب الھبات، باب العمریٰ ۱۶۲۵ میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''عمریٰ اس کے گھر والوں کی میراث ہے''۔)

رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی اپنے دوست سے کہے: ''میں نے تمہیں اپنا گھر بطور رقبیٰ دیا، اگر تم مجھ سے پہلے مرجاؤ تو یہ گھر مجھے لوٹ آئے گا''۔ جب تک موہوب لہ زندہ رہے گا اس کی ملکیت رہے گا، اور ہبہ کرنے والے کے لیے اپنے ہبہ میں اس وقت تک رجوع کرنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کا دوست زندہ ہو، اسی وجہ سے اس کو رقبیٰ کہا گیا ہے، کیوں کہ ہبہ کرنے والا موہوب لہ کا انتظار کرتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ مرجاتا ہے تو اپنا ہبہ واپس لیتا ہے۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کے لیے بطور عمریٰ ہبہ کیا جائے تو وہ اس کے لیے اور اس کے بعد والوں کے لیے ہے، کیوں کہ جس کو دیا گیا ہے وہ دینے والے کے پاس واپس نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس نے ایسا عطیہ دیا ہے جس میں وراثت نافذ ہوئی ہے''۔ (ترمذی: کتاب الاحکام، باب ماجاء فی العمریٰ ۱۳۵۰، ابوداود: کتاب البیوع، باب من قال فیہ ولعقبہ ۳۵۵۳، ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس پر بعض اہلِ علم کے نزدیک عمل ہے)

حضرت جابر سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہ بطور عمریٰ دو اور نہ بطور رقبیٰ، جو کوئی کسی چیز کو بطور رقبیٰ یا بطور عمری دے تو اس کی راہ میراث ہے''۔ (مسند امام شافعی ۲۱۹/۱، سنن ابوداود: باب من قال فیہ ولعقبہ ۳۵۵۶، السنن الکبری، بیہقی ۱۳۰/۴، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۵۱۲۷)

اس حدیث میں ہمارے لیے نبوی ہدایت ہے کہ ہم ہبہ میں یہ شرط نہ لگائیں کہ وہ موہوب لہ کے لیے اس وقت تک ہے جب تک وہ زندہ رہے، تاکہ ہبہ کرنے والا موہوب لہ کی موت کا انتظار کرے، اس میں ہبہ کے سلسلہ میں حکم شرعی کی وضاحت ہے کہ یہ موہوب لہ اور اس کے بعد اس کے وارثین کی ملکیت ہے چاہے صرف ہبہ کرے، یا عمریٰ ہبہ کرے یا رقبیٰ ہبہ کرے۔

موہوب لہ کے قبضہ کرنے کے بعد ہبہ اس کی ملکیت میں آتا ہے، (مسلک میں یہی

قول معتمد ہے، بغوی نے اس کو ''التھذیب'' میں ۴/ ۵۲۷، نووی نے ''المنھاج'' میں ۴/ ۵۲۷ صحیح کہا ہے جیسا کہ ''مغنی المحتاج'' میں ہے ۴/ ٦۷، امام مالک نے کہا ہے: عقد سے ہی موہوب لہ مالک ہوجاتا ہے۔ شافعیہ کی اس سلسلہ میں دلیل مسند احمد ٦/ ۲۷۲، اور بیہقی ٦/ ۲٦ کی روایت ہے) اگر ہبہ کرنے والا یا موہوب لہ قبضہ سے پہلے مرجائے تو ہبہ فسخ نہیں ہوگا، بلکہ وارثین کو اختیار ہے کہ موہوب لہ یا اس کے وارثین کے حوالہ کریں یا اس میں رجوع کریں، اسی طرح موہوب لہ کے وارثین کے لیے ہبہ قبول یا رد کرنے کا اختیار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

ضمان

ضمانت کے لغوی معنی: پابندی کے ہیں۔

شرعی معنی دوسرے کے ذمہ میں ثابت حق کی پابندی کرنا، یا اس کو حاضر کرنا جس پر قرض ہو یا ضمانت میں رکھی ہوئی کوئی عین چیز ہو۔ (دیکھا جائے: ''مغنی المحتاج'' ۳/ ۲۰۷)

اس کی مثال یہ ہے کہ زید عمرو کا قرض دار ہو، اور وہ اس کا اقرار کرے، اور عمرو سے درخواست کرے کہ ایک ماہ صبر کرے، لیکن عمرو قبول نہ کرے، بکر عمرو سے کہے: میں تمہارے لیے اس کا ضامن ہوں جس کا تم اس سے مطالبہ کررہے ہو، اس لیے زید کو قید مت کیجئے، اور میں تم کو قرض ادا کرنے کا پابند ہوں اگر وہ تم کو اپنی طلب کردہ مہلت میں ادا نہ کرے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ زید عمرو کا قرض دار ہو، زید اپنے گھر میں ہی بیٹھا ہو، وہاں سے نکل نہ رہا ہو، عمرو چاہتا ہو کہ زید کو باہر لانے کے لیے پولس کی مدد لے، اس موقع پر بکر کہے: میں اس کو لے آتا ہوں۔

تیسری مثال یہ ہے کہ عمرو کی گھڑی زید کے پاس ہے جس کی قیمت ایک ہزار درہم ہے، اور بکر اس گھڑی کو زید سے لے کر عمرو کے حوالہ کرنے کی ضمانت لے۔ یہ تمام مثالیں ضمانت کی ہیں۔

ضمانت مشروع ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ'' (یوسف ۷۲) انھوں نے کہا: شاہی پیالہ ہمیں نہیں مل رہا ہے اور جو بھی اس کو ڈھونڈ لائے گا اس کو ایک اونٹ بھر (غلہ) ملے گا اور میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

ابن العربی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: یہ کفالت جائز ہونے کا نص ہے۔

(أحکام القرآن ۳/ ۱۰۹۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ’’ضمانت لینے والا تاوان کا ذمہ دار ہے‘‘۔ (یہ اس حدیث کا جزء ہے جس کو امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے: ۲۲۲۹۴، ابوداود: کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ ۳۵۶۷، ترمذی: کتاب البیوع، باب ما جاء فی أن العاریۃ موداۃ ۱۲۶۵، یہ روایت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

دوسری روایت میں ہے: ’’کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے آدمی کی طرف سے دس دینار کی ضمانت لی‘‘۔ امام حاکم نے صحیح سند سے یہ روایت کی ہے۔ (مستدرک حاکم ۲۱۶۱، ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، یہ روایت سنن ابوداود میں ہے: کتاب البیوع، باب فی استخراج المعادن ۳۳۳۰، السنن الکبری۔ بیہقی ۶/ ۷۴) اسی طرح ضمانت کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس پر امت کا عمل ہے۔ (دیکھا جائے؛ ’’الاجماع‘‘ ابن منذر ص ۵۹) اس میں حکمت یہ ہے کہ اس کی ضرورت لوگوں کو اپنے معاملات میں پڑھتی ہے، اور اس سے تنگی دور ہوتی ہے۔

ضمانت کے ارکان:

ضمانت کے ارکان پانچ ہیں:

ضامن، مضمون لہ، مضمون عنہ یعنی قرض دار، مضمون یعنی قرض جو ضمانت کا موضوع ہے۔ اور صیغہ، یہ ایجاب وقبول ہے، مثلاً کوئی کہے: میں فلاں پر تمہارے حق کا ضامن ہوں۔ دوسرا جواب دے: میں فلاں کی طرف سے تمہاری ضمانت قبول کی۔

مضمون لہ کی طرف سے قبول کرنا اہم ہے، کیوں کہ ضامن مضمون لہ کی موافقت کے بغیر اپنے اوپر ضمانت کو نافذ نہیں کرسکتا ہے۔

ضامن کے لیے شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل، مختار اور مال دینے کا اہل ہو، اور اس کو مضمون لہ کے بارے میں معلوم ہو، یا اس کے وکیل کو جاننا کافی ہے، ضامن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس چیز کو جانے جس کی وہ ضمانت لے رہا ہے، اور اس کا مبلغ قرض دار کے ذمہ میں ثابت ہو، قرض کی ضمانت لینا صحیح نہیں ہے جب تک کہ وہ قرض دار کے ذمہ میں داخل نہ ہوا ہو۔

ضمانت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدن کی ضمانت، اس کو کفالت کہا جاتا ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی ہے: ’’لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَأْتُنَّنِيْ بِهِ‘‘ (یوسف ۶۶) (میں ہرگز ہرگز اس کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، یہاں تک کہ تم اللہ کی طرف سے مجھے یہ عہد وپیمان نہ دے دو کہ تم اس کو واپس ضرور لاؤ گے۔

اور بدن کی ضمانت قرض دار کے جسم سے متعلق ہوتی ہے، اس کے قرض سے متعلق نہیں ہوتی، بدن اور قرض دونوں کی ایک ساتھ ضمانت صحیح نہیں ہے، اللہ تعالی کی سزا میں بھی ضمانت صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جب شرعی طور پر جرم ثابت ہوگیا اور گنہ گار زنا یا شراب یا چوری کی حد کا مستحق بن گیا ہو، تو فوراً کسی تاخیر، کفالت یا ضمانت کے بغیر حد نافذ کرنا واجب ہے، یہ بھی ہے کہ شریعت حدود دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہے، اور ان میں رجوع بھی صحیح ہے، اور یہ کفالت کے منافی ہے جس میں ان امور کو ظاہر کرنے اور تاکید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی حکم اس وقت بھی ہے جب قاضی کسی خلاف سزا کا فیصلہ سنائے۔ (دیکھا جائے: ’’حاشیۃ القلیوبی‘‘ ۲/ ۳۲۷، ’’روضۃ الطالبین‘‘ ۴/ ۲۵۳)

قاضی تعزیر میں مختلف سزائیں دے سکتا ہے مثلاً مالی تاوان، یا کسی سربرآوردہ شخص کو مارنا یا لوگوں کے سامنے اس کی ملامت کرنا یا اس کو قید کرنا وغیرہ۔

کسی شخص کو حاضر کرنے کی کفالت لی جائے تو حاضر کیے جانے والے شخص کی رضامندی شرط ہے، کیوں کہ اگر وہ اس کفالت پر راضی نہیں ہے تو اس کے ساتھ وہ ہرگز حاضر نہیں ہوگا، صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کفیل مکفول کو حاضر کرنے کی طاقت اور قدرت رکھتا ہو، بلکہ مکفول کی رضامندی اور اجازت بھی ضروری ہے۔ (’’المجموع‘‘ ۱۳/ ۲۲۱، ’’حاشیۃ القلیوبی‘‘ ۲/ ۳۲۸)

اگر کفالت کسی میت کو قاضی کی مجلس میں حاضر کرنے کے ساتھ مخصوص ہو، مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کا قرض دار ہو، اور گواہ گواہی دیں کہ یہ شخص زید کا قرض دار ہے، لیکن ان لوگوں کو اس کا نام اور نسب معلوم نہ ہو، پھر قرض دار کی موت ہو جائے، تو قرض خواہ اس شخص

کی میت قاضی کی مجلس میں حاضر کرنے کی درخواست کرسکتا ہے تا کہ گواہ اس کو دیکھ کر گواہی دیں کہ یہی میت اس قرض خواہ کا قرض دار ہے، اس صورت میں کوئی بھی شخص اس میت کا جسم قاضی کی مجلس میں لانے کی کفالت لے سکتا ہے، تا کہ گواہ اس کا چہرہ دیکھیں، اس صورت میں میت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

جب مکفول لہ کا انتقال ہوجائے تو کفالت باطل نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کے وارثین کے لیے حق باقی رہتا ہے جیسا کہ مال کی ضمانت میں ہے۔

۲۔ دوسری قسم مالی ضمانت ہے: یہ صحیح ضمانت ہے جب مال قرض دار کے ذمہ میں ثابت مال ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو اور قرض خواہ کے پاس معروف ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مقدار میں کسی قسم کا نزاع نہ ہو، اور یہ معاملہ قرض خواہ کے اچھے اخلاق یا برے اخلاق پر موقوف نہ ہو، مضمون لہ کا قرض لازمی قرض ہے جس طرح بیع کی قیمت ہوتی ہے اور یہ جائز قرض نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ایسے مال کی ضمانت جائز نہیں ہے جو قطعی طور پر ثابت نہ ہو، اور ایسے قرض کی ضمانت کا کوئی موقع نہیں ہے جس کو کل ادا کیا جائے گا، کیوں کہ ضمانت ثابت حقوق کی حفاظت کے لیے ہے، اور ایسے حق کی ضمانت ممکن نہیں ہے جو ثابت نہیں ہے۔ اس صورت میں ضمانت کی مثال گواہی کی طرح ہے، کیوں کہ کوئی شخص آج ایسی بیع کی گواہی نہیں دے سکتا ہے جو کل ہونے والی ہے، کیوں کہ گواہی کا حق کے ثابت ہونے کے بعد مکمل ہونا ضروری ہے۔

کسی غیر معلوم چیز کی ضمانت صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مالی حق کو قرض دار کے ذمہ میں ثابت کرنے کے حکم میں ضمانت ہوتی ہے، اس کی مثال بیع اور اجارہ کی طرح ہے، یہ بات معلوم ہی ہے کہ مجہول چیز کی بیع جائز نہیں ہے، اسی طرح مجہول چیز کو کرایہ پر دینا بھی جائز نہیں ہے۔ (''المجموع''، ۱۳/۱۸۴؛ ''حاشیۃ القلیوبی''، ۲/۳۲۶)

خیار کی مدت کے دوران مبیع کی قیمت کی ضمانت خیار کی مہلت ختم ہونے اور بیع کے لازم ہونے سے پہلے صحیح ہے، کیوں کہ خیار کی مدت کے دوران بیع لازم ہونے والی ہوتی ہے، اس لیے اس کو لازم کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا لازم ہونا کسی چیز پر موقوف نہیں ہے۔

ایسی چیز کی ضمانت صحیح ہے جس کو غصب کیا گیا ہو یا اس کو عاریت میں دیا گیا ہو، مثلاً ضامن کہے: میں تمہارے لیے ان برتنوں کی واپسی کی ضمانت لیتا ہوں جو تم نے زید کو عاریت کے طور پر دیے ہیں۔

کسی تاجر سے صرف دیکھنے کی غرض سے سامان لیا جائے تو اس کی ضمانت لینا بھی صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: میں تمہارا سامان واپس کرنے کا ضامن ہوں جو زید نے دیکھنے کی غرض سے لیے ہیں۔

مضمونہ چیز پر قبضہ کرنے کے بعد درک کی ضمانت (ضمان الدرک سے مراد تاوان کی ضمانت ہے کہ ضمانت لینے والا مضمون لہ پر لاگو ہونے والے تاوان کو دیتا ہے اور اس کا ضامن بنتا ہے) جائز ہے، اس کو ضمان العہدہ یا ضمان التبعۃ بھی کہا جاتا ہے، مثلاً زید عمرو کی گائے خریدے، لیکن اس کو شک ہو کہ یہ گائے عمرو کی ملکیت ہے یا یہ چوری کی ہوئی ہے، اس وقت زید بکر سے کہے: میں اس گائے کے درک کا ضامن ہو، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ گائے چوری کی ہے اور بیچنے والے کی ملکیت نہیں ہے تو میں تمہیں دی ہوئی قیمت لوٹا دوں گا۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''روضۃ الطالبین''، ۴/۲۴۶)

اگر بائع کو شک ہو کہ مشتری جو مال بطور قیمت دے رہا ہے وہ اس کا مال نہیں ہے تو بھی ضمانت جائز ہے، مثلاً بکر اس سے کہے: میں اس مال کے درک کا ضامن ہوں، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ مال مسروقہ ہے تو میں تمہیں قیمت ادا کردوں گا۔

ضمانِ درک کی شکلوں میں سے مبیع میں عیب پایا جانا ہے جس سے لوٹانا جائز ہو، اور وزن میں کمی معلوم ہوجانا بھی ہے، ان دونوں صورتوں میں درک کے ضامن کے پاس رجوع کیا جاسکتا ہے۔

جب ضمانت مکمل ہوجائے، تو قرض خواہ قرض دار اور ضامن میں سے کسی سے بھی قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتا ہے، اگر قرض خواہ قرض دار کو قرض سے بری کرے تو ضامن ضمانت سے بھی بری ہوجاتا ہے، اگر قرض دار اپنا قرض ادا کرے تو وہ بھی بری ہوجاتا ہے

اور ضامن بھی بری ہوجاتا ہے۔

اگر قرض دار مرجائے یا ضامن مرجائے تو قرض کی مدت ختم ہوجاتی ہے اور اسی وقت ادائیگی ضروری ہوجاتی ہے، چاہے ابھی قرض کی ادائیگی کی مہلت باقی ہو، کیوں کہ ذمہ والے کی موت سے ذمہ زائل ہوجاتا ہے اور میت کے لیے ذمہ نہیں ہے، اور اس کا قرض اس کی وراثت سے ادا کیا جاتا ہے۔

ضامن قرض دار سے قرض کی ادائیگی اور اپنی ضمانت کی تحریر لکھنے کا مطالبہ کرسکتا ہے، ضامن کا یہ حق ہے کہ قرض دار کی طرف سے قرض کی ادائیگی کے لیے جو بھی مبلغ ادا کرے تو اس کا مطالبہ قرض دار سے کرے۔

واللہ وسبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

رہن

رہن کے لغوی معنی: روکنے کے ہیں، اسی معنی میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ’’مومن کی جان اس کے قرض کی وجہ سے مرہون یعنی رکی ہوئی رہتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے‘‘۔ (ابن ماجہ: کتاب الصدقات، باب التشدید فی الدین ۲۴۴۳، السنن الکبری۔ بیہقی ۲۵۱۹، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۳۰۶۱، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

رہن کے شرعی معنی: کسی عین مال کو قرض کے بدلہ وثیقہ بنانا جس کے ذریعہ قرض پورا کیا جاتا ہے جب اس کی ادائیگی دشوار ہوجاتی ہے۔ (یہی تعریف شربینی نے ’’مغنی المحتاج‘‘ میں کی ہے ۳/۹۰)

یہ بات متعارف ہے کہ قرض خواہ کو قرض دار پر اپنے حق کے اثبات میں تین طرح کی دستاویز اور وثیقہ حاصل رہتا ہے: گواہی، رہن اور ضمانت۔

رہن مشروع ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ’’رھان مقبوضۃ‘‘ (البقرۃ ۲۸۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے مشروع کیا ہے جو خریدے اور ابھی قبضہ نہ کیا ہو کہ رہن لے اور اس پر قبضہ کرے تاکہ اس کا حق ضائع نہ ہو۔

بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے بدلہ رہن رکھی جس کو آپ نے اس یہودی سے اپنے گھر والوں کے لیے خریدا تھا، اس کا نام ابوالشحم تھا، علی یا ابوبکر رضی اللہ عنہما نے رسول ﷺ کی وفات کے بعد زرہ کا رہن چھڑایا۔ (بخاری: کتاب البیوع، باب شراء الطعام إلی أجل ۲۲۰۰، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب الرھن ۱۶۰۳، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے)

رہن کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع اور اس پر عمل ہے۔ (ابن منذر نے ’’الاجماع‘‘ میں کہا ہے: اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ رہن سفر اور حضر میں جائز ہے۔ البتہ صرف مجاہد نے کہا

ہے: حضر میں جائز نہیں ہے۔ص ۵۷)

رہن کے ارکان چار ہیں:

عقد کرنے والے: وہ راہن اور مرتہن ہیں، ان دونوں کے لیے شرط ہے کہ مکلّف ہوں، مختار ہوں اور مال خرچ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

مرہون: وہ مال جو مرتہن کے پاس رکھا جاتا ہے اور یہ رہن ہے، اس میں شرط ہے کہ وہ کوئی عین چیز ہو، بیع کے قابل ہو اور جلدی خراب نہ ہوتی ہو۔

مرہون بہ: یہ وہ قرض ہے جس کی ضمانت کے طور پر رہن رکھا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قرض کی ادائیگی ہو۔

صیغہ: یہ راہن کی طرف سے ایجاب اور مرتہن کی طرف سے قبول ہے، مثلاً راہن کہے: میں نے تمہارے پاس یہ گھر بطور رہن مجھ پر تمہارے قرض کے بدلہ رکھا۔ مرتہن کہے: میں نے اس کو تم سے بطور رہن قبول کیا۔

جب رہن مکمل ہو جائے تو قبضہ کرنا واجب ہے۔ منقولہ چیز کا قبضہ اس کو اپنے قبضہ میں لینے سے ہوگا، یعنی اس کو راہن کے قبضہ سے مرتہن کے قبضہ میں منتقل کیا جائے گا، جائیداد پر قبضہ اس طرح ہوگا کہ اس کو راہن کے ساز وسامان سے خالی کیا جائے گا اور مرتہن کے حوالہ اس کی چابی دی جائے گی، زمین پر قبضہ کا طریقہ یہ ہے کہ راہن کی ملکیت والی ہر چیز سے اس کو خالی کیا جائے گا اور مرتہن کے حوالہ کی جائے گی، ان دونوں صورتوں میں یہ کہنا ضروری ہے: ''میں نے اپنا گھر یا زمین تمہارے پاس رہن رکھ دی''۔ اس سے بعض چیزیں مستثنی ہیں کہ جس کی بیع تو صحیح ہوتی ہے، البتہ رہن صحیح نہیں ہوتا، مثلاً منافع ہیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے: میں نے تم کو اپنے گھر میں رہنے کا حق رہن میں دیا۔ کیوں کہ مرتہن اس گھر میں رہ نہیں سکتا ہے، اور اس وجہ سے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ رہنے کی منفعت ختم ہو جاتی ہے، اور مرتہن کو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا ہے، اس صورت میں بیع صحیح ہے، البتہ رہن صحیح نہیں ہے۔

اس غلام کو رہن میں رکھنا صحیح نہیں ہے جو مالک کی موت کے بعد آزاد ہونے والا ہو، اسی

طرح اس غلام کو رہن میں رکھنا صحیح نہیں ہے جس کی آزادی کسی شرط کے ساتھ معلق ہو اور یہ شرط کل پوری ہونے والی ہو، اس صورت میں مرتہن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں آتی ہے جس سے اس کے حق کی ضمانت ملے، یہ بھی ان حالات میں سے ہے جن کی بیع تو صحیح ہے، لیکن رہن صحیح نہیں ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۲/ ۷۵۷، ''حاشیۃ القلیوبی'' ۲/ ۲۶۴)

ایسی کسی چیز کو رہن میں رکھنا صحیح نہیں ہے جو جلدی خراب ہو جاتی ہو مثلاً رطب کھجور جو ابھی سوکھا نہ ہو، کیوں کہ اس کی بیع تو صحیح ہے، البتہ رہن صحیح نہیں ہے۔

بعض ایسی چیزیں ہیں جن کو رہن میں رکھنا صحیح ہے، لیکن بیع صحیح نہیں ہے، مثلاً باندی کو رہن رکھنا اس کے بچے کو چھوڑ کر، جب کہ اس کو رہن میں رکھنا جائز ہے، اس کو اس کے دودھ پیتے بچے کے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی حربی کافر کے پاس ہتھیار رہن میں رکھنا جائز ہے جب کہ اس کے ہاتھ ہتھیار بیچنا جائز نہیں ہے، کسی مسلمان غلام کو کافر کے پاس رہن رکھنا، جب کہ کافر کے پاس نہ ہتھیار امانت میں رکھے جائیں گے اور نہ مسلمان غلام، بلکہ یہ ایسے شخص کے پاس رکھے جائیں گے جو قابلِ بھروسہ ہو جب ان دونوں کی ادائیگی کا وقت قریب آ جائے اور ان کو کسی مسلم کے ہاتھ بیچا جائے۔

باندی کو اس کے دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر رہن میں رکھنے کی صورت میں بیچنے کی ضرورت پیش آئے تو باندی اور بچہ دونوں کو ساتھ بیچا جائے گا، کیوں کہ اسلامی شریعت ماں اور اس کے دودھ پیتے بچے کو الگ کرنے سے منع کرتی ہے، (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کوئی ماں اس کے بچے سے الگ نہیں کی جائے گی''۔ بیہقی۔ السنن الکبری ۸/ ۵) رہن میں رکھی ہوئی چیز مرتہن کے پاس امانت ہے، یعنی اگر مرہونہ مال مرتہن کی کسی کوتاہی کے بغیر ضائع ہو جائے تو مرتہن پر کوئی تاوان نہیں ہے، اور اس کے حق میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جائے گا، حدیث شریف میں ہے: ''رہن اس کا ہے جس نے رکھنے کے لیے دیا ہے، اس کا فائدہ بھی اسی کے لیے ہے اور اس کا نقصان بھی اسی پر ہے''۔ حاکم اور ابن حبان نے یہ روایت کی ہے، حاکم نے کہا ہے: یہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ (مستدرک حاکم: ۲/ ۵۱، دارقطنی ۳/ ۳۲، ابن حبان

۵۹۳۴، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التلخیص الحبیر''۳/۳۶)

رہن راہن کی ملکیت ہے، اور اس کو رہن سے اس صورت میں فائدہ اٹھانے کا حق ہے جب استعمال سے اس میں کمی نہ آتی ہو؛ مثلاً کسی جانور پر سواری یا اس کا دودھ دوہنا یا گھر میں رہنا، کیوں کہ راہن مالک ہے، اگر رہن ضائع ہو جائے تو راہن پر اس کا تاوان ہے، بعض ایسے حالات ہیں جن میں مرتہن کا قبضہ مرہونہ چیز پر بطور امانت نہیں ہوتا ہے، بلکہ ید ضمانت ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص گھر غصب کرے اور اس سے راہن کوئی قرض لے اور اس کے پاس گھر تاوان میں رکھے جس پر اس نے غصب کر کے قبضہ کیا ہو، اس صورت میں اگر یہ گھر ضائع ہو جائے جو اصل میں غصب کیا ہوا ہے تو اس کا تاوان مرتہن پر ہے۔

جب رہن میں رکھی ہوئی چیز غصب کی جائے، مثلاً کسی شخص کے پاس بطور رہن کوئی چیز رکھی جائے، پھر مرتہن اس گھر پر زیادتی کرنے لگے، اس کے کمرے نکال دے، اور اس کے ایک حصے میں رہنے لگے اور وہاں لوہاری کا کام شروع کرے اور گھر مکمل طور پر گر جائے تو یہ گھر رہن میں رکھا ہوا رہنے کے باجود مرتہن کی طرف سے استعمال میں لایا ہوا حصہ غصب کیا ہوا مانا جائے گا، اور اس پر مکمل تاوان ہے، اور اس کا قبضہ ید ضمانت ہو جائے گا۔

اگر رہن میں رکھی ہوئی چیز عاریت پر دی جائے مثلاً راہن اپنا قرض مرتہن کے حوالے کرے اور کہے: جو گھڑی تمہارے پاس رہن میں رکھی ہوئی تھی اس کو اپنے پاس عاریت کے طور پر رکھئے۔ اس صورت میں مرتہن کا قبضہ ید ضمانت ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ گھڑی ضائع ہو جائے یا اس میں عیب پیدا ہو جائے تو مرتہن پر ضروری ہے کہ اس کا تاوان ادا کرے۔

اگر کوئی مالک سے دیکھنے یا تجربہ کی غرض سے کوئی سامان لے تاکہ پسند آنے پر خریدے تو بھی یہی حکم ہے، جب بائع اس سے کہے: یہ سامان تمہارے پاس رہن کی طرح باقی رہے، تو اس کو کوئی نقصان ہونے کی صورت میں اس کا تاوان لینے والے کے ذمہ ہے۔

کوئی چیز خریدے اور اس کی قیمت بائع کے حوالہ کرے، لیکن بائع بیع میں رجوع کرے اور مشتری یہ چیز بائع کو لوٹانے پر راضی ہو جائے، جب بائع اس سے کہے: یہ

تمہارے پاس رہن ہے، تو مشتری کسی طرح کے بھی نقصان کا ضامن ہوگا اور اس پر نقصان کی بھرپائی ضروری ہوگی۔

اگر شوہر اپنی بیوی کو خلع دے اور بیوی شوہر کو خلع کے مقابلہ میں گھر دے، پھر شوہر بیوی سے کہے: گھر تمہارے پاس رہن ہے۔ اس صورت میں گھر میں کسی طرح کا نقصان ہو جائے تو بیوی پر اس کے نقصان کا تاوان ہے۔

رہن ہمیشہ قرض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اور یہ لازم قرض ہے، رہن کسی جعالہ کے مقابلہ میں صحیح نہیں ہے۔

جب کوئی دوسرے سے کہے: جاؤ اور میرے لیے ایک لاکھ درہم قرض لو اور اس میں سے تمہارے لیے دس ہزار درہم ہے، تو اس صورت میں ان دس ہزار درہم کے لیے رہن پیش کرنا صحیح نہیں ہے جو مطلوبہ مبلغ ملنے کے بعد دیا جائے گا۔

جب کوئی شخص اپنا گھر ایک لاکھ درہم کے مقابلہ میں رہن رکھے تو اس وقت تک گھر رہن میں رہے گا جب تک کہ پورا مبلغ ادا نہ کیا جائے، اور اس وقت بھی رہن نہیں چھوٹے گا جب ننانوے ہزار نو سو ننانوے درہم ادا کیا جائے، اور صرف ایک درہم باقی رہے، شرعی اصول کہتا ہے: ''مکاتب اس وقت تک غلام ہے جب تک کہ اس پر ایک درہم بھی باقی ہو''۔ (یہ اس حدیث سے مستفاد ہے جس کو امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے، یہ روایت حضرت علی پر موقوف ہے ۲/ ۷۸۷، اور ابوداود ۳۹۲۶ نے حسن سند سے موصولا اس کو روایت کیا ہے، یہ روایت عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ ہے۔ اس کی مکمل تخریج کے لیے دیکھا جائے: ''التلخیص الحبیر''۴/ ۲۱۶)

اگر کوئی شخص ایک سو گناہ کرے اور ننانوے گناہ سے توبہ کرے اور ایک گناہ باقی ہو تو اس کی توبہ اس وقت تک مکمل قبول نہیں ہوگی جب تک کہ وہ باقی بچے ایک گناہ سے توبہ بھی نہ کرے۔

اگر پچاس ہزار درہم کے بدلہ آدھا گھر رہن میں رکھے، پھر آدھا گھر دوسرے پچاس ہزار کے بدلہ رہن میں رکھے، اگر وہ پہلے والے پچاس ہزار روپئے قرض ادا کرے تو آدھا گھر اس کا ہوگا اور آدھا رہن میں رہے گا، جب دوسرے پچاس ہزار ادا کرے گا تو پورا گھر رہن سے آزاد ہو جائے گا۔

مکاتبہ

مکاتبہ کے لغوی معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔

شریعت میں مکاتبہ سے مراد دو اوقات یا زیادہ اوقات پر منقسم عوض کے بدلہ کسی غلام کو آزاد کرنے کا معاہدہ کرنا۔ مثلاً کوئی اپنے غلام سے کہے جس کو اس نے مال دے کر خریدا ہو: ”میں نے تم کو ایک ہزار درہم کے بدلہ آزاد کر دیا جو تم دو قسطوں میں مجھے ادا کرو گے“۔

یہ بات معلوم اور مشہور ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے وقت ہوا جب غلاموں کی تجارت سب سے اہم تجارت بن گئی تھی اور اس وقت سب سے بڑی تجارتی منڈی غلاموں کی تھی؛ اس وقت اسلام نے غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور ان کی انسانیت کا احترام کرنے کا تاکیدی حکم دیا، یہاں تک کہ اسلام نے غلام کو آزاد کرنے کو اللہ کے افضل تقربات میں سے شمار کیا، اسی وجہ سے امام رویانی نے کہا ہے: مکاتبہ اسلامی ہے۔ (تقی حصنی نے یہ قول ”کفایۃ الأخیار“ میں نقل کیا ہے ۲/۴۰۲) یعنی یہ ایسا حکم ہے جو اسلام نے سب سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس کا رواج زمانہ جاہلیت میں نہیں تھا۔

غلاموں کو آزاد کرنے کے بہت سے طریقے ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کے ساتھ اس بات پر متفق ہو جائے کہ غلام آزادانہ کام کرے گا اور اپنے آقا کو ایک مبلغ ادا کرے گا اور اس طریقہ سے خود کو خرید لے گا۔

ان طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت نے مکاتبین کے تعاون کے لیے مال کی زکوۃ کا ایک حصہ مخصوص کیا ہے، جو اپنے اوپر ضروری مبلغ ادا کر کے خود کو اپنے آقا سے خرید لیتے ہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ”وَفِي الرِّقَابِ“ (التوبۃ ۶۰) اسلام نے غلاموں کی آزادی کو زکوۃ کے مصارف میں شامل کیا ہے جس کے ذریعہ مسلمان اللہ

تعالی کا قرب حاصل کرتا ہے۔

اسی سیاق میں اسلام نے بہت سے کفاروں میں غلام کی آزادی کو رکھا ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

قسم کا کفارہ: غلام آزاد کیا جائے۔

رمضان میں دن کے اوقات میں جماع کا کفارہ: اس دن روزہ توڑنے کے بدلہ غلام آزاد کیا جائے۔

ظہار کا کفارہ: ایک غلام کی آزادی۔

قتل کا کفارہ؛ چاہے وہ قتلِ عمد ہو یا قتلِ خطا، چاہے کوئی خودکشی کرے: ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔

یہ بات معلوم ہی ہے کہ ان میں سے کسی بھی کفارہ میں غلام آزاد کیا جاتا ہے تو اس کا مسلمان اور بیماریوں سے پاک رہنا ضروری ہے۔

عقدِ مکاتبہ باقی معاملات سے مختلف ہے، کیوں کہ آقا اور اس کے غلام کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے، گویا کہ کوئی اپنا مال اپنے مال کے لیے ہی بیچتا ہے، کیوں کہ اس سے غلام کے لیے ملکیت ثابت ہوتی ہے اور مال غلام کے ذمہ میں اس کے آقا کے لیے ثابت ہوتا ہے۔

مکاتبہ مشروع ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ”وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ“ (النور۳۳) (اور تمہارے غلاموں باندیوں میں سے جو مُکاتب بننا چاہیں) اس آیت میں آقاؤوں کو الٰہی حکم ہے کہ وہ اپنے غلاموں کے ساتھ مکاتبہ کریں اگر ان کو اس میں بھلائی معلوم ہو، یعنی یہ معلوم ہو کہ غلام کمائی کی طاقت رکھتا ہے اور مکاتبہ کا مبلغ اپنے آقا کو ادا کر سکتا ہے، بلکہ اللہ عزوجل نے مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ ایسے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے وہ اپنی زکوۃ کا ایک حصہ دیں اور ان کو صدقات دیں۔

رسول اللہ ﷺ نے مکاتب غلام کی آزادی میں تعاون کرنے کے عظیم ثواب کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ہے: ”جو کسی قرض دار یا غازی یا مکاتب کو غلامی سے چھڑانے

کے لیے مدد کرے تو اللہ اس دن اپنے سایہ میں اس کو سایہ دے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا''۔ (مستدرک حاکم: کتاب الجهاد ۲۳۸۵، بیہقی: السنن الکبری ۳۲۰/۱۰) بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی کسی مسلمان شخص کو آزاد کرے تو اللہ اس کے ہر عضو کے بدلہ اس کے ہر عضو کو جہنم سے بچائے گا''۔ (بخاری: کتاب العتق، باب ماجاء فی العتق وفضلہ ۲۵۱۷، مسلم: کتاب العتق، باب فضل العتق ۱۵۰۹)

مکاتبہ کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس پر عمل ہے۔ (''الإجماع'' ابن منذر ۶۵)

عقدِ مکاتبہ کے ارکان

مکاتبہ کے چار ارکان ہیں:

۱۔ غلام کا مالک: مالک کے لیے شرط ہے کہ وہ آزاد ہو اور مکمل اہلیت رکھنے والا ہو، اسی وجہ سے ایک غلام دوسرے غلام کو آزاد نہیں کرسکتا ہے؛ اسی طرح اگر کسی کو آزاد کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کا شمار نہیں ہوگا۔ بچہ، پاگل، مجور علیہ (جس پر بیوقوفی یا اسراف کی وجہ سے تصرف پر پابندی عائد کی گئی ہو) کی طرف سے صحیح نہیں ہے، کافر، سکران (نشہ میں موجود) اور اندھے کی طرف سے جائز ہے کہ اپنے غلاموں کے ساتھ مکاتبہ کا عقد کریں۔

۲۔ غلام: اس کے لیے شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل اور مختار ہو، اور خود کو مکمل خریدے، کیوں کہ اگر خود کو کامل نہ خریدے تو اس کو اپنی آزادی کے لیے کام اور کمائی کی آزادی ہرگز نہیں رہے گی۔ اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ اس کی گردن پر ثابت حق نہ ہو، مثلاً رہن میں رکھا ہوا ہو (دیکھا جائے: ''عجالة المحتاج'' ۱۸۸۶/۴) کیوں کہ رہن میں رکھے ہوئے غلام کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ مکاتبہ کرے، کیوں کہ رہن بیع کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

ام ولد اپنے آقا کے ساتھ عقدِ مکاتبہ کرسکتی ہے، ام ولد وہ باندی ہے جس کو اپنے آقا سے بچہ ہوا ہو، کیوں کہ وہ اپنے کام کے فائدوں کی مالک ہے اور وہ مکاتبہ کی قیمت اپنے آقا کو دے سکتی ہے۔

جو آدھا آزاد ہو اور آدھا غلام ہو تو وہ مکاتبہ کرسکتا ہے کہ اپنا باقی آدھا حصہ آزاد کرے۔

غلام اپنے دو مالکوں سے مکاتبہ کرسکتا ہے جب اس غلام کے دو آقا ہوں۔

۳۔ عوض: یہ مکاتبہ کی قسطیں ہیں جن کو ادا کرنا واجب ہے، اسی طرح ادائیگی کی میعاد بھی مقرر رہنا ضروری ہے، یہ دو قسطوں سے کم نہ ہو، مکاتبہ کی قسطیں مکاتبہ کا مبلغ اور اس کی مدت بھی ہے۔

اگر ہم مان لیں کہ مکاتبہ کا مبلغ ایک ہزار پانچ سو درہم ہے، اور اس کی قسطوں کی تعداد تین ہیں، اور ہر قسط کی مدت چھ مہینے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مکاتبہ کی قسطیں تین ہیں، یہ ضروری ہے کہ مکاتبہ کی قسطیں متعین ہوں اور ادائیگی کی تاریخ معلوم ہو۔

۴۔ صیغہ یعنی ایجاب وقبول:

ایجاب یہ ہے کہ مالک کہے: ''میں تمہارے ساتھ ایک ہزار درہم پر مکاتبہ کرتا ہوں کہ تم اس کو دو قسطوں میں ادا کرو، جب تم دو قسطیں ادا کرو تو تم آزاد ہو''۔ غلام کے مالک کے لیے ان الفاظ کا ادا کرنا ضروری ہے، وہ اپنے دل میں اس کی نیت بھی کرسکتا ہے یعنی قسطوں کی ادائیگی پر آزادی کو معلق کرے۔ ورنہ مکاتبہ صحیح نہیں ہوتا ہے۔ غلام کے آقا پر ضروری ہے کہ وہ مبلغ کا ایک حصہ ادا کردے یا اس کو مال کا ایک مبلغ دے کر اس کا تعاون کرے، تاکہ اس کو اپنی آزادی جلدی حاصل ہو۔

۔ غلام کی طرف سے قبول یہ ہے کہ وہ اپنے آقا سے کہے: ''میں نے تم سے مکاتبہ کو اس مبلغ پر فلاں مدت کے دوران قبول کیا''۔

عقدِ مکاتبہ غلام کے آقا کے لیے لازم عقد ہے، یعنی وہ اس کو فسخ نہیں کرسکتا ہے، اور غلام کے حق میں جائز عقد ہے، یعنی اس کو کسی بھی وقت فسخ کرنے کا حق ہے، مثلاً وہ اپنے آقا سے کہے: ''میں نے عقدِ مکاتبہ کو فسخ کیا اور غلامی کی طرف لوٹ آیا''۔

اگر عقدِ مکاتبہ فاسد ہوجائے کہ فوراً مال ادا کیا جائے، یا عوض کی شرط فاسد ہوجائے مثلاً غلام کی آزادی کی قیمت چند خنزیر مقرر کیے جائیں، تو مکاتب غلام کو کام اور کمائی کی

آزادی باقی رہتی ہے، اس صورت میں ایک نئی چیز یہ ہوتی ہے کہ عقد آقا کے لیے بھی جائز عقد بن جاتا ہے یعنی وہ جب چاہے اس کو فسخ کرسکتا ہے، اس میں ایک توجیہ یہ ہے کہ کوئی بھی عقد فاسد ہوجائے تو اس کی حقیقی قیمت مفقود ہوجاتی ہے۔

اگر عقدِ مکاتبہ فسخ ہوجائے تو مالک لیا ہوا مال غلام کو واپس کردے گا۔ (دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۸/ ۴۲۷) صحیح عقد کی صورت میں اگر آقا مکاتبہ کی تمام قسطوں پر قبضہ کرنے سے پہلے انتقال کرجائے تو غلام پر ضروری ہے کہ وہ اپنی آزادی کے عوض باقی قسطیں وارثین کے حوالے کرے۔

اگر عقدِ مکاتبہ فاسد ہوا اور غلام آقا کے علاوہ دوسرے کو مکاتبہ کی قسطیں ادا کرے تو کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ فاسد عقد، مکاتبہ کی وجہ سے آزاد نہیں ہوتا ہے جب اس کے آقا کا انتقال آزاد ہونے سے پہلے ہوجائے۔

جس طرح آقا اپنے غلام کے ساتھ عقدِ مکاتبہ کرسکتا ہے اور اس کی آازادی کے عوض مال طلب کرسکتا ہے، اسی طرح وہ غلام کو اس کے ہاتھوں مکاتبہ کے بغیر بھی بیچ سکتا ہے، مثلاً کہے: میں تم کو تمہارے ہاتھ ایک ہزار میں بیچا اور وہ ایک ہزار پر قبضہ کرلے تو غلام آزاد ہوجاتا ہے۔

غلام نے اپنی آزادی کو خرید لیا اور اس کی قیمت آقا کے حوالے بھی کردی، اس کے باجود اس کا حق ولاء اور سابقہ قیادت کا حق اس کے آقا کو ہی حاصل رہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ غلام مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا آقا وارث ہوگا، اگر اس کو ایک بیٹی ہو تو اس بیٹی پر آقا کو ولایت حاصل رہے گی اور وہ اس کی شادی کراسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص غلام کے مالک سے کہے: اپنے غلام کو ایک ہزار کے بدلے آزاد کرو جو میں تمہیں دوں گا، تو غلام اس وقت آزاد ہوجائے گا جب آقا ایک ہزار اپنے قبضے میں لے، اور غلام کا حقِ ولاء اس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اس کو آزاد کرنے کا سبب بنا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

اقرار

اس کو اعتراف بھی کہا جاتا ہے۔

اقرار کے لغوی معنی: ثابت کرنے کے ہیں، اقرار کو ثابت کرنے والے دلائل میں پہلا مقام اور مرتبہ حاصل ہے، اس کے بعد سند یا دستاویز اور گواہی کا نمبر آتا ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص اقرار کرتا ہے کہ وہ فلاں کا ایک ہزار کا مقروض ہے تو پھر کسی سند یا گواہی کی ضرورت باقی نہیں ہے، جب کہ سند اور گواہی کے مختلف درجات ہیں۔

اقرار کے شرعی معنی یہ ہے کہ اپنے اوپر دوسرے کا حق ہونے کی خبر دے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ'' (النساء ۱۳۵) انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن کر رہو خواہ وہ خود تم پر پڑے۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انیس! اس کی بیوی کے پاس جاؤ، اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو سنگسار کردو''۔ (بخاری: کتاب الحدود، باب الوکالۃ فی الحدود ۲۳۱۴، صحیح مسلم: کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنا ۳۲۹۶)

حدیث میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اقرار قطعی دلیل ہے، کیوں کہ زنا چار گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہوتا، اور ان میں سے ہر ایک کو یہ گواہی دینا ضروری ہے کہ اس نے زنا کا واقعہ دیکھا ہے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی اپنے خلاف گواہی کو کافی قرار دیا ہے، اور اس کو چار گواہوں کے برابر مانا ہے، اگر اقرار کافی نہیں ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انیس بن ضحاک کو اس طرح کے اہم واقعہ میں یہ کہہ کر روانہ نہ کرتے کہ اگر عورت اپنے زنا کا اقرار کرے تو اس کو سنگسار کردو۔ اقرار کے صحیح ہونے پر امت کا اجماع

ہے اور معاملات میں اس کا اعتبار کیا ہے۔

اقرار کے ارکان: (دیکھا جائے: ''فتح الوھاب''، شیخ الاسلام زکریا ۱/۲۲۳)

اقرار کے ارکان چار ہیں:

۱۔اقرار کرنے والا: یہ وہ شخص ہے جو دوسرے کے لیے اپنے ذمہ کسی حق کا اعتراف کرتا ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ وہ آزاد اور مکلّف ہو، اس پر مال میں تصرف کی پابندی نہ ہو اور اس کو مطلق تصرف کا اختیار ہو۔

۲۔مقرلہ: وہ شخص جس کے لیے کسی حق کا اعتراف کیا جائے۔

۳۔مقر بہ؛ وہ حق جس کا اقرار کیا جاتا ہے۔

۴۔صیغہ؛ یہ وہ لفظ ہے جس سے اقرار مکمل ہوتا ہے۔

اقرار یہ ہے کہ مثلاً کہے: مجھ پر زید کے لیے ایک ہزار درہم ہے۔

پاگل اور بچے کا اقرار ان امور میں قبول نہیں کیا جائے گا جن کی بات معاملات میں قبول نہیں کی جاتی، مثلاً خرید وفروخت، عقود، اجارہ اور رہن وغیرہ، اسی طرح عقود کے فسخ میں بھی قبول نہیں ہے، البتہ ممیّز پاگل اور وہ بچہ جس سے جھوٹ کا واسطہ نہ پڑا ہو؛ اجازت سے گھر میں داخل ہونے میں، ہدیہ اور خط پہنچانے میں بات قبول کی جائے گی۔

پابندی لگائے جانے سے پہلے کے قرض کا اقرار مفلس کرے تو صحیح نہیں ہے، مثلاً کسی شخص کے پاس ایک ہزار درہم ہو اور اس پر ایک ہزار درہم کا قرض ہو، قرض خواہ قاضی سے اس پر پابندی لگانے اور اس کو مال میں تصرف کرنے سے روکنے کا مطالبہ کریں تا کہ ان کے حق ضائع نہ ہوں، تو اس کو اپنے اوپر پابندی لگائے جانے سے پہلے والے معاملات کا اقرار کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس کے ذریعہ یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے مال کی تقسیم میں شریک کرے، اس سے ان قرض خواہوں کو نقصان ہوگا جنھوں نے اس کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تصرف کرنے سے روک دیا ہے، البتہ اس کو ایسے معاملات کے اقرار کا حق ہے جو اس نے تصرف پر پابندی عائد کرنے کے بعد کیے ہیں، کیوں کہ اس کا

یہ اقرار اس کے ذمہ سے متعلق ہے، اس کے مال سے نہیں، کیوں کہ اس صورت میں قرض خواہوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

ایسے سفیہ کا اقرار صحیح نہیں ہے جس پر بیوقوفی کی وجہ سے پابندی عائد کی گئی ہو۔ (سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جس کو مالی سمجھ بوجھ حاصل نہ ہو اور ایک سو قیمت والی چیز کو دس میں بیچتا ہو، اور دس روپیوں والی چیز کو سو میں خریدتا ہو) شریعت نے اس کو مالی تصرف سے روکنے کا حکم دیا ہے تا کہ اس کا مال ضائع نہ ہو۔ (اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ولا تؤتوا السفھاء أموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما'' النساء ۵)

ان چیزوں میں سفیہ کا اقرار قبول کیا جائے گا جس کا تعلق مال سے نہ ہو، یعنی جس کا تعلق بدن سے ہو مثلاً نذر، نماز، روزے اور حج کا اقرار کرے، حج میں اس کے ساتھ ایک شخص بھیجا جائے گا تا کہ وہ سفیہ پر خرچ کرے، تا کہ وہ اسراف نہ کر سکے۔

حدود میں سفیہ کا اقرار قبول کیا جائے گا مثلاً چوری کا اقرار کرے، اس صورت میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، قتل کا اقرار کرے تو اس کو قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا، طلاق کا اقرار کرے تو اس کے اور بیوی کے درمیان علیحدگی کی جائے گی اگر اس نے تین طلاق دیا ہو۔ (دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی)

اگر سفیہ اپنی بیوی کو خلع دے تو اس کو قبول کیا جائے گا، چاہے کم مبلغ پر ہی کیوں نہ ہو، اس سے ظہار اور ایلاء کا اقرار بھی قبول کیا جائے گا، اسی طرح اپنی بیوی کو ایک طلاق دینے کی صورت میں رجوع کا اقرار بھی مانا جائے گا۔

بیوی کے حق میں لعان کے ذریعہ نسب کی نفی کے اقرار کو بھی قبول کیا جائے گا یا پابندی کے حق میں قسم کو مانا جائے گا، اپنے لیے کسی دوسرے کے نسب کے صحیح ہونے کا اقرار کرے تو بھی اس کو قبول کیا جائے گا جب اس کے صحیح ہونے کا احتمال ہو، مثلا سفیہ کی عمر پچاس سال ہو اور دوسرے کی عمر بیس سال ہو، اگر اس کا احتمال نہیں ہے تو قبول نہیں کیا جائے گا مثلاً سفیہ کی عمر بیس سال ہو اور جس کے نسب کا اپنے لیے دعوی کر رہا ہے اس کی عمر پچاس سال ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ سفیہ کا اقرار حدود، قصاص، بدنی عبادات، طلاق، ظہار، ایلاء، رجوع، نسب کی نفی، اور کسی کا نسب اپنے ساتھ ملانے میں قبول کیا جائے گا۔

آقا کے خلاف اس کے غلام کا اقرار صحیح نہیں ہے، البتہ خود آقا اس کو کسی معاملہ کی ذمہ داری سونپے تو قبول ہے، اور وہ خود یہ معاملہ انجام دے۔ اگر غلام اپنے جسم سے متعلق اقرار کرے تو اس کو قبول کیا جائے گا یعنی حدود، قصاص اور طلاق میں۔

اگر غلام قتل کا اقرار کرے اور اس سے قصاص نہ لیا گیا ہو، کیوں کہ مقتول کے اولیاء اس کو معاف کر دے اور اس پر دیت لازم ہوجائے تو اس دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی کے ذمہ ہے، اور اس پر ضروری ہے کہ جب وہ آزاد ہوجائے اور اپنی محنت سے مال کمائے تو اس دیت کو ادا کرے گا۔

اگر غلام چوری کا اقرار کرے اور اس کی تصدیق اس کا آقا کرے تو چوری کیا ہوا مبلغ اس کے ذمہ میں داخل ہوجاتا ہے، غلام کسی ایسے معاملہ میں قرض کا اقرار کردے جو آقا کی اجازت سے ہوا ہو تو یہ قرض غلام کے پاس موجود مال اور اس کی کمائی سے پورا کیا جائے گا۔

صحیح اقرار انکار کو قبول نہیں کرتا ہے، یعنی جب وہ اقرار کرے کہ زید کا ایک سو درہم کا قرض دار ہے تو اس کے لیے اپنے اقرار میں رجوع کرنا صحیح نہیں ہے، مثلاً کہے: میں اس کا قرض دار نہ ہو۔ (کیوں کہ حقوق العباد میں اقرار کرنے کے بعد رجوع صحیح نہیں ہے) ہم نے یہ بات پہلے بتادی ہے: اقرار اسی کی طرف سے صحیح ہے جو بالغ عاقل مختار مطلق الارادہ ہو جس پر پابندی نہ لگائی گئی ہو، جب اقرار صحیح ہوگیا تو اس میں رجوع صحیح نہیں ہے، سوائے ارتداد کی صورت میں، کیوں کہ مرتد کلمہ کفر سے رجوع کرسکتا ہے کہ وہ کہے: لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ۔ میں مسلمان ہوں اور اسلام کے علاوہ ہر کسی دین سے بری ہوں۔

زنا کے اقرار میں رجوع قبول کیا جائے گا، کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس نے غلطی سے انکار کیا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''مسلمانوں سے جتنا ہوسکے حدود دور کردو''۔ حاکم نے یہ روایت کی ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (مستدرک حاکم ۴/۳۸۴، مصنف ابن أبي شيبة: ۸۵۵۱، سنن الدار قطنی ۳/۸۴۔ اس کی سند ضعیف ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے یزید

بن زیاد دمشقی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الهداية في تخريج أحاديث البداية'' احمد بن صدیق غماری ۸/۵۳۶-۵۳۸)

شراب پینے کے اقرار میں بھی رجوع قبول کیا جائے گا، اسی طرح چوری کے اقرار میں بھی رجوع قبول ہوگا، ڈاکہ ڈالنے کے اقرار میں بھی رجوع قبول کیا جائے گا۔

چوری، ڈاکہ ڈالنے کے اس اقرار میں رجوع سے صرف حد نافذ نہیں ہوگی، البتہ جس مال کو چوری کرنے کا اقرار کیا ہے اس کو واپس کرنا واجب ہے۔

چوری کیا ہوا مال جس کا ہے وہ چور کو اس وقت تک معاف کرسکتا ہے جب کہ ابھی مقدمہ سلطان کے پاس نہ پہنچا ہو، اگر چوری کا مقدمہ سلطان تک پہنچ جائے تو صاحبِ مال کی طرف سے معافی قبول نہیں ہوگی، اور شرعی حد نافذ کرنا ضروری ہے۔ (دیکھا جائے: ''التهذيب'' بغوی ۷/۳۳۴۔ انھوں نے مخزومیہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس نے چوری کی تھی اور قریش والوں کے لیے اس کا معاملہ بڑا اہم بن گیا تھا)

اگر اقرار مبہم ہو تو اس کو اقرار کرنے والے کی طرف سے وضاحت کا مطالبہ کرنا ضروری ہے، مثلاً کوئی شخص کہے: میری گردن پر زید کا بہت بڑا قرض ہے۔ قرض کی مقدار کے بارے میں اس سے سوال کرنا واجب ہے، اگر وہ کہے: ایک درہم۔ تو اس سے قبول کیا جائے گا، کیوں کہ اس کی مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اس نے حق کے بغیر ایک درہم لیا ہے اور اس کو اپنے لیے حلال سمجھ لیا ہے تو اس نے کفر کیا، جو مال لینے والے کے لیے کفر کا سبب بن جائے وہ حقیقتاً بڑا ہی گھٹیا مال ہے چاہے ایک درہم ہی کیوں نہ ہو۔ (ایضاً ۴/۲۳۶)

کسی بھی کرنسی میں قرض کا اقرار کیا جائے تو اس شہر میں رائج کرنسی کے ذریعہ ادا کیا جائے گا۔

بسترِ مرگ پر مریض کا اقرار اس کے وارثین کے حق میں بھی مقبول ہے اور غیر وارثین کے حق میں بھی، کیوں کہ جس کو اپنی موت کا احساس ہوتا ہے وہ سچ ہی کہتا ہے، چاہے وہ اپنی زندگی میں جھوٹ کا عادی رہا ہو، اگر وہ سچ کرنے میں مشہور ہو تو اس موقع پر بدرجہ اولی سچ کہے گا۔

حق شفعہ

شفعہ کے لغوی معنی ملانے کے ہیں، کیوں کہ دو میں سے ایک حصہ کو دوسرے سے ملایا جاتا ہے۔

شفعہ کے شرعی معنی: قہری اور جبری ملکیت کا حق ہے جو نئے شریک پر قدیم شریک کو اس میں حاصل ہوتا ہے جس کا نیا شریک شرعی طور پر عوض دے کر مالک ہوا ہے۔

مثلاً زید اور عمرو کسی زمین کی ملکیت میں شریک ہوں، عمرو اپنا حصہ بکر کو ایک ہزار درہم میں بیچے، اس صورت میں بکر زید کا نیا شریک ہوا، اس صورت میں زید کو حق شفعہ حاصل ہے، وہ بکر کو اس کی طرف سے عمرو کو ادا کردہ قیمت دے کر اس زمین کے حصے کو اپنے لیے لے سکتا ہے، اور بکر زید کے حوالہ زمین کرنے سے انکار نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ شفعہ ایک جبری حق ہے جس کو شریعتِ اسلامی نے قدیم شریک کو دیا ہے تاکہ اس کو نئے شریک سے نقصان نہ ہو۔

شفعہ کی مشروعیت کی دلیل نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا جس کو ابھی تقسیم نہ کیا گیا ہو، جب حدود متعین کیے جائیں اور راستے الگ الگ بنائے جائیں تو شفعہ کا حق نہیں ہے۔ (بخاری: کتاب البیوع، باب بیع الشریک من شریکہ ۲۲۱۳، ترمذی: کتاب الأحکام، باب ما جاء إذا حدت الحدود ۱۳۷۰)

اگر زمین ابھی تقسیم نہ ہوئی ہو اور اس کے منافع مشترک ہوں یعنی کنواں اور وہاں پہنچنے کا راستہ ایک ہی ہو، پھل جمع کرنے کی جگہ بھی ایک ہو، تو قدیم شریک کو اس زمین میں شفعہ کا حق حاصل ہے، تاکہ ان منافع سے محرومی کی وجہ سے اس کو نقصان نہ ہو جب اس کا شریک اپنا حصہ کسی اجنبی کو بیچ دے۔

صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس شراکت میں شفعہ کا فیصلہ کیا

جس میں رہنے کا گھر یا باغ تقسیم نہ ہوا ہو۔ (مسلم: کتاب المساقات، باب الشفعة ۱۶۰۸، ۱۳۴، ابوداود: کتاب البیوع، باب الشفعة ۳۵۱۳، نسائی: کتاب البیوع، باب بیع المشاع ۷/۳۱۰، یہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے، ابن المنذر نے شفعہ کے جائز ہونے پر اپنی کتاب میں اجماع نقل کیا ہے ''الاجماع'' ص ۵۶)

شفعہ کے ارکان

شفعہ کے ارکان تین ہیں: شفیع: حق شفعہ لینے والا۔ مشفوع علیہ: جس سے شفعہ کا حق لیا جائے۔ مشفوع فیہ یعنی لی جانے والی چیز۔

لینے والے سے مراد وہ ہے جو حق شفعہ کو عوض کے بدلے لیتا ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ وہ زمین یا گھر میں ملکیت میں شریک ہو، چاہے مکاتب غلام ہی کیوں نہ ہو، موقوفہ زمین میں حق شفعہ نہیں ہے۔

جس سے لیا جائے سے مراد وہ شخص ہے جس سے خریدی ہوئی ملکیت چھین لی جاتی ہے اور اس کو ادا کردہ قیمت واپس کردی جاتی ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ اس کی ملکیت قدیم شریک کی ملکیت سے زمانی اعتبار سے بعد میں ہو، اور وہ لازم ملکیت ہو۔

لی جانے والی چیز سے مراد وہ زمین یا گھر ہے جس کو عوض کے بدلہ حق شفعہ کی وجہ سے لیا جاتا ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ اس کو ایک قیمت پر بیچا جاچکا ہو یا کسی عورت کو مہر میں دیا گیا ہو، اس صورت میں قدیم شریک عورت کو مہر مثل دے گا اور مال کو واپس لے گا، یا جس کو اپنے شوہر سے عورت کو دیے جانے والے خلع کے مقابلہ میں دیا گیا ہو، اس صورت میں قدیم شریک زمین لے گا اور اس کی قیمت شوہر کو دے گا، یا وہ زمین مقتول کے اولیاء کو دیت کے طور پر دی گئی ہو اور شفعہ کا مستحق دیت مقتول کے اولیاء کو ادا کرے جس کی مقدار ایک سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے، اور یہ زمین لے لے۔

اگر ملکیت کسی عوض کے بغیر منتقل ہوئی ہو مثلاً وراثت یا وصیت یا ہبہ کی وجہ سے تو اس میں حق شفعہ نہیں ہے۔

شفعہ میں دو شرطیں ہیں:

ا۔جائیداد ہو

۲۔جائیداد تقسیم کے قابل ہو

صیغہ شفعہ کے ارکان میں سے نہیں ہے۔اس کا لفظ یہ ہے: میں نے حق شفعہ کے ذریعہ وہ زمین لی جس کو تم نے میرے شریک سے خریدا ہے، اسی قیمت پر جو تم نے اس کو ادا کیا ہے۔

شفعہ فوری حق ہے، اس لیے قدیم شریک پر ضروری ہے اگر وہ شفعہ کا مستحق ہے کہ اپنے شریک کی طرف سے بیچے جانے کی خبر ملتے ہی شفعہ کی کاروائیاں شروع کرے، اگر رات کو معلوم ہو جائے تو دوسرے دن انتظار سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اگر وہ سفر پر ہو تو سفر سے واپس آتے ہی شفعہ کی کاروائیاں شروع کرے، اور اس پر ضروری ہے کہ حق شفعہ میں اپنی خواہش پر کسی کو گواہ بنائے، کیوں کہ کسی عذر کے بغیر اس کے مطالبہ میں تاخیر کرنے سے حق شفعہ ساقط ہو جاتا ہے۔

حق شفعہ زمین، اس پر موجود تمام چیزوں اور اس کے تابع سبھی چیزوں پر ثابت ہو جاتا ہے۔(دیکھا جائے: ''مغنی المحتاج'' ۳/۳۵۶) مثلاً زمین پر عمارت ہو یا پھل دار درخت ہوں، یا کھیت ہوں جس کو بار بار کاٹا جاتا ہو، یا درخت باقی ہوں، یا ایک مرتبہ سے زیادہ پھل دینے والے درخت ہوں مثلاً ککڑی، کھیرا، شام، ٹماٹر، بھینڈی وغیرہ، یہ سب زمین کے تابع ہیں، اسی طرح زمین میں سمنٹ کے ذریعہ گاڑے ہوئے مِل کے پتھر بھی زمین کے تابع ہیں، جب زمین کو حق شفعہ کے ذریعہ لیا جائے گا تو ان چیزوں کو بھی اس کے تابع مان کر لیا جائے گا۔

زمین کے علاوہ میں حق شفعہ نہیں ہے (اس کو فقہاء منقولات کہتے ہیں، دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۴/۳۳۷) مثلاً دوسری منزل میں حق شفعہ نہیں ہے جو زمین کے تابع نہیں ہے، اسی طرح کرایہ پر لی ہوئی زمین پر تعمیر میں حق شفعہ نہیں ہے، مثلاً کسی زمین کو پچاس سال کے لیے کرایہ پر لے اور کرایہ پر لینے والا اس زمین پر تعمیر کرے اور اس عمارت میں رہے یا اس عمارت کو بیچے، جو زمین کی ملکیت کے تابع نہیں ہے اور اس میں حق شفعہ نہیں ہے۔

دیوار اور اس کی بنیاد بیچی جائے تو حق شفعہ نہیں ہے جب دیوار موٹی نہ ہو اور اس پر

تعمیر کرنا ممکن نہ ہو، اسی طرح درخت اور اس کو بونے کی جگہ بیچی جائے تو حق شفعہ نہیں ہے، کیوں کہ درخت کے ساتھ اس کو بونے کی دوسری جگہ نہیں ہے؛ ان تمام امور میں شفعہ کا حق نہیں ہے، کیوں کہ زمین کے بغیر ہے۔

اس شریک کو شفعہ کا حق حاصل رہتا ہے جو زمین یا گھر میں سے عین چیز میں کسی حصہ کا مالک ہو جب اس کا دوسرا شریک اس عین چیز میں اپنا حصہ بیچنا چاہتا ہو، اس عین چیز میں پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں ہے جو اس میں کسی بھی حصہ کا مالک نہ ہو۔

ایسی زمین میں شفعہ کا حق ثابت ہوتا ہے جو تقسیم کے قابل ہو، البتہ وہ زمین جس کو اگر تقسیم کیا جائے تو اس کی منفعت ختم ہو جاتی ہو تو اس میں شفعہ نہیں ہے، اس لیے اس حمام میں شفعہ کا حق نہیں ہے جس کو دو حمام میں تقسیم کیا جانا ممکن نہ ہو، چکّی میں بھی شفعہ نہیں ہے کیوں کہ اس کو تقسیم کرنے سے منفعت ختم ہو جاتی ہے، چھوٹے گھر میں شفعہ کا حق نہیں ہے جب کسی ایک شریک کا حصہ اس گھر کی مساحت سے دسویں حصہ سے تجاوز نہ کرے، اس لیے دسویں حصے کے مالک کے لیے شفعہ کا حق نہیں ہے اگر دوسرا شریک بیچ دے، کیوں کہ جو دسویں حصہ کا مالک ہے اس کا دعوی اس وقت سنا نہیں جائے گا جب وہ گھر کی تقسیم کا مطالبہ کرے گا۔(''مغنی المحتاج'' ۳/۳۵۷)

شفیع شفعہ کے الفاظ کہتے ہی شفعہ کا مالک ہو جائے گا، اور اس پر ضروری ہے کہ مشتری کے حوالہ وہ قیمت کرے جو اس نے بیچے ہوئے شریک کو ادا کی ہے یا مشتری کو راضی کرے کہ قیمت اس کے ذمہ میں ہے، یا قاضی اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالی أعلم

☆☆☆☆☆

غصب کے احکام

غصب کے لغوی معنی ظلم کر کے کوئی چیز لینے کے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں غصب کہتے ہیں؛ حق کے بغیر دوسرے کے حق پر ظلم وزیادتی کرتے ہوئے قبضہ کرنا۔ (التھذیب للبغوی ۴/۲۹۲، ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۱/ ۲۳۱)

اسی بنیاد پر اگر کوئی مسجد میں بیٹھا ہو اور کوئی دوسرا آئے اور اس جگہ سے ہٹائے اور اس کی جگہ بیٹھ جائے تو یہ ظلم ہے، چاہے پہلے بیٹھنے والا پڑھنے کے لیے بیٹھا ہو یا تدریس کے لیے، یا فتوی دینے کے لیے یا صرف مسجد میں بیٹھنے کی غرض سے؛ یہ ظلم ہے چاہے وہ پہلے والے کی جگہ پر بیٹھے یا نہ بیٹھے، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب بازار میں یا کسی دوسری جگہ پر بیٹھے۔ البتہ اگر وہ دوسرے کے حق پر زیادتی کرے مثلاً وہ حق کے بغیر تاجر کی دکان پر جا کر بیٹھ جائے تو تاجر کو اپنی دکان سے اس کو نکالنے کا حق اور اختیار ہے، اسی بنیاد پر کسی کے لیے بھی کسی سبب کے بغیر دوسروں کے کسی حق پر بھی قبضہ کرنا جائز نہیں ہے، چاہے یہ حق کتنا بھی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

غصب کے حرام ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''**لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ** '' (البقرۃ ۱۸۸) (تم آپس میں اپنا مال باطل طریقہ سے مت کھاؤ) قرآنی تعبیر میں ''**أموالكم**'' کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے، کیوں کہ زندہ قومیں اپنے افراد میں سے ہر شخص کا مال احترام اور اس کی حفاظت کی حیثیت سے تمام لوگوں کا مال مانتی ہیں، کیوں کہ قوم کا کوئی بھی شخص ایک روپئے کا مالک ہو جاتا ہے تو یہ قوم کے خزانے میں اضافہ ہے اور کسی بھی شخص کا کوئی بھی روپیہ ضائع ہو جائے تو یہ قوم کے خزانے میں کمی ہے، اسی وجہ سے قرآنی تعبیر کی عظمت معلوم ہو جاتی ہے جس نے فرد کی دولت کو امت اور قوم کی دولت کا ایک حصہ شمار کیا ہے اور کسی کی بھی دولت کے ایک دینار پر بھی ظلم وزیادتی کو حلال نہیں کیا ہے۔

حدیثِ نبوی میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا یہ دن تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینہ میں حرام ہے''۔ (بخاری: کتاب العلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''رب مبلغ أوعی من سامع''، ۱۶۷، مسلم: کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲۱۸، یہ روایت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق کی حفاظت میں اجتماعی ذمہ داری کی تاکید فرمائی ہے، یہ حدیث مکہ میں شہر ذی الحجہ کے عرفہ کے دن دیے ہوئے خطبہ کا ایک حصہ ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی ہے کہ خون، مال اور عزتوں پر زیادتی کبیرہ گناہوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالی نے حرام کیا ہے اور ان پر زیادتی کرنے والوں کو دردناک عذاب کی دھمکی دی ہے، بخاری و مسلم میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو ایک گز زمین ظلم کر کے لے لے تو سات زمینوں کے بقدر اس کا طوق بنا کر ڈالا جائے گا......''۔ (بخاری: کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا ۲۴۵۲، مسلم: کتاب المساقات، باب تغلیظ تحریم الدماء ۱۶۷۹، ابن حبان: ۳۱۹۵، اس میں حدیث کی مکمل تخریج ہے)

امت کا بھی اجماع ہے کہ غصب شریعت میں حرام ہے۔

کوئی شخص مال غصب کرے اور اس میں کوئی تصرف کرے مثلاً کوئی جائے نماز یا قالین غصب کرے اور اس کو رنگ دے۔ یا زمین غصب کرے اور اس میں درخت لگائے یا اس میں کنواں کھودے، اس صورت میں غصب کرنے والے پر مالک کو لوٹاتے وقت زمین اس حال میں لے آنا ضروری ہے جیسے غصب کرنے سے پہلے تھی۔ اگر اس کی وجہ سے زمین میں کوئی کمی ہو جائے تو تاوان دینا ضروری ہے۔ اگر درخت لگایا ہو تو اپنے لگائے ہوئے درخت نکال کر واپس کرنا ضروری ہے، اسی طرح کنواں کھودا ہو تو کنواں مٹانا ضروری ہے۔

اگر مالک غاصب کی طرف سے زمین میں کیے ہوئے اضافہ یا کمی کو معاف کردے تو غاصب موجودہ حالت میں ہی زمین کو لوٹا سکتا ہے یعنی کنواں مٹائے بغیر، یا درخت اکھاڑے بغیر یا قالین کے رنگ کے ساتھ۔

اگر غصب کیے ہوئے دھاگے کا کپڑا بنایا جائے یا مٹی کو اینٹوں میں تبدیل کر دیا جائے، یا شیشہ بنانے والی ریت شیشہ بنائی جائے، یا سونے چاندی کو ڈھال کر زیورات بنائے جائیں تو اسی حالت میں واپس کرنا ضروری ہے، پھر غصب کرنے والے کو مالک کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کوئی بھی تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ موجودہ شکل میں کوئی بھی تبدیلی کرنے سے اس کی منفعت ختم ہو جاتی ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ۲/۸۸۸)

مال کی ضمانت کے مندرجہ ذیل چھ اسباب ہیں:

۱۔ غصب: اگر کوئی دوسرے کا مال چھین لے تو اس کا ضامن بن جاتا ہے، اگر وہ مال ہو مثلاً گیہوں، چاول، سونا چاندی وغیرہ اور ہر وہ چیز جس کو تول کر یا ناپ کر مقدار معلوم کرنا ممکن ہو تو غصب کرنے والے پر اس کا مثل دینا اس صورت میں واجب ہے جب وہ ضائع ہو جائے۔ اگر غصب کی ہوئی چیز موجود ہو تو وہی چیز مالک کو لوٹائے گا، اگر اس میں کوئی کمی آئی ہو تو وہ چیز لوٹانے کے ساتھ کمی کی قیمت بھی ادا کرے گا، اگر غصب کی ہوئی چیز مال کے ذریعہ قیمت لگائی جانے والی ہو، مثلاً جاندار ہو تو اس صورت میں غصب کرنے والے پر ضروری ہے کہ غصب کرنے کے دن سے لے کر ضائع ہونے تک کے دنوں میں اس چیز کی جو سب سے بڑی قیمت ہو وہ ادا کرے۔ (التہذیب للبغوی ۴/۲۹۳-۲۹۴)

۲۔ بیعِ فاسد: مثلاً کوئی چیز شراب یا کتے کے بدلے خریدے۔ بیعِ فاسد کی صورت میں اگر مبیع (بیچی جانے والی چیز) ضائع ہو جائے تو اس پر ثمنِ مثل دینا ضروری ہے۔ قیمت کا اندازہ حوالگی کے دن سے لے کر ضائع ہونے تک کے دن میں سب سے بڑی قیمت کی بنیاد پر لگایا جائے گا۔

۳۔ عاریت: جب کوئی چیز عاریت پر لینے والے کے ہاتھ میں ضائع ہو جائے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اس چیز کی قیمت عاریت پر دینے والے کے حوالہ کر دے اور اس صورت میں قیمت کا اندازہ ضائع ہونے کے دن میں کیا جائے گا۔

۴۔ کوئی شخص تاجر سے کوئی چیز سیمپل کے طور پر لے کہ اگر اس کو پسند آئے گی تو خریدے گا، مثلاً کسی دکان سے کپڑے کا ایک ٹکڑا بطور سیمپل لے کہ اگر کپڑا پسند آئے گا اس میں سے دس میٹر خریدے گا، اگر اس کے ہاتھوں یہ سیمپل ضائع ہو جائے تو اس کی پوری قیمت کا ضامن ہوگا اور قیمت کا اندازہ تلف ہونے والے دن کی بنیاد پر کیا جائے گا، عاریت اور بطور سیمپل لینے میں ثمنِ مثل اور ثمنِ غیر مثل میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۵۔ کوئی چیز ضائع کر دے: اگر کوئی کسی چیز کو ضائع کر دے تو اس کے ذمے بدلِ مثل یا اس کی قیمت مالک کے حوالے کرنا ضروری ہے۔

۶۔ زیادتی کرے: مثلاً کوئی چیز خریدے اور اس کی قیمت ادا نہ کرے تو اس صورت میں بیچنے والے کو یہ حق ہے کہ وہ خریدی ہوئی چیز خریدنے والے کے حوالے نہ کرے، صرف قیمت کی ادائیگی کی صورت میں ہی کرے۔ اگر خریدنے والا خریدی ہوئی چیز قیمت ادا کیے بغیر لے تو ضائع ہونے کی صورت میں بیچنے والے کو قیمت دینا ضروری ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہاتھ پر ضروری ہے جو لے یہاں تک کہ وہ اس کو ادا کرے''۔ (ابن ماجہ: کتاب الصدقات، باب العاریۃ ۲۳۹۷، ابوداود: کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ ۳۱۰۸، یہ روایت سمرہ بن جندب سے ہے)

ضمانت تاوان کے معنی میں

اس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ ہر وہ چیز جس کو بطورِ سلم بیچا جائے اور اس کی مقدار وزن یا ناپ سے معلوم کی جائے تو اس صورت میں ثمنِ مثل کا تاوان ہے، مثلاً پانی؛ گرم کیا ہوا ہو یا نہ ہو، مٹی، پیتل، مشک، روئی، آٹا، بادام، اخروٹ، تر کھجور، انگور اور مختلف قسم کے سرکہ، ان تمام چیزوں میں بیعِ سلم کرنا صحیح ہے اور ان چیزوں میں ثمنِ مثل کا تاوان ہے۔

مختلف عناصر سے مرکب چیزیں مثلاً معجون اور جوتے جن کو چمڑے وغیرہ سے بنایا جاتا ہے تو ان تمام چیزوں کی خرید و فروخت تو صحیح ہے، البتہ بیعِ سلم یعنی مال دیکھنے سے پہلے ہی خریدنا جائز نہیں ہے۔

ہر وہ چیز جس کی قیمت عدد سے لگائی جاتی ہو مثلاً حیوان، یا ناپ کر مثلاً میٹر یا بالشت یا یارڈ وغیرہ سے تو اس کا تاوان اسی کے مثل ہوتا ہے، اور اس میں خرید وفروخت اور بیعِ سلم دونوں جائز ہے۔

کبھی کبھار ہر اس چیز میں قیمت کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے جس کی قیمت پر اتفاق ہوجائے مثلاً جانور اور ہر اس چیز میں جس کی خریداری بطور سلم جائز نہیں رہتی ہے اور منفعت کا مقابل اور عوض دینا لازم ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص گھر پر ناجائز قبضہ کرے اور اس میں رہے تو اس پر گھر واپس کرنے کے ساتھ رہائش کے بدل کے طور پر اجرتِ مثل دینا بھی ضروری ہے، کرایہ کا حساب اس پوری مدت کا لیا جائے گا جتنی مدت گھر اس کے قبضہ میں رہا ہو، کیوں کہ منفعت کی بھی قیمت رہتی ہے۔

کبھی قیمت کے فرق کی ادائیگی ضروری ہوجاتی ہے، مثلاً کوئی غلام دوسرے غلام پر زیادتی کرکے اس کا ہاتھ کاٹ دے اور ہاتھ کٹے ہوئے غلام کا آقا زیادتی کرنے والے غلام کو قتل کردے تو اس صورت میں مقتول غلام کی قیمت لگائی جائے گی اور کٹے ہوئے ہاتھ کی قیمت طے کی جائے گی، پھر ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کو قتل کرنے والا آقا برداشت کرے گا اور یہ تاوان وہ مقتول غلام کے آقا کو دے گا۔

مندرجہ ذیل چار صورتوں میں تاوان غیرِ مثل ہوتا ہے:

۔مبیع مثلاً کوئی سامان خریدے اور اس کی قیمت ادا کرکے بیچنے والے کے پاس ہی چھوڑ دے، اگر وہ ضائع ہوجائے تو بیچنے والے پر اس کی قیمت کا تاوان لازم ہوجاتا ہے، یہ تاوان وہ اتنی ہی مقدار میں مشتری کے حوالہ کرے گا جتنی قیمت اس نے مشتری سے لی ہے۔

۔مصرّاۃ کا دودھ: مصرّاۃ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن میں اس کو بیچنے سے چند دنوں سے پہلے ہی دودھ چھوڑ دیا جائے، دوہیا نہ جائے، تا کہ تھن بڑا نظر آئے اور خریدنے والا دھوکہ کھا جائے، اگر مشتری اس کو دودھ دوہنے کے بعد واپس کردے تو جانور کے ساتھ ایک صاع یعنی تقریباً تین کلو کھجور واپس کردے گا، یہ کھجور اس جانور کے دوہے

ہوئے دودھ کی قیمت ہے۔(کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:''جو مصرّاۃ بکری خریدے تو اس کو تین دن کا اختیار ہے، اگر اس کو لوٹا دے تو اس کے ساتھ ایک صاع کھانا بھی دے''۔ بخاری: کتاب البیوع، باب النھی للبائع أن لا یحفل الإبل والبقر والغنم ۲۱۴۸، مسلم: کتاب البیوع، باب حکم بیع المصراۃ ۱۵۲۴، یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

۔شوہر کے ہاتھ مہر موجود ہو: اگر بیوی کا مہر شوہر کے ہاتھ میں ضائع ہوجائے، مثلاً کوئی اپنی بیوی کے مہر میں گھوڑا دے پھر یہ گھوڑا شوہر کے ہاتھ میں ضائع ہوجائے تو شوہر کے ذمہ مہرِ مثل اپنی بیوی کو دینا ضروری ہوجاتا ہے، یہاں تاوان مہرِ مثل ہے۔

۔باندی کا جنین: اگر کوئی باندی کے پیٹ پر لات ماردے جس کی وجہ سے اس کا جنین مرجائے تو مارنے والے پر جنین کی ماں کی قیمت کا دسواں حصہ اپنے کرتوت کے تاوان کے طور پر دینا ضروری ہے، البتہ اس میں قیمت کا اعتبار زیادتی کیے جانے والے دن سے جنین کے ساقط ہونے تک کے دن تک سب سے بڑی قیمت کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

کوئی کسی پڑی ہوئی چیز کا مالک بن جائے، مثلاً راستہ پر کوئی گری ہوئی چیز پائے اور اس کا اعلان کرے، اس کا مالک نہ ملے، پھر وہ اس کو بیچ دے، پھر اس کا مالک سامنے آئے تو اس چیز کو اٹھا کر بیچنے والے پر اس دن کی قیمت بطورِ بدل دینا ضروری ہے، جس دن اس نے بیچا ہے، یہ قیمت وہ مالک کے حوالہ کرے گا، اس صورت میں کم یا زیادہ قیمت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اسی طرح اگر رہن میں لینے والے کے پاس مال ضائع ہوجائے تو رہن رکھنے والے کو اسی طرح کی چیز رہن میں لینے والے کے حوالہ بطور رہن کرنا ضروری ہے، اس میں بڑی قیمت یا چھوٹی قیمت کا اعتبار نہیں ہے۔

اگر ضمانت لینے والا قرض خواہ کو اس کے قرض کے بدلے کوئی چیز دے تو قرض دار پر ضامن کو صرف قرض کی قیمت دینا ضروری ہے، یہاں اس کا تعلق نہیں ہے کہ ضامن نے قرض خواہ کو جو کچھ دیا ہے وہ قیمت بڑی ہے یا چھوٹی۔

بعض موقعوں پر چیز کا تاوان دومرتبہ دینا ضروری ہوتا ہے:

ا۔ کوئی شخص دوسرے کے حوالہ ہرن کرے، پھر یہ دوسرا شخص حج اور عمرہ کا احرام باندھے اور ہرن ضائع ہوجائے تو اس صورت میں اس پر لازم ہوجاتا ہے کہ ہرن کی جگہ اسی کی طرح کا کوئی جانور ذبح کرے، یہ جانور بکری ہے، اور اس کا گوشت مکہ میں حرم کے فقراء میں تقسیم کرے، یہ احرام کے دوران شکار مارنے کا فدیہ ہے اور اس پر یہ بھی ضروری ہے کہ مالک کو ہرن کی قیمت دے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ کوئی شخص غلام کو غصب کرے، غصب کے دوران وہ غلام دوسرے غلام کا قتل کردے اور اس کے بعد غصب کیا ہوا غلام بھی مرجائے تو اس صورت میں غلام کو غصب کرنے والے پر ضروری ہوجاتا ہے کہ جس شخص کا غلام غصب کیا ہے اس کی قیمت ادا کرے اور مقتول غلام کے آقا کو اس کی دیت بھی دے۔

۲۔ جب کوئی شخص بیل غصب کرے اور یہ بیل کسی گائے کو مار ڈالے، پھر غصب کرنے والا بیل کو مار ڈالے تو اس صورت میں بیل غصب کرنے والے پر ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ گائے والے کو اس کی قیمت دے جس کو بیل نے مار ڈالا ہے، اور جس شخص کا بیل غصب کیا ہے اس بیل کی قیمت بھی اس کو دے۔

دوسری مثال: ایک شخص اور اس کا بیٹا ایک ہی دن میں شادی کریں، شادی کی رات باپ غلطی سے اپنے بیٹے کی بیوی سے جماع کرے، اور بیٹا غلطی سے اپنے باپ کی بیوی سے جماع کرلے تو اس صورت میں باپ اور بیٹے دونوں پر دو دو مہر لازم ہوجاتے ہیں؛ اپنی بیوی کا مہر اور بیوی کے شوہر کو مہر جس کی بیوی کے ساتھ اس نے غلطی سے جماع کیا ہے، کیوں کہ جماع کرتے ہی اس کے باپ کی بیوی باپ اور بیٹے دونوں کے لیے حرام ہوجاتی ہے، اسی طرح باپ کے اپنے بیٹے کی بیوی سے جماع کرنے سے باپ اور بیٹے دونوں پر حرام ہوجاتی ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لیے ہوجاتی ہے؛ ان میں سے دونوں دو دو مہر ادا کریں گے۔

اگر غصب کی ہوئی چیز بے قیمت ہوجائے یا اس کی افادیت ختم ہوجائے تو غصب کرنے والے کے لیے یہی چیز لوٹانا جائز نہیں ہے، مثلاً نوٹ غصب کرے پھر حکومت کی

طرف سے ان نوٹوں کو بند کردینے کے بعد واپس کردے تو یہ نوٹ قبول نہیں کیے جائیں گے، بلکہ غصب کرنے والے پر اس کی قیمت کی ادائیگی ضروری ہے یعنی نوٹ بند ہونے سے پہلے ان نوٹوں کی جو قیمت تھی وہی قیمت ادا کرے گا۔

اسی طرح اگر کوئی صحراء میں پانی غصب کرے تو چشمہ یا ندی کے پاس پانی لوٹانے کو قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ صحراء میں پانی کی جتنی قیمت ہے وہی قیمت ادا کرنا اس پر ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

☆☆☆☆☆

لقطہ

لقطہ ہر وہ چیز ہے جو عام راستہ پر پڑی ہوئی ہو۔

شریعت کی اصطلاح میں لقطہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو محترم، حرز مثل میں نہ موجود ضائع حق ہو اور اس کے مالک کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ (بغوی نے اس کی تعریف یوں کی ہے: وہ مال جو ضائع پایا جائے تو اس کو اٹھالیا جائے۔ التھذیب ۴/۵۴۶)

اگر لقطہ کسی گھر یا باغ میں پایا جائے تو وہ گھر یا باغ کے مالک کا ہے، البتہ اگر وہ کہے: یہ اس کا نہیں ہے اور وہ ثابت کردے کہ یہ غیر معلوم مالک کی طرف سے دو یا تین دنوں سے چھوڑا ہوا یا ضائع ہے، تو اس صورت میں اس چیز کے ساتھ عمومی لقطہ کا سا معاملہ کیا جائے گا، جس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

اگر ہوا کی وجہ سے کوئی چیز کسی کے گھر میں آجائے اور اس کا مالک معلوم ہو، سمندر کے کنارے پر غرق ہونے والوں کا مال پہنچ جائے، چوہوں کے بلوں یا کوّوں اور حملہ آور پرندوں کے گھونسلوں میں پایا جائے تو یہ سب ضائع مال ہیں اور ان کو مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کیا جائے گا، ان جگہوں کی مثال بیت المال کی طرح ہے؛ اس لیے ایسے مال کو یتیموں، فقراء اور بیواؤں پر خرچ کیا جائے گا۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا'' (القصص ۸) پھر فرعون کے گھر والوں نے ہی ان کو اٹھالیا اس لیے کہ نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ ان کے دشمن ہوں اور کوفت کا باعث ہوں۔

یہ آیت کریمہ قرآن کریم کے ان واقعات میں سے ایک واقعہ کے سیاق میں آئی ہے جو عبرتوں سے معمور ہیں، یہ اللہ کے نبی حضرت موسی علیہ السلام، فرعون مصر اور اس کی بیوی

آسیا کا واقعہ ہے، جب موسی چھوٹے بچہ کی شکل میں ایک لکڑی کے تابوت میں مصر کے دریائے نیل میں فرعون کے محل کے قریب پائے گئے تو ان کو اٹھالیا گیا، جب تابوت کھولا گیا تو فرعون اور آسیہ کو ایک خوبصورت نورانی چہرہ والا بچہ ملا، دونوں اس پر بڑے خوش ہوئے اور اس کا نام ''موشیہ'' (ابن الماء) رکھا اور اس کو اپنا بیٹا بنانے کے لیے اٹھالیا، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہی بچہ فرعون کی ہلاکت اور اس کی حکومت کی تباہی کی وجہ اور سبب بننے والا ہے۔

فقہاء نے اس آیت کریمہ سے لقطہ اور لقیط کا شرعی حکم مستنبط کیا ہے، یہ دونوں ایک چیز میں مشترک ہیں، وہ یہ کہ دونوں عام راستے پر ملتے ہیں، یا سمندر ساحل پر ڈال دیتا ہے، لقطہ کا مالک اور لقیط کا باپ دونوں غیر معروف رہتے ہیں۔ (آیت کریمہ ''لاتقتلوا یوسف وألقوہ فی غیابات الجب یلتقطہ بعض السیارۃ'' یوسف ۱۰، کی تفسیر کے دوران مفسرین نے لقطہ کے احکام کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ دیکھا جائے: تفسیر القرطبی ۹/۱۳۴)

اس آیت میں فقہی مسائل اور عبرتیں ہیں کہ اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یقینی طور پر ہو جاتا ہے، چاہے یہ چیز ایسی ہو کہ اللہ کے سب سے بڑے دشمن نے اپنے گھر میں اللہ کی سب سے محبوب مخلوق کی تربیت کی ہو۔

حدیث نبوی میں لقطہ کی دلیل زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سونے اور چاندی کے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''اس کے برتن اور دھاگے کو پہچان لو پھر اس کا ایک سال تک اعلان کرو، اگر اس کے مالک کے بارے میں معلوم نہ ہو تو اس کو خرچ کرو اور وہ تمہارے پاس امانت رہے، (یعنی جس قیمت پر بیچ کر خرچ کیا ہے وہ قیمت تم پر رہے گی) اگر اس کا مالک کسی بھی دن آئے تو یہ اس کے حوالے کرو، ورنہ تم اس کے ساتھ جو چاہے کرو''۔ اس نے آپ سے گمشدہ اونٹ کے بارے میں دریافت کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے تمہارا کیا تعلق؟ اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ اس کے ساتھ اس کا جوتا اور اس کا مشکیزہ ہے، وہ پانی پر آتا ہے اور درخت کے پتے کھاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے

مالک کے پاس پہنچ جاتا ہے‘‘۔اس نے آپ سے بکری کے بارے میں دریافت کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:’’اس کو لو، کیوں کہ یہ تمہارے لیے ہے یا تمہارے بھائی کے لیے یا کسی بھیڑیے کے لیے‘‘۔(بخاری:۲۴۲۹،مسلم:کتاب اللقطۃ۲۲،۱۷،ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۴۸۸۹)

فقہاء نے لقطہ کی تشریح یہ کی ہے کہ اس کا اعلان اسی جگہ پر روزانہ ایک مدت تک کرے جہاں یہ ملی ہے، پھر ہفتہ میں ایک مرتبہ، پھر مہینہ میں ایک مرتبہ، یہاں تک کہ سال ختم ہوجائے، اس کا اعلان میں مسجد میں نہ کرے، کیوں کہ صحیح حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔(التھذیب۔بغوی۴/ ۵۴۸)

رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کرنے والے حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ تھے۔

لقطہ مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے، لقطہ کے اعلان کی شرعی مدت مکمل ایک سال ان چیزوں کے لیے ہے جو قیمت والی ہے اور مکمل سال اس کا اعلان کرنا ممکن ہو، البتہ غیر قیمتی چیزوں کا اعلان ان کی قیمتوں کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

لقطہ کے ارکان:

اس کے تین ارکان ہیں:

۱۔لقطہ اٹھانا

۲۔لقطہ اٹھانے والا

۳۔لقطہ یعنی وہ چیز جو کہیں پڑی ملے اور اس کے مالک کا پتہ نہ ہو، اور یہ حرز مثل میں نہ ہو اور عام راستے پر ہو۔

اس کی نو قسمیں ہیں:

۱۔لقطہ جانور ہو جو کسی جگہ ملے، اس کا اعلان ایک سال کیا جائے گا، اگر اس کا مالک نہ ملے تو اٹھانے والا اس کا مالک بن جاتا ہے؛ چاہے وہ کتا ہی کیوں نہ ہو، کتا بھی ہو تو کسی بھی دوسرے جانور کی طرح اعلان کرنا واجب ہے، اگر اس کا مالک نہ ملے تو یہ کتا اس کے لیے مخصوص بن جائے گا اور اس طرح اس کی ملکیت میں داخل ہوجائے گا، اگر کوئی نجس چیز ہو اور

وہ خرید وفروخت کے قابل ہو تو اس کے لیے ملکیت نہیں کہا جائے گا، اس کو اختصاص کہا جائے گا، ملکیت کے لیے لفظ استعمال کرنا واجب ہے، یعنی یہ کہے گا کہ میں اس کا مالک بن گیا۔

صحراء میں اگر کوئی جانور ملے جو بھیڑیا اور شکاری جانوروں سے اپنی حفاظت نہ کرسکتا ہو، مثلاً بکری اور بچھڑا وغیرہ، اس کو بطور لقطہ لینا صحیح ہے، تاکہ خائن کے ہاتھ میں نہ پہنچے یا کوئی بھیڑیا اس کا شکار نہ کرے۔

اگر جانور اپنی طاقت کی وجہ سے اپنی حفاظت خود کرسکتا ہو، مثلاً گھوڑا اور اونٹ، یا وہ بھاگ کر اپنی حفاظت کرسکتا ہو، مثلاً خرگوش، یا چھلانگ لگا کر مثلاً کبوتر تو اس کی حفاظت کی غرض سے لینا صحیح ہے، مالک بننے کے ارادہ سے لینا صحیح نہیں ہے۔(مغنی المحتاج۴/ ۸۲)

خانگی جگہ سے مراد عام راستہ، سڑک، محلّہ، مسجد اور مدرسہ وغیرہ؛ وہ جگہیں جہاں لوگ کثرت سے آتے جاتے ہوں۔

اگر لقطہ اٹھانے والا کسی ماکول اللحم جانور کو اٹھائے تو اس کو تین میں سے کسی ایک کا اختیار ہے: اس کا اعلان کرے پھر مالک نہ ملنے کی صورت میں اس کا مالک بن جائے۔ یا اس کو حاکم کی اجازت سے بیچ دے، اگر حاکم نہ ہو تو اپنی طرف سے بیچے گا اور مالک آنے کی صورت میں اس کو دینے کے لیے اس کی قیمت محفوظ رکھے گا۔

۲۔اگر لقطہ جانور نہ ہو اور اس کے خراب ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو مثلاً لوہا، ریت اور المونیم وغیرہ تو اس صورت میں یہ جہاں ملا ہے؛ آبادی میں ہو یا صحراء میں اس کا ایک سال تک اعلان کیا جائے گا، اگر اس کا مالک نہ ملے تو وہ چاہے تو اس کا مالک بن سکتا ہے، یا اس کو بیچ دے اور اس کی قیمت اپنے محفوظ رکھے۔

۳۔جو چیز خراب ہوجاتی ہو مثلاً ہریسہ اور تازہ کھجور جو سوکھی نہ ہو تو اس کو پانے والا اس کا اعلان کرے گا، اگر مالک نہ ملے تو یہ چیز اٹھانے والے کی ملکیت ہوجائے گی، وہ کھا سکتا ہے، اگر اس کا مالک مل جائے تو اس کی قیمت ادا کرے گا۔ اس کا اعلان کرنے کے بعد اس کی قیمت کا مالک نہ ملنے کی صورت میں وہ مالک بن جائے گا، چاہے اسے یہ چیز آبادی

میں ملی ہو یا صحراء میں۔

۴۔ اگر لقطہ حرمِ مکی میں ملے تو صرف اعلان کرنے اور اس کی حفاظت کی نیت سے لے تو صحیح ہے، کیوں کہ حرم کے لقطہ کا مالک ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ (کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ نے مکہ کو حرام کیا ہے، اس لیے یہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال ہوا ہے اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا، نہ اس کا درخت کاٹا جائے، نہ اس کے شکار کو بِدکایا جائے اور نہ وہاں کا لقطہ اٹھایا جائے، سوائے وہ شخص جو اعلان کرنے والا ہو''۔ بخاری نے یہ روایت کی ہے: کتاب اللقطۃ، باب کیف تعرف اللقطۃ ۲۴۳۴، مسلم: کتاب الحج، باب تحریم مکۃ وصیدھا ۱۳۵۳ وغیرہ، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) کیوں کہ مکہ مکرمہ ایسی جگہ ہے جہاں لوگ لوٹ کر آتے رہتے ہیں، یہ امکان ہے کہ لقطہ کا مالک دوبارہ آئے اور اس چیز کو واپس لے یا کسی کو اپنی چیز تلاش کرنے کی ذمہ داری دے اور یہ مالک تک پہنچا دے۔

۵۔ دار الکفر میں کسی کو لقطہ ملے جہاں کوئی مسلمان نہ رہتا ہو اور اس کے شہر کے باشندے حربی ہوں اور وہ امان کا پروانہ لیے بغیر وہاں گیا ہو تو یہ لقطہ اس کے لیے مالِ غنیمت کے حکم میں ہے، اس پر ضروری ہے کہ اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کرے، چار حصے اس کے لیے ہوں گے اور پانچواں حصہ مالِ غنیمت کے پانچ میں سے ایک حصے کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ لوگ آج کل ویزا لے کر دوسرے ملکوں کا سفر کرتے ہیں، اس ویزا کا حکم پروانۂ امن کا ہے، اسی وجہ سے مالِ غنیمت کے طور پر وہاں کا لقطہ اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی ایک بھی مسلمان ہو تو وہاں لقطہ کے سبھی احکام کو منطبق کرنا ضروری ہے۔

۶۔ اگر کسی کو نومولود بچہ عام راستے پر ملے اور اس کے پیٹ پر یا اس کے نیچے یا اس کے گہوارہ میں مال ملے تو یہ مال اس بچہ کا ہے، اگر مال اس کے قریب رکھا ہوا ہو یا زمین کے نیچے مدفون ہو جہاں وہ بچہ سویا ہوا ہو تو اس مال کا حکم لقطہ کا ہے۔ اگر یہ زمین بچہ کی ملکیت ہو تو اس میں مدفون سبھی مال اس بچے کی ملکیت ہے۔

۷۔ اگر لقطہ ایسا جانور ہو جو کعبۃ اللہ لے جا کر قربانی کرنے کے لیے ہو اور اس کے ذبح کا وقت قریب پہنچ چکا ہو تو اس کو پانے والا یہ جانور حاکم کے حوالہ کرے گا یا خود سے ذبح

کرے گا اور فقراء میں اس کا گوشت تقسیم کرے گا، اگر اس کا مالک مل جائے تو مالک کے حوالے اس کی قیمت کرنا ضروری ہے، یہ اس وقت ہے جب اس پر قربانی ضروری ہو، اس صورت میں ملا ہوا قربانی کا جانور اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

۸۔ اگر کوئی حربی کافر مسلمانوں کے شہر آئے اور اس کو لقطہ ملے تو اس سے لیا جائے گا اور کسی مسلمان کے حوالہ کیا جائے گا تا کہ وہ مسلمان اس کا اعلان کرے، اگر اس کا مالک نہ ملے تو یہ مسلمان اس چیز کا مالک بن جائے گا اور اس چیز پر مذکورہ تمام شرعی احکام منطبق ہو جائیں گے۔

۹۔ اگر مرتد کو لقطہ ملے تو اس سے بھی لیا جائے گا اور اس سے لینے والا اٹھانے والے کے حکم میں ہو جائے گا، اس پر ضروری ہے کہ مذکورہ احکام اس لقطہ پر منطبق کرے، اگر مرتد دوبارہ اسلام لے آئے تو لقطہ اس کے حوالے کیا جائے گا اور اس پر خود سے لقطہ کے مذکورہ احکام منطبق کرنا ضروری ہے۔ (التھذیب۔ بغوی ۴/۵۶۳)

غلام کو لقطہ ملے اور وہ اپنے آقا کی اجازت سے اس کو اٹھائے تو اس کا آقا لقطہ کا ذمہ دار ہوگا، اگر وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اٹھائے تو اس سے لیا جائے گا، اگر یہ لقطہ غلام کے ہاتھوں ضائع ہو جائے تو اس کا آقا قیمت کا تاوان بھرے گا اگر غلام نے اس کی اجازت سے اٹھایا ہو، اگر غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اٹھائے اور اس کے پاس یا اس کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اس چیز کی قیمت غلام کے ذمہ رہے گی اور جب بھی اس کو آزادی حاصل ہوگی تو اس کی قیمت کا اس سے مطالبہ کیا جائے گا۔

مکاتب اگر غلامی کی طرف لوٹ نہ آئے تو اس کے پاس اس کا لیا ہوا لقطہ رکھا جائے گا تا کہ وہی لقطہ کے احکام کو منطبق کرے، اگر مکاتب غلامی کی طرف لوٹ آئے تو قاضی اس سے لے گا اور اس کی حفاظت مالک ملنے تک کرے گا۔

اگر لقطہ اٹھانے والا بچہ یا پاگل ہو یا اس پر پابندی لگائی گئی ہو تو اس کا سرپرست اس سے لے گا اور اس کا اعلان کرے گا، اگر اس کا مالک نہ ملے تو یہ سرپرست اس کا مالک بن جائے گا، تا کہ جب بھی مالک آئے تو اس کی قیمت دے، اگر سرپرست لینے میں کوتاہی

کرے اور بچے کے ہاتھ میں ضائع ہوجائے تو سرپرست اس چیز کی قیمت کا ضامن ہوجائے گا۔(''التھذیب''بغوی۴/۵۹۹)

اگر لقطہ اٹھانے والا فاسق ہوتو اس کا لینا صحیح نہیں ہے، لیکن اس کے ہاتھوں میں چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ کسی عادل کے ہاتھوں میں بطورامانت رکھا جائے گا، اس پر ضروری ہے کہ صحیح شکل میں اس کے اعلان کی کوشش کرے۔

اگر کوئی لقطہ اٹھالے تو سفر میں اپنے ساتھ اعلان کرنے سے پہلے لے جانا صحیح نہیں ہے، اگر سفر کرنے کا ارادہ کرے تو کسی دوسرے آدمی کے پاس لقطہ بطورِامانت رکھے گا اور اس کو اعلان کرنے کا مکلّف بنائے گا۔

صحراء میں کوئی لقطہ ملے تو اس کا اعلان اس جگہ سے قریب کسی شہر میں کرنا ضروری ہے۔(الوسیط۴/۲۹۶)اس کو اپنے سفر سے رکے رہنا ضروری نہیں ہے۔

اگر کوئی دوسرے کو لقطہ کے اعلان کا مکلّف بنائے تو اس سے پہلے حاکم کی اجازت لینا ضروری ہے۔

لقطہ کا اعلان کرتے وقت اس کی بعض صفات کا تذکرہ کرنا واجب ہے، تمام صفات کا تذکرہ ضروری نہیں ہے، اگر کوئی لقطہ کے تمام صفات کو بیان کردے تو حاکم کی اجازت سے اس کے حوالہ کیا جائے گا تا کہ اگر کوئی دوسرا آکر اس چیز کا دعوی کرے تو اٹھانے والا اس کے تاوان کا ذمہ دار نہ بنے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

لقیط

لقیط کے معنی راستے پر پڑا ہوا بچہ۔

اس کے شرعی معنی ہر وہ بچہ ہے جو گمشدہ ہو اور جس کا کوئی کفیل نہ ہو۔

شریعت میں ایسے بچے کو اٹھانے کا حکم:

یہ فرض کفایہ ہے، اگر اس بچہ کے بارے میں صرف ایک ہی شخص کو معلوم ہو تو اس پر اٹھانا فرض عین ہے، کیوں کہ اس کی حفاظت اور اس کی تربیت سبھی لوگوں پر فرضِ کفایہ ہے، اگر یہ کام کوئی بھی شخص کرے تو تمام لوگوں سے فرض ساقط ہوجاتا ہے، اگر کوئی بھی نہ اٹھائے جس کی وجہ سے بچہ کی موت ہوجائے تو شہر والے سبھی لوگ گنہگار ہوجاتے ہیں۔(''التھذیب''بغوی۴/۵۶۸)

لقیط کا حکم:

اگر لقیط کسی ایسے شہر میں پایا جائے جہاں صرف ایک ہی مسلمان ہو اور باقی باشندے کافر ہوں اور اس شہر والوں کی تعداد دس لاکھ بھی ہو تو اس لقیط کو مسلمان ماننا ضروری ہے، چاہے یہ مسلمان قید میں ہو یا تاجر ہو، اس مسئلہ کی تفصیلات طویل فقہی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔(''التھذیب''۴/۵۷۰۔۵۷۱)

لقیط کو لینے والے کے لیے شرطیں

لقیط کو لینے والے کے لیے مسلمان، عاقل، عادل اور رشید ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی چھوٹا بچہ یا فاسق یا مجور علیہ (جس پر مالی تصرفات میں پابندی عائد کی گئی ہو) یا کافر مسلمان لقیط بچہ کو اٹھائے تو ان سے لے کر کسی ایسے فرد کے حوالے کیا جائے گا جس میں یہ تمام شرطیں پائی جاتی ہوں۔(کفایۃ الأخیار۳/۱۴)

اگر کسی لقیط کے سلسلہ میں دو افراد کا جھگڑا ہوجائے تو مالدار کو فقیر پر ترجیح دی جائے

گی اور عادل کو اس شخص پر ترجیح دی جائے گی جس کی عدالت معلوم نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی
شہر میں لقیط پائے تو وہ اس بچہ کو صحراء میں منتقل نہیں کرسکتا ہے۔ (کیوں کہ جس شخص کے ہاتھوں
میں گم ہوگیا ہو وہ اسی جگہ تلاش کرے گا، اسی وجہ سے بچہ کو منتقل کرنے میں اس کا نسب ضائع ہوگا، یہ بھی وجہ ہے کہ
شہر بچہ کے لیے زیادہ مناسب ہے اور اس کے حق میں نرمی ہے، اس کو دیہات میں منتقل کرنے میں اس کے لیے
مشقت ہے۔ بغوی نے یہ وجہ ''التھذیب'' میں کہی ہے ۴/۱۷۵) البتہ جو بچہ صحراء میں مل جائے تو اس کو
شہر منتقل کیا جاسکتا ہے، اگر کسی اجنبی کو شہر میں لقیط ملے تو وہ اس کو اپنے ساتھ اپنے شہر لے
جاسکتا ہے جب اس میں تمام شرطیں پائی جائیں۔

لقیط کا نفقہ:

لقیط کے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات اس کے مال سے ادا کیے جائیں گے اگر
اس کے ساتھ مال بھی ملا ہو، اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کا خرچ بیت المال سے پورا کیا
جائے گا، اگر بیت المال میں اس کے اخراجات کے لیے مال نہ ہو، یا مال ہو، لیکن اس سے
زیادہ اہم اخراجات ہوں، اس صورت میں اس کا خرچ مالدار مسلمانوں پر ہے اور اس کو مال
بطور قرض دیا جائے گا جس کو وہ بڑا ہونے کے بعد ادا کرے گا، امام شافعی کا ایک قول یہ ہے
کہ لقیط کا نفقہ مالداروں پر ان کے مال میں حق ہے اور ان کو بعد میں واپس لینے کا بھی حق
نہیں ہے۔ (امام شافعی کے اس قول کو دیکھنے کے لیے رجوع کیا جائے: الأم ۶/۲۴۹)

اگر کوئی شخص لقیط کو لے تو وہ اس کے مال کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا اگر اس کے ساتھ
مال ہو اور اس مال میں سے لقیط پر قاضی کی اجازت ہی سے خرچ کیا جائے گا۔

لقیط کی آزادی کا مسئلہ

لقیط آزاد ہوتا ہے، مگر یہ کہ وہی خود کسی متعین شخص کا غلام ہوجانے کا اقرار کرے تو
اس سے یہ اقرار قبول کیا جائے گا، اگر لقیط کسی ایسے شہر میں پایا جائے جہاں کوئی بھی مسلمان
نہ پایا جاتا ہو اور کوئی کافر آگے بڑھ کر کہے: یہ میرا بچہ ہے تو اس کی بات قبول کی جائے گی اور
بچہ اس کے حوالے کیا جائے گا۔ (مغنی المحتاج ۴/۱۰۶)

اگر کوئی مسلمان کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو لقیط مسلمان ہوجائے گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ
مسلمان بالغ، عاقل اور آزاد ہو...... اس کی تربیت اور دیکھ ریکھ میں اس کو مقدم کیا جائے گا۔ لقیط
کے احکام کی تفصیلات کے لیے شوافع کی بڑی اور طویل کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

مدتوں کے بارے میں

بعض مدتوں کو شریعت نے یا مجتہد فقہاء نے متعین کیا ہے، مثلاً متوفی عنہا زوجھا کی مدت۔ شریعت نے اس کی مدت چار ماہ دس دن متعین کی ہے۔ حاملہ کی عدت یہ ہے کہ اس کو بچہ ہو جائے۔

جن مدتوں کو مجتہد فقہاء نے متعین کیا ہے ان کی مثالیں یہ ہیں کہ نامرد کو مہلت دی جائے یعنی جو اپنی بیوی سے جماع نہیں کر سکتا ہے، اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے ایک سال کی مدت متعین کی ہے۔ اسی طرح حیض کی مدت کو امام شافعی نے بحث وتحقیق اور اکثر عورتوں کی ماہواری کو دیکھتے ہوئے متعین کیا ہے۔

شریعت نے بیس قسم کی مدتیں متعین کی ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عدت: حائضہ مطلقہ کی عدت تین طہر ہے، حیض نہ آنے والی مطلقہ کی عدت تین ماہ ہے، حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے، حاملہ باندی کی عدت بھی وضعِ حمل ہے، اگر وہ حاملہ نہ ہو اور اس کو حیض آتا ہو تو اس کی عدت دو طہر ہے۔ اگر وہ چھوٹی بچی ہو تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہے۔ حاملہ متوفی عنہا کی عدت چاہے وہ آزاد ہو یا باندی وضعِ حمل ہے۔ آزاد متوفی عنہا جو حاملہ نہ ہو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے، اور متوفی عنہا غیر حاملہ باندی کی عدت اس سے آدھی ہے یعنی دو مہینے پانچ دن۔

۲۔ استبرائے رحم: اس سے مراد عورت کے مادرِ رحم کے کسی جنین کے خالی ہونے کی تاکید کرنا ہے، حیض والی باندی کا استبرائے رحم ایک طہر سے ہوتا ہے اور چھوٹی بچی باندی کا جس کو حیض نہیں آتا ہے یا ناامیدی کی عمر کو پہنچنے والی باندی کا ایک ماہ گزرنے پر ہوتا ہے۔

۳۔ کافروں اور مسلمانوں کے درمیان صلح: اس کی مدت چار مہینے یا دس سال یا اس

سے کم مدت ہوتی ہے، اس سے مراد یہ بھی ہے کہ دار الاسلام میں داخل ہونے والے کافر کو امان کا عہد چار مہینوں کے لیے دیا جائے۔

۴۔ زکوۃ: اس کی مدت نقدی کی تمام شکلوں میں اور مالِ تجارت میں ایک ہجری سال ہے، اور غلّوں کے لیے دانے پختہ ہونا ہے، اور انگور و کھجور کے لیے اس کے پختہ ہو کر کھانے کے لائق ہونا ہے۔

۵۔ نامردی یعنی مرد اگر جماع سے عاجز ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے، اگر اس مدت کے دوران وہ اپنی بیوی سے جماع کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا نکاح باقی رہے گا، اگر جماع کے بغیر سال گزر جائے تو قاضی ان دونوں کو علحیدہ کرے گا۔

۶۔ لقطہ: لقطہ کا اعلان ایک سال کیا جائے گا، البتہ شرط یہ ہے کہ یہ قیمت والی چیز ہو، البتہ غیر قیمتی چیزوں کا اعلان اتنی مدت تک کیا جائے گا جب تک چیز کھونے والے کو یاد رہتی ہو۔

۷۔ رضاعت: حرام کرنے والی رضاعت کی مدت دو سال ہے، البتہ دو سال بعد والی رضاعت حرام نہیں بناتی ہے۔

۸۔ حمل: حمل کی کم سے کم مدت اپنی بیوی سے جماع کرنے کے وقت سے چھ ماہ چند منٹ ہے، اور زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے اور عمومی مدت نو ماہ ہے۔

۹۔ خیارِ شرط: بیچنے والا اور خریدنے والا؛ دونوں کے لیے یہ شرط رکھنا صحیح ہے کہ اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین دن ہے۔

۱۰۔ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن ایک رات ہے۔

۱۱۔ حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہیں۔

۱۲۔ حیض کی عمومی مدت چھ سے سات دن ہیں۔

۱۳۔ نفاس کی کم سے کم مدت ولادت کے بعد ایک لحظہ ہے۔

۱۴۔ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ دن ہیں۔

۱۶۔ طہر کی کم سے کم مدت پندرہ دن ہیں۔

۱۷۔طہر کی عمومی مدت ہر مہینے ۲۳ یا ۲۴ دن ہیں۔

طہر کی زیادہ سے زیادہ مدت کی کوئی انتہا نہیں ہے، کیوں کہ بعض عورتوں کو زندگی میں کبھی بھی حیض نہیں آتا ہے، وہ پوری زندگی طہر میں رہتی ہیں۔

۱۸۔وہ مدت جس میں مسافر غیر مقیم کے حکم میں رہتا ہے؛ مسافر چار دنوں سے کم غیر مقیم رہتا ہے، البتہ اس میں داخل ہونے اور نکلنے کے دنوں کا شمار نہیں ہے، اگر وہ داخل ہونے اور نکلنے کے دنوں کو چھوڑ کر کسی شہر میں چار دن رہے تو وہ مقیم شمار ہوتا ہے اور اس کو قصر اور جمع بین الصلاتین کا حق نہیں رہتا ہے۔

البتہ اگر مسافر کو اپنا کام ہوتے ہی سفر کا ارادہ ہو لیکن کسی وجہ سے اس کا کام نہ ہو مثلاً وہ ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے جائے اور ڈاکٹر اس کا سفر ایک ایک دن کر کے موخر کرتا رہے تو اس کو نماز میں قصر اور جمع کا اٹھارہ دنوں تک اختیار ہے اور ان دونوں میں داخل ہونے اور نکلنے کے دنوں کا شمار نہیں ہے۔

۱۹۔موزوں پر مسح کی مدت: مقیم کو وضو میں اپنے پاؤں دھونے کے بدلے موزوں پر مسح کرنے کی ایک دن اور ایک رات اجازت ہے اور مسافر کو تین دن، تین رات۔

۲۰۔بلوغت کی عمر: عورت کے لیے بلوغت کی عمر احتلام اور حیض کی مدت ہے یعنی نو سال سے پندرہ سال تک اور مرد کے لیے بلوغت کی مدت احتلام ہے یعنی پندرہ سال۔

جس مخنث کی جنس معلوم نہ ہو؛ اگر اس کو شرمگاہ سے خون نکلے تو اس کو عورت ہونے اور بالغ ہونے کا حکم لگایا جائے گا، جس طرح عورت میں ہوتا ہے، اگر اس کی اگلی شرمگاہ سے منی نکلے تو اس کے مرد اور بالغ ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

کافر کے بالغ ہونے کا حکم اس وقت لگایا جائے گا جب اس کو زیرِ ناف بال آئے، یہ بات معروف ہے کہ پندرہ سال ہونا اور احتلام اس کے بالغ ہونے کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

۲۱۔سنِ یاس: ۶۲ سال کی عمر کو پہنچنے سے عورت سنِ یاس کو پہنچتی ہے، ان تمام حالتوں کی تفصیلات ان کے موقعوں پر بیان کی جا چکی ہیں۔

مدتوں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو عقود کی وجہ سے متعین کیا جاتا ہے، اس کی پانچ مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

۱۔سودی چیز میں کوئی مدت متعین کرنا (سونا، چاندی، نقدی اور ہر وہ چیز جس سے غذا حاصل کی جاتی ہے) اس صورت میں عقد فاسد اور باطل ہو جاتا ہے۔

مثلاً پانچ مثقال سونے کو پانچ مثقال سونے سے بیچا جائے تو اس صورت میں دونوں سونا حاضر رہنا ضروری ہے اور ان پر قبضہ بھی ضروری ہے۔ اگر دونوں اس پر متفق ہو جائیں کہ ایک آج سونا حوالہ کرے گا اور دوسرا کل تو اس صورت میں بیع باطل ہو جاتی ہے، یہی حکم ہر سودی چیز میں ہے، اس کی تفصیلات سود کے باب میں گزر چکی ہیں۔

۲۔عقدِ سلم: یہ پہلے ہی خریدنے کا عقد ہے، اس میں واجب ہے کہ راس المال حاضر ہو، یہ وہ قیمت ہے جو بائع کے حوالہ کی جاتی ہے، اگر فوراً اس پر قبضہ نہ کیا جائے مثلاً کوئی ایک ہزار کلو گیہوں خریدے جس کو تاجر تین ماہ بعد حوالے کرے گا اور اس کی قیمت ایک ہزار درہم مقرر کی جائے جو تین دنوں بعد ادا کی جائے گی تو قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت کی تعین سے عقد باطل ہو جاتا ہے، بیعِ سلم میں عقد ہوتے ہی قیمت کی ادائیگی ضروری ہے۔قرض کے سلسلہ میں مخصوص شرعی اصول یہ ہے کہ ہر قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے تو وہ حرام ہے۔ (الحاوی الکبیر۔ماوردی ۵/۳۵۶)

۳۔بعض عقود ایسے ہیں جو مدت متعین کیے بغیر صحیح نہیں ہوتے ہیں، مثلاً کرایہ کا عقد، غلام کی بنسبت عقدِ مکاتبہ، مساقات کے عقود، کھجور کے درختوں اور انگور کے بیلوں کو سیراب کرنے کے عقود اور جزیہ کے عقود جو ذمی کافر مسلمانوں کو دیتے ہیں۔

۴۔بعض عقود میں مدت متعین کرنا جائز ہے اور نہ کرنا بھی جائز ہے، یہ خرید و فروخت کے عقود ہیں جن مین بیچی جانے والی چیز اور قیمت موجود رہتی ہے اور عقدِ بیع کے وقت بائع اور مشتری دونوں اس کو حوالے کرتے ہیں، مشتری قیمت ادا کرتا ہے اور اپنا سامان بائع سے حاصل کرتا ہے، یہ بغیر مدت والی بیع ہے اور مدت کی بیع بھی صحیح ہے، مثلاً کوئی گھر خریدے

اوراس کی قیمت ایک ہفتہ بعدادا کرے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ کپڑوں کا سیمپل دیکھ کر زید سے ایک ہزار میٹر خریدے اوراس کوایک لاکھ درہم ادا کرے پھراپنا مال لے یعنی ایک ہزار میٹر کپڑاایک ماہ بعد لے،اس کو بیعِ صفات یا بیع فی الذمہ کہا جاتا ہے۔

۵۔بعض عقود ایسے ہیں جو مجہول مدت سے بھی صحیح ہے اوراس کی مدت متعین نہ کرنے پر صحیح نہیں ہے، یہ عقدِ رہن ہے جس کو بیچی جانے والی چیز کی قیمت کے بدل میں پیش کیا جاتا ہے جب قیمت ادا کی جاتی ہے تو رہن میں رکھی ہوئی چیز واپس مل جاتی ہے۔

قراض مثلاً زید کے حوالہ ایک مبلغ تجارت کرنے کی غرض سے اس شرط پر دے کہ جو فائدہ ہوگا آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا،اس میں کوئی مدت متعین نہیں رہتی ہے، بلکہ جب بیع ہو جائے اور جب فائدہ ملے تو تقسیم کیا جاتا ہے،اسی طرح عمری اور رقبی ہبات اور عطیوں کے عقود ہیں جن کی تفصیلات ہبہ کے باب میں گزر چکی ہیں۔

۶۔بعض عقود ایسے ہیں جو متعین مدت کی صورت میں بھی صحیح ہے اور مجہول مدت کی صورت میں بھی،مثلاً کوئی ایک ہفتہ کی مدت پر چند برتن عاریت پر لے، مدت متعین کیے بغیر بھی عاریت پر لینا صحیح ہے۔

اس میں امانت کا عقد بھی ہے جس میں مدت کی تعین بھی صحیح ہے مثلاً کوئی شخص دوسرے کے پاس کسی چیز کو بطور امانت ایک مہینہ کے لیے رکھے پھر اپنی امانت واپس لے، یہ بھی صحیح ہے کہ غیر متعین مدت کے لیے امانت رکھی جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

پابندی

شرعی اصطلاح میں پابندی سے مراد کسی خاص سبب کی وجہ سے مخصوص تصرف سے روکنا ہے۔(مغنی المحتاج ۳/۱۵۶) مثلاً بیوقوف کو مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے،لیکن اس کے بچوں پراس کی ولایت اور سرپرستی جاری رہتی ہے،اس کو شادی سے بھی روکا نہیں جائے گا، وہ عبادتوں کوادا کرسکتا ہے،اسی وجہ سے وہ مخصوص تصرف سے روک دیا جاتا ہے اور یہ تصرف مالی ہے،ایک خاص وجہ سے، جو بیوقوفی ہے۔

بچہ کو مال وغیرہ میں تصرف سے بچہ ہونے کی وجہ سے روکا جاتا ہے،لیکن اس کو گھر میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت دینے کا اختیار ہے، وہ ہدیہ لے جا کر دے سکتا ہے، وہ ہلکی پھلکی چیزیں مثلاً روٹی وغیرہ خرید سکتا ہے،مرض الموت میں مبتلا شخص کواس کے مال میں ایک تہائی سے زائد مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے،اس کی وجہ اس کے وارثین کے حقوق کی حفاظت ہے۔

رہن رکھنے والا رہن رکھی ہوئی چیز میں تصرف نہیں کرسکتا ہے، تاکہ رہن لینے والے کے حق کی حفاظت ہو۔

مرتد پراس کے ارتداد کی وجہ سے مالی تصرف پر پابندی ہے تاکہ اس کے مال میں مسلمانوں کے حق کی حفاظت ہو۔

پاگل پراس کے جنون کی وجہ سے تصرف پر پابندی ہے۔

مفلس پراس کے مالوں میں تصرف پر پابندی ہے تاکہ اس کے قرض خواہوں کے حقوق کی پابندی کی جائے ،البتہ وہ اپنے ذمہ میں باقی قیمت سے خرید سکتا ہے اور شادی کرسکتا ہے۔

غلام کسی بھی طرح کا تصرف نہیں کرسکتا ہے، البتہ اپنے آقا کی اجازت سے کرسکتا ہے، کیوں کہ وہ اپنی جان کا مالک نہیں رہتا ہے۔

پابندی کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ’’وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ‘‘(النساء ۶)

یعنی جب وہ رشد کو پہنچ جائیں اور اپنے دین اور مال کی حفاظت کرسکیں اور ان کو معاملات میں دھوکہ نہ دیا جاسکے تو اس وقت ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔

یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے: ’’فَإِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا ‘‘(البقرۃ ۲۸۲) یعنی جس پر حق ہو وہ بیوقوف اور سفیہ ہو، اور سفیہ سے مراد اپنا مال اسراف کے ساتھ خرچ کرنے والا ہے، اس صورت میں ولی اور سرپرست اس کے حقوق کی ضمانت کے لیے اس کا نائب بن کر تصرف کرے گا، اسی طرح اس پر موجود دوسروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کی طرف سے خرچ کرے گا مثلاً بچے اور وہ بوڑھا جو اتنی عمر کو پہنچ گیا ہو کہ اس کے اندر چیزوں کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہو، تاکہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور مسلم معاشرے کے سبھی افراد کے مال کو تحفظ فراہم ہو۔

حدیث نبوی میں اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر پابندی لگانا اور ان کے مال کو بیچنا ہے۔ (السنن الکبری۔ بیہقی ۶/ ۴۸، معرفۃ السنن والآثار ۱۰/ ۵۶، مکمل فائدے کے لیے رجوع کیا جائے: التلخیص الحبیر ۳/ ۳۷)

اسلام نے مال کی حفاظت کرنے اور مفید جگہوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے، جب مسلم معاشرہ نے اپنی شریعت کے اس اصول کو چھوڑ دیا کہ ایسے افراد پر پابندی عائد کی جائے تو ہم کو اس کا یہ اثر دکھائی دے رہا ہے کہ ہر دن وہ لوگ مفلسی اور بربادی کے شکار ہو رہے ہیں جو اپنے مال میں صحیح تصرف نہیں کرتے ہیں اور ان کے قرض خواہوں کے حقوق بھی ضائع ہوجاتے ہیں، اگر مناسب وقت ان پر پابندی لگائی جائے تو ان کے مال بھی ضائع نہیں ہوں گے اور ان کے قرض خواہوں کے حقوق بھی پامال نہیں ہوں گے۔

تیمیوں اور بیوقوفوں وغیرہ کو آزمانے اور امتحان لینے کے طریقے ان کے حالات کے اعتبار سے مختلف ہیں، تاجر کے بیٹے کی آزمائش کسی تجارتی معاملہ کے ذریعہ کی جائے گی کہ وہ دھوکہ کھاتا

ہے یا نہیں، کسان کے بیٹے کو زمین کا ایک حصہ زراعت کے لیے دیا جائے گا اور اس کی نگرانی کی جائے گی کہ وہ اپنی زمین کے تئیں اپنی ذمہ داری پوری کرسکتا ہے یا نہیں، یتیم بچی کو گھر کے امور ومعاملات اور گھریلو اخراجات کو چلانے میں آزمایا جائے گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ جو اپنے مال میں بہترین تصرف نہیں کرتے ہیں ان کی نگرانی کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا مال ضائع نہ ہوجائے۔

پابندی کی دو قسمیں ہیں:

خصوصی پابندی مثلاً رہن میں رکھنے والے کو رہن میں رکھی ہوئی چیز میں تصرف کرنے سے باز رکھا جائے، البتہ اس سے مستثنی یہ ہے کہ رہن میں رکھی ہوئی چیز غلام ہو اور رہن میں رکھنے والا مالدار ہو اور وہ اپنے غلام کو آزاد کردے اور اس کی قیمت رہن میں لینے والے کو دے۔ یا رہن میں رکھی ہوئی چیز ام ولد باندی ہو، اس کی قیمت بطور رہن، رہن میں لینے والے کو ام ولد کے بدلے دینا ممکن ہے۔

مثلاً صاحبِ مال پر اس کے ضائع مال پر مال ملنے تک پابندی لگائی جائے اور اس کے مغصوبہ مال پر غاصب سے واپس لینے تک پابندی لگائی جائے، یا بیچنے والے پر بیچی ہوئی چیز میں مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی اور اس کو حاصل کرنے پر پابندی لگائی جائے۔

عمومی پابندی

اس کی سات مندرجہ ذیل قسمیں ہیں: (بغوی نے اس کی پانچ قسمیں بیان کی ہے: ’’التھذیب‘‘ ۴/ ۱۲۵)

۱۔ افلاس کی وجہ سے پابندی: مفلس پر اس کی سبھی جائیدادوں اور مال میں تصرف کرنے پر پابندی لگائی جاتی ہے تاکہ اس کے قرض خواہوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے، یہ پابندی صرف مال کی حد تک رہے گی، اسی طرح مفلس پر وقف، ہبہ اور خرید وفروخت پر پابندی رہتی ہے، چاہے وہ قرض خواہوں کے حق میں ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح مفلس کو کسی مالی اقرار یا اپنے موجود مال کے بدلے شادی کرنے سے بھی روکا جائے گا تاکہ وہ موجود حقیقی قرض خواہوں کے حقوق ضائع کرنے کے لیے جھوٹ موٹ دوسروں کا قرض ہونے کا

دعوی اور اقرار نہ کر لے، مفلس پابندی لگائے جانے کے بعد اپنے پابندی لگائے ہوئے مال
سے مہر دے کر شادی نہیں کر سکتا ہے، وہ سبھی بدنی عبادات کر سکتا ہے مثلاً نماز اور روزہ
وغیرہ، وہ اپنی وفات کے بعد کے لیے وصیت بھی کر سکتا ہے۔ (مغنی المحتاج ۳/۱۵۶)

۲۔ چھوٹے ممیّز بچے پر پابندی: ممیّز بچے کو ہر مالی تصرف یا اقرار سے باز رکھا جائے
گا، وہ عبادتوں کی ادائیگی کر سکتا ہے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے مفادات کے
بارے میں معلوم نہیں رہتا ہے۔ وہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے سکتا ہے، وہ
دوسروں کے لیے ہدیہ اور جانوروں کے لیے چارہ لے جا سکتا ہے اور ہر مباح کام کر سکتا
ہے، اسی طرح منکرات سے روک سکتا ہے۔ اس کو مستحقین میں زکوۃ کی تقسیم کا کام دیا جا سکتا
ہے جب یہ تعین کی جائے کہ فلاں فلاں میں تقسیم کیا جائے، اس کے ہاتھوں قربانی اور عقیقہ کا
گوشت اس کے مستحقین اور فقراء ومساکین میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ غلام پر پابندی: غلام کو اس کے آقا کو نقصان سے بچانے کے لیے تصرف سے
روکا جاتا ہے۔ یہ بھی وجہ ہے کہ وہ اپنے آقا اور خود اپنی خدمت کے لیے فارغ ہو جائے اور
اس کا ذمہ دوسروں کے حقوق میں مشغول نہ ہو جائے۔

۴۔ مرض الموت میں مبتلا شخص پر پابندی: اس پابندی کا تقاضا یہ ہے کہ مرض الموت
میں مبتلا شخص کو اس کے ایک تہائی سے زائد مال میں تصرف سے روک دیا جائے۔ اس کا
مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس کا نتیجہ موت ہو اور وہ اپنے مال میں تصرف
کرے تو اس کا ایک تہائی مال سے زیادہ میں تصرف موقوف رہتا ہے، اگر اس کے وارثین
اجازت دیں تو صحیح ہو جاتا ہے، اگر قبول نہ کریں تو باطل ہو جاتا ہے۔

اس شرعی اصول کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی شخص بیماری یا قتل یا غرق کی وجہ سے موت
کے قریب ہو تو اس کا مالی تصرف صرف اس کی ملکیت کے ایک تہائی میں ہی صحیح ہوتا ہے۔
اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی سبھی جائیداد یا کوئی ایک جائیداد کسی وارث کو دے، چاہے
یہ ایک تہائی سے کم میں ہی کیوں نہ ہو، اگر بیمار شفایاب ہو جائے تو اس کو اپنی سبھی
جائیدادوں میں مکمل تصرف کی آزادی ہے اور یہ حق اس کو واپس ملتا ہے۔

۵۔ ارتداد کی وجہ سے پابندی: مرتد کو اس کے مال میں تصرف پر پابندی کی وجہ یہ ہے کہ
جب وہ مرتا ہے تو اس کا سبھی مال مسلمانوں کا ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس کے مال میں تصرف پر
پابندی مال اور جائیداد میں مسلمانوں کے حق کی حفاظت ہے۔ یہ اس وقت ہے جب مرتد اپنے
ارتداد پر ہی جما رہے، اگر وہ اسلام میں واپس آئے تو اس کو تصرف کا حق بھی واپس ملتا ہے اور وہ
ان تمام جائیدادوں اور مال میں بھی تصرف کر سکتا ہے جن میں تصرف پر ارتداد کی وجہ سے
پابندی لگائی گئی تھی؛ البتہ اس نے ارتداد کی حالت میں جتنے بھی تصرفات کیے ہیں یعنی خرید
وفروخت کیا ہے، ہبہ کیا ہے اور رہن میں رکھا ہے تو یہ تصرفات باطل ہو جاتے ہیں، البتہ منقطع
تصرفات باقی رہتے ہیں، مثلاً غلام کو آزاد کرنا اور اپنی وفات کے ساتھ مشروط آزادی۔

۶۔ بیوقوفی کی وجہ سے پابندی: بیوقوف کو اس کی جائیداد اور مال میں تصرف اور مال
وجائیداد سے متعلق ہر اقرار سے روک دیا جاتا ہے، بیوقوف پر یہ پابندی اس وقت لگائی جاتی
ہے جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور بالغ ہو جائے، اس کے باوجود وہ اپنے مال کو اسراف کے
ساتھ خرچ کرتا ہو، اسی صورت میں قاضی مال میں تصرف سے منع کرنے کا حکم صادر کرے گا۔

۷۔ پاگل پر پابندی: پاگل کو اس کے مال اور دیگر معاملات میں تصرف سے روکا جاتا ہے۔

بیوقوفی اور افلاس کی وجہ سے پابندی قاضی کے فیصلہ پر ختم ہوتی ہے، جب قاضی کے
پاس یہ ثابت ہو جائے کہ بیوقوف اپنے مالی تصرفات میں پختہ بن گیا ہے اور مال میں
اسراف سے باز آ گیا ہے۔ اور مفلس جب اپنے قرض خواہوں کا قرض ادا کر دے۔ جو سن
رشد کو پہنچنے سے پہلے ہی بیوقوف ہو اور بالغ ہونے کے بعد اس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو
اس کو ''سفیہِ مہمل'' کہا جاتا ہے۔

باقی سبھی مجورین (جن پر پابندی لگائی گئی ہو) سے پابندی ان پر لگائی ہوئی پابندی کا
سبب ختم ہونے کی صورت میں ختم ہوتی ہے، بچے پر پابندی بالغ ہونے سے ختم ہو جاتی ہے،
پاگل پر پابندی اپنے جنون سے شفایابی پر ختم ہوتی ہے۔ مرتد سے جب وہ دوبارہ اسلام لے
آئے، غلام سے جب وہ آزاد کر دیا جائے یا اس کا مالک اس کو تصرف کی اجازت دے۔

تفلیس

(التھذیب ۴/۸۲، مغنی المحتاج ۳/ ۱۲۸)

تفلیس کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی کو افلاس کی صفت سے موصوف کیا جائے۔

تفلیس کے شرعی معنی یہ ہیں کہ حاکم کی طرف سے کسی شخص کو مفلس قرار دیا جائے اور اس پر غیر معینہ مدت والے قرض ہونے اور ان کی ادائیگی کے لیے اس کا مال کافی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو مالی تصرفات سے روک دیا جائے۔ (اسنی المطالب۔ شیخ الاسلام زکریا ۲/۱۸۳)

مثلاً کسی شخص کے پاس دس ہزار روپئے ہوں اور اس کا قرض گیارہ ہزار ہوں تو شریعت اس کو اپنے مال میں تصرف سے روکتی ہے تا کہ قرض خواہوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔

مکاتب غلام پر معاہدے کی قسطوں کی وجہ سے پابندی نہیں لگائی جائے گی کیوں کہ یہ قسطیں ابھی ادا کرنی نہیں ہیں، بلکہ ان کی مدت متعین ہوں، اسی طرح شوہر پر اپنی بیوی کے کل کا نفقہ نہ پائے جانے کی وجہ سے پابندی نہیں لگائی جائے گی، کیوں کہ بیوی کے حق دار بننے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے، زکوۃ یا کفارہ ہونے کی وجہ سے مسلمان پر پابندی نہیں لگائی جائے گی، کیوں کہ یہ اللہ کا حق ہے، کسی آدمی کا قرض نہیں ہے۔

اگر کسی شخص پر اس کے ذمہ ابھی ادا کیے جانے والے قرض کی وجہ سے پابندی لگائی جائے تو ان قرضوں کے ساتھ بعد والے قرضوں کو شامل نہیں کیا جائے گا، اگر کسی کے پاس ایک لاکھ روپئے ہوں اور اس پر قرض ننانوے ہزار نوسو ننانوے روپئے ہوں تو اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی، کیوں کہ اس کا مال قرض سے زائد ہے۔

مفلسی کی وجہ سے پابندی لگانے کی دلیل حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک شخص کو پھلوں میں نقصان ہوا جو انھوں نے خریدا تھا، اس وجہ سے قرض بہت زیادہ ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس پر صدقہ

کرو''۔ اس کے باوجود مال قرض کی ادائیگی کے لیے کافی نہ ہوا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تم پاؤ لے لو، اس کے علاوہ تمہارے لیے نہیں ہے''۔ (مسلم: المساقاۃ، باب استحباب الوضع عن المدین ۱۵۵۶، ابوداود: البیوع، باب وضع الجائحۃ ۳۴۶۹، نسائی: البیوع، باب وضع الجوائح ۷/ ۲۵۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ کا ایک شخص ابو مذکور تھا، اس کا ایک قبطی غلام تھا۔ اس نے اپنے اس غلام سے ایک دن کہا: تم میری موت کے بعد آزاد ہو۔ یہ واقعہ پیش آیا کہ ابو مذکور اپنی زندگی میں ہی مفلس بن گیا اور اس پر بہت قرض تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے غلام لیا اور اس کو آٹھ سو درہم میں بیچ دیا اور قیمت ابو مذکور کے حوالہ کر کے فرمایا: ''اس سے اپنا قرض ادا کرو''۔ (مسلم: کتاب الزکاۃ، باب الابتداء فی النفقۃ بالنفس ثم أھلہ ثم القرابۃ ۱۷۲۵) کیوں کہ قرض کی ادائیگی فرض ہے اور غلام کو آزاد کرنا سنت ہے، اور فرض سنت پر مقدم ہے۔

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حاکم مفلس کی ملکیت بیچ کر اس کے قرض ادا کر سکتا ہے۔

امام حاکم کی صحیح روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ پر پابندی لگائی اور قرض کے سلسلہ میں ان کا مال بیچ کر قرض خواہوں میں تقسیم کر دیا تو ان کو اپنے حقوق کے سات میں سے پانچ حصے ملے اور آپ نے ان سبھوں سے کہا: ''یہ تمہارا حق ہے''۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم افلاس کی وجہ سے پابندی کا حکم صادر کر سکتا ہے، قرض دار کو قرض خواہوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مالی تصرف سے روک سکتا ہے اور وہ اس کا مال ان قرض خواہوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے معاذ کے قرض خواہوں سے اس وقت کہا جب آپ نے ان میں معاذ کا مال تقسیم کیا: ''تم کو بس اتنا ہی ہے''۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاذ جب مستقبل میں صاحبِ حیثیت ہو جائیں تو وہ اپنے باقی قرضوں کو ادا کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا اور فرمایا: ''شاید اللہ تمہاری بھرپائی فرمائے اور تمہارا قرض ادا کرے''۔ (مستدرک حاکم ۳/۷۰۳، ابن اثیر نے اسد الغابۃ میں یہ

نقل کیا ہے۴/۴۱۹) اس نبوی دعا کی برکت سے حضرت معاذ اپنا قرض ادا کرنے میں کامیاب ہوگئے، معاذ کے مفلس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ یتیموں کے وصی (یعنی ذمے دار) تھے، وہ اپنا مال ان پر خرچ کرتے تھے، اسی وجہ سے لوگوں کے قرض دار بن گئے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کبار صحابہ میں سے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا: ''میری امت میں حلال اور حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ ہیں''۔ (ابن ماجہ: مقدمہ، باب فی فضائل أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۵۴، ترمذی: المناقب، باب مناقب معاذ ۳۷۹۱، ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے ۷۱۳۷، یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ وہ عام لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، لیکن ان کا علم ابوبکر، عمر یا علی کے علم تک پہنچا ہوا نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے علم فرائض کو سب سے زیادہ جاننے والے زید ہیں''۔ (یہ مذکورہ روایت ہی کا ایک حصہ ہے) زید سے مراد زید بن ثابت ہیں۔ یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا مقصود یہ ہے کہ وہ عام لوگوں میں علم میراث کے سب سے بڑے واقف کار ہیں، وہ خلفائے راشدین سے زیادہ جاننے والے نہیں تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن ہی میں رہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا تو بھی وہیں تھے۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب نے ان کو شام میں لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا، وہ اپنی وفات تک شام ہی میں رہے، ان کی وفات شام کے شہر عمواس میں ۱۸ ہجری کو ہوئی جب وہاں طاعون کی بیماری پھیلی تھی، آپ اردن میں مدفون ہیں۔

مفلس پر پابندی اس وقت لگائی جائے گی جب وہ خود اس کی درخواست کرے یا اس کے قرض خواہ درخواست کریں، پابندی کی قرارداد حاکم کے حکم سے صادر ہوتی ہے، چاہے یہ پابندی بچہ پر لگائی جائے یا یتیم یا بیوقوف یا مفلس پر۔

افلاس کی شرطیں

قرض خواہ پر افلاس کا حکم اور اس پر پابندی لگانے کے لیے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ قرض؛ اس مفلس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ اس کے ذمہ قرض ہو۔

۲۔ کسی آدمی کا قرض ہو؛ کیوں کہ حقوق العباد کی بنیاد لالچ پر ہے، اس لیے اللہ تعالی کے قرض کی وجہ سے پابندی نہیں لگائی جائے گی، مثلاً اس کے ذمہ زکوۃ، حج اور کفارہ باقی ہو، کیوں کہ ان حقوق کی بنیاد معافی پر ہے۔

۳۔ قرض ادا کرنے کا وقت آ چکا ہو مثلاً مبیع کی قیمت، کرایہ اور قرض۔

۴۔ قرض قرض دار کے پورے مال کے برابر ہو یا اس سے زائد ہو۔

۵۔ مطالبہ کیا جائے؛ افلاس اور پابندی میں یہ شرط ہے کہ اس کا مطالبہ کیا جائے، بغیر مطالبہ کے پابندی نہیں لگائی جائے گی۔

جب حاکم کی طرف سے مفلس پر پابندی کا حکم صادر ہو جائے اور اس کی کوئی ایسی کمائی نہ ہو جس سے وہ اپنے اوپر خرچ کرے تو حاکم پر واجب ہے کہ اسی کے مال سے اس کے لیے نفقہ مقرر کرے کیوں کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے اخراجات کو اس کے قرض کی ادائیگی پر اولیت حاصل ہے، یہ نفقہ پابندی کے حکم کے صادر ہونے سے لے کر قرض خواہوں میں مال تقسیم کرنے تک جاری رہے گا، کیوں کہ وہ اس سے مال لیے جانے سے پہلے تک مال دار کے حکم میں ہے۔

اگر مفلس کے پاس کوئی کمائی کا ذریعہ ہو جس سے وہ خرچ کرتا ہو تو پھر اس کو اپنے مال میں سے خرچ کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ اب یہ مال اس کے قرض خواہوں کی ملکیت بن گیا ہے۔ اپنا اور اپنے اہل وعیال کے نفقہ سے مراد ان کا کھانا، پہننا اور گھر ہے۔ اگر اس کی کمائی سے یہ نفقہ پورا نہ ہوتا ہو تو اس کے مال میں سے اتنی مقدار لی جائے گی جس سے مطلوبہ اخراجات پورے ہو جائیں۔

اگر مفلس یا اس کے گھر والوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کی مکمل تجہیز و تکفین اسی کے مال سے کی جائے گی، اگر قرض خواہوں کو اعتراض نہ ہو، اگر اعتراض ہو تو

صرف لازمی کفن، قبر اور لحد کے اخراجات لیے جائیں گے۔ یہ اس وقت ہے جب مال کی تقسیم یا اس کی تقسیم کے دن سے پہلے ہو، کیوں کہ میت کی تجہیز و تکفین کے اخراجات قرض کی ادائیگی پر مقدم ہیں، مفلس کی جائیدادوں کو بیچنے کی اجرت بھی قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے، اس میں دلال کی اجرت بھی ہے جو مال بیچتا ہے اور اس کے ضروری کام اور متعلق امور انجام دیتا ہے، اس کے بعد بچا ہوا مال قرض خواہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

اگر مفلس اپنے مال اور جائیداد میں سے کوئی چیز اپنے قرض کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر رہن میں رکھے اور یہ پابندی لگائے جانے سے پہلے ہی ہو تو رہن والے قرض کو باقی قرض کی ادائیگی پر مقدم کیا جائے گا، اس صورت میں رہن کو بیچا جائے گا اور اس کی قیمت اور مرتہن کا قرض پورا کیا جائے گا، اگر اس سے قرض پورا نہ ہوتا ہو تو مرتہن بھی باقی قرض خواہوں میں شامل ہو جائے گا، اگر رہن کی قیمت زیادہ ہو تو بچا ہوا باقی قرض خواہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص مفلس کے ہاتھوں کوئی چیز بیچ دے اور اس کی قیمت نہ لے، اسی دوران مفلسی کا حکم صادر ہو جائے تو بیچنے والا اپنی بیچی ہوئی چیز موجود ہو تو لے لے گا۔ (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کوئی مال بیچے پھر خریدنے والا مفلس ہو جائے، وہی چیز اس کے پاس موجود ہو تو وہ دوسرے قرض خواہوں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ حق دار ہے''۔ ابن حبان ۵۰۳۷، مسلم: کتاب المساقاۃ، باب من أدرک ما باعہ عند المشتری ۱۵۹، یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے) مثلاً کوئی تاجر کسی شخص کو گائے بیچے اور اس کی قیمت نہ لے۔ پھر قاضی کا حکم اس شخص کے مفلس ہونے کے سلسلہ میں صادر ہو جائے اور اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روکا جائے تو اس صورت میں تاجر اپنی گائے واپس لے سکتا ہے اور اس کو باقی قرض خواہوں پر ترجیح دی جائے گی۔

اگر گائے میں کوئی کمی یا نقص پیدا ہو جائے تو اسی حال میں تاجر کے حوالہ کیا جائے گا اور اس کو کمی کے تاوان اور معاوضہ کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ اگر گائے مفلس کے پاس موٹی ہو جائے اور اس کی قیمت بڑھ جائے تو یہ مفلس کا حق ہوگا اور تاجر پر زائد قیمت مفلس کو دینا ضروری ہوگا۔

بیچی ہوئی چیز میں ایک ناحیہ سے کمی ہونے اور دوسرے ناحیہ سے زیادتی ہونے کی

دوسری مثال:

۔تاجر مفلس کے ہاتھوں دو گائے بیچ دے، ایک مر جائے اور دوسرے کو بچہ پیدا ہو جائے، پھر خریدنے والے پر مفلسی کا حکم صادر ہو جائے تو اس صورت میں تاجر زندہ گائے واپس لے گا اور گائے کا بچھڑا مفلس کے حوالے کیا جائے گا، کیوں کہ اس کا حق ہے۔ پھر تاجر دوسرے قرض خواہوں کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور مفلس کے پاس مری ہوئی گائے کی قیمت اس کے حق میں ثابت ہو جائے گی۔

اگر زیادتی یا کمی بیچی جانے والی چیز کے اوصاف میں ہو مثلاً لنگڑی ہونے کی وجہ سے گائے کی قیمت میں کمی آئے پھر بیچتے وقت گائے کے وزن میں اضافہ ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت پہلے کی طرح ہی ہو جائے تو تاجر اسی حال میں واپس لے گا، نہ مشتری کے ذمہ کچھ ہوگا اور نہ تاجر کے ذمہ۔

اگر کوئی شخص کسی تاجر سے ایک سو من گیہوں خریدے اور اس کی قیمت ادا نہ کرے پھر اس گیہوں کو دوسرے اتنی ہی قیمت والے گیہوں یا کم قیمت والے گیہوں میں ملا دے، پھر اس پر پابندی لگائی جائے تو تاجر اسی ملے ہوئے گیہوں سے اپنے بیچے ہوئے گیہوں کی مقدار کے بقدر لے سکتا ہے۔

اگر خریدنے والا گیہوں اس سے زیادہ قیمتی گیہوں کے ساتھ ملا دے تو تاجر کو اپنا گیہوں واپس لینے کا حق نہیں ہے، اس پر ضروری ہے کہ وہ مطالبہ میں دوسرے قرض خواہوں میں شامل ہو جائے۔

خرید و فروخت کے یہ سبھی احکام وہ ہیں جن میں ملکیت ایک شخص سے دوسرے کے قبضہ میں منتقل ہو جاتی ہے، اس کے بعد والا باب وقف سے متعلق ہے جس میں ملکیت وقف کرنے والے کے ہاتھ سے نکل کر اللہ تعالی کی ہو جاتی ہے اور عام طور پر اس کا فائدہ عمومی ہو جاتا ہے۔

وقف

وقف امت اسلامیہ کی خصوصیات اور امتیازات میں سے ہے، کیوں کہ جاہلیت میں کسی بھی طرح کا وقف نہیں تھا۔

وقف کے لغوی معنی رکنے کے ہیں......شریعت کی اصطلاح میں وقف مال روکنے کے ہیں جس سے اس کو باقی رکھتے ہوئے اپنے ذمہ موجود مباح مصرف کے لیے مخصوص کرتے ہوئے فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔ (یہی تعریف شربینی نے کی ہے ''مغنی المحتاج'' ۴/۳۰) مثلاً کوئی شخص کسی مدرسہ کے لیے کتاب وقف کردے تاکہ طلبہ اس سے استفادہ کریں، طلبہ یہ کتاب کئی سالوں تک اس کو اپنی حالت میں باقی رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں، جب کہ وقف کرنے والے کو موقوفہ کتاب کو بیچنے یا ہبہ کرنے کا حق نہیں رہتا ہے۔

وقف کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مَا تُحِبُّوْنَ'' (آل عمران ۹۲) تم اس وقت تک بھلائی کو ہرگز پا نہیں سکتے جب تک کہ تم اپنی پسند کی چیز خرچ نہ کردو۔

جب صحابی جلیل ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ بیرحاء باغ کو وقف کردیا جائے۔ (یہ مسجد نبوی کے سامنے کی جگہ ہے جیسا کہ قاضی عیاض وغیرہ نے ''مشارق الانوار'' میں تحریر کیا ہے) رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ''بہت خوب، بہت خوب، یہ سودمند مال ہے''۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الأقارب ۱۴۶۱، مسلم: کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ علی الأقربین ۹۹۸، یہ روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے) آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنے قریبی رشتے داروں پر اس چیز کو وقف کردیں۔ بیرحاء باغ رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے سامنے ہی تھا، وہاں میٹھے پانی کا کنواں تھا۔ رسول اللہ

ﷺ کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کا میٹھا پانی نوش فرماتے تھے۔

بخاری ومسلم میں ہے کہ عمران رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اس کی اصل کو روک دو اور اس کا صدقہ کردو''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر صدقہ کیا کہ اس کے اصل کو نہ بیچا جائے، نہ اس کو ہبہ کیا جائے اور نہ وراثت میں تقسیم کیا جائے۔ (بخاری: الشروط فی الوقف ۲۷۷۲، مسلم: کتاب الوصیۃ، باب الوقف ۱۶۳۲، یہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

یہ زمین منجملہ ان مالِ غنیمت میں سے تھی جو خیبر کی جنگ میں شریک ہونے والے مسلم مجاہدین کے درمیان تقسیم کی گئی تھی اور تقسیم کے بعد زمین کا یہ حصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔ یہ وقف اسلام کا سب سے پہلا وقف بن گیا۔

وقف کے ارکان

۱۔ وقف کرنے والا: اس کے لیے بالغ، عاقل، آزاد، رشید اور تبرع کرنے کا اہل ہونا شرط ہے، اسی طرح وہ وقف کی جانے والی چیز کا مالک بھی ہو، بچہ، پاگل اور بیوقوف کی طرف سے کیا جانے والا وقف صحیح نہیں ہے، خلیفہ بیت المال میں سے کوئی بھی چیز اسی صورت میں وقف کرسکتا ہے جب اس میں مسلمانوں کا مفاد اوران کی مصلحت پائی جاتی ہو۔

۲۔ وقف کی جانے والی چیز: اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا نفع عین چیز کے باقی رہتے ہوئے جاری رہتا ہو چاہے وہ مدت لمبی ہی کیوں نہ ہو، مثلاً اجرت پر لی ہوئی زمین پر تعمیر کردہ عمارت کو وقف کیا جائے، یہ بھی شرط ہے کہ وقف کردہ چیز وقف کرنے والے کی ملکیت ہو اور اس کا نفع متعین ہو، زیب وزینت کے لیے نقدی کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ خرچ کرنے کے لیے ہے، زیب وزینت کے لیے نہیں، یہ بھی شرط ہے کہ وقف کسی گناہ کے لیے نہ ہو، اسی وجہ سے لہو ولعب کے آلات کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے۔

۳۔ وہ افراد جن پر وقف کیا جائے: اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ معصیت میں نہ ہو، وہ موجود ہو اور وہ مالک بننے کا اہل ہو، اسی وجہ سے شراب پینے کے لیے وقف صحیح نہیں ہے، اس بچہ

کے لیے وقف صحیح نہیں ہے، جو ابھی دنیا میں نہ آیا ہو، کیوں کہ وقف کے وقت وہ موجود نہیں ہے، ماں کے پیٹ میں موجود جنین پر وقف صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جنین میں مالک بننے کی اہلیت نہیں ہے، جانوروں پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جانور میں بھی مالک بننے کی اہلیت نہیں ہے، البتہ ان گھوڑوں پر وقف صحیح ہے جن کو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ان غلاموں پر وقف صحیح ہے جو مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کی خدمت انجام دیتے ہیں، حرم مکی کے حمام پر وقف صحیح ہے، ذمی کافر پر اس شرط کے ساتھ وقف صحیح ہے کہ یہ وقف گناہ کے کام کے لیے نہ ہو، مثلاً کافر عیسائیوں کے کنیسہ کی خدمت کرتا ہے، کنیسہ کی تعمیر کے لیے وقف صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ کام ہی صحیح نہیں ہے۔

ایک قول کے مطابق مالداروں پر بھی وقف صحیح ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ان کو وقف کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج ۴/ ۳۷) اور یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ مالدار پر وقف کرنے میں ثواب ہے یا نہیں؟

ایک قول کے مطابق کسی شخص کا خود اپنے اوپر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، یہی قولِ معتمد ہے۔ (کیوں کہ اس کا فائدہ ہی نہیں ہے، وقف کرنے والا وقف کرنے سے پہلے ہی اس کا مالک ہے، یہ تحصیلِ ما حاصل ہے) دوسرا قول یہ ہے کہ وقف صحیح ہے۔ یہ رائے غیر معتمد ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر یا ملکیت میں کسی چیز کی حفاظت نہیں کرسکتا ہے تو اپنی زندگی میں ضرورت پڑنے والی چیزوں کو بیچنے سے روکنے کے مقصد سے وقف کرسکتا ہے۔

۴۔ صیغہ یعنی ایجاب وقبول: اس کی شکل مندرجہ ذیل ہے:

’’میں نے یہ دکان اس مسجد پر وقف کردی یا فلاں مسجد پر وقف کردی‘‘۔ یا کہے: ’’میں نے یہ باغ اپنے رشتے داروں پر وقف کردیا‘‘۔ یا کہے: ’’میں نے یہ کنواں یا یہ چشمہ یا یہ تالاب عام لوگوں پر وقف کردیا جہاں سے وہ پانی لیں گے‘‘۔

وقف پر دلالت کرنے والے دوسرے الفاظ سے بھی وقف صحیح ہوجاتا ہے، مثلاً کہے: ’’میں نے اپنی دکان میری مسجد پر وقف کردی‘‘۔ یا کہے: ’’میں نے اپنی دکان مسجد کے لیے

روک دی‘‘۔ یا کہے: ’’میں نے عام مسلمانوں کے لیے یہ کنواں سبیل بنادیا‘‘۔ یا کہے: ’’میں نے یہ زمین مدرسہ پر اس شرط کے ساتھ صدقہ کردی کہ اس کو نہ بیچا جائے اور نہ اس کو ہبہ کیا جائے‘‘۔ یہ تمام عبارتیں صحیح ہیں۔ یہ وقفِ شرعی کے صیغہ کی مثال ہے۔

اگر کوئی شخص کہے: ’’میں نے یہ حصہ مسجد بنادی‘‘۔ تو یہ زمین مسجد کے حکم میں آجاتی ہے۔
اگر کہے: ’’میں نے یہ گھر زید پر وقف کردیا تو اس وقف کے صحیح ہونے کے لیے زید کی طرف سے قبول کرنا ضروری ہے، کیوں کہ صیغہ ایجاب یعنی قبول کرنے کے بعد ہی مکمل ہوتا ہے۔ یعنی وقف کرنے والا کہے: میں نے وقف کیا۔ جس پر وقف کیا گیا ہے وہ کہے: میں نے وقف کو قبول کیا۔

اگر کوئی شخص اپنے اوپر کیے ہوئے وقف کو ٹھکرادے اور کہے: میں قبول نہیں کرتا ہوں۔ یا کہے: میں نہیں چاہتا ہوں۔ تو وقف میں اس کا حق ختم ہوجاتا ہے اور اس کے حق میں وقف منعقد نہیں ہوتا ہے۔

وقف اسی وقت باطل ہوجاتا ہے جب اس کو کسی متعین مدت میں محدود کردیا جائے۔
اگر کوئی شخص کہے: ’’میں نے ایک سال کی مدت کے لیے یہ گھر وقف کردیا‘‘۔ تو یہ وقف باطل ہے۔ البتہ اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے جب کوئی کہے: ’’میں نے یہ زمین قبرستان بنانے کی خاطر ایک سال کے لیے وقف کردی‘‘۔ تو اس صورت میں وقف صحیح ہے اور یہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے ہمیشہ کے لیے وقف بن جاتی ہے۔

مدت کی شرط ساقط ہوجاتی ہے۔ (مالکیہ کے نزدیک متعین مدت والا وقف صحیح ہے۔ ’’الشرح الکبیر‘‘ دردیر ۴/ ۷۶) مثلاً کوئی مسجد گرنے کے قریب ہو اور اس کی تعمیر نو کی ضرورت ہو، تعمیری کام کے لیے پورے ایک سال کی مدت درکار ہو، یہ دیکھ کر کوئی شخص مسجد سے قریب اپنے گھر یا زمین کو ایک سال کی مدت کے لیے مسجد کی تعمیر کی پوری مدت لوگوں کو نماز پڑھنے کے لیے وقف کردے تو صحیح ہے۔

معلق وقف صحیح نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: ’’میرا گھر زید پر اس وقت وقف ہے جب وہ واپس آجائے‘‘۔ کیوں کہ وقف کی شرطوں میں سے ایک شرط انجاز ہے یعنی کسی تعلیق کے بغیر وقف کیا جائے۔ (’’مغنی المحتاج‘‘ ۴/ ۴۳) اگر کوئی شخص دو لوگوں پر نخلستان وقف کردے یا

ان دونوں میں سے ایک مرجائے تو اس کا حصہ دوسرے کو دیا جائے گا اور ان دونوں کے بعد نخلستان فقراء کے لیے ہوگا۔

وقف غیر موجود اول پر کرنے سے صحیح نہیں ہوتا ہے مثلاً کوئی کہے: ''میں نے یہ گھر زید کے پیدا ہونے والے بچہ پر وقف کر دیا اور اس کے بعد مسلم فقراء پر''۔ کیوں کہ وقف کے وقت زید کا کوئی بچہ ہے ہی نہیں۔

درمیانی غیر موجود شخص پر وقف صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں نے یہ زید پر وقف کیا، پھر اس کے گدھے پر، پھر مسلم فقراء پر''۔ اس صورت میں زید پر وقف صحیح ہوجائے گا کیوں کہ فی الحال اور مستقبل میں مصرف موجود ہے، اس کے بعد وقف مسلم فقراء میں منتقل ہوجائے گا۔

آخری غیر موجود شخص پر وقف صحیح ہے۔ مثلاً کوئی کہے: ''میں نے اپنی اولاد پر پھر اولاد کی اولاد پر وقف کیا''۔ وقف کرنے والے نے اس صیغہ سے اپنے پوتوں کے بعد وقف کے منتقل ہونے کی تعین نہیں کی ہے، جب یہ پوتے انتقال کرجائیں گے تو وقف کرنے والے کے قریبی رشتے داروں میں وقف منتقل ہوجائے گا، وہ وقف کرنے والے کی ملکیت یا اس کے وارثین میں منتقل نہیں ہوگا۔

اگر وقف کسی متعین جماعت کے لیے مخصوص کر دیا جائے مثلاً کوئی کہے: ''یہ مدرسہ اس مسجد پر شوافع کے لیے وقف ہے''۔ تو یہ اصح قول کے مطابق صرف شوافع کے لیے ہی مخصوص ہوگا۔ ایک دوسرا صحیح قول یہ ہے کہ یہ سبھی مسلمانوں کے لیے وقف ہوجائے گا، کسی متعین جماعت کے لیے مخصوص نہیں ہوگا۔ (پہلے قول کو امام رافعی نے صحیح قرار دیا ہے، اور زرکشی نے اس کو ''إعلام الساجد بأحکام المساجد'' میں نقل کیا ہے ص ۳۴۳، عمرانی نے ''البیان'' میں اس سے اختلاف کیا ہے اور دوسرا قول کہا ہے)

وقف کردہ چیز کی ملکیت اللہ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے وقف کرنے والا اس میں خرید وفروخت یا دوسرا کوئی تصرف نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح جس پر وقف کیا گیا ہے وہ بھی وقف کو بیچ نہیں سکتا ہے۔

مسجد کی چٹائی اور قالین بوسیدہ اور نماز کے لیے ناقابل استعمال ہوجائیں تو اس کو بیچنا

صحیح ہے، اسی طرح چھت کی لکڑیاں بھی بیچنا جائز ہے اور اس کی قیمت مسجد کی تعمیر اور تجدید کاری پر خرچ کی جائے گی۔

اگر مسجد گرجائے اور وہ نماز کے لائق نہ ہو تو وہ مسجد کے حکم میں ہی باقی رہتی ہے، اور اس پر موقوفہ آمدنی اس سے سب سے زیادہ قریبی مسجد پر خرچ کی جائے گی، اگر اس کی دوبارہ تعمیر یا تجدید کاری کی امید نہ ہو تو یہ مسئلہ ہے، اگر اس کی دوبارہ تعمیر کی امید ہو تو اسی مسجد پر آمدنی کو خرچ کرنے کے لیے محفوظ رکھا جائے گا۔

وقف کی نگرانی

اگر وقف کرنے والا اپنی موقوفہ چیز پر اپنی ہی نگرانی کی شرط رکھے تو اس کو یہ حق رہے گا۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''فتاوی العلائی'' ص ۴۹-۵۱) وہ دوسرے کو بھی وقف کا نگران بنا سکتا ہے، اگر وہ کسی کو متعین طور پر نگران مقرر نہ کرے تو قاضی نگران ہوگا، موجودہ زمانے میں اوقاف کا ادارہ اس کی ذمہ داری سنبھالے گا اگر واقف کسی متعین شخص کو نگران متعین نہ کرے۔

وقف کے نگران کے لیے عادل، متقی اور اوقاف کے انتظام کا تجربہ رہنا ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

بنجر زمین کی آبادکاری

بنجر زمین اس کو کہا جائے گا جس میں کسی کی مخصوص عمارت یا کھیت وغیرہ نہ ہو۔ اس باب کا مقصد بنجر زمین کی آبادکاری مثلاً گھیر کر اپنے قبضہ میں لینے، یا کھیتی کرنے یا وہاں گھر بنانے کے مسائل کو بیان کرنا ہے۔

بنجر زمین جو کبھی کسی مسلمان کی ملکیت میں نہ رہی ہو تو آباد کرنا مستحب ہے، اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو کوئی بنجر زمین کو آباد کرے تو اس کے لیے اس میں اجر ہے اور وہاں سے عوافی جو کھائیں وہ صدقہ ہے''۔ (مسند امام احمد: ۳/۳۰۴، سنن دارمی ۲/ ۱۹، اس حدیث کی مکمل تخریج کے لیے دیکھا جائے: ''التلخیص الحبیر'' ۳/ ۶۲) عوافی ان جانوروں کو کہتے ہیں جن کو اپنی زندگی کے لیے کھانے کی ضرورت پڑتی ہو۔ امام بخاری نے یہ صحیح حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی زمین کو آباد کرے جو کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے''۔ (بخاری: کتاب الحرث والمزارعۃ، باب من أحیا أرضا مواتا ۲۳۳۵، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے) بنجر زمین کی آبادکاری مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

بنجر زمین اس کو مانا جائے گا جس کو کبھی آباد ہی نہ کیا گیا ہو یا وہ زمین جو زمانۂ جاہلیت میں آباد رہی ہو پھر اس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ (بغوی نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کے مالک کا پتہ نہ ہو، دیکھا جائے: ''التھذیب'' ۴/ ۴۸۹)

شہروں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: دارالکفر جہاں والوں کا مسلمانوں کے ساتھ امان کا معاہدہ نہیں ہے، اس طرح کے شہر میں کسی بھی بنجر زمین کو مسلمان یا کافر آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، فقہاء نے جو یہ حکم لگایا ہے پوری طرح صحیح ہے، کیوں کہ غیر حربی کافروں کے علاقہ میں

رہنے والے مسلمانوں نے ان سے ان کے گھر نہیں لیے ہیں، اسی وجہ سے مسلمان یا کافر جو بھی بنجر زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''المجموع'' ۱/ ۱۱۸، ''حاشیۃ القلیوبی'' ۳/ ۸۸)

آج کے زمانے میں امریکہ ہجرت کر کے جانے والے یورپی مہاجرین نے وہاں کے اصل باشندوں ''ریڈ انڈینس'' اور دیگر لوگوں کو ہلاک کر دیا تاکہ ان کی زمین پر قابض ہو جائیں، آسٹریلیا میں بھی ''ریڈ انڈینس'' کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا گیا تاکہ طویل مدت تک ان کا قتل عام کیا جائے، اب تک انھوں نے امریکہ کے ۹۹ فیصد اصل باشندوں کو قتل کر دیا ہے۔

ہم اتنی دور کیوں جائیں؟ ہمارے پاس اپنے قریب کی ہی مثال ہے؟!! مارے مارے پھرنے والے ذلیل یہود دنیا کے ہر حصہ سے جمع ہو گئے اور انھوں نے مسلمانوں کی ایک زمین پر قبضہ کر لیا، وہ ہر دن فلسطینیوں کے گھروں کو تباہ کر رہے ہیں اور مختلف بہانوں سے ان کے مکانات منہدم کر رہے ہیں تاکہ ان گھروں کے کھنڈرات پر اپنے گھر تعمیر کریں، ان کی صرف ایک ہی زبان ہے، وہ ہے: طاقت کا استعمال، وہ حقوق انسانی کے بڑے بڑے دعوے تو کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب نہیں جانتے ہیں، وہ مطلب جانتے ہیں تو صرف طاقت کا اور اسی کو منطبق کرتے ہیں۔

بوسنیا اور ہرگوزینا میں جو کچھ ہوا ہے اس سے ہم واقف ہیں، وہاں کس طرح حقوقِ انسانی کو پامال کیا گیا اور معصوم مسلمانوں کو کسی گناہ کے بغیر ہی مار ڈالا اور ان کا خون بہایا گیا، مسلمانوں نے ایسے لوگوں پر بھروسہ کیا جو مسلمانوں کا کوئی وزن ہی نہیں سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے امور پر توجہ ہی نہیں دیتے ہیں، یہ صرف مسلمانوں کی جہالت اور ان کے تفرقہ وانتشار کا نتیجہ ہے، لیکن یہی حال ہمیشہ رہنا محال اور ناممکن ہے، اسلام اللہ کا دین ہے جو ہمیشہ مومن اور اپنے دین اور وطن کی حفاظت کرنے والے لوگوں کو پیدا کرتا رہتا ہے جیسا کہ صلاح الدین ایوبی پیدا ہوئے جنھوں نے معرکہ حطین میں کفر کے سبھی شاہوں کو شکست دی اور بیت المقدس کی پاکیزہ زمین کو کفر ونجاست کی گندگیوں سے پاک کر دیا۔ عنقریب

ایسے افراد پیدا ہوں گے جو فلسطین کی پاکیزہ سرزمین کو صہیونیوں کی گندگیوں اور نجاست
سے پاک کردیں گے، دیکھنے والے کے لیے کل بہت ہی قریب ہے۔

دوسری قسم: دارالاسلام؛ اس کا انطباق تمام اسلامی ملکوں اور شہروں پر ہوتا ہے، اس وجہ
سے ہر آباد زمین اسلامی زمین ہے، جب یہاں کوئی زمین ویران ہوجائے تو وہ اس کے مالکوں
کی ہے، اگر اس کے مالک معلوم نہ ہوں تو مسلمانوں کے امیر کے حوالے اس کا فیصلہ ہے؛ یا تو
وہ اسی حال میں باقی رکھے یا اس کو بیچ دے اور اس کی قیمت محفوظ رکھ کر اس کا مالک آنے کے
بعد حوالے کردے۔ اگر اس کا مالک نہ آئے تو یہ قیمت بیت المال میں منتقل کی جائے گی۔

حاکم کسی کو یہ زمین آباد کرنے کی ذمہ داری بھی دے سکتا ہے، کسی بھی صورت میں
اگر کسی بھی وقت اس کا مالک آجائے تو یہ زمین اس کے حوالے کی جائے گی۔

جس زمین کو بھی مسلمان آباد کرے گا تو اس میں موجود سبھی چیزوں کا وہ مالک بن
جائے گا، چاہے اس میں سونے، چاندی اور پیتل کی کانیں موجود ہوں، وہاں موجود کانوں
کے ساتھ زمین کا مالک اسی صورت میں بنے گا جب کہ وہاں موجود کانوں کا اس کو علم نہ ہو،
اگر ان کی موجودگی کے بارے میں جانتا ہو اور اس کو آباد کرے تا کہ وہاں کی کانوں پر قبضہ
ہو تو وہ صرف زمین کا مالک ہوگا، اس میں موجود کانوں کا مالک نہیں بنے گا چاہے وہ سونا ہو یا
چاندی، یا کوئی بھی دوسری کان۔ کیوں کہ اس صورت میں کانیں عام لوگوں کی ملکیت بنتی
ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس نے یہ زمین آباد کی ہے وہ کسی کان پر اپنا گھر تعمیر نہیں کرسکتا
ہے چاہے وہ سونے چاندی کی کان ہو یا کوئی دوسری۔

کانیں

کانوں کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ کانیں جو مسطح زمین پر رہتی ہیں مثلاً پٹرول کا کنواں اور ماچس کی کان اور تارکول کی
کان، اس کو نکالنے کے لیے زیادہ جدوجہد اور محنت کی ضرورت نہیں پڑتی ہے اور اس کی ملکیت

میں سبھی مسلمان شریک رہتے ہیں، کوئی تنہا اس کا مالک نہیں بن سکتا ہے، یا اس سے تنہا فائدہ نہیں
اٹھا سکتا ہے اور اس کو گھیر کر یا اس کی آبادکاری کرکے کوئی ایک آدمی اس کا مالک نہیں بن سکتا ہے۔
یہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے جس طرح چارہ اور صحراء کی لکڑیاں وغیرہ ہیں، ہر مسلمان اپنی
ضرورت کے بقدر اس سے لے سکتا ہے، اگر دو مسلمان یہ چیز لینے کے لیے آئیں اور دونوں کے
لیے کافی مقدار میں نہ ہو تو پہلے آنے والے کو ترجیح حاصل رہے گی، اگر دونوں ایک ساتھ آئیں تو
قرعہ کے ذریعہ ترجیح دی جائے گی، اپنی حاجت سے زیادہ لینے والے کو روکا جائے گا۔

۲۔ زمین کے اندر موجود یا باطنی کانیں: یہ وہ کانیں ہیں جہاں سے بڑی جدوجہد اور خرچ
کرکے ہی نکالنا ممکن ہوتا ہے، مثلاً سونے، چاندی اور پیتل کی کانیں، اور امام یہ کانیں کسی کو بطورِ
جاگیر نہیں دے سکتا ہے، البتہ اتنا حصہ دے سکتا ہے جس میں وہ خود کام کرکے نکال لے۔

باطنی کان بھی ظاہری کان کے حکم میں ہی ہے یعنی کسی کان کو آباد کرنے کے لیے اس کا
مالک بننا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ حکم صرف بنجر زمین پر ہی منطبق ہوتا ہے، کانوں پر یہ حکم
نافذ نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ کام میں مطلوب کھدائی ہے، تعمیر نہیں، کیوں کہ کھدائی کے بعد ہی
کان کے پتھر نکالے جاتے ہیں اور ان کو بھٹی میں بھیجا جاتا ہے تا کہ پتھروں سے لوہا الگ
کردیا جائے، اسی وجہ سے کانوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف کھدائی کافی نہیں ہے۔

آج کے دنوں میں حکومتیں کانوں میں موجود ذخیروں کو نکالتی ہیں اور ان کی آمدنی
مسلمانوں کے مفادات پر خرچ کرتی ہیں مثلاً اسکولوں اور یونیورسٹیوں پر خرچ کیا جاتا ہے
اور لوگوں کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور مدارس، ہسپتالوں کی تعمیر
کی جاتی ہے اور قوم کے افراد کو مفت خدمات دی جاتی ہیں۔

حاکم کسی بھی جگہ کے تعلق سے ممنوعہ علاقہ قرار دے سکتا ہے یا اس کو مخصوص بنا کر فقراء
کی بکریوں یا جانوروں کی چراگاہ بنا سکتا ہے، اسی طرح حکومت کے کاموں کے لیے مخصوص
بنا سکتا ہے مثلاً زکوۃ کے جانوروں کا باڑھ یا گم شدہ جانوروں کا باڑھ بنا سکتا ہے، اور باقی
لوگوں کو اس علاقہ میں اپنے جانوروں کو چرانے سے منع کرسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی سولہ فرسخ زمین جس کا نام ''نقیع'' تھا مسلمانوں کے گھوڑوں کو چرنے کے لیے مخصوص کی تھی اور دوسرے لوگوں کو وہاں چرانے سے منع کیا تھا۔ (بخاری: کتاب المزارعۃ، باب لاحمی إلا للہ ولرسولہ ۲۳۷۰، ابن حبان ۴۷۵۶، یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

آج کے زمانے میں حاکم یا امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں کرسکتا ہے یعنی وہ صرف جانوروں کے لیے جگہ مخصوص نہیں کرسکتا ہے کیوں کہ اس طرح کی پابندی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے۔ جب امام کسی زمین کو کمزور مسلمانوں کے جانوروں کو چرانے کے لیے مخصوص کرے پھر مفاد اس میں دیکھے کہ یہ تخصیص کالعدم کی جائے تو وہ کرسکتا ہے اور عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے یہ زمین مقرر کرسکتا ہے، امام زیادہ چارہ والی زمین کسی متعین شخص کو دے سکتا ہے، لیکن اس کی ضرورت کے بقدر ہی دے سکتا ہے۔

بنجر زمین کو آباد کرتے وقت اسے استعمال میں لانا ضروری ہے جس کے لیے آباد کی گئی ہے، اگر کوئی گھر تعمیر کرنے کے لیے آباد کرے تو اس پر ضروری ہے کہ اس کے آس پاس دیوار بنائے اور دیوار کا دروازہ بھی بنائے، اگر کوئی شخص بنجر زمین باغ بنانے کے لیے آباد کرے تو اس کے لیے باڑھ بنانا اور پانی کی کیاریاں بنانا، کنواں کھودنا اور درخت لگانا ضروری ہے۔ اگر مسجد تعمیر کرنے کے لیے زمین آباد کرے تو وہاں مسجد کے ستون بنانا، قبلہ کی تعین کرنا اور وہاں اذان واقامت اور نماز قائم کرنا ضروری ہے، یہی حکم اس وقت ہے جب وہاں حمام یا اصطبل بنانا ہو، صرف اتنا کرنا کافی نہیں ہے کہ زمین پر لکیر کھینچ لے یا چند پتھر زمین کے آس پاس رکھ دے، یہ بنجر زمین کو آباد کرنا نہیں ہے بلکہ اسے زمین کو پتھروں سے بھرنا کہا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

☆☆☆☆☆

میراث

علمِ میراث کو علمِ فرائض بھی کہا جاتا ہے، فرائض فریضۃ کی جمع ہے، فریضۃ کے معنی طے شدہ حصے کے ہیں یعنی جو وارثین کے حصے متعین کیے جاتے ہیں جس سے ہر وارث کا حصہ اسلامی شریعت کے مطابق معلوم ہوتا ہے، فرائض میں میراث کے مسائل اور ان حصوں کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے جو ہر وارث کے لیے شریعت کی طرف سے متعین ہیں۔

فرض کے لغوی معنی کاٹنے کے ہیں، اس سے مراد اندازہ لگانا بھی ہوتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ''، یعنی جو تم نے اندازہ لگایا ہے اس کا آدھا۔

شریعت کی اصطلاح میں وہ حصہ ہے جو شریعت میں وارث کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ (یہی تعریف خطیب شربینی نے کی ہے ''الإقناع فی حل ألفاظ أبی شجاع'' ۲/۹۹)

وارثین کے حصوں کی تعین کی دلیل قرآن کریم کی آیتیں ہیں جن میں ہر وارث کا حصہ مقرر کیا گیا ہے، یہ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

''وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ، وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ '' (النساء: ۳۳) اور ہر مال کے ہم نے کچھ وارث مقرر کردیے ہیں جو بھی ماں باپ اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں اور جن سے تمہارا معاہدہ ہے ان کو ان کا حصہ دے دو۔

''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ '' (النساء: ۷) ماں باپ اور قریبی رشتے دار جو کچھ بھی چھوڑ جائیں اس میں مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اور ماں باپ اور قریبی رشتے دار جو چھوڑ کر جائیں اس میں عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے۔

’’یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْ أَوْلَادِکُمْ، لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَیَیْنِ، فَإِنْ کُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ، وَإِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ‘‘ (النساء:۱۱) اللہ تمہیں تمہاری اولاد (کی وراثت) کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے اور اگر وہ دو سے اوپر عورتیں ہیں تو (مورث) جو چھوڑ جائے اس کا دو تہائی ان کا ہے اور اگر ایک ہی عورت ہے تو اس کے لیے آدھا (حصہ) ہے۔

’’وَلِأَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ إِنْ کَانَ لَهُ وَلَدٌ، فَإِنْ لَّمْ یَکُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ، فَإِنْ کَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ‘‘ (النساء:۱۱) اور ماں باپ میں سے دونوں کے لیے اگر (مورث) کے اولاد ہے تو چھٹا حصہ ہے اور صرف ماں باپ ہی وارث ہیں تو ماں کا تہائی حصہ ہے اور اگر اس کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

’’وَلَکُمْ نِصْفُ مَاتَرَکَ أَزْوَاجُکُمْ إِنْ لَمْ یَکُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ، فَإِنْ کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْنَ، مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُوْصِیْنَ بِهَا أَوْ دَیْنٍ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْتُمْ إِن لَّمْ یَکُنْ لَکُمْ وَلَدٌ، فَإِنْ کَانَ لَکُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکْتُمْ‘‘ (النساء:۱۲) اور جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کی اولاد نہ ہو تو تمہارا آدھا ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو وہ جو بھی چھوڑ جائیں اس کا چوتھائی تمہارا ہے اس وصیت (کے نکال لینے) کے بعد جو وصیت وہ کر جائیں یا قرض (کی ادائیگی) کے بعد اور تم جو چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو، اور اگر تمہارے اولاد ہو تو تم جو بھی چھوڑ جاؤ اس کا آٹھواں حصہ ان کا ہے۔

’’وَإِنْ کَانَ رَجُلٌ یُوْرَثُ کَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ، فَإِنْ کَانُوْا أَکْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَهُمْ شُرَکَاءُ فِی الثُّلُثِ‘‘ (النساء:۱۲) اور اگر کوئی مورث مرد ہو یا عورت، ایسا ہو کہ اس کے اصول وفروع نہ ہوں اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ

ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔

’’وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهَاجِرِیْنَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوْا إِلٰی أَوْلِیَاءِکُمْ مَعْرُوْفًا، کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا‘‘ (الأحزاب:۶) اور اللہ کے حکم میں مسلمانوں اور ہجرت کرنے والوں سے زیادہ آپس کے رشتے داروں کا ایک دوسرے پر حق ہے سوائے اس کے کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ احسان کرو، یہ کتاب کا لکھا ہے۔

اسی طرح شریعت اسلامی کے مطابق وارثین کے حصوں کا تعین صحیح احادیث میں بھی کیا گیا ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ’’حصے اس کے حق داروں کو دو، پھر جو بچ جائے تو سب سے قریبی مرد کے لیے ہے‘‘۔ (بخاری: کتاب الفرائض، باب میراث الولد من أبیہ وأمہ ۶۷۳۲، مسلم: کتاب الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأھلھا ۱۶۱۸، ان کے علاوہ سنن کی دیگر کتابوں میں بھی یہ روایت ہے، یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے)

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں، میں اس کی طرف سے دیت دیتا ہوں اور اس کا وارث بنتا ہوں‘‘۔ (ابن حبان: ۶۰۳۵، ابوداود: کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام ۲۵۲۹، ابن ماجہ: کتاب الدیات، باب الدیۃ علی العاقلۃ)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ’’قاتل کے لیے وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ہے‘‘۔ یہ روایت نسائی نے صحیح سند سے کی ہے۔ (السنن الکبری۔ نسائی: کتاب الفرائض، باب توریث القاتل، ابو داود: کتاب الدیات، باب دیات الأعضاء ۳۹۷۶، دونوں نے یہ روایت عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ سے کی ہے)

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ’’مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا‘‘۔ بخاری اور مسلم نے یہ روایت کی ہے۔ (بخاری: کتاب الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم ۶۷۶۴، مسلم: کتاب الفرائض ۳۱۱۲، دونوں نے یہ روایت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کی ہے)

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بیٹیوں کے سلسلہ میں دو تہائی دینے کا حکم دیا۔ ابوداود اور

حاکم نے یہ روایت کی ہے اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (ابوداود: کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الصلب ۲۵۲۰، مستدرک حاکم: کتاب الفرائض ۸۰۲۴، یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے ہے)

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی/ نانی کو چھٹا حصہ دیا۔ ابوداود وغیرہ نے یہ روایت کی ہے۔ (السنن الکبری للنسائی: کتاب الفرائض، باب ذکر الجدات والأجداد ۶۳۰۰، مراسیل أبی داود: ماجاء فی الفرائض ۳۳۱، سنن الدارقطنی: کتاب الفرائض والسیر ۳۶۲۰، یہ حدیث معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے ہے)

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی کے ساتھ ایک پوتی کے لیے چھٹے حصہ کا فیصلہ کیا۔ بخاری نے ابن مسعود سے یہ روایت کی ہے۔ (بخاری: کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ الابن مع بنت ۸۳۶۶)

وراثت کے کچھ اسباب، شرائط اور موانع ہیں:

وراثت کی شرطیں

(تفصیلات کے لیے دیکھا جائے "حاشیۃ القلیوبی" ۳/۱۵۰، "مغنی المحتاج" ۳/۴)

وراثت کی شرطیں چار ہیں:

۱۔ مورث (وارث بنانے والا) کی وفات کا یقین ہو یا اندازاً اس کو مرے ہوئے لوگوں میں شامل کیا جائے مثلاً وہ بچہ جو مردہ ہی دنیا میں آتا ہے یا اس کو مردوں میں حکماً شامل کیا جاتا ہے، مثلاً وہ گمشدہ شخص جو ۶۲ سال تک واپس نہ آئے، اور اس کے بارے میں کوئی اتا پتا نہ ہو۔

۲۔ وارث بنانے والے کی وفات کے وقت وارث کے زندہ ہونے کا یقین ہو۔

۳۔ قرابت یا نکاح یا ولاء (آزاد کرنے والے کا حق اس کے آزاد کردہ غلام میں) کی وجہ سے میت سے تعلق کا یقین ہو۔

۴۔ وارث کے حصہ کا علم ہو، اس کی ذمہ داری قاضی کی ہے تاکہ وہ کل وراثت سے ہر وارث کا حصہ میت سے اس کی رشتے داری کے مطابق متعین کرے۔

وراثت کے اسباب

۱۔ رشتے داری: قریب والا دور والے کو محجوب (یعنی وراثت سے محروم) کر دیتا ہے، مثلاً جب باپ موجود ہو تو وہ دادا کو وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ جب بیٹا موجود ہو تو پوتا

وارث نہیں ہوتا ہے، اسی طرح دوسری رشتے داریاں بھی ہیں۔

۲۔ صحیح نکاح: اس سے مراد شادی ہے؛ بیوی اپنے شوہر کی وارث ہوتی ہے اور شوہر اپنی بیوی کا، وارث بنانے والے نکاح کے ثابت ہونے کے لیے میاں بیوی کے درمیان صرف عقد صحیح ہونا کافی ہے، جماع شرط نہیں ہے یا تنہائی میں ملنا بھی شرط نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے لیے صحیح نکاح شرعی ہونا کافی ہے۔

۳۔ حق ولاء: یہ آقائیت کا حق ہے، مثلاً زید کا ایک غلام ہے، جس کا نام عمرو ہے، وہ اس کو خرید کر آزاد کر دے، جب عمرو کا انتقال ہو جائے اور اس کے وارث موجود نہ ہوں تو آزاد کرنے والا زید اس کا وارث بنتا ہے، کیوں کہ وہ آزاد کرنے والا ہے اور اس کی نعمت کا ذمہ دار ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ولاء رشتہ ہے نسب کے رشتہ کی طرح"۔ ابن حبان ۴۹۵۰، حاکم ۷۹۹۰، بیہقی؛ السنن الکبری ۱۰/۳۳۹، طبرانی "المعجم الوسیط" ۱۳۱۸، یہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے)

۴۔ اسلام؛ جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو دوسرے محتاج مسلمان کے لیے اس کا وارث بننا جائز ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سبھی مسلمان اس کے وارث بن جائیں گے؛ اس کی مثال یہ ہے کہ مسلمان اپنے مال کی زکوۃ مسلم فقراء میں سے تین کو دے، اس کے لیے سبھی فقیر مسلمانوں میں اپنی زکوۃ تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے۔

ایک مسلمان کی وراثت فقیر مسلمان کو دینے کے لیے شرط یہ ہے کہ وفات پائے ہوئے مسلمان کی وراثت کا مستحق کوئی بھی شخص نہ ہو۔ اسی بنیاد پر متوفی مسلمان جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی وراثت بیت المال منتقل ہو جائے گی تاکہ وارث اور موروث اور وراثت ہر ایک کی حفاظت ہو، بیت المال کا ذمہ دار یہ وراثت مسلم فقراء میں سے کسی ایک یا چند کو دے گا۔

جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی وراثت بیت المال منتقل ہونے کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی یہ حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو"۔ (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وراثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں منتقل ہوتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے کچھ بھی نہیں لیتے

تھے بلکہ اس کو مسلمانوں کے مفادات اور مصالح میں خرچ کرنے کا حکم دیتے تھے۔

بیت المال کے مصارف میں سے یہ بھی ہے کہ تنگ دست مسلمان پر قاضی کی طرف سے طے کردہ دیت ادا کی جائے جب اس نے غلطی سے قتل کیا ہو اور اس کے پاس مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔

وراثت کے موانع یعنی رکاوٹیں

وراثت کی رکاوٹیں سات ہیں: (''نھایۃ المحتاج''، شمس رملی ۶/ ۲۸)

۱۔ غلامی: غلام وارث نہیں بنتا ہے کیوں کہ وہ خود اپنی ذات کا مالک نہیں ہے، خود غلام اور اس کی ملکیت کی سبھی چیزیں اس کے آقا کی ہیں، اگر وہ وارث ہوتا ہے تو اس کا مالک اس کا آقا ہوتا جب کہ میت سے اس کا کوئی بھی رشتہ نہیں ہے۔

۲۔ ارتداد: اگر کسی شخص کا ارتداد کی حالت میں انتقال ہو جائے تو اس کی وراثت بیت المال میں منتقل ہو جائے گی، مرتد نہ وارث ہوتا ہے اور نہ دوسرے کو وارث بناتا ہے، کیوں کہ وہ کسی مال کا مالک نہیں ہوتا۔ جو بھی اس کی ملکیت میں آیا ہے وہ بیت المال میں چلا جاتا ہے، کیوں کہ مسلمان کا تعلق دیگر مسلمانوں کے ساتھ بڑا مضبوط رہتا ہے، وہ اپنی ہر نماز میں تمام مسلمانوں کو سلام کرتا ہے اور مسلمان ہر مسلمان کے لیے طاقت اور قوتِ بازو ہوتے ہیں، جو اسلام سے پھر جاتا ہے تو وہ اس طاقت و رصلہ اور رابطہ کو کھو دیتا ہے جو امت مسلمہ کو جوڑے ہوئے ہے اور کوئی ایسا رابطہ بھی نہیں ہے کہ اس کو کافروں کے ساتھ مربوط کر دے، کیوں کہ اس کو کافروں میں شامل ہونے اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے چھوڑا نہیں جائے گا۔

۳۔ قتل: کوئی اپنے مورث کو قتل کر دے تو اس کی وراثت میں سے قاتل کو کچھ بھی نہیں ملے گا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''قاتل کے لیے میراث میں سے کچھ بھی نہیں ہے''۔ (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اس شرعی اصول اور قاعدہ میں عظیم حکمت پوشیدہ ہے، کیوں کہ اگر قاتل وارث بنتا تو فقیر وارث اپنے مالدار مورث پر صبر نہیں کر سکتا اور موقع ملتے ہی اس کو مار ڈالتا تا کہ اس کی وراثت میں سے اپنا حصہ پالے، اگر اس کو معلوم رہے گا کہ مورث کو قتل کرنے سے وہ

وراثت سے محروم ہوتا ہے اور اس کی وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا ہے تو وہ اس بدترین جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ (دیکھا جائے: ''نھایۃ المحتاج'' ۶/ ۲۸، باب ذکر من صار مسلما بإسلام أبویہ أو أحدھما)

۴۔ دین کا اختلاف: مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث بنتا ہے، کیوں کہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور نہ کافر مسلمان کا''۔ (اس کی تخریج گزر چکی ہے) قولِ معتمد یہ ہے کہ مسلمان کسی بھی صورت میں کافر کا وارث نہیں ہوتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث بنتا ہے، رسول اللہ نے دوسری حدیث میں فرمایا: ''اسلام بلند ہوتا ہے اور اس پر بلند ہوا نہیں جاتا''۔ (السنن الکبری۔ بیہقی ۶/ ۲۰۵، ضیاء مقدسی نے ''المختارۃ'' میں اس کو صحیح کہا ہے ۳/ ۲۹۶) اسی وجہ سے قول اصح کے مقابلے میں ایک قول یہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث بنتا ہے۔ (ماوردی نے ''الحاوی الکبیر'' میں زہری سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا اور نہ کافر مسلمان کا، اسی طرح ابوبکر و عمر اور عثمان و علی کے زمانے میں بھی وارث نہیں ہوتے تھے۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انھوں نے مسلمان کو کافر کا وارث بنایا اور اس کو خلفاء نے اختیار کیا، یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو آپ پہلے والی سنت واپس لے آئے ۸/ ۷۹)

۵۔ کافرِ اصلی کے علاقے الگ الگ ہوں: اگر دارالاسلام میں کوئی کافر (ذمی) رہتا ہو اور دارالحرب میں کوئی کافر (حربی) رہتا ہو تو وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے ہیں۔ البتہ دارالاسلام میں رہنے والا ذمی کافر دوسرے ذمی کافر کا وارث بنتا ہے اور وہ وارث بناتا بھی ہے، اسی طرح حربی کافر دوسرے حربی کافر کا وارث بنتا ہے اور وارث بناتا ہے چاہے وہ دونوں الگ الگ علاقوں میں رہتے ہوں۔ ایک کافر ذمی دوسرے کافر ذمی کا وارث بنتا ہے چاہے دونوں کا دین الگ الگ ہو مثلاً ایک عیسائی ہو اور دوسرا یہودی، یہی اصول حربی کافروں پر بھی منطبق ہوتا ہے، کیوں کہ کفر ایک ہی ملّت ہے۔ (دیکھا جائے: ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۴/ ۲۵) اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**فماذا بعد الحق إلا الضلال**'' (یونس ۳۲) حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

۶۔حکمی دور:اس کا مطلب یہ ہے کہ شرعی حکم اس سے پہلے والے حکم شرعی پر مرتب ہو،مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کا ایک بھائی ہو،اس کے علاوہ دوسرے وارثین نہ ہوں۔ یہ وارث اپنے بھائی کی پوری وراثت کا وارث بن جاتا ہے۔جب یہ بھائی گواہی دے کہ مثلاً زید اس کے متوفی بھائی جس کا نام عمرو ہے کا حقیقی بیٹا ہے تو اس صورت میں زید کا نسبِ شرعی ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ عمرو کا شرعی طور پر بیٹا ہے،لیکن زید اپنے والد عمرو کی وراثت میں سے کسی بھی چیز کا وارث نہیں بنتا ہے، کیوں کہ اگر وہ وارث بنتا ہے تو اپنے چچا کو محجوب کردیتا ہے اور چچا کا یہ حصہ ختم کردیتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا وارث بن جائے۔اگر وراثت میں چچا کا حق ساقط ہوجائے تو زید کی نسبت اس کے والد کی طرف صحیح ہونے کی گواہی بھی ہر اعتبار کو ختم کرنے والی بن جائے گی۔ جب یہ گواہی اپنا اعتبار کھودے گی تو زید وراثت سے محروم ہوجائے گا اور چچا کو اپنے بھائی کی وراثت مل جائے گی۔یہ حکمی تسلسل ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وراثت کا وارث بھائی بنے گا اور زید کا نسب اپنے والد عمرو سے ثابت ہوجائے گا،لیکن وہ وارث نہیں ہوگا۔

تین قسم کے دور ہیں:

۱۔حکمی دور: جس کو ہم نے سابقہ پیراگراف میں بیان کردیا ہے۔

۲۔وجودی دور؛ یعنی ایک ہی معبود خالق کے وجود پر ایمان سے اس معبود کا شریک نہ ہونا مراد ہے،اس طرح کا تسلسل اللہ سبحانہ وتعالی کی وحدانیت کے لیے عقلی و منطقی ثبوت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔حسابی دور: یعنی وراثت میں سے کسی وارث کے حصہ کو دوسرے وارث کو جاننے پر موقوف رکھا جائے،اس کو وراثت کے مسائل میں مناسخہ کہا جاتا ہے، یہ دور وراثت کے موانع اور رکاوٹوں میں سے نہیں ہے۔

۷۔موت کے وقت میں اشکال پایا جائے: یہ آخری مانعِ وراثت ہے،اس کی مثال یہ ہے کہ جب باپ اور بیٹا ایک ساتھ غرق ہوجائیں اور معلوم نہ ہو کہ ان میں سے کس کی موت پہلے ہوئی تو دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے،یعنی باپ اپنے بیٹے کا وارث نہیں ہوگا اور

بیٹا باپ کا وارث نہیں ہوگا،ان دونوں کی وراثت باقی وارثین میں تقسیم کی جائے گی۔اگر باپ کے چار دوسرے بیٹے ہوں تو وہ وارث ہوں گے، جب بیٹے کی ماں، بیوی اور بیٹے ہوں تو ماں، بیوی اور اس کے بچے وارث ہوں گے۔پھر باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا وارث نہیں ہوگا۔

مردوں میں سے وارثین

مردوں میں مندرجہ ذیل دس لوگ وارث بنتے ہیں:

اختصار کے ساتھ دس اور تفصیل کے ساتھ پندرہ مرد وارث ہوتے ہیں۔

۱،۲۔بیٹا اور پوتا؛ نیچے تک۔

۳،۴۔باپ اور دادا؛ اوپر تک۔

۵۔بھائی، چاہے وہ حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۶۔بھتیجا سوائے اخیافی بھتجے کے، چاہے وہ حقیقی بھتیجا ہو یا علاتی بھتیجا، اس سے اخیافی بھتیجا مستثنی ہے،جس کا شمار ذوی الارحام میں ہوتا ہے، ذوی الارحام کی وراثت میں شرعی حصہ نہیں ہے،البتہ کوئی بھی رشتہ دار نہ ہو تو اس کو وراثت ملتی ہے۔

۷۔چچا سوائے اخیافی چچا کے، چاہے چچا حقیقی ہو یا علاتی،اس سے اخیافی چچا مستثنی ہے اور اس کا شمار ذوی الارحام میں ہوتا ہے۔

۸۔چچازاد بھائی،سوائے اخیافی کے: چاہے وہ حقیقی چچازاد بھائی ہو یا علاتی، البتہ اخیافی چچازاد بھائی ذوی الارحام میں سے ہے۔

۹۔شوہر

۱۰۔ولاء کا حق یعنی غلام کو آزاد کرنے والا۔

تفصیلی طور پر وارثین پندرہ ہیں: بیٹا، پوتا، باپ، دادا، حقیقی بھائی، علاتی بھائی، اخیافی بھائی، حقیقی بھتیجا، علاتی بھتیجا، حقیقی چچا، علاتی چچا، حقیقی چچازاد بھائی، علاتی چچازاد بھائی، شوہر، ولاء کا حق دار یعنی غلام کو آزاد کرنے والا۔

عورت وارثین

سات عورتیں وارث بنتی ہیں:

۱۔ بیٹی

۲۔ پوتی نیچے تک

۳۔ ماں

۴۔ دادی اور نانی مطلقاً

۵۔ حقیقی، علاتی اور اخیافی بہن

۶۔ بیوی

۷۔ حق ولاء رکھنے والی عورت

تفصیلی طور پر دس عورتیں وارث بنتی ہیں:

بیٹی، پوتی، ماں، دادی و نانی، حقیقی بہن، علاتی بہن، اخیافی بہن، بیوی، اور حق ولاء رکھنے والی عورت۔

اگر منظّم بیت المال نہ ہو تو شوہر اور بیوی کو چھوڑ کر باقی حصہ داروں میں رد کیا جائے گا۔

مثال ۱: کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی بیوی اور بیٹی ہو تو اس کی وراثت کے آٹھ حصے کیے جائیں گے اور بیوی کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا یعنی ایک حصہ، جب کہ بیٹی کو چار حصے ملیں گے یعنی وراثت کا آدھا، پھر تین حصے بچیں گے جو رد کے اصول کے مطابق بیٹی کو دیے جائیں گے۔

مثال ۲: بیوی کا انتقال ہو جائے اور اس کے وارثین میں شوہر اور بیٹی ہو تو اس کی وراثت کے چار حصے کیے جائیں گے، شوہر کو ایک حصہ یعنی ایک چوتھائی ملے گا اور بیٹی کو دو یعنی وراثت کا نصف ملے گا، اس کے بعد ایک حصہ یعنی پاؤ وراثت باقی بچتی ہے جو بیٹی کو دی جائے گی، یہ اس وقت ہے جب کوئی عصبہ موجود نہ ہو۔

اگر کوئی عصبہ موجود ہو تو حصوں کی تقسیم کے بعد بچنے والا مال عصبہ کو دیا جائے گا، مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی ماں، بیٹی اور حقیقی بھائی ہو تو اس صورت میں متوفی کی

وراثت کے چھ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ ماں کو، کیوں کہ شریعت میں اس کا چھٹا حصہ مقرر ہے، بیٹی کو تین حصے ملیں گے کیوں کہ شریعت میں اس کا حصہ نصف ہے، حقیقی بھائی کو دو حصے ملیں گے، جو وراثت کا ایک تہائی بنتا ہے۔

اگر متوفی کے وارثین میں کوئی عصبہ موجود نہ ہو تو حصہ داروں کے حصے کی ادائیگی کے بعد شوہر اور بیوی کو چھوڑ کر باقی حصے داروں میں ہی تقسیم کیے جائیں گے اور تقسیم میں ان کے حصوں کی رعایت رکھی جائے گی، مثلاً ایک شخص کی وفات ہوئی اور اس کے وارثین میں بیٹی، پوتی اور ماں ہو۔ تو وراثت کے چھ حصے بنائے جائیں گے، ماں کو ایک حصہ ملے گا یعنی وراثت کا چھٹا، بیٹی کو آدھا ملے گا یعنی وراثت کے تین حصے، پوتی کو ایک حصہ ملے گا یعنی چھٹا......اس طرح وراثت میں سے ایک حصہ بچ جاتا ہے۔ یہ چھٹا حصہ وارثین میں ان کے حصوں کے بقدر تقسیم کیا جائے گا، انھوں نے وراثت میں چھ میں سے پانچ حصوں کو لے لیا ہے۔ باقی بچے چھٹے حصہ کو تیس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، اس میں سے ماں چھٹا حصہ، بیٹی نصف یعنی پندرہ حصے اور پوتی چھٹا حصہ لے گی، اس طرح سب مندرجہ ذیل حصے لیں گے:

۵+۱۵+۵=۲۵۔ تیس میں سے پانچ حصے بچ جاتے ہیں۔ اس کو پانچ اجزاء میں تقسیم کیا جائے گا، پانچ حصوں میں سے ایک حصہ ماں کو، تین حصے بیٹی کو اور ایک حصہ پوتی کو ملے گا۔

اس تقسیم کا ماحصل مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوگا:

۱۔ ماں: ۵+۱ حصے لیں گی، یعنی حصوں میں سے ایک اور زائد میں سے ایک، اس طرح ماں کے مجموعی حصے چھ ہو جاتے ہیں۔

۲۔ پوتی: ۵+۱، حصے لیں گی، یعنی حصوں میں سے ایک اور زائد میں سے ایک، اس طرح ماں کے مجموعی حصے چھ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ بیٹی: ۱۵+۳ یعنی حصوں میں سے پندرہ لے گی اور زائد میں سے تین لے گی، اس طرح مجموعی حصے اٹھارہ ہو جاتے ہیں۔

یعنی وراثت مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگی:

ماں کو ۶ + پوتی کو ۶ + بیٹی کو ۱۸۔

یعنی ماں کو ایک + پوتی کو ایک + بیٹی کو تین۔

مختصراً یہ کہ حصہ اور رد کے اعتبار سے اس مسئلہ میں پانچ حصے ہوتے ہیں، ایک حصہ ماں کو، تین حصے بیٹی کو اور ایک حصہ پوتی کو۔

اگر متوفی کے ذوی الفروض (حصہ والوں) اور عصبہ میں سے کوئی بھی وارث نہ ہو تو ذوی الارحام اس کی وراثت کے وارث بنتے ہیں۔

ذوی الارحام گیارہ ہیں:

۱۔نواسا، پوتے کی بیٹی کی اولاد، چاہے نواسا ہو یا نواسی، چاہے بیٹے کا نواسہ ہو یا نواسی۔

۲۔بھانجے اور بھانجیاں چاہے علاتی ہو یا اخیافی یا حقیقی۔

۳۔بھتیجی چاہے حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۴۔چچازاد بہن چاہے چچا حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۵۔اخیافی چچا۔

۶۔ماموں چاہے ماں کا حقیقی بھائی ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۷۔خالہ چاہے وہ ماں کی حقیقی بہن ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۸۔پھوپھی چاہے وہ باپ کی حقیقی بہن ہو یا علاتی یا اخیافی۔

۹۔نانا اوپر تک۔

۱۰۔نانا کی ماں اوپر تک۔

۱۱۔اخیافی بھائی کی اولاد چاہے مرد ہو یا عورت۔

ان میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو ان میں سے کسی ایک طرف سے میت کے ساتھ رشتہ داری میں مربوط ہوں، یہ بات معلوم ہی ہے کہ نواسی بیٹی کی جگہ پر ہے اور بھتیجا بہن کی جگہ پر اور یہ دونوں اپنی ماں کی جگہ پر، بھتیجی بھائی کی جگہ پر اور پھوپھی زاد بہن چچا کی جگہ پر اور وہ دونوں اپنے باپ کی جگہ پر، ماموں اور خالہ ماں کی جگہ پر، اخیافی چچا اور پھوپھی باپ کی جگہ پر رہتے ہیں۔

اگر میت کے وارثین یعنی ذوی الفروض اور عصبہ نہ ہوں، اسی طرح ذوی الارحام میں سے بھی کوئی نہ ہو جو وراثت کے حق دار بنتے ہوں تو یہ وراثت مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کی جائے گی۔

اس بات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے کہ ذوی الارحام کا حکم وراثت میں ان کے اصول یعنی ماں باپ کے حکم میں رہتے ہیں: اس سے صرف یہ شکل مستثنی ہے کہ میت کے قریبی رشتے داروں میں صرف بیوی کی اولاد ہوں تو ان کا حصہ متوفی شوہر کی وراثت میں چوتھائی سے کم کر کے ثمن (آٹھواں حصہ) بنایا جائے گا۔

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اپنے پیچھے ایک بیوی اور بیٹی چھوڑے تو بیوی آٹھویں حصہ کی وارث بنے گی، اگر میت کی بیوی اور ایک نواسی ہو تو بیوی کی وراثت ایک چوتھائی سے آٹھواں حصہ نہیں ہوگا۔

ذوی الارحام کو محجوب کرنے کے سلسلہ میں بھی یہی حکم ہے یعنی ذوی الارحام کو وہی لوگ محجوب کرتے ہیں جو ان کے اصول یعنی ماں باپ کو وراثت میں محجوب کرتے ہیں۔

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے رشتے داروں میں حقیقی بھائی، علاتی بھائی اور اخیافی بھائی ہو تو اس صورت میں اخیافی بھائی چھٹے حصہ کا وارث ہوگا اور حقیقی بھائی باقی بچے ہوئے حصوں کا وارث ہوگا، جب کہ علاتی بھائی محجوب ہو جائے گا۔

اگر متوفی کے رشتے داروں میں حقیقی بھتیجی، علاتی بھتیجی اور اخیافی بھتیجی ہوں تو وراثت حقیقی بھتیجی اور اخیافی بھتیجی کو ملے گی اور علاتی بھتیجی محجوب ہو جائے گی۔

ذوی الارحام کی وراثت ان کے اصول یعنی باپ اور ماں کی وراثت کی طرح ہی ہے؛ ان کو حصوں اور عصبہ بننے کی وجہ سے وراثت ملتی ہے۔

مثلاً کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کے رشتے داروں میں نانا کی ماں، نواسا اور بھتیجی ہو تو مسئلہ چھ سے بنے گا، نانا کی ماں کو چھٹا یعنی ایک حصہ، نواسی کو نصف یعنی تین حصے ملیں گے اور باقی دو حصے بھتیجی کو ملیں گے جو عصبہ بننے کی وجہ سے وارث ہوگی۔

ذوی الارحام کی وراثت میں وارث کا سب سے قریبی افراد دور والوں کو کو چھوڑ کر وارث بنیں گے۔

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے رشتے داروں میں بیٹے کی نواسی ہو اور بیٹی کی نواسی تو بیٹے کی نواسی وارث ہوتی ہے، بیٹی کی نواسی وارث نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ یہ اُس کے مقابلہ میں ابعد ہے۔

حصوں کی بنیاد پر مردوں میں پانچ وارث بنتے ہیں:

۱،۲۔ باپ اور دادا اوپر تک، اگر باپ کے ساتھ بیٹا یا پوتا ہو تو باپ کو چھٹا حصہ ملتا ہے، اگر باپ کے ساتھ دوسرا کوئی وارث مثلاً شوہر ہو تو شوہر کو نصف ملے گا اور عصبہ بننے کی وجہ سے باپ کو باقی ملے گا۔ اگر باپ کے ساتھ بیٹی پوتی ہو تو باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور وہ عصبہ بھی بنے گا۔

مثال: ایک عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے وارثین میں باپ، شوہر اور بیٹی ہو تو اس صورت میں وراثت کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور یہ حصے مندرجہ ذیل طریقہ پر دیے جائیں گے:

شوہر کے لیے ایک چوتھائی، بیٹی کے لیے نصف اور باپ کے لیے چھٹا، اس طرح جملہ ۳+٦+۲=۱۱؛ ہو جائیں گے، ایک حصہ باقی بچے گا جس کا باپ عصبہ کی بنیاد پر حق دار بن جائے گا۔ اگر عورت صرف اپنے والد کو ہی چھوڑے تو والد پوری وراثت کا وارث بن جاتا ہے۔

مذکورہ مثالوں میں دادا باپ کے حکم میں ہے، باپ اور دادا کے درمیان فرق یہ ہے کہ باپ کی موجودگی میں بھائی اور بہنیں وارث نہیں ہوتے، لیکن دادا کی موجودگی میں بہنیں اور بھائی وارث ہوتے ہیں اور دادا کی وراثت کے بارے میں تفصیل ذوی الفروض کی بحث میں آئے گی۔

۳۔ اخیافی بھائی: اس کا حصہ چھٹا ہے۔

۴۔ حقیقی بھائی مسئلہ مشترکہ میں: حقیقی بھائی مسئلہ مشترکہ میں چھٹے حصے کا وارث بنتا ہے، مسئلہ مشترکہ یہ ہے:

کسی عورت کا انتقال ہو جائے، اس کے پسماندگان میں شوہر، ماں یا نانی اور دو اخیافی بھائی اور ایک حقیقی بھائی ہو تو اس صورت میں ترکہ کے چھ حصے بنائے جائیں گے جس کو مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے گا: تین حصے شوہر کے لیے، کیوں کہ وہ نصف کا وارث بنتا ہے، ایک حصہ کی وارث ماں بنتی ہے، کیوں کہ اس کا حصہ چھٹا ہے، دو اخیافی بھائی ایک تہائی یعنی دو حصوں کے وارث بنتے ہیں اور حقیقی بھائی کے لیے کچھ نہیں بچتا ہے، اس صورت میں حقیقی بھائی کہے گا: میں دو اخیافی بھائیوں کا شریک ہوں۔ اس طرح ترکہ کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور دوبارہ اس کو مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے گا:

شوہر کے لیے نصف یعنی ۹ حصے۔

ماں کے لیے چھٹا یعنی ۳ حصے۔

اخیافی بھائیوں اور حقیقی بھائی کے لیے ایک تہائی یعنی ٦ حصے، ان میں سے ہر ایک کو دو حصے ملیں گے۔

حقیقت میں حقیقی بھائی متوفی کا عصبہ بنتا ہے، اس کے باوجود وہ دوسروں کے ساتھ ایک تہائی کے حصوں میں شریک ہوتا ہے، مسئلہ مشترکہ میں حقیقی بہن کا بھی یہی حکم ہے، اگر متوفی کی ایک حقیقی بہن اور دوسری اخیافی بہن ہو تو وہ میراث میں اخیافی بہن کے ساتھ شریک ہو جائے گی، مشترکہ کی تقسیم میں حقیقی بھائی ایک ہو یا سو، وہ سب اخیافی بھائیوں کے ساتھ تقسیم میں شریک رہیں گے۔

۵۔ ذوی الفروض میں شوہر ہے، اگر متوفی عورت کے بچے ہوں تو اس کے لیے ایک چوتھائی ملتا ہے، اگر بچے نہ ہو تو نصف۔

مثلاً بیوی کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر اور ایک بیٹا ہو تو وراثت کے چار حصے بنائے جائیں گے، شوہر کو ایک حصہ یعنی ربع ملے گا اور بیٹے کو بچے ہوئے باقی تین حصے ملیں گے۔ اگر بیوی کی ایک بیٹی یا پوتا یا پوتی ہو تو شوہر کا حصہ اتنا ہی رہے گا یعنی ربع۔ اگر بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ نصف بن جائے گا۔

مثلاً کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر اور باپ ہوں تو اس صورت میں شوہر کو نصف ملے گا اور باپ کو باقی بچا ہوا ملے گا۔

عصبہ:

عصبہ مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی مفرد لفظ بھی ہے اور جمع کا لفظ بھی۔ (المصباح المنیر ص۴۱۲) اور اس کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں پر ہوتا ہے۔

وارثین میں سے عصبہ وہ ہے جس کے لیے متوفی کی وراثت میں متعین حصہ مقرر نہ ہو، اس کے باوجود وہ پوری وراثت کا وارث بنتا ہے اگر متوفی کے ذوی الفروض میں سے کوئی وارث نہ ہو، اگر متوفی کے ذوی الفروض وارث ہوں تو ان کو دینے کے بعد وراثت میں جتنا بھی بچتا ہے تو وہ عصبہ کو ملتا ہے، اس سے باپ اور دادا مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ باپ اور دادا تنہا ہونے کی صورت میں پوری وراثت کے وارث بن جاتے ہیں، اگر ان کے ساتھ بیٹا یا پوتا ہو تو وہ چھٹے حصہ کے وارث ہوتے ہیں، اگر بیٹی ہو تو باپ اور دادا حصہ کی بنیاد پر چھٹے حصہ کا وارث بنتے اور بیٹی اپنا حصہ نصف لینے کے بعد عصبہ کی بنیاد پر باقی بچے ہوئے حصوں کا وارث بنتے ہیں، حقیقی بہن اور علاتی بہنیں بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہیں۔

ذیل میں عصبہ کی تفصیل پیش ہے، یہ کل ۱۳ ہیں:

۱۔ بیٹا

۲۔ پوتا نیچے تک یعنی پوتے کا بیٹا وغیرہ

۳۔ باپ

۴۔ دادا، اوپر تک یعنی دادا اور پردادا وغیرہ

۵۔ حقیقی بھائی

۶۔ حقیقی بھتیجا نیچے تک

۷۔ علاتی بھائی

۸۔ علاتی بھتیجا نیچے تک

۹۔ حقیقی چچا

۱۰۔ حقیقی چچازاد بھائی نیچے تک

۱۱۔ علاتی چچا

۱۲۔ علاتی چچازاد بھائی نیچے تک

۱۳۔ بہنیں بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہیں: حقیقی بہنیں اور علاتی بہنیں بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہیں، اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں ایک بیٹی اور ایک حقیقی بہن ہو تو وراثت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، بیٹی آدھا لے گی اور حقیقی بہن آدھا لے گی، کیوں کہ وہ بیٹی کے ساتھ عصبہ بنتی ہے، اگر متوفی کی کوئی بیٹی نہ ہو، بلکہ پوتی ہو تو حقیقی اور علاتی بہن کو پوتی کے ساتھ عصبہ بنایا جائے گا، ولاء کے حق دار کو اس کے غلام کی بنسبت عصبہ کے حکم میں مانا جائے گا جس کو آزادی ملی ہو، یہ اس وقت ہے جب اس آزاد کردہ غلام کا کوئی شرعی وارث نہ ہو۔

عورتوں میں عصبہ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ خود سے عصبہ بننے والی: یہ وہ عورت ہے جس کو غلام یا باندی آزاد کرنے کی وجہ سے حقِ ولاء حاصل ہو جائے۔

۲۔ دوسروں کی وجہ سے عصبہ بننے والی: مثلاً بیٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں، پوتیاں بھی اپنے بھائیوں یعنی پوتوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں۔ حقیقی بہنیں اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں، علاتی بہنیں اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں، بیٹیاں اور بیٹے سب عصبہ بنتے ہیں اور ان پر یہ شرعی اصول منطبق ہوتا ہے: ''مرد کے لیے عورتوں کے دو حصوں کے بقدر ہے''۔ (یہ اصول اس فرمانِ الٰہی سے اخذ کردہ ہے: ''یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین ''النساء۱۱) پوتیاں پوتوں کے ساتھ اور حقیقی بہنیں حقیقی بھائیوں کے ساتھ، علاتی بہنیں علاتی بھائیوں کے ساتھ اس شرعی اصول کے مطابق وارث بنتی ہیں: ''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے بقدر حصہ ہے''۔

۳۔دوسروں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں: مثلاً حقیقی یا علاتی بہنیں بیٹیوں یا پوتیوں کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہیں۔

بیت المال کی موجودگی میں وہ حصہ داروں کو حصے دینے کے بعد بچے ہوئے مال کا وارث بنتا ہے اور یہ مال مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کیا جاتا ہے، اگر بیت المال نہ ہو تو زائد حصے حصہ داروں میں ہی تقسیم کیے جائیں گے۔(البتہ اس سے شوہر اور بیوی مستثنیٰ ہیں)، اگر کوئی حصہ دار نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو، اسی طرح بیت المال بھی نہ ہو تو وراثت ذوی الارحام میں منتقل ہو جاتی ہے۔

حصہ دار بننے والے ۲۱ لوگ ہیں:

۱۔ جو نصف کے وارث ہوتے ہیں، یہ پانچ ہیں: شوہر، ایک بیٹی، ایک پوتی، ایک حقیقی بہن اور ایک علاتی بہن۔

۲۔ جو ربع یعنی ایک چوتھائی کے وارث ہوتے ہیں، یہ صرف دو ہیں؛ شوہر، اگر اس کے ساتھ متوفی عورت کا بیٹا یا پوتا بھی ہو، دوسرے بیوی اگر اس کے ساتھ متوفی کی اولاد نہ ہو۔

۳۔ جو آٹھویں حصہ کے وارث ہوتے ہیں: یہ بیوی ہے چاہے وہ تنہا ہو یا زیادہ، جب شوہر کی کوئی اولاد یا پوتا/ پوتی موجود ہو۔

۴۔ جو دو تہائی کے وارث ہوتے ہیں، یہ چار ہیں: دو یا دو سے زائد بیٹیاں، دو یا دو سے زائد پوتیاں، دو یا دو سے زائد حقیقی بہنیں، دو یا دو سے زائد علاتی بہنیں۔

۵۔ جو ایک تہائی کے وارث ہوتے ہیں، یہ صرف دو ہیں: ماں، اگر اس کے ساتھ کوئی اولاد یا بیٹے کی اولاد نہ ہو، اسی طرح دو بھائی اور بہنیں نہ ہوں۔ دو یا دو سے زائد اخیافی بھائی بہنیں، اگر ان کے ساتھ باپ یا دادا یا اولاد یا بیٹے کی اولاد نہ ہو۔

۶۔ جو چھٹے حصہ کے وارث بنتے ہیں سات لوگ ہیں: اخیافی بھائی، اخیافی بہن، دادا جس کے ساتھ متوفی کا بچہ ہو، ماں اگر اس کے ساتھ متوفی کی اولاد یا بیٹے کی اولاد ہو یا دو یا دو سے زائد بھائی بہن ہوں، باپ جب اس کے ساتھ اولاد یا بیٹے کی اولاد ہو، پوتی جب اس کے ساتھ ایک بیٹی ہو، علاتی بہن جب اس کے ساتھ ایک حقیقی بہن ہو۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں مذکورہ حصے چھ ہیں: دو تہائی (ثلثان) ایک تہائی (ثلث) چھٹا (سدس) آدھا (نصف) ایک چوتھائی (ربع) آٹھواں حصہ (ثمن)

دو تہائی چار لوگوں کا حصہ بنتا ہے:

۱۔ دو یا دو سے زائد بیٹیاں، دو یا دو سے زائد پوتیاں، دو یا دو سے زائد حقیقی بہنیں، دو یا دو سے زائد علاتی بہنیں دو بیٹیاں اس صورت میں دو تہائی کی وارث بنتی ہیں جب ان کے ساتھ بھائی نہ ہو، کیوں کہ اگر متوفی کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو تو بیٹا بیٹی کے مقابلہ میں دگنا حصے کا وارث بنتا ہے، یہ بھی شرط ہے کہ وہ دونوں کسی مانع اور رکاوٹ کی وجہ سے محروم نہ ہوتی ہوں مثلاً دو بیٹیاں اپنے مورث کو قتل کر دیں؛ اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ دونوں میراث سے حجب نقصان کی وجہ سے محروم نہ ہوتی ہوں مثلاً پوری وراثت پر عول کا اصول منطبق کیا جائے، جس کا مطلب وراثت کے حصوں کا زیادہ ہونا اور وارثین کے حصوں کا کم پڑنا ہے، اس طور پر کہ وراثت میں ان میں سے ہر ایک کے حق کو ترکہ کے حصوں میں ان کے درمیان برابر برابر نسبت سے کمی کر کے پورا کرتا ہے۔

عول کے اصول کی مثال مندرجہ ذیل ہے:

ایک شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں بیوی، دو بیٹیاں، باپ اور ماں ہوں۔ جب ہم وراثت کو شریعت میں مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کریں تو ہمیں مندرجہ ذیل تفصیل ملتی ہے:

باپ کو چھٹا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ، دو بیٹیوں کو دو تہائی، اس صورت میں بیوی کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچے گا جو اس کو شریعت میں حاصل ہے اور یہ آٹھواں حصہ ہے۔

اس صورت میں وراثت کے حصے ۲۴ سے ۲۷ بن جاتے ہیں، اس صورت میں کہا جائے گا کہ مسئلہ ۲۴ سے ۲۷ کی طرف عول ہوا ہے تا کہ بیوی کو اس کا شرعی حق دیا جائے، اس صورت میں دوبارہ مندرجہ ذیل طریقے پر تقسیم کی جائے گی:

باپ؛ چار حصے

ماں؛ چار حصے

دو بیٹیاں؛ ۱۶ حصے

بیوی؛ تین حصے

مجموعی حصے عول بن کر ۲۷ بن جاتے ہیں۔

اس صورت میں بیٹیاں حجبِ نقصان کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان کا حصہ ۲۴ حصوں میں سے دو تہائی سے ۲۷ حصوں میں دو تہائی ہو جاتا ہے۔

۲۔ دو یا دو سے زائد پوتیاں: اگر ان کے ساتھ پوتے نہ ہوں تو وہ دو تہائی کی وارث بنتی ہیں، اگر پوتے بھی ہوں تو وہ ان پوتوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں اور اس میں یہ اصول منطبق ہوتا ہے: ''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصوں کے بقدر ہے''۔

اگر متوفی کے پسماندگان میں ایک بیٹی اور پوتیاں ہوں تو بیٹی کے ساتھ پوتیاں چھٹے حصہ کی وارث بنتی ہیں، اگر متوفی کی ایک سے زائد بیٹیاں ہوں اور پوتیاں بھی ہوں، مثلاً دو بیٹیاں اور دو پوتیاں ہوں تو دو بیٹیاں دو تہائی کی وارث بنتی ہیں اور پوتیوں کے ساتھ عصبہ بنانے والا کوئی ہونا ضروری ہے مثلاً بھائی یا چچا زاد بھائی تاکہ ان کو اس وراثت میں کوئی حصہ ملے، البتہ شرط یہ ہے کہ وہاں ان دونوں کے مقابلہ میں میت سے زیادہ ہی قریبی پوتی نہ ہو، اگر میت کے زیادہ قریب کوئی پوتی ہو تو دور والی پوتی وارث نہیں بنتی ہے، اگر میت کی دو پوتیاں اور دو پوتے کی بیٹیاں ہوں تو پوتے کی بیٹیاں وارث نہیں بنتی ہیں۔

یہ بھی شرط ہے کہ دو پوتیوں کے ساتھ میت کا بیٹا نہ ہو، کیوں کہ اگر میت کا ایک بیٹا اور دو پوتیاں ہوں تو یہ دو پوتیاں وراثت سے محجوب اور محروم ہو جاتی ہیں اور ان کو وراثت نہیں ملتی ہے۔ اگر میت کی ایک بیٹی اور پوتیاں ہوں تو ان کو حجبِ نقصان ہو جاتا ہے اور پوتیوں کو بیٹی کی موجودگی میں چھٹا حصہ ملتا ہے۔

۳۔ دو یا دو سے زائد بہنیں؛ شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ کوئی بھائی نہ ہو، کیوں کہ اگر متوفی کی بہنیں اور بھائی ہوں تو یہاں وراثت کا یہ اصول منطبق ہوتا ہے کہ ''مرد کے لیے دو

عورتوں کے حصے کے بقدر ہے''۔ اسی طرح بھائی کو بہن کے دوگنا وراثت ملتی ہے، یہ بھی شرط ہے کہ متوفی کی دو حقیقی بہنوں کے ساتھ بیٹیاں یا پوتیاں نہ ہوں، کیوں کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنیں عصبہ بن کر حصہ داروں کی وراثت دے کر بچی ہوئی وراثت کا وارث بنتی ہیں۔

مثلاً جب متوفی کے پسماندگان میں دو بیٹیاں، ماں اور دو بہنیں ہوں تو ترکہ کے چھ حصے بنائے جائیں گے، کیوں کہ ماں چھٹے حصے کی وارث بنتی ہے اور بیٹیاں دو تہائی کی یعنی ۴، اور بہنوں کے لیے چھٹا حصہ باقی رہتا ہے، اس تقسیم میں بہنیں حجبِ نقصان کی شکار ہوتی ہیں، یہ بھی شرط ہے کہ ان دونوں کے ساتھ باپ یا بیٹا یا پوتا نہ ہو، کیوں کہ دو بہنیں میراث سے محجوب اور محروم ہو جاتی ہیں جب میت کا کوئی بیٹا یا پوتا یا باپ موجود ہو، اور ان کو وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا ہے/ اسی طرح اگر متوفی کے پسماندگان میں دو حقیقی بہنیں اور بیٹیاں ہوں اور حصہ داروں کو ان کے شرعی حصے دیے جانے کے بعد کچھ بھی باقی نہ بچے تو مسئلہ اس طرح بن جائے گا: متوفی نے صرف بیٹیاں اور ماں اور دادا کو چھوڑا ہے، کیوں کہ اس صورت میں ترکہ کی تقسیم چھ حصوں میں کی جائے گی اور مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے گا:

ماں:	چھٹا حصہ	ایک حصہ
دادا:	چھٹا حصہ	ایک حصہ
دو بیٹیاں:	دو تہائی	چار حصے

پھر بہنوں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا ہے۔

اگر متوفی کے پسماندگان میں دو بیٹیاں، شوہر، ماں اور دو بہنیں ہوں تو اس صورت میں ترکہ کو ۱۲ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور یہ حصے مندرجہ ذیل طریقے پر منقسم ہوں گے:

دو بیٹیاں :	دو تہائی	۸ حصے
شوہر :	ایک چوتھائی	۳ حصے
ماں :	چھٹا	۲ حصے

اس صورت میں مسئلہ ۱۳ سے عول ہو جائے گا اور دو بہنوں کو وراثت میں سے کچھ بھی

نہیں ملے گا۔

۴۔ دو یا دو سے زائد علاتی بہنیں؛ یہ دو تہائی کی اس شرط کے ساتھ وارث بنتی ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی علاتی بھائی نہ ہو، اگر بھائی بھی ہوں تو وراثت مذکورہ شرعی اصول ''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے بقدر ہے'' کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ ان دونوں کے ساتھ حقیقی بہن نہ ہو، کیوں کہ حقیقی بہن کی موجودگی مین علاتی بہنوں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ یہ بھی شرط ہے کہ حقیقی بہنیں نہ ہوں، کیوں کہ دو حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی بہنیں وارث بننے کے لیے ان کا کوئی علاتی بھائی ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ وارث نہیں بنتی ہیں۔ یہ بھی شرط ہے کہ علاتی بہنوں کے ساتھ متوفی کا باپ یا بیٹا یا پوتا یا حقیقی بھائی نہ ہو، کیوں کہ ان افراد کی موجودگی میں وہ محجوب ہوجاتی ہیں اور وہ ترکہ میں سے کسی بھی حصہ کی وارث نہیں بنتی ہے۔

اگر متوفی کے پسماندگان میں علاتی بہنوں کے ساتھ ایک حقیقی بہن ہو تو وہ حجب نقصان کی شکار ہوجاتی ہے، کیوں کہ وہ اس صورت میں چھٹے حصہ کی وارث بن جاتی ہیں۔ اگر ذوی الفروض کے حصوں کی تقسیم کے بعد کچھ بھی نہ بچے تو علاتی بہنوں کو کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

مثلاً کسی عورت کا انتقال ہوجائے اور اس کے پسماندگان میں دو حقیقی بہنیں، شوہر، اخیافی بھائی اور علاتی بہنیں ہوں تو اس صورت میں وراثت مندرجہ ذیل طریقہ پر چھ حصوں میں تقسیم کی جائے گی:

دو حقیقی بہنیں	۴ حصے
شوہر آدھی میراث کا	۳ حصے
اخیافی بھائی چھٹے حصے کا	۱ حصہ

اس مسئلہ میں چھ سے آٹھ کا عول ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے حقیقی بہنوں کو چار حصے، اخیافی بھائی کو ایک حصہ اور شوہر کو تین حصے ملتے ہیں۔ یہی ذوی الفروض ہیں، یہ سب حجبِ نقصان کے شکار ہوجاتے ہیں، کیوں کہ میراث میں ان کا حصہ کم ہوجاتا ہے اور علاتی بہنوں کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا ہے کیوں کہ ان کو حصہ نہیں ہے، یہ اصول اس مسئلہ میں بھی منطبق ہوتا

ہے کہ پسماندگان میں علاتی بھائی کے ساتھ علاتی بہنیں ہوں، اس صورت میں علاتی بھائی کو کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

ایک تہائی دو کا حصہ بنتا ہے:

۱۔ ماں جب میت کی کوئی اولاد نہ ہو اور ایک سے زائد بھائی بہن نہ ہوں، مثلاً: کسی شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کے پسماندگان میں باپ اور ماں ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور اس کے پسماندگان میں باپ اور ماں ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور باپ باقی کا وارث بنتا ہے جو دو تہائی ہے، اگر متوفی کی ماں اور حقیقی بھائی ہو تو ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور باقی یعنی دو تہائی حقیقی بھائی کو ملتا ہے۔

اگر میت کے پسماندگان میں ماں، باپ اور بیوی ہو تو ماں بیوی کو حصہ دینے کے بعد بچے ہوئے مال کے ایک تہائی کی وارث بنتی ہے جو وراثت کا ایک چوتھائی بنتا ہے، اس صورت میں وراثت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، بیوی کو ایک حصہ ملے گا یعنی چوتھائی، اور تین حصے باقی رہیں گے جن میں سے ایک حصہ ماں کو دیا جائے گا اور باپ کو ''مرد کے لیے دو عورتوں کے بقدر حصہ ہے'' کے مطابق دو حصے ملیں گے۔

اگر کسی عورت کا انتقال ہوجائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر، ماں اور باپ ہوں تو وراثت کے چھ حصے بنائے جائیں گے، شوہر کو نصف یعنی تین حصے ملیں گے اور ماں کو ایک حصہ، باپ کو دو حصے۔

دونوں مسئلوں میں اگر ماں کو شروع میں ہی ایک تہائی دیا جائے تو باپ، ماں اور شوہر والے مسئلہ میں ماں کو دو حصے مل جائیں گے اور باپ کے لیے صرف ایک ہی حصہ ملے گا۔ جب کہ یہ شرعی اصول وقاعدے کے برعکس ہے کہ ''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے بقدر ہے''۔ اسی طرح بیوی، ماں اور باپ والے مسئلہ میں بھی ماں کو شوہر کے حصے سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے۔

اگر ہم ماں کو ایک تہائی دینا چاہیں تو وراثت کے بارہ حصے ہوجائیں گے تاکہ بیوی کو ایک چوتھائی یعنی تین حصے دیے جائیں اور ماں کو باقی میں سے ایک تہائی یعنی تین حصے دیے

جائیں اور باقی چھ حصے باپ کے ہوجائیں گے۔ یہ شرعی اصول کے مطابق ہے۔ اگر شروع ہی میں ماں کو ایک تہائی دیا جائے تو اس کو چار حصے ملیں گے اور باپ کو پانچ حصے ملیں گے، یہ عورت اور مرد کی وراثت میں شرعی اصول کے مطابق نہیں ہے۔

۲۔ ایک تہائی دو یا دو سے زائد اخیافی بھائیوں یا بہنوں کا حصہ ہے، وراثت میں اخیافی بھائیوں اور بہنوں کے حصے برابر ہوتے ہیں۔

کسی کا انتقال ہوجائے اور اس کے پسماندگان میں چار حقیقی بہنیں، ایک اخیافی بھائی اور ایک اخیافی بہن ہو تو اس مسئلہ میں وراثت کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، حقیقی بہنوں کو دو تہائی یعنی چار حصے ملیں گے اور ہر ایک کو ایک حصہ، اخیافی بھائی اور بہن کو ایک تہائی یعنی دو حصے ملیں گے پھر ایک ایک حصہ ایک ایک کو ملے گا۔ ہمیں نظر آرہا ہے کہ یہاں اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اسی وجہ سے اگر وہاں کوئی دوسرا مخنث ہو تو بھی یہی حکم رہے گا، کیوں کہ اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کے حصوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

ان دونوں کے ساتھ بھائیوں کی موجودگی میں دادا کو بھی ملایا جاتا ہے جب ان کے ساتھ کوئی دوسرے ذوی الفروض نہ ہوں، کیوں کہ بھائیوں کے ساتھ مقاسمہ کی صورت میں جب اس کو زیادہ اور بڑا حصہ ایک تہائی ملے تو وہ ایک تہائی لے گا، یہ اس وقت ہے جب بھائیوں کی تعداد اس کے دوگنا سے زیادہ ہو۔

چھٹا حصہ وارثین میں سے سات لوگوں کو ملتا ہے:

۱،۲۔ باپ یا دادا کو جب متوفی کا کوئی وارث بچہ یا بچی ہو، مثلاً متوفی کے پسماندگان میں ایک بیٹا یا بیٹی یا پوتا یا پوتی اور باپ یا دادا ہو۔

۳۔ ماں کو جب میت کی کوئی اولاد ہو، مثلاً متوفی کی اولاد یا پوتے پوتیاں ہوں یا ایک ایک سے زائد بھائی اور بہنیں ہوں۔

۴۔ دادی یا نانی، اس کا حصہ چھٹا ہے چاہے میت کی اولاد یا پوتے پوتیاں ہوں یا نہ ہوں۔

۵۔ پوتی یا پوتیاں جب بیٹی کے ساتھ ہوں۔

۶۔ ایک یا ایک سے زائد علاتی بہن جب ایک حقیقی بہن موجود ہو۔

۷۔ ایک اخیافی بہن یا بھائی؛ اس کا حصہ چھٹا ہے۔

نصف پانچ لوگوں کو ملتا ہے:

۱۔ بیٹی

۲۔ پوتی

۳۔ حقیقی بہن

۴۔ علاتی بہن، البتہ شرط یہ ہے کہ یہ سب تنہا ہوں

بیٹی کے لیے آدھی میراث کی وارث بننے کے لیے یہ شرط ہے کہ متوفی کا بیٹا نہ ہو، اگر متوفی کا بیٹا ہو تو پوتی محجوب ہوجاتی ہے، یہ بھی شرط ہے کہ پوتی کے ساتھ دو بیٹیاں نہ ہوں، کیوں کہ دو بیٹیوں کی صورت میں پوتی محجوب ہوجاتی ہے، جب اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہ ہو۔

یہ بھی شرط ہے کہ حقیقی بہن کے ساتھ حقیقی بھائی نہ ہو، کیوں کہ متوفی کے پسماندگان میں حقیقی بھائی ہو تو اس مسئلہ میں یہ اصول منطبق ہوجاتا ہے کہ ''مرد کے لیے دو عورتوں کے بقدر حصہ ہے''۔ اس صورت میں بھائی کو وراثت میں بہن سے دوگنا ملے گا۔

۵۔ شوہر؛ جب متوفی بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو اور پوتے پوتیاں نہ ہوں، چاہے اسی شوہر سے ہوں یا دوسرے کسی شوہر سے۔

ایک چوتھائی یعنی ربع دو لوگوں کا حصہ بنتا ہے:

۱۔ متوفی بیوی کی کوئی وارث فرع ہو یعنی شوہر اپنی بیوی کی وراثت کے ایک چوتھائی کا اس وقت وارث بنتا ہے جب اس کی بیوی کی کوئی اولاد ہو یا اس کے بیٹے کی کوئی اولاد ہو۔

۲۔ بیوی؛ جب متوفی شوہر کی کوئی وارث فرع نہ ہو یعنی بیوی ایک چوتھائی کی اس وقت وارث بنتی ہے جب اس شوہر کی کوئی اولاد یا اس کے بیٹے کی کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو یہ ایک چوتھائی سبھی بیویوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

نوٹ: طلاق رجعی کی عدت گزارنے والی بیوی؛ چاہے اس کو ایک طلاق دی گئی ہو یا

دو؛ اگر اس کا انتقال ہو جائے تو شوہر اس کا وارث بنتا ہے، اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ اس کے مال کی وارث بنتی ہے، اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ (''بدائع الصنائع'' کاسانی ۳/ ۲۱۸) چاہے طلاق مرض الموت میں ہوئی ہو یا صحت کی حالت میں۔

اگر طلاقِ بائن یعنی تین طلاق یا خلع کے بعد دونوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے ہیں۔ چاہے وفات عدت کے دوران ہو یا مرض الموت میں طلاق ہو، البتہ حنفی فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر طلاقِ بائن کی عدت میں شوہر کا انتقال ہو جائے تو بیوی اس کی وارث ہوتی ہے۔ (لیکن ان کے نزدیک شرط یہ ہے کہ بیوی کی رضامندی کے بغیر طلاق ہوئی ہو۔ دیکھا جائے: ''بدائع الصنائع'' ۳/ ۲۱۸)

حنبلی فقہاء کا کہنا ہے: اگر کسی کو طلاق بائن ہو اور اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے اور عدت بھی ختم ہو جائے، البتہ وہ دوسری شادی نہ کرے اور اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو یہ مطلقہ اس کی وارث بنتی ہے۔ (''المبدع''، ابن مفلح المقدسی ۶/ ۲۴۲، انہوں نے کہا ہے کہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ عدت میں وارث ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی جب تک کہ یہ عورت شادی نہ کرے)

مالکی علماء کہتے ہیں: جس طلاق کا مقصد وراثت سے محروم کرنا ہو تو یہ طلاق ہی نہیں ہوتی ہے، جب اس کے بعد شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ وراثت میں اپنا حصہ پاتی ہے۔ (''حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر'' ۴/ ۹)

عول کے مسائل

عول کے لغوی معنی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں، یہ ظلم اور میلان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں اصطلاحی معنی کے مناسب ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں عول سے مراد یہ ہے کہ ذوی الفروض میں سے کسی کا حصہ اصل وراثت سے بڑھ جائے یعنی وراثت کے حصوں سے شریعت کی طرف سے مقرر کردہ سبھی وارثین کے حقوق پورے نہ ہوں۔ (''روضۃ الطالبین'' میں نووی کی عبارت یہ ہے: جب مال حصوں سے تنگ پڑ جائے تو مسئلہ میں عول ہوتا ہے۔ یعنی اس کے حصوں کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کے حصہ میں اس کے حصہ کے بقدر کمی کی جائے جس طرح قرض خواہوں اور جن کے حق میں وصیت کی گئی ہے ان کے حقوق میں اس وقت کمی کی جاتی ہے جب مال کم پڑ جائے۔ ۵/ ۱۴)

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں باپ، ماں، دو بیٹیاں اور بیوی ہو، اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ۲۴ میں تقسیم کیا جائے، اگر مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے:

۱۔ دو بیٹیاں	دو تہائی	۱۶ حصے
۲۔ باپ	چھٹا	۴ حصے
۳۔ ماں	چھٹا	۴ حصے
	جملہ	۲۴ حصے

اس صورت میں بیوی کا حصہ کہاں ہے جب کہ اس کے لیے شریعت میں آٹھواں حصہ یعنی ۲۴ میں سے ۳ حصے ملنے چاہیے؟

اس صورت میں فقہاء کہتے ہیں کہ اصل مسئلہ میں ۲۷ کی طرف عول ہوا ہے یعنی ۲۴ میں

بیوی کے تین حصے ملائیں جاتے ہیں، اس مسئلہ میں ۲۴ سے ۲۷ عول ہوا ہے، پھر دوبارہ ۲۷ حصے لوگوں میں تقسیم کیے جائیں گے تاکہ ہر وارث کو وراثت میں اس کا حق مل جائے۔ (اس مسئلہ کو "مسئلہ منبریہ" کہا جاتا ہے، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس مسئلہ کے بارے میں اس وقت دریافت کیا گیا جب آپ منبر پر تھے۔ آپ نے برجستہ کہا: اس کا ثمن (آٹھواں حصہ) نواں حصہ بن جائے گا۔ یہ عول اسی وقت ہوتا ہے جب متوفی مرد ہو۔ امام بغوی نے یہ بات "التھذیب" ۵/۴۶ میں کہی ہے اور امام نووی نے "روضۃ الطالبین" ۵/۱۴۱ میں)

عول پر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ کے عہدِ خلافت میں صحابہ کے درمیان اجماع ہوا ہے۔ آپ کے زمانے میں ایک عورت کا انتقال ہوا جس کے پسماندگان میں شوہر اور دو علاتی بہنیں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کبارِ صحابہ کی ایک کمیٹی قائم کر کے اس کی وراثت کی تقسیم پر غور کرنے کی ذمہ داری دی۔ اس وقت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اس وراثت کے اصل میں چھ حصے ہیں اور ان کو بڑھا کر سات کرنا ضروری ہے تاکہ شوہر کو تین حصے ملیں اور دو بیٹیوں کو چار۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی ہے جیسے کوئی شخص کسی کا تین درہم کا قرض دار ہو اور دوسرے شخص کا چار درہم کا، پھر قرض دار کا انتقال ہو جائے اور اس کے پاس صرف چھ ہی درہم ہوں تو اس صورت میں اس کی وراثت کے سات حصے بنائے جائیں گے تاکہ دونوں قرض خواہوں کے حقوق میں سے برابر برابر کمی کی جائے، اس طریقہ پر تین درہم والے کو ۲ ۲/۷ درہم اور چار والے کو ۳ ۳/۷ ملے گا اور جملہ چھ ہو جائے گا جو متوفی کی کل وراثت ہے۔

اب عول کا مطلب یہ ہوا کہ وراثت کے حصول میں اضافہ کیا جائے اور وارثین کی طرف سے لیے جانے والے حصوں کی قیمت گھٹائی جائے تاکہ سبھوں کی وراثت میں متوازن طور پر کمی ہو جائے۔

پھر ورثاء کے مابین حصوں کی تقسیم میں مسئلہ مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوتا ہے:

۱۔ دو (۲) حصے
۲۔ تین (۳) حصے
۳۔ چار (۴) حصے

۴۔ چھ (۶) حصے
۵۔ آٹھ (۸) حصے
۶۔ بارہ (۱۲) حصے
۷۔ اٹھارہ (۱۸) حصے
۸۔ چوبیس (۲۴) حصے
۹۔ چھتیس (۳۶) حصے

حصوں کے اصل سے عول کرنے والے تین ہیں ("روضۃ الطالبین" حاشیۃ البلقینی ۵/۱۴) : چھ حصے، بارہ حصے، اور چوبیس حصے یعنی چھ اور اس کا دوگنا اور اس کا چار گنا۔

چھ دس تک چار مرتبہ پے در پے عول ہوتا ہے یعنی ۷، ۸، ۹، ۱۰۔

چھ اس وقت سات کی طرف عول ہوتا ہے جب کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر، دو حقیقی یا علاتی بہنیں ہوں تو شوہر کو نصف اور دو بہنوں کو دو تہائی ملتا ہے، اس طرح حصے ۳+۴ = ۷ ہو جاتے ہیں جب کہ چھ ہونے چاہییے۔

چھ حصے عول بن کر آٹھ بن جاتے ہیں جب کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں ماں، شوہر، حقیقی بہن ہو، اس مسئلہ میں اصل یہ ہے کہ چھ حصے بنائے جائیں اور اس کا عول آٹھ حصوں میں ہو جائے، اس میں شوہر نصف یعنی ۳ حصوں کا وارث ہوتا ہے، بہن نصف یعنی تین حصوں کی وارث ہوتی ہے اور ماں کے لیے ایک تہائی یعنی دو حصے ہیں، اس طرح جملہ ۳+۳+۲ = ۸ حصے بن جاتے ہیں، اس مسئلہ کو "مباہلہ" کہا جاتا ہے۔ (دیکھا جائے: "الوسیط" امام غزالی ۴/۳۷۷)

متوفی کے پسماندگان میں شوہر اور دو حقیقی بہنیں اور ایک اخیافی بھائی ہو تو مسئلہ عول الی نو ہوتا ہے، کیوں کہ شوہر کو تین حصے، بہنوں کو چار حصے یعنی دو تہائی اور اخیافی بھائی کو چھٹا حصہ یعنی ایک حصہ ملتا ہے، اس کی مجموعی تعداد ۳+۴+۱+۱ = ۹ ہو جاتی ہے۔

متوفی عورت کے پسماندگان میں شوہر، دو علاتی بہنیں، ماں اور دو خیافی بھائی ہوں تو

مسئلہ ۱۰ سے عول ہوتا ہے، کیوں کہ شوہر کو نصف یعنی ۳ حصے، بہنوں کو دو تہائی یعنی ۴ حصے اور ماں کو ایک حصہ ملتا ہے اور اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی یعنی دو حصے ملتے ہیں، اس صورت میں حصوں کی جملہ تعداد ۳+۴+۱+۲=۱۰ ہو جاتی ہے اور وراثت کو دس حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو قاضی شریح کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''مسئلہ شریحیہ'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ انھوں نے ہی اس طریقہ پر تقسیم کی تھی، اسی طرح اس کو عول کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ''اُم الفروخ'' (چوزوں کی ماں) بھی کہا جاتا ہے۔ (''التھذیب'' بغوی ۵/۴۵)

۱۲ کا عول ۱۳، ۱۵، اور ۱۷ ہوتا ہے:

اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں بیوی، ماں اور دو علاتی بہنیں ہوں تو عول ۱۳ ہوتا ہے، کیوں کہ بیوی کو ایک چوتھائی یعنی ۳ حصے، ماں کو چھٹا یعنی دو حصے اور علاتی بہنوں کو دو تہائی یعنی آٹھ حصے ملتے ہیں، اس طرح جملہ تعداد ۳+۲+۸=۱۳ ہو جاتی ہے۔

۱۲ کا عول ۱۵، اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی کے پسماندگان میں بیوی، ماں، دو علاتی بہنیں اور ایک اخیافی بھائی ہو۔ بیوی کو ایک چوتھائی یعنی ۳، ماں کو چھٹا یعنی ۱۲ میں سے دو، اور علاتی بہنوں کو دو تہائی یعنی ۸ حصے ملتے ہیں، اور اخیافی بھائی کو چھٹا یعنی دو حصے ملتے ہیں، اس طرح جملہ حصے ۳+۲+۸+۲=۱۵ ہو جاتے ہیں اور وراثت کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور مذکورہ حصوں کے مطابق وراثت تقسیم کی جاتی ہے۔

۱۲ کا عول ۱۷، اس صورت میں ہوتا ہے جب متوفی کے پسماندگان میں بیوی، ماں، دو علاتی بہنیں اور دو اخیافی بھائی ہوں، اس صورت میں بیوی کو چوتھائی یعنی ۱۲ میں سے ۳، ماں کو چھٹا یعنی ۱۲ میں سے ۲، دو علاتی بہنوں کو دو تہائی یعنی ۸، اور اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی یعنی ۱۲ میں سے ۴ حصے ملتے ہیں، اس طرح جملہ حصے ۳+۲+۸+۴=۱۷ ہو جاتے ہیں، اور وراثت کی تقسیم ۱۷ حصوں میں ہوتی ہے اور ان کو وارثین میں ان کے حصوں کے بقدر تقسیم کیا جائے گا۔

۲۴ کا عول صرف ۲۷ ہوتا ہے، جب متوفی کے پسماندگان میں دو بیٹیاں، باپ، ماں اور شوہر ہوں تو مسئلہ کی اصل ۲۴ سے ہوتی ہے، کیوں کہ دو بیٹیاں دو تہائی کی وارث بنتی ہیں

جس کا مخرج ۳ بنتا ہے اور بیوی آٹھویں حصہ کی وارث بنتی ہے جس کا مخرج ۸ بنتا ہے، ۳ کو جو دو تہائی کا مخرج ہے ۸ سے ضرب دیا جائے گا جو ثمن کا مخرج ہے اور نتیجہ ۲۴ بنتا ہے۔

۲ بیٹی کو دو تہائی یعنی ۲۴ میں سے ۱۶ ملتا ہے۔

باپ کو چھٹا یعنی ۲۴ میں سے ۴ ملتا ہے۔

ماں کو چھٹا یعنی ۲۴ میں سے ۴ ملتا ہے۔

بیوی کو آٹھواں یعنی ۲۴ میں سے ۳ ملتا ہے۔

اگر ہم ان تعداد کو جمع کریں تو ۲۷ ہو جاتا ہے یعنی ۱۶+۴+۴+۳=۲۷، اسی کے مطابق وراثت ۲۷ حصوں میں تقسیم کی جائے گی۔

اس مسئلہ کو ''مسئلہ منبریہ'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا: اللہ کے لیے سبھی تعریفیں ہیں جس نے ق کے ذریعہ قطعی فیصلہ کیا اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا: امیر المومنین! آپ دو بیٹیوں، ماں باپ اور بیوی کے سلسلہ میں کیا کہتے ہیں؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیوی کا آٹھواں حصہ نواں بن جائے گا، کیوں کہ عورت ۲۴ کا آٹھواں یعنی تین حصوں کی وارث بنتی ہے، لیکن اس مسئلہ میں وہ عول کی وجہ سے ۲۷ میں سے تین حصوں کی وارث بنتی ہے۔

حجب کے احکام ومسائل

حجب کے لغوی معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں۔

شرعی معنی یہ ہیں کہ کسی سبب کی وجہ سے مکمل طور پر وراثت سے محروم ہوجائے یا اپنے حصوں میں سے سب سے بڑے حصے سے محروم ہوجائے۔ (یہی تعریف شربینی نے کی ہے ''مغنی المحتاج''، ۴/۱۳۶) پہلی قسم کو حجبِ حرمان اور دوسری قسم کو حجبِ نقصان کہا جاتا ہے۔

مثلاً پوتی وارثین میں سے ایک ہے، لیکن وہ محجوب ہوتی ہے یعنی وارث نہیں بنتی ہے جب متوفی کا بیٹا ہو، اگر متوفی کا بیٹا نہ ہو، بلکہ ایک بیٹی ہو تو پوتی کا حصہ نصف (جب وہ تنہا رہتی ہے تو نصف ملتا ہے) سے کم ہوکر چھٹا ہوجاتا ہے، یہ بیٹی کی موجودگی میں ثلثین کا تکملہ ہے۔ (یعنی بیٹی کو نصف ملتا ہے اور دوتہائی میں سے چھٹا حصہ باقی رہتا ہے جو پوتی کو ملتا ہے)۔

حجبِ حرمان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ حجب بالوصف

۲۔ حجب بالشخص

حجب بالوصف مثلاً غلام ہونے کی صفت ہے، کیوں کہ غلام وارث بننے کا اہل نہیں ہے، اسی طرح قتل کی صفت ہے کیوں کہ قاتل اس شخص کا وارث نہیں بنتا ہے جس کو قتل کیا ہو، دین کے اختلاف کی صفت ہے، اس لیے کافر اور مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے، مذکورہ تمام مثالوں میں حجب حرمان کی یہ قسم پائی جاتی ہے۔

حجب بالوصف تمام وارثین پر منطبق ہوتا ہے۔ (حجب بالوصف کی وجہ سے محجوب ہونے والے کو اصطلاح میں محروم کہتے ہیں)

حجب بالشخص: یعنی کسی شخص کا اس سے قریبی رشتے دار کی موجودگی میں پوری وراثت سے یا

بڑے حصے سے محروم ہوجانا، یہ حجب بالشخص بعض وارثین پر منطبق ہوتا ہے، سبھی وارثین پر نہیں، وارثین کی پانچ قسمیں پائی جاتی ہیں جن پر حجب بالشخص کا اصول مطلقاً منطبق نہیں ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے متوفی کی میراث سے محروم ہوتے ہی نہیں ہیں، یہ باپ، ماں، بیٹا، بیٹی اور میاں بیوی ہیں۔ ان پانچ افراد کے علاوہ حجب بالشخص وارثین میں سے مندرجہ ذیل افراد پر منطبق ہوتا ہے:

۱۔ پوتا بیٹے کی موجودگی میں محجوب ہوجاتا ہے، چاہے بیٹا پوتا ہو یا پوتی، اسی وجہ سے پوتا اور پوتی کو بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں ملتی ہے۔

۲۔ باپ کی موجودگی میں دادا محجوب ہوجاتا ہے۔

۳۔ دادی اور نانی ماں کی موجودگی میں محجوب ہوتی ہے۔

۴۔ علاتی بھائی حقیقی بھائی کی موجودگی میں محجوب ہوجاتا ہے۔

۵۔ علاتی بھتیجا حقیقی بھتیجے کی موجودگی میں محجوب ہوجاتا ہے۔

۶۔ حقیقی چچا کی موجودگی میں علاتی چچا محجوب ہوجاتا ہے۔

۷۔ حقیقی چچازاد بھائی کی موجودگی میں علاتی چچازاد بھائی محجوب ہوجاتا ہے۔

۸۔ بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں محجوب ہوجاتی ہیں، مگر یہ کہ ان کے ساتھ یا ان کے نیچے کوئی ایسا مرد ہو جو ان کو عصبہ بنادے یعنی ان کے ساتھ پوتا ہو یا پوتے کا بیٹا ہو تو اس صورت میں وہ اس کے ساتھ مل کر وارث بنتی ہیں۔

۹۔ علاتی بہنیں حقیقی بہنوں کی موجودگی میں محجوب ہوجاتی ہیں اور وہ ایک حقیقی بہن کی موجودگی میں اس وقت وارث نہیں بنتی ہیں جب متوفی کی بیٹی یا پوتی ہو، البتہ علاتی بہنوں کے ساتھ کوئی علاتی بھائی ہو تو وہ ان کو عصبہ بنادیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ مل کر وارث بنتی ہیں، اخیافی بھائی اور بہن متوفی کے فرع کی موجودگی میں محجوب ہوجاتے ہیں، نیچے تک، اسی طرح باپ دادا اوپر تک کسی کی موجودگی میں بھی محجوب ہوجاتے ہیں۔

حجبِ نقصان

وارث کو اس کے بڑے حصے سے روکنا ہے۔

حجبِ نقصان کسی شخص کے ذریعہ ہی ہوتا ہے اور یہ سبھی وارثین میں ہوتا ہے:

حجب نقصان کی مثالیں:

۱۔ماں کا حصہ ایک تہائی سے چھٹا اس وقت بنتا ہے جب اس کے متوفی کی اولاد یا بیٹے کی اولاد ہو نیچے تک، اور متوفی کے دو یا دو سے زائد بھائی اور بہنیں ہوں۔

۲۔شوہر کا حصہ نصف سے کم ہو کر ربع ہو جاتا ہے جب اس کی متوفی بیوی کی اولاد یا بیٹے کی اولاد پائی جائے، اگر متوفی شوہر کی اولاد ہو یا اس کے بیٹے کی اولاد ہو تو بیوی کا حصہ ربع سے کم ہو کر ثمن بن جاتا ہے۔

۳۔وراثت میں ذوی الفروض کی صفت سے عصبہ کی صفت میں منتقل ہو جائے مثلاً بیٹی تنہا وارث ہونے کی صورت میں نصف کی حق دار ہوتی ہے، اگر اس کے ساتھ بھائی بھی ہو یعنی میت کا بیٹا ہو تو وہ حصہ داروں سے عصبہ میں منتقل ہو جاتی ہے اور اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حصہ داروں کو دے کر بچی ہوئی وراثت کی وارث بنتی ہے۔

۴۔ایک عصبہ سے دوسرے عصبہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے مثلاً بھائی تنہا ہو تو عصبہ بنتا ہے اور اپنی بہنوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں ان کو عصبہ بنانے والا بن جاتا ہے۔

۵۔یا عصبہ سے حصہ دار میں منتقل ہو جائے مثلاً دادا کے لیے وراثت میں حصہ داروں کی طرف سے لیے جانے کے بعد صرف چھٹا حصہ بچتا ہے تو دادا صرف یہی چھٹا حصہ لیتا ہے۔

۶۔حصہ دار سے دوسرے حصہ دار کے ساتھ شریک بن جائے مثلاً بیٹیاں، ایک بیٹی نصف کی وارث بنتی ہے، اگر دس بیٹیاں ہوں تو وہ دو تہائی حصہ میں ایک دوسرے کی شریک بن جاتی ہیں۔

۷۔حصہ داروں سے عصبہ میں شریک ہونے میں تبدیل ہو جائیں مثلاً بیٹیوں کے ساتھ بہنیں۔

حجب کا دار و مدار رشتے داری میں قرابت پر ہے، مثلاً بھائی باپ کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے کیوں کہ ابوت کو اخوت پر اولیت حاصل ہے، حجب کا مدار بھی قرابت ہے۔ (فقہاء

اس کو جہت اور سمت کہتے ہیں، دیکھا جائے ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا انصاری ۳/۱۲) چناں چہ پوتا بیٹے کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے، کیوں کہ بیٹا پوتے کے مقابلہ میں متوفی سے زیادہ قریب رہتا ہے، حجب کا مدار قوت بھی ہے، اسی وجہ سے علاتی بھائی حقیقی بھائی کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے، کیوں کہ حقیقی بھائی کی قرابت زیادہ طاقت ور ہے۔

فطری طور پر ثمن اور ربع ایک ہی وراثت میں جمع نہیں ہوتے ہیں، کیوں کہ ثمن اولاد کی موجودگی میں بیوی کا حصہ ہے اور ربع اس کا حصہ اس وقت ہے جب اس کی کوئی اولاد نہ ہو۔

اسی طرح ثمن اور ثلث وراثت کی تقسیم میں جمع نہیں ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

وراثت میں جو دوسرے کا قائم مقام بنتا ہے

۱۔ پوتا بیٹے کا قائم مقام ہوتا ہے اور عصبہ ہوکر وارث بنتا ہے، مگر یہ کہ بیٹی موجود ہو تو پوتا بیٹی کے دوگنا حصہ کا وارث نہیں بنتا ہے، کیوں کہ پوتا بیٹی کو عصبہ نہیں بناتا ہے کہ اس کی میراث کا دوگنا وارث بن جائے، بیٹی کو عصبہ بنانے والا اس کا بھائی یعنی متوفی کا بیٹا ہے، اس صورت میں وہ بیٹی کے دوگنے حصہ کا وارث بنتا ہے۔

۲۔ پوتی بیٹی کی طرح ہے، مگر یہ کہ وہ بیٹے کی موجودگی میں محجوب ہوجائے، کیوں کہ بیٹا پوتی کے مقابلہ میں متوفی سے زیادہ قریب ہے۔

۳۔ دادی/ نانی ماں کی طرح ہے، لیکن دادی/ نانی ایک تہائی کی وارث نہیں بنتی ہے اور ماں کی طرح اس کو ثلث ماقی (یعنی بچی ہوئی وراثت کا ایک تہائی) نہیں ملتا ہے، کیوں کہ دادی/ نانی کا حصہ صرف چھٹا ہی ہے۔

۴۔ دادا باپ کی طرح ہے، مگر یہ کہ دادا بھائیوں اور بہنوں کو وراثت سے محروم نہیں کرتا ہے، جس طرح باپ بھائیوں اور بہنوں کو محجوب کردیتا ہے یعنی باپ کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں ہوتے ہیں؛ اگر دادا ہو تو حقیقی اور علاتی بھائی بہن وارث ہوتے ہیں، اخیافی بھائی بہن دادا کی موجودگی میں وارث نہیں بنتے ہیں، کیوں کہ دادا ان کو محجوب بنادیتا ہے۔

۵۔ علاتی بھائی حقیقی بھائی کی طرح ہے، البتہ وہ حقیقی بہن کی موجودگی میں اس کے دوگنا کا وارث نہیں بنتا ہے، کیوں کہ وہ حقیقی بہن کو عصبہ نہیں بناتا ہے۔

۶۔ علاتی بہن حقیقی بہن کی طرح ہے، البتہ وہ حقیقی بھائی کی موجودگی میں محجوب بن جاتی ہے، اس صورت میں وہ وراثت میں کسی چیز کی بھی مستحق نہیں بنتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مسائل کی اصل

مسائل: یہ ایک اصطلاح ہے، جس کو فقہاء قرآن کریم، حدیث نبوی اور خلفائے راشدین ابوبکر و عمر و عثمان و علی اور کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر ہمارے زمانہ کے فقہائے امت کے اجماع پر مبنی شرعی اصولوں کے مطابق وراثت کو تقسیم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مسائل کی اصل مذکورہ اصول وضوابط کے مطابق وراثت کی تقسیم میں معمول بہا قواعد ہیں۔

میراث کے مسائل کی اصل سات ہیں: ۲، ۴، ۶، ۸، ۳، ۱۲، ۲۴ (۱۸، ۳۸)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ میراث کے مسائل کی اصل دو اور اس کے دوگنے ہیں یعنی ۴، ۸۔ ۳، اور اس کے دوگنے ہیں یعنی ۶، ۱۲، ۲۴، یہ حصوں کے مخارج کے اعتبار سے اس بنیاد پر ہے کہ نصف کا مخرج ۲ ہے، ربع کا مخرج ۴ ہے، ثمن کا مخرج ۸ ہے، ثلث کا مخرج ۳ ہے اور سدس کا مخرج ۶ ہے، ان پانچ کا ایک ہی مخرج ہے، سدس اور ربع کا مخرج ۱۲ ہے، ثمن اور ثلث کا مخرج ۲۴ ہے۔

۱۲ ربع اور سدس کا مخرج ہے، جس طرح ثلث اور ربع کا مخرج ہے، ہر کسر کا مخرج وہی ہے، حصہ میں مماثل مسائل میں دونوں کا مخرج ایک ہی ہے مثلاً بیٹی اور علاتی بہن ہو تو اس مسئلہ میں دونوں کے لیے نصف ہے اور ان کے مسئلہ کا مخرج نصف ہے۔

جب دو حصے ایک مسئلہ میں داخل ہوتے ہوں (تداخل) مثلاً ثلث اور سدس، تو بڑے حصہ کو مخرج بنایا جائے گا، مثلاً متوفی کی ماں، حقیقی بہن اور دو اخیافی بھائی ہوں تو اس مسئلہ میں ماں کو سدس، دو اخیافی بھائیوں کو ثلث ملتا ہے، سدس اور ثلث ۶ میں موجود ہیں، اسی بنیاد پر یہ مسئلہ ۶ سے ہوگا، اس میں ماں سدس لے گی اور دو اخیافی بھائی ثلث، اور حقیقی بھائی کے لیے نصف باقی بچتا ہے۔

اگر مسئلہ ایک ہی مخرج سے ہو مثلاً بیوی اور ماں ہو تو بیوی اس مسئلہ میں ربع کی وارث

ہوتی ہے جس کی اصل ۴ ہے اور تین حصے باقی رہتے ہیں جس میں سے ماں کو ایک تہائی ملتا ہے یعنی ایک حصہ اور وراثت میں سے دو حصے باپ کے لیے بچتے ہیں جن کا وہ وارث بنتا ہے۔

اگر مسئلہ میں دو حصے ایسے ہوں جو اپنے حصوں کی تقسیم میں کسی ایک عدد سے تقسیم ہوتے ہوں اور ان کا مخرج ۴، اور ۶ ہو اور یہ دونوں ۲ سے تقسیم ہوتے ہیں تو ہم ایک کے نصف کو دوسرے کے نصف سے ضرب دیں گے تا کہ دونوں مسئلوں کا اصل معلوم ہو جائے ۶ ÷ ۲ = ۳ × ۴ = ۱۲۔ یا ۴ ÷ ۲ = ۲، پھر ۲ ک ۶۲ سے ضرب دیا جائے ۲ × ۶ = ۱۲، یہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہوتا ہے: ماں، بیوی اور ۳ علاتی بھائی اور ایک علاتی بہن، اس میں بیوی کو ربع یعنی ۳ حصے ملتے ہیں، ماں کو سدس یعنی ۲ حصے ملتے ہیں اور ۷ حصے باقی رہتے ہیں، ۳ بھائیوں کو ۶ حصے ملتے ہیں اور ہر بھائی کو دو حصہ اور بہن کو ایک حصہ ملتا ہے۔

اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جس کے دونوں حصے متباین ہوں مثلاً ثلث اور ربع جن کا مخرج ۳، اور ۴ ہے اور یہ دونوں عدد کسی ایک عدد سے تقسیم نہ ہوتے ہوں تو ان دونوں کو ایک دوسرے سے ضرب دیں گے، یعنی ۳ × ۴ = ۱۲، یہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہوتا ہے: بیوی، ماں، حقیقی بھائی، بیوی کو ربع یعنی ۳ حصے ملتے ہیں، ماں کو سدس یعنی ۲ حصے ملتے ہیں اور سات حصے باقی رہتے ہیں جن کا وارث حقیقی بھائی بنتا ہے۔

بعض متاخرین فقہاء نے ۱۸، اور ۳۶ کا بھی مسائل کی اصل میں اضافہ کیا ہے، انھوں نے ۱۸ کا اضافہ اس مسئلہ میں کیا ہے جس میں سدس اور ثلث مابقی ہو، مثلاً متوفی کی ماں، دادا اور پانچ علاتی بھائی ہوں تو اس مسئلہ میں ماں کو ۳، دادا کو ۵ ملے گا اور دس حصے باقی بچیں گے جو پانچ علاتی بھائیوں میں تقسیم کیے جائیں گے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ماں کے چھٹے حصہ کو ۶ سے کم کریں گے جس کے بعد پانچ باقی بچتا ہے، جس سے ہم ماں کا ایک تہائی نکال نہیں سکتے ہیں، اس وجہ سے ہم ۳ کو ۶ سے ضرب دیں گے تو اس کا نتیجہ ۱۸ نکلتا ہے جو اس مسئلہ کی اصل بن جائے گا۔

فقہاء نے ۱۸ کو وراثت کے مسائل میں ایک اصل کے طور پر قبول کیا ہے، کیوں کہ یہ سب سے کم صحیح مخرج ہے، جس سے سدس کو نکالا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے اس سے صحیح عدد

کے طور پر ثلث کو نکالنا ممکن ہوتا ہے۔

۳۶ کا استعمال اس مسئلہ میں ہوتا ہے جس میں ربع، سدس، ثلث مابقی اور باقی بچے ہوئے حصے ہوں، مثلاً بیوی، ماں، دادا اور سات بھائی ہوں، بیوی کو ربع ملتا ہے، ماں کو سدس اور دادا کو ثلث، اس صورت میں ہم ربع کے نصف یعنی ۲ کو ۶ سے ضرب دیں گے جس کا نتیجہ ۱۲ نکلتا ہے، پھر ۱۲ کو ۳ سے ضرب دیا جائے گا تو اس کا ماحصل ۳۶ نکلتا ہے، پھر وراثت کی تقسیم ۳۶ حصوں میں کی جائے گی، بیوی کو ربع یعنی نو حصے ملیں گے، ماں کو سدس یعنی ۶ حصے، دادا کو ثلث مابقی یعنی ۷ حصے ملیں گے اور باقی بچے ہوئے ۱۴ حصے سات بھائیوں میں تقسیم کیے جائیں گے جن میں سے ہر ایک کو دو حصے ملیں گے۔

فقہاء نے وراثت کی تقسیم میں مسئلوں کی اصل کے ضمن میں ۳۶ کو قبول کرنے پر اتفاق کیا ہے، کیوں کہ یہ سب سے چھوٹی عدد ہے جس سے ربع، سدس اور ثلث مابقی کو صحیح عدد کے طور پر تقسیم کرنا ممکن ہے۔ امام الحرمین (ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ بن یوسف جوینی ہے، اپنے زمانے میں شوافع کے امام، ایک عظیم الشان عالم، آپ کے ہاتھوں بڑے بڑے علماء فارغ ہوئے ہیں، مثلاً امام غزالی وغیرہ، آپ کی تصنیفات سے آپ کے امام ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے، آپ کی جلیل القدر تصنیفات یہ ہیں: نہایۃ المطلب، البرھان فی أصول الفقہ، وغیرہ۔ دیکھا جائے: ''طبقات ابن قاضی شھبۃ'' ص ۱/ ۲۵۵) متولی (ابو سعید عبد الرحمٰن بن مامون بن علی نیساپوری متوفی ۴۷۸ ہجری؛ مذہب شافعی کے ایک زبردست عالم، آپ بڑے زبردست فقیہ و محقق ہیں، آپ کی تصنیفات میں ''التتمۃ'' بڑی مشہور ہے، آپ نے فورانی، قاضی حسین وغیرہ سے فقہ کی تعلیم کی، آپ کا تعارف ''طبقات ابن قاضی شھبۃ'' میں ہے ۱/ ۲۴۷) اور نووی نے ''الروضۃ'' (روضۃ الطالبین ۵/ ۱۳۹۔۱۴۰) نے ۳۶ کو وراثت کی تقسیم میں ایک اصل عدد کے طور پر موافقت کی ہے، لیکن بعض متاخر فقہاء نے ۱۸، اور ۳۶ کو بطور اصل عدد کے اس لیے قبول نہیں کیا ہے کہ یہ طویل ہے۔ متقدمین سے مراد وہ علماء ہیں جو پانچویں صدی کی ابتدا سے پہلے کے ہوں اور متاخرین ان علماء کو کہا جاتا ہے جو چوتھی صدی کے بعد رہے ہوں، لیکن متاخرین کا خیال یہ ہے کہ متقدمین کا زمانہ امام شہاب الدین ابن حجر ہیتمی اور شمس الدین رملی تک پھیلا ہوا ہے اور ان کے بعد آنے والوں کو متاخرین مانا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہراس وراثت کے مسئلہ میں جس میں دو نصف رہتے ہیں مثلاً شوہر اور علاتی بہن اوران میں سے ہر ایک نصف کا وارث بنتا ہے، اور وہ مسئلہ جس میں نصف اور بقیہ رہتا ہے مثلاً شوہر اور علاتی بھائی، اس میں شوہر کو نصف ملتا ہے اور علاتی بھائی کو بچا ہوا تو اس میں اصل ۲ ہوگی، کیوں کہ نصف کا مخرج دو ہے۔

اگر کسی مسئلہ میں دو تہائی اور ایک تہائی ہو مثلاً دو علاتی بہنیں اور دو اخیافی بہنیں تو بہنوں کو دو تہائی اور اخیافی بہنوں کو ایک تہائی ملتا ہے۔ یا ثلثین اور بقیہ ہو مثلاً دو حقیقی بہنیں اور ایک علاتی بھائی ہو تو بہنیں دو تہائی کی وارث بنتی ہیں اور بھائی بچے ہوئے کا وارث بنتا ہے، یا مسئلہ میں ثلث اور بقیہ ہو مثلاً ماں اور علاتی چچا ہو تو ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور چچا باقی کا وارث بنتا ہے، ان مسائل میں مخرج ۳ ہوتا ہے۔

جس مسئلہ میں ربع اور بقیہ ہو مثلاً بیوی اور چچا ہو تو بیوی کو ربع ملتا ہے اور چچا بچے ہوئے کا وارث ہوتا ہے، ان مسائل کی اصل ۴ ہوتی ہے۔

جس مسئلہ میں بھی سدس اور بقیہ ہو مثلاً ماں اور بیٹا ہو تو ماں کو سدس ملتا ہے اور بیٹا بچے ہوئے کا وارث بنتا ہے یعنی ۶ میں سے پانچ حصے اس کو ملتے ہیں۔ یا جس مسئلہ میں سدس اور ثلث ہو مثلاً ماں، دو اخیافی بھائی اور تین حقیقی بھائی تو ماں کو سدس ملتا ہے، دو اخیافی بھائیوں کو ثلث ملتا ہے اور تین حقیقی بھائیوں کو باقی وراثت ملتی ہے۔

یا مسئلہ میں سدس اور ثلثین اور بقیہ ہوں مثلاً ماں، دو علاتی بہنیں اور چچا ہو تو ماں سدس کی وارث بنتی ہے جو ایک حصہ ہے، دو علاتی بہنیں دو تہائی کی وارث بنتی ہیں جو چار حصے ہیں اور چچا بچے ہوئے کا وارث بنتا ہے جو ایک حصہ ہے۔

یا مسئلہ میں سدس، نصف اور مابقی ہو مثلاً ماں، بیٹی اور علاتی بھائی ہو تو ماں سدس یعنی ایک حصہ کی وارث بنتی ہے، بیٹی نصف یعنی تین حصوں کی حقدار بنتی ہے اور علاتی بھائی کو مابقی ملتا ہے یعنی دو حصے؛ ان تمام مسائل کی اصل ۶ بنتی ہے۔

ہراس مسئلہ میں جس میں ثمن اور مابقی ہو، مثلاً بیوی اور بیٹا ہو تو بیوی کو ثمن ملتا ہے اور

بیٹے کو مابقی یعنی بیوی کو ایک اور بیٹے کو سات حصے ملتے ہیں۔

یا مسئلہ میں ثمن، نصف اور مابقی ہو مثلاً بیوی، بیٹی اور علاتی بھائی ہو تو بیوی کو ثمن، بیٹی کو نصف اور علاتی بھائی کو بقیہ ملتا ہے یعنی ۸ میں سے ۳ حصے، ان تمام مسائل کی اصل ۸ ہوتی ہے جو ثمن کا مخرج ہے۔

جس مسئلہ میں ربع اور سدس ہو مثلاً بیوی، اخیافی بھائی اور حقیقی بھائی ہو تو بیوی کو ربع، اخیافی بھائی کو سدس اور حقیقی بھائی کو بقیہ ملتا ہے، اس مسئلہ کی اصل ۴ کے نصف اور ۶ کے ضرب کا ماحاصل ہے یعنی ۲×۶=۱۲، یا ۶ کے نصف کو ۴ سے ضرب کا ماحاصل ہے یعنی ۳×۴=۱۲۔

جس مسئلہ میں سدس اور ثمن اور مابقی ہو مثلاً بیوی، دادی اور بیٹا ہو تو بیوی کو ثمن ملتا ہے، دادی کو سدس اور باقی بیٹے کو ملتا ہے، اس مسئلہ کی اصل ۲۴ ہوتی ہے جو ۶ کے نصف کو ۸ سے ضرب دینے کا ماحاصل ہے تو اس میں اصل ۲۴ ہوتی ہے اور یہی ۶ کے نصف کو ۸ سے ضرب دینے یا ۸ کے نصف کو ۶ سے ضرب دینے کا ماحصل ہے۔

جن مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ سبھی وراثت کے وہ مسائل ہیں جن میں وارثین کے لیے مقررہ حصے ہیں، البتہ جن مسائل میں حصے نہ ہوں تو وارثین کی تعداد کے مطابق وراثت کی تقسیم کی بنیاد پر حساب کیا جاتا ہے مثلاً وراثت کا وہ مسئلہ جس میں وراثت پانچ بیٹوں میں تقسیم کی جاتی ہے تو اس کا مخرج ۵ ہوگا، جس مسئلہ میں وراثت ۵۰ بیٹوں میں تقسیم کی جاتی ہے تو اس کا مخرج ۵۰ ہوگا۔ عددِ رؤوس کی تقسیم میں اگر مرد اور عورتیں دونوں پائے جائیں تو ان کے درمیان اس اصول کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے گی کہ ”مرد کے لیے دو عورتوں کے بقدر حصہ ہے“۔ مثلاً دس بیٹے اور دس بیٹیاں ہو تو اس کا مخرج ۳۰ ہوگا جو ہر بیٹے کے دو حصے شمار کر کے ۲۰، اور بیٹیوں کے دس حصوں کو ملانے کے بعد بنتا ہے، کیوں کہ بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے ملتے ہیں، وراثت میں حتی الامکان ہمیشہ اسی اصول کی رعایت نسب یعنی بیٹا/ بیٹی ہونے میں کرنا ضروری ہے۔

اگر یہ دشوار ہو مثلاً کسی مسئلہ میں دو بیٹیاں اور ایک حقیقی بھائی ہو تو ہمیں یہاں نظر آتا

ہے کہ شریعت نے ان کے درمیان برابری کی ہے، یعنی دو بیٹیوں کو دو تہائی اور بھائی کو ایک تہائی ملتا ہے۔ اس مسئلہ میں بھی؛ چار بیٹیاں، چار حقیقی بھائی ہوں تو بیٹیوں کو دو تہائی ملتا ہے اور چار بھائیوں کو صرف ایک تہائی ملتا ہے، اس مسئلہ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورت کو مرد کی وراثت سے دوگنا مل رہا ہے، لیکن ان دو مسئلوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ وراثت میں مرد اور عورت کی رعایت صرف ان مسائل میں کی جاتی ہے جن میں حصے نہ ہوں۔

وراثت کے مسائل میں ولاء اور آقائیت کی بحث بھی ہے (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب فی علم الفرائض'' کلوذانی ۳۰۲) یعنی آقا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث بنتا ہے، یہاں بھی مرد اور عورت کا اصول منطبق ہوتا ہے، کیوں کہ یہ حق آزاد کرنے والے کے ساتھ خاص ہے، چاہے آزاد کرنے والا مرد ہو یا عورت، وہ اپنے آزاد کردہ غلام کے وارث بنتے ہیں، ولاء کی وراثت آقا کے بعد اس کے مرد عصبہ کو پہنچتی ہے، اس میں سے عورتوں کو کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

اگر غلام میں چند افراد شریک ہوں مثلاً کوئی غلام کا آدھا حصہ خریدے اور دوسرا ایک تہائی اور تیسرا چھٹا حصہ تو اس مسئلہ میں مسئلہ کی اصل نصف، سدس اور ثلث کا مخرج بنے گا یعنی ۶، پھر غلام کی وراثت ان کے درمیان غلام میں ان کے حصوں کے بقدر تقسیم کی جائے گی یعنی غلام کی وراثت چھ حصوں میں تقسیم کی جائے گی، آدھے والے کو تین حصے ملیں گے، ایک تہائی والے کو دو حصے اور چھٹے والے کو ایک حصہ ملے گا، اس طرح آزاد کرنے سے پہلے غلام کی ملکیت کے اعتبار سے ان میں وراثت برابر برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔

تصحیح کے مسائل

اس باب میں میراث کے مسائل میں ہر وراثت کے وارثین کے حصوں کو صحیح بنانے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، جس سے ہر وارث کا حصہ بغیر کسر کے صحیح عدد سے معلوم ہو جاتا ہے، جب یہ ہو جاتا ہے تو وراثت کی تقسیم صحیح ہو جاتی ہے۔

مثلاً متوفی کے پسماندگان میں شوہر، ماں اور اخیافی بہن ہو تو اس مسئلہ کی اصل ۶ سے ہوگی، اس میں سے شوہر کو نصف یعنی ۳ حصے ملیں گے، ماں کو ایک تہائی یعنی ۲ حصے اور اخیافی بہن کو چھٹا یعنی ایک حصہ ملے گا، تقسیم کا مجموعہ ۳+۲+۱=۶ ہو جائے گا، ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ وراثت میں ہر وارث کا حصہ صحیح ہے، یہاں اس مسئلہ میں عول کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

میراث کے بعض مسائل میں عول کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے وارثین میں دادی و نانی، تین بیویاں اور چار اخیافی بہنیں اور آٹھ علاتی بہنیں ہوں تو اس مسئلہ کی اصل ۱۲ سے ہوگی، کیوں کہ ربع کے نصف یعنی ۲ کو سدس کے مخرج سے ضرب دیا جائے گا یعنی ۲×۶=۱۲ یا ۴×۳=۱۲، کیوں کہ بیویوں کا حصہ ایک چوتھائی ہے، تین اخیافی بہنوں کا حصہ ایک تہائی ہے، نانی اور دادی کا حصہ چھٹا ہے اور ۸ علاتی بہنوں کا حصہ دو تہائی ہے، ان حصوں کی تعداد ۳+۴+۲+۸=۱۷ ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے وراثت کی تقسیم ۱۲ حصوں کے بجائے ۱۷ حصوں میں کی جائے گی، کیوں کہ اصل مسئلہ ۱۲ میں ۱۷ تک عول ہوا ہے، تاکہ ہر وارث کو وراثت کے حصوں میں صحیح عدد مل جائے۔

اگر وارثین میں سے کسی بھی قسم کے حصہ میں کسر ہو جائے تو اس قسم کے عدد رؤس (اس قسم میں موجود وارثین کی عدد) کو اصل مسئلہ میں عول کے بغیر ضرب دیا جائے گا، مثلاً شوہر اور دو حقیقی بھائی ہوں تو شوہر کو نصف ملتا ہے اور اصل مسئلہ دو سے بنتا ہے، اگر شوہر نصف لے تو ایک

حصہ بچتا ہے، جب کہ یہ عدد دو بھائیوں میں بغیر کسر کے تقسیم نہیں ہوتی ہے، اس کا حل یہ ہے کہ اصل مسئلہ جو ۲ ہے کو حقیقی بھائیوں کے عددِ رؤوس سے ضرب دیا جائے جو ۲ ہے تو اس کا نتیجہ ۲×۲=۴ نکلتا ہے پھر اس نئے مخرج سے وراثت کی دوبارہ تقسیم کی جائے گی، شوہر کو نصف یعنی ۲ حصے ملیں گے اور ۲ باقی بچیں گے جو دو بھائیوں کے ہیں، ہر بھائی کے لیے ایک ایک حصہ۔

متوفی کے پسماندگان میں ماں اور چار چچا ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور مسئلہ کی اصل ۳ ہوتی ہے، اس میں ماں کو ایک تہائی یعنی ایک حصہ ملتا ہے، پھر دو حصے باقی رہتے ہیں جو چار چچا میں تقسیم نہیں ہوتے ہیں، چچا کی تعداد چار ہے جس کا نصف ۲ بنتا ہے جس کو ہم اصل مسئلہ میں ضرب دیں گے ۲×۳=۶۔ پھر چھ حصوں میں وراثت تقسیم کی جائے گی، اس صورت میں ماں کو ایک تہائی یعنی ۲ ملتا ہے اور چار حصے باقی رہتے ہین جو چچا کے ہیں، ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملتا ہے۔

اگر کسی مسئلہ میں عول ہو تو اس صورت میں وہاں عول کیا جائے گا جب وارثین کی قسموں میں سے کسی ایک کے حصے کسر کے بغیر تقسیم کو قبول نہ کرتے ہوں مثلاً متوفی کے پسماندگان میں شوہر، پانچ حقیقی یا علاتی بہنیں ہوں تو شوہر کو نصف ملتا ہے اور پانچ بہنوں کو دو تہائی یعنی مسئلہ چھ سے ہوگا، شوہر کے لیے نصف یعنی ۳ حصے ملیں گے اور بہنوں کو دو تہائی یعنی چار حصے ملیں گے، اس طرح مجموعی تعداد ۷ ہو جائے گی، جب کہ مسئلہ کی اصل ۶ ہے، اس صورت میں مسئلہ ۶ عول الی ۷ ہو جائے گا، پھر شوہر کو تین حصے ملیں گے اور پانچ بہنوں کو چار حصے، لیکن چار کی تعداد پانچ میں تقسیم نہیں ہوتی ہے، اس لیے ہم بہنوں کے عدد رؤوس کو عول میں ضرب دیں گے ۵×۷=۳۵، یعنی دوبارہ مسئلہ کو ۳۵ میں سے تقسیم کیا جائے گا۔

پہلی تقسیم میں شوہر کا حصہ تین تھا جس کو ہم ۵ سے ضرب دیں گے ۳×۵=۱۵، یہ عول کے بعد وراثت میں شوہر کا حصہ ہوگا اور ۲۰ حصے باقی بچتے ہیں جن کو پانچ بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا؛ ہر بہن کو ۴ حصے ملیں گے۔

متوفی کے پسماندگان میں شوہر، باپ، ماں اور چھ بیٹیاں ہوں تو شوہر کو وراثت میں چوتھائی ملتا ہے، باپ کو چھٹا اور ماں کو چھٹا ملتا ہے، اور بہنوں کو دو تہائی ملتا ہے، اس مسئلہ کی

اصل جاننے کے لیے ہمیں چھ کے نصف کو ۴ سے ضرب دینا پڑے گا یعنی ۳×۴=۱۲، اس مسئلہ کی اصل ہوگی، جن میں شوہر کو چوتھائی یعنی ۳ حصے، باپ کو چھٹا یعنی دو حصے، ماں کو چھٹا یعنی دو حصے اور بیٹیوں کو دو تہائی یعنی آٹھ حصے ملیں گے، جس کی وجہ سے مجموعی تعداد ۳+۲+۲+۸=۱۵ ہو جائے گی، اس مسئلہ میں ۱۲ عول الی ۱۵ ہو جاتا ہے، لیکن اس جدید اصل میں چھ بیٹیوں کا حصہ ۸ بنتا ہے جو ۶ میں تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے ۶ کے نصف یعنی ۳ کو ۱۵ میں ضرب دیں گے ۳×۱۵=۴۵، پھر مندرجہ ذیل طریقہ پر دوبارہ تقسیم کی جائے گی:

شوہر کا حصہ	۳×۳=۹
باپ کا حصہ	۲×۳=۶
ماں کا حصہ	۲×۳=۶
بیٹیوں کا حصہ	۸×۳=۲۴
مجموعہ	۴۵

اگر کسی مسئلہ کی دو قسموں کے حصے صحیح عدد کی تقسیم قبول نہ کرتی ہوں جیسا کہ مندرجہ ذیل مثال میں ہے: متوفی کے پسماندگان میں ۱۲ بیٹیاں، چار علاتی بہنیں ہوں تو بیٹیوں کو دو تہائی ملتا ہے جس کا مخرج ۳ ہے اور ۳ میں سے بیٹیوں کو دو حصے ملتے ہیں اور چار بھائیوں کو عصبہ کی بنیاد پر ایک حصہ ملتا ہے، یہاں ہمیں نظر آرہا ہے کہ بیٹیوں کے حصے ۲ ہیں جو وارثین بیٹیوں میں کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اسی طرح بھائیوں کو ایک حصہ ملا ہے جو کسر کے بغیر ۴ میں تقسیم نہیں ہوتا ہے، بیٹیوں کی تعداد ۱۲ ہے اور بھائیوں کی تعداد ۴ ہے، جو ایک ہی عدد سے تقسیم ہوتی ہیں جو یہاں ۴ ہے، اس لیے ہم بیٹوں کی تعداد کے ربع کو بھائیوں کی تعداد میں ضرب دیں گے یعنی ۳×۴=۱۲، پھر بارہ کو اصل مسئلہ یعنی ۳ میں ضرب دیں گے، اس سے ہمارے پاس ایک نئی اصل آجائے گی جو وارثین کے کسر کے بغیر تقسیم ہو جاتی ہے یعنی ۱۲×۳=۳۶، اس طرح بیٹوں کو ۱۲×۲=۲۴ حصے ملیں گے اور بھائیوں کو ۱۲×۱=۱۲ حصے ملیں گے۔

متوفی کے پسماندگان میں تین بیٹیاں، دادی اور نانی اور چچا ہو تو دادی نانی کو چھٹا

حصہ ملتا ہے جس کا مخرج ۶ ہے، اسی وجہ سے مسئلہ کی اصل چھ ہوجائے گی، بیٹیوں کو دو تہائی ملتا ہے یعنی ۴ جس کی تقسیم ۳ سے نہیں ہوتی ہے، اس لیے یہاں بیٹیوں کے عدد رؤوس یعنی ۳، اور ان کے حصوں کی تعداد یعنی ۴ کے درمیان تباین پایا جاتا ہے، دادی نانی کا حصہ ایک ہے اور یہ بھی دو دادیوں پر برابر برابر بغیر کسر کے تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے یہاں بھی دادی نانی کی تعداد ۲، اور ان کے حصوں کی تعداد ایک میں تباین ہے، چچا کا حصہ ایک ہے، اس مسئلہ میں صرف یہی ایک وارث ہے جس کے حصوں کی تعداد اور وارثین کی تعداد میں تماثل پایا جاتا ہے، کیوں کہ وہ تنہا وارث ہے اور اس کے حصوں کی تعداد بھی ایک ہے۔

اس صورت میں ہم ۳ کو جو بیٹیوں کا عدد رؤوس ہے دو سے ضرب دیں گے جو دادی نانی کا عدد رؤوس ہے، اس کا حاصلِ ضرب ۶ ہوتا ہے جس کو ہم اصل مسئلہ ۶ میں ضرب دیں گے ۶×۶ = ۳۶، پھر اس نئے اصل کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے گی۔

بیٹیوں کے حصے ۴×۶=۲۴

دادی نانی کے حصے ۱×۶=۶

چچا کے حصے ۱×۶=۶

سابقہ دونوں مسئلوں میں عول نہیں ہوتا ہے۔

یہی اصول جو ہم نے مذکورہ بالا دو مسائل میں اپنایا ہے؛ ہر اس مسئلہ میں بھی اپنائیں گے جس میں عول ہوتا ہے جب اصل سے زائد حصوں میں کسر پایا جائے اور وارثین میں بغیر کسر کے وراثت تقسیم نہ ہوتی ہو۔

مثلاً متوفی کے پسماندگان میں ماں، آٹھ اخیافی بھائی اور ۲۴ علاتی بہنیں ہوں، ماں چھٹے حصہ کی وارث ہوتی ہے، اس لیے مسئلہ کی اصل ۶ ہوگی یا ۶ حصوں میں سے ماں کو ایک حصہ ملتا ہے، آٹھ علاتی بہنوں کا حصہ دو تہائی ہے جو ۶ میں سے ۴ حصے بنتے ہیں، اس طرح جملہ حصے ۱+۲+۴=۷ ہوگئے، جب کہ مسئلہ کی اصل ۶ ہے اور اس میں عول الی ۷ ہوگئے، اس میں سے ماں کا حصہ ایک ہے جو ایک میں تقسیم ہوجاتا ہے، یعنی ماں ایک ہی ہے، اخیافی بھائیوں کے ۲ حصے

ہیں، جو آٹھ بھائیوں کے عدد رؤوس کے نصف کا مشترک عامل ہے یعنی ۴ دو میں تقسیم ہوتا ہے۔

۲۴ بہنوں کے حصے ۴ ہیں اور یہ ان کی تعداد کے ربع کا عامل مشترک ہے، ۲۴، اور ۴ دونوں ۴ سے تقسیم ہوجاتے ہیں، علاتی بہنوں کی تعداد کا ربع یعنی چوتھائی ۶ ہے اور اس کا نصف ۳ ہے جس کو ہم ۴ سے ضرب دیں گے جو بھائیوں کی تعداد کا نصف ہے، اس کا ماحاصل ۱۲ ہوتا ہے جس کو ہم ۷ میں ضرب دیں گے جو عول کے بعد مسئلہ کی اصل ہے، اس کے نتیجہ میں اس مسئلہ کی نئی اصل ۸۴ ہوجائے گی اور اس کے مطابق مندرجہ ذیل طریقہ پر وراثت تقسیم ہوگی:

ماں کا حصہ ۱×۱۲=۱۲

۸۔اخیافی بھائیوں کا حصہ ۲×۱۲=۲۴ ہر ایک کے لیے ۳ حصے

۲۴۔علاتی بہنوں کا حصہ ۴×۱۲=۴۸ ہر ایک کے لیے ۲ حصے

جملہ ۸۴

ورثاء کے مابین حصوں کو تقسیم کرنے کے اعتبار سے ان مسائل میں چار امور پائے جاتے ہیں: (مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب فی علم الفرائض'' کلوذانی ص ۶۲)

۱۔تماثل مثلاً ۳، ۳

۲۔تداخل مثلاً ۳، ۶، کیوں کہ ۳، ۶ میں داخل ہوجاتا ہے۔

۳۔توافق مثلاً ۴، ۶، دونوں ۲ کی تقسیم کو قبول کرتے ہیں۔

۴۔تباین مثلاً ۳، ۴ کے درمیان کا تعلق، یہ دونوں الگ الگ تعداد ہے اور دونوں کسی ایک کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا، اگر دو میں تداخل ہو تو ان میں سے بڑی عدد کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا۔

اگر دو اصناف کی تعداد میں توافق ہو تو ان میں سے کسی ایک کے عاملِ مشترک کو دوسرے سے ضرب دیں گے، اگر دو عدد میں تباین ہو تو ایک کو دوسرے سے ضرب دیں گے اور حاصلِ ضرب کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا۔

تداخل کی مثال یہ ہے کہ متوفی کے پسماندگان میں ماں، آٹھ اخیافی بھائی اور آٹھ

علاتی بہنیں ہوں، ماں چھٹے حصہ کی وارث بنتی ہے، اس وجہ سے مسئلہ کی اصل ۶ ہوگی جن میں سے ماں کو ایک حصہ ملتا ہے، آٹھ اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی ملتا ہے یعنی دو حصے، آٹھ بہنیں دو تہائی کی وارث ہوتی ہیں یعنی ۴ حصے، اس طرح حصوں کی تقسیم ۱+۲+۴ ہوگی اور مسئلہ میں ۷ سے عول ہوگا، اس میں سے ماں کو ایک حصہ، یہ اس پر برابر تقسیم ہوجاتا ہے، اخیافی بھائیوں کو ۲ حصے ملتے ہیں، یہ عدد ۸ میں تقسیم نہیں ہوتی ہے، لیکن ان دونوں اعداد میں ۲ سے توافق پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان کی تعداد کا نصف یعنی ۴ کو لیں گے، علاتی بہنوں کے چار حصے ہیں، یہاں ان کی تعداد اور ان کے حصوں میں ربع سے توافق پایا جاتا ہے، کیوں کہ ان کی تعداد کا ربع ۲ ہے اور یہ عدد ۴ میں داخل ہوجاتی ہے جو ان کے حصوں کی تعداد، اس وجہ سے ہم ۴ کو ۷ سے ضرب دیں گے اور مسئلہ کی اصل ہوجائے گا یعنی ۲۸۔

اس اصل کے مطابق ہم دوبارہ مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کریں گے:

ماں کا حصہ ۔۔۔ ۱×۴=۴

آٹھ اخیافی بھائیوں کا حصہ ۔۔۔ ۲×۴=۸

آٹھ علاتی بہنوں کا حصہ ۔۔۔ ۴×۴=۱۶

جملہ ۔۔۔ ۲۸

تماثل کی مثال: متوفی کے پسماندگان میں ماں، چھ اخیافی بھائی اور ۱۲ علاتی بہنیں ہوں، اس مسئلہ کی اصل ۶ ہے جس میں ۷ سے عول ہوتا ہے اور مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوتی ہے:

ماں کو چھٹا حصہ یعنی ایک حصہ

چھ اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی یعنی ۲ دو حصے

۱۲ علاتی بہنوں کو دو تہائی یعنی ۴ حصے

ماں کا حصہ اس پر برابر تقسیم ہوتا ہے، لیکن اخیافی بھائیوں کی تعداد ۲ پر تقسیم نہیں ہوتی ہے، ان کی تعداد ۶ ہے، لیکن دو اور چھ دونوں ۲ سے تقسیم ہوجاتے ہیں، اس وجہ سے ہم ۶ کا نصف کریں گے جو ۳ ہوتا ہے۔

۱۲ علاتی بہنوں کے حصے ۴ ہوتے ہیں جو ان کے عدد رؤوس کے ساتھ ربع کے ذریعہ توافق ہوتا ہے جب کہ ۱۲ اربع ۳، یہاں ۳، اور ۳ کے درمیان تماثل پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ہم اصل مسئلہ میں ان دونوں میں سے ایک کو ضرب دیں گے یعنی ۳×۷=۲۱، پھر ان کے درمیان دوبارہ ۲۱، اصل سے تقسیم کی جائے گی جس کا نتیجہ مندرجہ ذیل نکلتا ہے:

ماں کا حصہ ۔۔۔ ۱×۳=۳

اخیافی بھائیوں کا حصہ ۔۔۔ ۲×۳=۶

علاتی بھائیوں کا حصہ ۔۔۔ ۴×۳=۱۲

جملہ ۔۔۔ ۲۱

ہم نے یہاں تماثل اور توافق کی مثالیں اس لیے دی ہیں تا کہ ان مسائل میں تصرف کی کیفیت اور طریقہ کی وضاحت ہو جن میں وارثین کے اصناف کے حصے کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں۔

اگر کسر صرف ایک ہی صنف میں ہو مثلاً متوفی کے پسماندگان میں ماں اور پانچ چچا ہوں، تو ماں ایک تہائی کی وارث بنتی ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ کی اصل ۳ سے ہوتی ہے جس میں ماں ایک تہائی یعنی ایک حصہ کی وارث بنتی ہے، چچا کے لیے ۲ حصے باقی بچتے ہیں، اور یہ پانچ چچا پر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس صورت میں ہم چچا کے عدد رؤوس کو یعنی ۵ کو اس مسئلہ یعنی ۳ سے ضرب دیں گے ۳×۵=۱۵، پھر ہم اس نئے اصل سے دوبارہ وراثت تقسیم کریں گے:

ماں کا حصہ ۔۔۔ ۱×۵=۵

پانچ چچا کا حصہ ۔۔۔ ۲×۵=۱۰

جملہ ۔۔۔ ۱۵

مندرجہ ذیل مثال سے وارثین کی تین اصناف کے حصوں میں کسر کی وضاحت ہوتی ہے:

متوفی کے پسماندگان میں دادی نانی، تین اخیافی بھائی اور دو چچا ہوں تو مسئلہ کی اصل ۶ سے ہوگی، دادی نانی کو چھٹا، تین اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی، دو چچا کو بچا ہوا ملے گا یعنی حصوں کی

تقسیم ۱+۲+۳=۶ ہوگی، ان تینوں اصناف میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر صنف کی اس سے تقسیم نہیں ہوتی ہے بلکہ ان میں کسر پایا جاتا ہے، اس صورت میں ہم بھائیوں کے عدد رؤوس کو چچا کے عدد رؤوس سے ضرب دیں گے یعنی ۲×۳=۶، پھر ماحصل کو جو چھ ہے اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے ۶×۶=۳۶، پھر اس نئی اصل کے مطابق وراثت کو دوبارہ تقسیم کریں گے:

دادی نانی	۱×۶=۶
دو چچا	۳×۶=۱۸
تین اخیافی بھائی	۲×۶=۱۲
جملہ	۳۶

وارثین میں سے چار اصناف کے حصوں میں جب کسر ہوتا ہے تو ترکہ میں تصرف کرنے کو واضح کرنے والی مثال مندرجہ ذیل ہے:

دو بیویاں، چار دادیاں، تین اخیافی بھائی اور دو چچا، ہم اس مسئلہ میں دیکھتے ہیں کہ بیویوں کا حصہ چوتھائی ہے، دادیوں کا حصہ چھٹا ہے، اگر ہم چار کے نصف کو چھ سے ضرب دیں ۲×۶ تو حاصل ۱۲ نکلتا ہے جو اس مسئلہ کی اصل بنتا ہے، اس میں بیویوں کو ربع ملتا ہے جو ۳ حصے بنتے ہیں، یہ عدد دو بیویوں میں تقسیم نہیں ہوتی ہے، چار دادیوں کا حصہ چھٹا ہے جو ۲ حصے بنتے ہیں، یہ عدد چار سے تقسیم نہیں ہوتی ہے، تین اخیافی بھائیوں کے حصہ میں ۴ حصے آتے ہیں جو ۳ پر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، دو علاتی چچا کے ۳ حصے ہیں جو ۲ پر تقسیم نہیں ہوتے ہیں۔

یہاں اخیافی بھائیوں کی تعداد اور دو بیویوں کے حصوں کی تعداد کے درمیان تماثل پایا جاتا ہے جو ۳ ہے، دادیوں کے حصول کی تعداد یعنی ۲، اور چچاؤں کے عدد رؤوس یعنی ۲ کے درمیان تماثل پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ہم ۳ مماثل سے ایک اور ۲ مماثل میں سے ایک کو لے کر دوسرے کو ضرب دیں گے ۲×۳=۶، پھر اس عدد کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے ۶×۱۲=۷۲۔

پھر دوبارہ اس نئی اصل کے مطابق حصہ داروں میں وراثت تقسیم کریں گے:

دو بیویاں	۳×۶=۱۸	ہر ایک کے لیے نو

چار دادیاں	۲×۶=۱۲	ہر ایک کے لیے تین
تین اخیافی بھائی	۴×۶=۲۴	ہر ایک کے لیے آٹھ
دو چچا	۳×۶=۱۸	ہر ایک کے لیے نو
جملہ	۷۲	

ہم نے یہ بات پہلے بتادی ہے کہ چار سے زیادہ اصناف میں وارثین کے حصوں میں کسر نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ متوفی کے بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں پانچ اصناف ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوسکتے ہیں: باپ، ماں، بیٹا، بیٹی اور میاں بیوی میں سے کوئی ایک۔ شوہر دو نہیں ہوسکتے ہیں اور باپ بھی الگ الگ نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس کی جگہ دادا ہے۔ ماں بھی متعدد نہیں ہوسکتی ہے، البتہ اس کی جگہ دادیاں متعدد ہوسکتی ہیں، بیویاں کئی ہوسکتی ہیں، بیٹے اور بیٹیاں کئی ہوسکتی ہیں، جمع کے ممکن ہونے کی صورت میں صرف چار اصناف میں تعدد پایا جاتا ہے، مجتمع نہ ہونے کی صورت میں چار اصناف سے زیادہ ہوتے ہیں، اگر کوئی اس اصول کو جان جائے تو کوئی بھی مثال پیش کی جائے تو اس کے لیے دشوار نہیں بنتا ہے۔

ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ نسب کی بنیاد پر وراثت کی صورت میں وارثین میں سے چار اصناف سے زیادہ کے حصوں میں کسر نہیں ہوتا ہے، البتہ ولاء کی بنیاد پر وارث ہونے کی صورت میں چار سے زیادہ کسر ہوسکتے ہیں، کیوں کہ سو سے زائد آدمی نصف غلام کے مالک ہوسکتے ہیں اور پانچ سو آدمی ایک غلام کے مالک بن سکتے ہیں، اسی بنیاد پر اس غلام پر ان کی ملکیت کے اعتبار سے وراثت تقسیم کی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

میراث کے مسائل میں اختصار

(مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب فی علم الفرائض'' کلوذانی ۶۰)

اس باب میں میراث کے حصوں کے مسائل میں اختصار کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، اختصار کی دو قسمیں ہیں: ایک اختصار حصوں کے درمیان ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہے:

متوفی کے پسماندگان میں ایک بیٹی، بیوی اور دادا ہو تو بیوی کو آٹھواں، دادا کو چھٹا ملتا ہے، ثمن اور سدس کی تقسیم ۲ سے ہوتی ہے، اس وجہ سے ۸ کے نصف یعنی ۴ کو ۶ سے ضرب دیں گے ۴×۶=۲۴، اس طرح ہمیں مسئلہ کی اصل ملے گی جو ۲۴ ہے:

بیٹی نصف کی وارث ہوتی ہے	یعنی ۱۲ حصے
بیوی ثمن کی وارث بنتی ہے	یعنی ۳ حصے
دادا سدس کا وارث بنتا ہے	یعنی ۴ حصے

پھر پانچ حصے بچتے ہیں جن کا دادا عصبہ کی بنیاد پر وارث ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کا اختصار مندرجہ ذیل ہے:

بیٹی ۱۲	ایک تہائی ۴ حصے
بیوی ۳	ایک تہائی ۱ حصہ
دادا ۹	ایک تہائی ۳ حصے

اس طرح وارثین کے حصوں کی مجموعی تعداد ۴+۱+۳=۸ ہو جائے گی اور ان کے مسئلہ کی اصل ۸ بن جائے گی اور اس مختصر اصل کی بنیاد پر تقسیم کی جائے گی۔

اختصار کی دوسری قسم عدد رؤوس کے درمیان اختصار ہے، اس کی عدد رؤوس کے

اعتبار سے تین قسمیں ہیں: متماثل، متداخل اور متوافق، جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ متماثل اختصار مثلاً ۴، ۴، ۴، اس میں ان میں سے صرف ایک رقم کو اصل مسئلہ سے ضرب دینا کافی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مثال میں ہے: ۴ دادیاں، آٹھ اخیافی بھائی اور ۴ علاتی چچا۔

چار دادیوں کو سدس ملتا ہے یعنی اصل مسئلہ ۶ میں سے ایک حصہ ملتا ہے، ایک چار پر تقسیم نہیں ہوتا ہے جو دادیوں کا عدد رؤوس ہے، آٹھ اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی یعنی ۶ میں سے دو حصے ملتے ہیں جو ۸ بھائیوں پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، بھائیوں کی تعداد یعنی ۸، اور ان کے حصوں ۲ کو دیکھا جائے تو دونوں عدد ۲ سے تقسیم ہوتی ہیں، اسی وجہ سے بھائیوں کی تعداد کو مختصر بنا کر ۴ کیا جائے گا، اس طرح چار چچا ۳ حصوں کے وارث بنتے ہیں اور یہ عدد ۴ پر تقسیم نہیں ہوتی ہے، اس وجہ سے ان کا عدد رؤوس ۴ ہی باقی رہے گا۔

ان تین مماثل اعداد میں سے صرف ایک کو لیا جائے اور اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا یعنی ۴×۶=۲۴، اس طرح ہمارے پاس ایک نئی اصل ۲۴ ہو جائے گی جس کے مطابق مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگی:

۴ دادیاں ایک حصہ کی وارث ہوں گی	۱×۴=۴
آٹھ اخیافی بھائی دو حصوں کے وارث ہوں گے	۲×۴=۸
چار چچا ۳ حصوں کے وارث ہوں گے	۳×۴=۱۲

۲۔ اختصارِ متداخل: مثلاً ۳، ۶، ۱۲، اس صورت میں ہم سب سے بڑی عدد کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے جیسا کہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہے:

۳ دادیاں، ۱۲ اخیافی بھائی اور ۳۶ چچا۔ دادیاں چھٹے حصہ کی وارث بنتی ہیں، اس مسئلہ کی اصل ۶ ہے، ان میں سے ایک ۳ دادیوں کے لیے ہے، ایک تین پر تقسیم نہیں ہوتا ہے، یہاں ایک اور تین کے درمیان تباین پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان کے عدد رؤوس ۳ کو باقی رکھا جائے گا، اخیافی بھائی ایک تہائی کے وارث بنتے ہیں، جو ۶ میں سے ۲ حصے بنتے ہیں، یہ عدد اور ان کے عدد رؤوس کی تعداد جو ۱۲ ہے، ۲ سے تقسیم ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کے عدد

رؤوس کا اختصار ۶ بنتا ہے، علاتی چچا کی تعداد ۳۶ ہے جو باقی وراثت کے وارث بنتے ہیں اور یہ تین حصے ہیں، یہاں دونوں ۳، اور ۳۶ کے درمیان توافق پایا جاتا ہے کیوں کہ دونوں ۳ سے تقسیم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے عدد رؤوس کا اختصار ۱۲ ہو جائے گا، یہ چچا کے ساتھ مخصوص عدد ہے اور یہ ۶، اخیافی بھائیوں اور ۳ دادیوں میں سب سے بڑی عدد ہے، اس وجہ سے اس عدد کو ۶ سے ضرب دیا جائے گا جو اس مسئلہ کی اصل ہے یعنی ۱۲×۶=۷۲، یہ مسئلہ کی نئی اصل ہوگی جس کے مطابق مندرجہ ذیل طریقہ پر وارثین کے درمیان وراثت تقسیم ہوگی:

۳ دادیوں کی وراثت ایک حصہ ہے	۱×۱۲=۱۲
بارہ اخیافی بھائیوں کی وراثت دو حصے ہیں	۲×۱۲=۲۴
۳۶ چچا کی وراثت ۳ حصے ہیں	۳×۱۲=۳۶
جملہ	۷۲

۳۔ اختصار متوافق: مثلاً ۴، ۶، ۱۰، یہ سبھی اعداد ۲ سے تقسیم ہوتے ہیں، اس کی مثال مندرجہ ذیل ہے: چار دادیاں، ۱۲۔ اخیافی بھائی، دس چچا؛ مسئلہ کی اصل ۶ بنتی ہے۔

۴ دادیاں سدس کی وارث بنتی ہیں جو ایک ہے اور یہ ۴ کے عدد سے متباین ہے یعنی دونوں میں تباین پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے دادیوں کا عدد رؤوس ویسے ہی باقی رہے گا یعنی ۴۔

بارہ اخیافی بھائی ایک تہائی یعنی ۶ میں سے دو حصوں کے وارث بنتے ہیں جس سے عدد رؤوس تقسیم ہوتا ہے، اس وجہ سے بھائیوں کے عدد رؤوس کا اختصار بنا کر ۶ کیا جائے گا۔

۱۰ چچا باقی وراثت کے وارث بنتے ہیں یعنی ۶ میں سے ۳ حصوں کے، چچا کے عدد رؤوس اور اس عدد میں تباین پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس کا عدد رؤوس اپنی اسی حالت پر باقی رہے گا۔

یہاں ۴، ۶ کے درمیان توافق پایا جاتا ہے، کیوں کہ یہ دونوں اعداد ۲ سے تقسیم ہوتی ہیں، اسی وجہ سے ہم ۴ کا اختصار ۲ کریں گے اور اس کو ۶ سے ضرب دیں گے ۲×۶=۱۲، یہاں ۱۰، اور ۱۲ کے درمیان توافق ہے کیوں کہ یہ دونوں اعداد ۲ سے تقسیم ہوتی ہیں، اس وجہ سے بارہ کو مختصر کر کے ۶ بنایا جائے گا اور اس کو ۱۰ سے ضرب دیا جائے گا جس کا حاصل ۶۰ بنتا ہے

اور ہم ۶۰ کو اصل مسئلہ ۶ سے ضرب دیں گے ۶۰×۶=۳۶۰، اور اس مسئلہ میں وراثت کو ۳۶۰ حصوں میں تقسیم کریں گے:

چار دادیاں	۱×۶۰=۶۰	ہر ایک کے لیے پندرہ
۱۲۔ اخیافی بھائی	۲×۶۰=۱۲۰	ہر ایک کے لیے دس
۱۰ چچا	۳×۶۰=۱۸۰	ہر ایک کے لیے اٹھارہ
جملہ	۳۶۰	

خلاصہ: عدد رؤوس کے درمیان تماثل پائے جانے کی صورت میں ان میں سے ایک کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے مثلاً ۳، ۳ ہو۔

تداخل کی صورت میں مثلاً ۳، ۶ بڑے عدد کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے۔

توافق کی صورت میں مثلاً ۴، ۶۔ ایک عدد کے وفق کو دوسرے کے کل سے ضرب دیں گے اور حاصلِ ضرب کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے۔

تباین کی صورت میں ایک کو دوسرے سے ضرب دیں گے اور حاصلِ ضرب کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے۔

مناسخہ کے احکام

مناسخہ کے معنی زائل کرنے اور تبدیل کرنے کے ہیں۔

میراث کے مسائل میں مناسخہ یہ ہے کہ وراثت کی تقسیم سے پہلے ہی کسی وارث کا انتقال ہوجائے تو اس کا حصہ اس کے وارثین میں منتقل ہوجاتا ہے، یہ میراث کے مسائل میں دشوار مسئلہ شمار کیا جاتا ہے۔ (مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۸/ ۱۴۱، ''التھذیب'' بغوی ۵/ ۴۷، ''شرح الرحبیۃ'' ماردینی ۶۵، ''التھذیب فی علم الفرائض'' کلوذانی ۳۵۳)

اس کو مناسخہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر وراثت کی تقسیم سے پہلے کسی وارث کا انتقال ہوجائے تو پہلے مسئلہ میں وراثت کی تقسیم کے اصول وضوابط تبدیل ہوجاتے ہیں، یا ایک وارث کی وراثت اس کے انتقال کی وجہ سے اس کے وارثین میں منتقل ہوجاتی ہے، جب وارثین میں سے وفات پانے والے کا حصہ باقی وارثین میں تقسیم کیا جائے تو اس کو پہلے مسئلہ کی تصحیح مانا جائے گا، اس صورت میں یہی کافی ہے، پھر مناسخہ کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً متوفی کے پانچ بیٹے ہوں تو اس صورت میں مسئلہ کی اصل ۵ ہوگی اور ہر ایک کو اپنا ایک حصہ ملے گا، اگر ان پانچ بیٹوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہوجائے اور اس کا صرف ایک بیٹا ہو تو وراثت میں اس کا حصہ وہی ایک ہوگا، جو اس کے باپ کا ہے اور یہی حصہ بیٹے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور مسئلہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

اگر میت نمبر ۲ کو پہلی میت سے ملے ہوئے حصوں اور اس کے وارثین کی تعداد میں کسر پایا جائے اور اس کی پہلے اور دوسرے دونوں مسئلوں میں تصحیح کی ضرورت پیش آئے، اور پہلے مسئلہ کے حصوں کی تعداد اور دوسرے مسئلہ کے وارثین کی تعداد کے درمیان تباین پایا جائے تو اس صورت میں مناسخہ کا اصول اپنانے کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی وضاحت

مندرجہ ذیل مثال سے ہوجائے گی:

متوفی کے پسماندگان میں شوہر اور ایک بیٹا ہو تو اس مسئلہ میں شوہر کا حصہ ربع ہوگا اور بیٹے کو بچا ہوا ملے گا یعنی وراثت سے شوہر کا حصہ ایک کو کم کرنے کے بعد تین حصے۔

اگر اس بیٹے کا انتقال ہوجائے اور اس کے تین بیٹے ہوں تو ان میں سے ہر بیٹے کو اپنے والد کی وراثت کے تین حصون میں سے ایک ایک حصہ ملے گا، پھر اس مسئلہ میں مناسخہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر بیوی کا انتقال ہوجائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر اور ایک بیٹا ہو پھر اس بیٹے کا انتقال ہوجائے اور اس کے پانچ بیٹے ہوں تو اس صورت میں یہاں متوفی باپ کے حصوں کی تعداد یعنی تین اور بیٹوں کے عدد رؤس یعنی پانچ کے درمیان تباین پایا جاتا ہے، اس وقت مناسخہ کے ذریعہ دونوں مسائل کی تصحیح کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اس صورت میں ہم پہلے مسئلہ کی اصل یعنی ۴ کو دوسرے مسئلہ کے عدد رؤس سے ضرب دیں گے جو ۵ ہے، اس کا حاصل ۲۰ ہوگا، یہ نئی اصل ہوگی جس کی بنیاد پر وراثت تقسیم ہوگی:

پہلے مسئلہ میں شوہر کا حصہ ۱×۵ = ۵ ہے اور یہ دوسرے مسئلہ کی اصل سے شوہر کا حصہ ہے، پانچ بیٹوں کا حصہ ۳×۵ = ۱۵ ہوگا اور ان پر ۱۵÷۵ = ۳ تقسیم کیا جائے گا۔

اگر متوفی بیوی کا شوہر اور بیٹا ہو اور اس بیٹے کا انتقال ہوجائے جس کے چھ بیٹے ہوں تو بیٹوں کے حصوں کی تعداد اور وراثت میں سے ان کے حصوں میں توافق پایا جاتا ہے کیوں کہ دونوں ۳ سے تقسیم ہوتے ہیں، اس طرح ہم چھ کو تین سے تقسیم کریں گے تو حاصل دو نکلتا ہے جس کو ہم چار سے ضرب دیں گے جو پہلے مسئلہ کی اصل ہے جس کا حاصل ۸ بنتا ہے، اس میں سے شوہر کو ربع یعنی دو حصے ملتے ہیں اور چھ اولاد کو بچے ہوئے چھ حصے ملتے ہیں، یعنی ہر ایک بیٹے کو ایک حصہ۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مشرّکہ

(اس کو مسئلہ حماریہ بھی کہا جاتا ہے، مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۴/۳۴۳، ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۸/ ۱۵۵، ''نھایۃ المحتاج'' شمس رملی ۶ /۲۱، ''أسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا انصاری ۳/ ۲۵، ''التھذیب فی علم الفرائض'' کلوذانی ۱۳۹)

اس مسئلہ کو مسئلہ مشرّکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی بھائی ایک تہائی کی تقسیم میں اخیافی بھائیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں جب کہ یہ ایک تہائی اخیافی بھائیوں کا حصہ ہے۔

مثلاً کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں شوہر، ماں، دو اخیافی بھائی یا بہنیں اور ایک حقیقی بھائی ہو تو اس مسئلہ کی اصل ۶ سے ہوگی، شوہر کو نصف یعنی ۳ حصے ملتے ہیں، ماں چھٹے حصہ کی وارث ہوتی ہے اور دو اخیافی بھائی ایک تہائی یعنی دو حصے کے حق دار بنتے ہیں، اس صورت میں حقیقی بھائی اپنے اخیافی بھائیوں سے کہتا ہے: میری اور تمہاری ماں ایک ہی ہے، اس وجہ سے وہ اخیافی بھائیوں کو حاصل وراثت کے حصہ میں شریک ہو جاتا ہے۔

وراثت مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگی:

شوہر کو نصف	۳ حصے
ماں کو چھٹا	۱ حصہ
تین بھائیوں کو ایک تہائی	۲ حصے
جملہ	۶

لیکن یہاں بھائی تین ہیں اور حصے دو ہیں، دو تین پر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس کا حل یہ ہے کہ بھائیوں کے عدد رؤوس کو اصل مسئلہ میں ضرب دیا جائے یعنی ۳×۶ = ۱۸

پھر دوبارہ مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے:

شوہر نصف	۳×۳ =۹

ماں سدس	۱×۳=۳
تین بھائی	۲×۳=۶
جملہ	۱۸

اگر حقیقی بھائی ایک سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی کی تقسیم میں اخیافی بھائیوں کے ساتھ اسی طرح شریک رہتے ہیں۔

اگر بھائی اور بہن ہوں تو وہ میراث میں برابر برابر حصوں کے وارث بنیں گے یعنی یہاں مرد کا حصہ عورت کے حصہ کے برابر ہوگا، بھائی اور بہن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اگر اس مسئلہ میں صرف علاتی بھائی ہوں تو وہ وراثت کی تقسیم میں شریک نہیں ہوں گے اور وہ کسی بھی چیز کے وارث نہیں بنیں گے۔

☆☆☆☆☆

میراث میں دادا کے حالات

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۸/ ۱۲۱، ''حاشیۃ القلیوبی'' ۳/ ۱۴۷، ''روضۃ الطالبین'' قلیوبی کے حاشیہ کے ساتھ ۵/ ۱۰۷، ''فتح الوھاب'' شیخ الاسلام زکریا ۴/ ۲۱)

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دادا بھائیوں کی وجہ سے وراثت سے محجوب نہیں ہوتا ہے، شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ دادا بھائیوں کے ساتھ مل کر وراثت کو تقسیم کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس کے خلاف کہا ہے اور بعض صحابہ کے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ وراثت میں دادا کی وجہ سے بھائی محجوب ہو جاتے ہیں جس طرح باپ کی موجودگی میں ہوتا ہے۔

بھائیوں کے ساتھ دادا کے وارث ہونے کے سلسلہ میں قرآن اور حدیث میں کوئی صریح دلیل نہیں ہے، یہ اجتہاد سے ثابت ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایسا پہلا واقعہ پیش آیا تو صحابہ کے درمیان وراثت کی تقسیم میں اختلاف ہوا۔ حضرت ابوبکر، ابن عباس اور بہت سے صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے جس کو امام ابوحنیفہ نے دلیل بنایا ہے؛ دادا بھائیوں کو مطلقاً محجوب کر دیتا ہے جس طرح باپ کی موجودگی میں ہوتا ہے، کیوں کہ دادا کے لیے باپ کے بعض احکام ہیں۔ حضرت عمر، عثمان اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے اور یہی شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے کہ دادا کو بھائیوں کی جگہ پر رکھا جائے گا، کیوں کہ وہ بعض احکام میں بھائیوں کے مشابہ ہے اور وہ وراثت کے حق دار ہونے کے سبب اور قرابت میں برابر درجے کے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ تینوں ائمہ اور اکثر صحابہ کرام کی رائے یہ ہے کہ دادا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوتا ہے اور وراثت میں دادا کی مندرجہ ذیل حالتیں ہیں:

پہلی حالت:

۱۔ وہ بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں چھٹے حصہ کا وارث بنتا ہے یعنی دادا کو اس وقت

سدس ملتا ہے جب بیٹا، پوتا یا نیچے تک کوئی ہو چاہے دوسرے وارثین پائے جائیں یا نہ پائے جائیں۔

۲۔ دادا بیٹی یا پوتی کی موجودگی میں سدس اور باقی بچی ہوئی میراث کا عصبہ بن کر وارث بنتا ہے، اگر متوفی کی بیٹی اور دادا ہو تو بیٹی کو نصف ملتا ہے اور دادا کو حصہ کی بنیاد پر سدس ملتا ہے اور چھ میں سے دو حصے باقی بچتے ہیں جن کا وارث دادا عصبہ کی بنیاد پر بنتا ہے، یہی مسئلہ پوتی کے ساتھ بھی ہے۔

۳۔ متوفی کا دادا اور دو بیٹیاں ہوں تو مسئلہ کی اصل ۶ ہوگی، جس میں سے دادا کو سدس یعنی ایک حصہ اور بیٹیوں کو دو تہائی یعنی چار حصے ملیں گے اور ایک حصہ باقی بچے گا جو دادا کو عصبہ کی بنیاد پر ملے گا۔ یہی تقسیم دو پوتیوں کی موجودگی میں بھی ہے۔

۴۔ متوفی کا دادا، دو بیٹیاں اور شوہر ہو تو دادا کو سدس اور دو بیٹیوں کو دو تہائی اور شوہر کو چوتھائی ملے گا، مسئلہ کی اصل بارہ سے ہوگی اور اس میں ۱۳ سے عول ہوگا، کیوں کہ ۶+۳+۴=۱۳ ہوتا ہے، پھر مندرجہ ذیل طریقہ پر دوبارہ تقسیم کی جائے گی:

دو بیٹیوں کو ۱۳ میں سے ۸ حصے

شوہر کو ۱۳ میں سے ۳ حصے

دادا کو ۱۳ میں سے ۲ حصے

جملہ ۱۳

دوسری حالت:

جب دادا کے ساتھ حقیقی یا علاتی بھائی ہو تو اس صورت میں دادا کو تین میں سے ایک کا اختیار رہتا ہے:

۱۔ صرف ایک بھائی کی موجودگی میں دادا کے لیے تقسیم: متوفی کا دادا اور ایک بھائی ہو چاہے حقیقی ہو یا علاتی، مسئلہ کی اصل ۲ ہوگی، دادا کو ایک حصہ ملے گا اور بھائی کو ایک یعنی دادا آدھی میراث کا وارث بنتا ہے۔

۲۔ پانچ بھائیوں کی موجودگی میں دادا کے لیے ایک تہائی افضل اور بہتر ہے، مثلاً مسئلہ میں دادا اور پانچ حقیقی یا علاتی بھائی ہوں تو مسئلہ کی اصل ۳ سے ہوگی جن میں سے دادا کو ایک حصہ ملے گا اور دو حصہ پانچ بھائیوں کے ہو جائیں گے، یہ عدد پانچ پر تقسیم نہیں ہوتی ہے، اس لیے بھائیوں کے عدد رؤس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا ۳×۵=۱۵

پھر مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگی:

دادا	۱×۵=۵
۵ بھائی	۲×۵=۱۰ حصے، ہر بھائی کو دو حصے

۳۔ وراثت کی تقسیم یا ایک تہائی دونوں دادا کے حق میں یکساں ہوتا ہے، مثلاً اس مسئلہ میں ہے: دادا اور دو بھائی۔ اس میں دادا کو ایک تہائی ملتا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ کی اصل ۳ بنتی ہے جس میں دادا کو ایک حصہ ملتا ہے اور دو بھائی دو حصوں یعنی دو تہائی کے وارث بنتے ہیں۔

اگر دادا کے ساتھ ایک حقیقی بھائی اور ایک علاتی بھائی ہو تو حقیقی بھائی علاتی بھائیوں کو وراثت سے صرف حجبِ حرمان میں محجوب کرتے ہیں اور وراثت میں ان کا حساب لگایا جاتا ہے:

مثلاً متوفی کا دادا، حقیقی بھائی اور علاتی بھائی ہو تو بھائی دادا سے کہیں گے: تم کو ہمارے ساتھ وراثت تقسیم کرنے یا ایک تہائی لینے میں اختیار ہے، اس صورت میں دادا ایک تہائی لے گا، اس طرح حقیقی بھائی کو تنہا دو تہائی ملے گا اور علاتی بھائی کو کچھ بھی نہیں ملے گا، کیوں کہ حقیقی بھائی علاتی بھائی کو محجوب کر دیتا ہے۔

اگر متوفی کا دادا، حقیقی بہن، ایک علاتی بھائی اور علاتی بہن ہو تو حقیقی بہن دادا سے کہے گی: تم کو ہمارے ساتھ برابر برابر وراثت تقسیم کرنے یا ایک تہائی لینے میں اختیار ہے۔ دادا کے لیے دونوں اختیار برابر ہے، دادا، بھائی اور دو بہنوں کا عدد رؤس تین ہوتا ہے، دادا اور بھائی کو دو بہنوں کے برابر حصہ ملتا ہے، اس لیے مسئلہ کی اصل ۶ سے ہوگی، دادا ایک تہائی لے گا یعنی دو حصے۔ دو تہائی باقی رہتا ہے یعنی ۴ حصے۔ اس وقت حقیقی بہن کہے گی: میرے ساتھ کوئی جھگڑنے والا نہیں ہے۔ اس لیے وہ نصف یعنی ۳ حصے لے گی، اس کے بعد ایک

حصہ باقی بچتا ہے جو علاتی بھائی اور بہن کو ملتا ہے، جو تین پر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے ان کے عددِ رؤس ۳ کو اصل مسئلہ ۶ میں ضرب دیں گے جس کا حاصل ۱۸ بن جاتا ہے، جس میں چھ حصے دادا کو، نو حصے حقیقی بہن کو ملتے ہیں پھر ۳ حصے بچتے ہیں جن میں دو علاتی بھائی کو اور ایک علاتی بہن کو۔

تیسری حالت:

جب دادا اور بھائیوں کے ساتھ دوسرے حصہ دار ہوں تو دادا کو مندرجہ ذیل تین امور میں سے ایک کا اختیار ہے:

۱۔ خود کو متوفی کے بھائیوں میں شریک کرے اور اس کو مقاسمہ کہا جاتا ہے۔ (اس مسئلہ کی تفصیلات ''الحاوی الکبیر'' ۸/۱۲۶، اور ''روضۃ الطالبین'' ۵/۱۰۸ میں دیکھی جائے) یا وہ وراثت حصہ داروں میں تقسیم ہونے کے بعد بچی ہوئی وراثت کا ایک تہائی لے یا پوری وراثت کا چھٹا حصہ لے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ بھائی اور دادا رشتہ داری میں ایک ہی درجے کے ہیں، کیوں کہ دادا باپ کا باپ ہے اور بھائی باپ کی اولاد ہیں، دادا کے ثلث مابقی حاصل کرنے کی تشریح یہ ہے کہ اگر متوفی کے حصہ دار نہ ہوں تو دادا ایک تہائی کا وارث بنتا ہے، اگر یہاں اس کے علاوہ دوسرے حصہ دار ہوں تو پہلے ان کو حصے دیے جائیں گے، اس کے بعد دادا بچی ہوئی وراثت کے ایک تہائی کا وارث بنے گا، دادا کے سدس کے وارث ہونے کا سبب یہ ہے کہ دادا کو سدس سے محجوب کرنے والا صرف باپ ہی ہوتا ہے۔ البتہ بیٹیاں اور بھائی دادا کو میراث سے محجوب نہیں کرتے ہیں۔

مثلاً کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں دو بیٹیاں، ماں، شوہر اور دادا ہوں۔

دادا کو سدس یعنی ۱۲ میں سے ۲ حصے

شوہر کو ایک چوتھائی یعنی ۱۲ میں سے تین حصے

دو بیٹیوں کو دو تہائی یعنی ۱۲ میں سے آٹھ حصے

ماں کو سدس یعنی ۱۲ میں سے ۲ حصے

یہ مسئلہ ۱۳ سے ہوگا: دو بیٹیوں کو آٹھ، شوہر کو تین، ماں کو دو، اس طرح ۸+۳+۲=۱۳ ہو جاتا ہے اور اس مسئلہ میں ۱۳ سے عول ہوتا ہے اور دادا کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔ اسی وجہ سے دادا سدس لے گا یعنی ۲ حصے، اس صورت میں عول الی ۱۵ ہو جاتا ہے پھر وراثت مندرجہ ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگی:

دو بیٹیاں	۱۵ میں سے ۸ حصے
شوہر	۱۵ میں سے ۳ حصے
ماں	۱۵ میں سے ۲ حصے
دادا	۱۵ میں سے ۲ حصے

اس مسئلہ میں اگر بھائی ہوں تو ان کو وراثت میں کچھ نہیں ملے گا۔

کبھی دادا کے لیے سدس سے کم بچتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہے: دو بیٹیاں، شوہر اور دادا۔

بیٹیوں کو دو تہائی، شوہر کے لیے چوتھائی اور دادا کو چھٹا ملتا ہے، اس مسئلہ کی اصل ۱۲ ہوتی ہے لیکن اس میں جملہ حصے ۱۳ تک عول ہو کر زیادہ ہو جاتے ہیں:

دو بیٹیوں کے لیے دو تہائی یعنی ۱۳ میں سے ۸ حصے۔

شوہر کے لیے ربع یعنی ۱۳ میں سے ۳ حصے

اور دادا کے لیے سدس یعنی ۱۳ میں سے ۲ حصے

اس طرح دادا کے لیے ۱۳ میں سے صرف ایک حصہ بچتا ہے، اس مسئلہ میں ۱۲ سے عول ۱۳ ہو جاتا ہے، اور دادا کو سدس سے کم ملے گا اور وراثت کی تقسیم نئی اصل یعنی ۱۳ سے کی جائے گی۔

کبھی دادا کے لیے صرف سدس بچتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہے: دو بیٹیاں، ماں اور دادا، اس میں بیٹیوں کو دو تہائی یعنی ۶ میں سے ۴، ماں کو چھٹا یعنی ۶ میں سے ایک اور دادا کو بھی چھٹا یعنی ۶ میں سے ایک حصہ ملتا ہے، اگر متوفی کے اس مسئلہ میں بھائی بھی ہوں تو وہ محجوب ہو جاتے ہیں، ان کو وراثت میں کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

مرتد، ولد زنا اور لعان کی وجہ سے نفی کردہ بچے کے احکام

(مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ۸/۱۴۵، ''التھذیب'' بغوی ۵/۴۹، ''اسنی المطالب'' ۳/۱۶، ''التھذیب فی علم الفرائض'' ۲۳۵)

مرتد نہ وارث بنتا ہے اور نہ دوسرے کو وارث بناتا ہے، ہم نے یہ بات پہلے کہہ دی ہے کہ وراثت کی رکاوٹوں میں سے ایک ارتداد ہے اور مرتد کا مال بیت المال کے لیے مالِ فئ بن جاتا ہے جس کو مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کیا جاتا ہے چاہے اس نے یہ مال اسلام کی حالت میں کمایا ہو یا مرتد ہونے کے بعد۔ (یہی راجح قول ہے، البتہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے جس کو کلوذانی نے بیان کیا ہے ص ۲۳۵)

جو کافر یا ذمی مسلمانوں کے ملک میں مرتا ہے اور اس کے وارثین میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا پورا مال بیت المال میں چلا جاتا ہے، اگر وارثین ہوں اور ان کو وراثت دینے کے بعد کچھ بچتا ہو تو وہ بھی بیت المال میں چلا جاتا ہے۔

ولدِ زنا باپ کے رشتے کی وجہ سے وارث نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ بچہ جس کی نفی لعان میں کی گئی ہو، کیوں کہ وہ ان دونوں کا شرعی باپ نہیں ہے، البتہ وہ ماں کے رشتے سے وارث ہوتا بھی ہے اور بناتا بھی ہے۔

اگر ولدِ زنا کا انتقال ہو جائے اور اس کا کوئی بیٹا یا پوتا نہ ہو تو دوسرے حصہ داروں کو ان کا حصہ دینے کے بعد بچنے والی وراثت بیت المال کی ہو جائے گی اور مسلمانوں کے مصالح اور مفادات میں خرچ کی جائے گی۔ اسی بنیاد پر اگر ولدِ زنا کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں ماں اور اخیافی بھائی ہوں تو ماں سدس کی وارث ہوگی اور بھائی ایک تہائی کے، باقی بچا ہوا بیت المال کا ہو جائے گا۔

ولدِ زنا کے بیٹے اپنے حصے داروں کے وارث بنتے ہیں، مثلاً بیٹیاں اور پوتیاں، اسی طرح اپنی بیویوں کے وارث بنتے ہیں، لڑکی ہو تو اپنے شوہر کی وارث بنتی ہے، حصہ داروں کو دے کر جو بھی بچے تو وہ بیت المال میں چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک ہی شخص حصے دار بھی ہو اور عصبہ بھی

یا دونوں جہت سے حصہ دار بنتا ہو یا دو جہت سے عصبہ بنتا ہو

ا۔ دو جہت سے حصہ دار بنتا ہو، مثلاً کوئی مجوسی اپنی ماں سے شادی کرے جس سے اس کی بیٹی پیدا ہو، یہ بیٹی ایک جہت سے اس کی اخیافی بہن ہوگی اور دوسری جہت سے اسی کی بیٹی، اگر یہ مجوسی مر جائے تو بیٹی اس کی وراثت سے بیٹی ہونے کی وجہ سے آدھے کی وارث ہوگی اور اخیافی بہن ہونے کی وجہ سے چھٹے حصہ کی وارث ہوگی، لیکن وہ دونوں جہت سے وارث نہیں ہوگی، بلکہ سب سے طاقت ور جہت سے وارث ہوگی، اس صورت میں اخیافی بہن ہونے کے مقابلہ میں بیٹی ہونے کا رشتہ زیادہ طاقت ور ہے، کیوں کہ بیٹی کو کوئی بھی وراثت سے محجوب نہیں کرتا ہے، لیکن اخیافی بہن اس سے زیادہ قریب بہت سے وارثین کی وجہ سے محجوب ہوتی ہے، مثلاً بیٹا، پوتا، بیٹی، پوتی، باپ اور دادا، یہ سب اس کو وراثت سے محجوب کر دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وارث میں حصہ دار بننے کی دو جہت جمع ہو جائیں تو وہ صرف طاقت ور جہت کے ذریعہ وارث ہوگا، دونوں حصوں کا وارث نہیں بنے گا۔ (یہ مالکیہ اور شوافع کا قول ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ دونوں جہت سے وارث بنتا ہے، دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۵/۵۰)

یہی اصول وضابطہ مجوسی کے علاوہ یہودی اور وطی شبہ کی صورت میں بھی منطبق ہوتا ہے۔

اگر یہودی اپنی بیٹی کے ساتھ نکاح کرے اور اس سے ایک بیٹی ہو جائے تو یہ بیٹی ایک جہت سے دوسری بیٹی کی ماں بن جائے گی اور دوسری جہت سے بہن؛ کیوں کہ ان دونوں کا باپ ایک ہی ہے، لیکن وہ دونوں جہت سے وارث نہیں ہوتی ہے، بلکہ صرف ماں ہونے کے اعتبار سے وارث بنتی ہے، بہن بننے کے اعتبار سے نہیں، کیوں کہ ماں کو کوئی

محجوب نہیں بناتا ہے جب کہ بہن بہت سے حالات میں محجوب ہوجاتی ہے مثلاً متوفی کا بیٹا یا پوتا یا باپ ہوتو بہن محجوب ہوجاتی ہے۔

اگر ایک ہی شخص میں حصہ دار بننے کی جہت اور عصبہ بننے کی جہت مجتمع ہوجائے تو وہ دونوں جہتوں سے وارث بنتا ہے، مثلاً کوئی شخص اپنی علاتی چچازاد بہن کے ساتھ شادی کرے پھر اس کی بیوی کا انتقال ہوجائے اور اس کی اولاد نہ ہوتو وہ متوفی کی وراثت کے نصف کا حق دار ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کا شوہر ہے اور باقی نصف کا عصبہ ہونے کی وجہ سے وارث بنتا ہے کیوں کہ وہ اس کا چچازاد بھائی ہے۔

اگر ایک ہی شخص دو جہت سے عصبہ بنتا ہو مثلاً چچازاد بھائی بھی ہو اور اس کو آزاد کرنے والا آقا بھی ہوتو وہ چچازاد بھائی ہونے کے اعتبار سے وارث ہوگا، آزاد کرنے والے آقا ہونے کے اعتبار نہیں، کیوں کہ چچازاد بھائی آزاد کرنے والے آقا کو محجوب کر دیتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

خنثیٰ مشکل، مفقود اور حمل کی وراثت

خنثیٰ مشکل یقینی مقدار کا وارث بنتا ہے اور باقی کو اس کی حیثیت یعنی مرد یا عورت ہونے تک موقوف رکھا جاتا ہے۔ (دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ۸/۱۶۸، ''التھذیب'' بغوی ۵/۵۲)

اگر خنثیٰ مشکل کا حصہ دونوں حالتوں میں یکساں ہوتا ہے یعنی مرد ماننے کی صورت میں یا عورت ماننے کی صورت میں تو وراثت سے اس کا حصہ دیا جائے گا، مثلاً وہ اخیافی بھائی ہو یا اخیافی بہن، کیوں کہ وراثت میں دونوں کا حصہ یکساں ہے، اسی طرح آزاد کرنے والا ہوتو بھی مرد یا عورت ہونے سے وراثت میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔

اگر مخنث کا حصہ مرد یا عورت ہونے کی صورت میں الگ ہوتا ہو، مثلاً متوفی کا ایک بیٹا یا بیٹی ہوتو یقینی مقدار کی بنیاد پر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، اور باقی وراثت اس وقت تک روک دی جائے گی جب تک اس کی حقیقت کا پتہ نہ چلے۔

مثلاً متوفی کا شوہر، باپ اور ایک خنثیٰ مشکل بچہ ہوتو شوہر کو چوتھائی ملے گا، باپ کو یہ مانتے ہوئے چھٹا حصہ ملے گا کہ خنثیٰ مشکل بچہ مرد ہوسکتا ہے، اور خنثیٰ مشکل کو نصف دیا جائے گا اور باقی وراثت کو اس وقت تک روک دیا جائے گا جب تک کہ اس کے مرد یا عورت ہونے کی وضاحت نہ ہو، اگر واضح ہوجائے کہ وہ مرد ہے تو باقی وراثت اس کے حصہ میں آئے گی، اگر واضح ہوجائے کہ وہ عورت ہے تو باقی وراثت باپ کو ملے گی۔

اس مسئلہ کی اصل ۱۲ سے ہے اور مندرجہ ذیل طریقہ پر وراثت تقسیم کی جائے گی:

شوہر کو ایک چوتھائی یعنی	۳ حصے
باپ کو سدس یعنی	۲ حصے
خنثیٰ مشکل کو نصف یعنی	۶ حصے
جملہ	۱۱ حصے

ایک حصہ باقی رہتا ہے جس میں تصرف کو اس بات کو جاننے تک موقوف رکھا جائے گا کہ خنثیٰ مشکل مرد ہے یا عورت؟ اگر وہ مرد ہے تو اس کو باقی حصہ ملے گا، اگر عورت ہو تو باپ اس حصے کو لے گا۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ۸/۸۸، ''الوسیط'' ۴/۳۶۷، ''التھذیب'' کلوذانی ص ۲۵۸)

مفقود کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہے۔

مفقود کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہے، مفقود وہ ہے جو اپنے شہر سے نکل کر چلا جائے اور معلوم نہ ہو کہ کہاں چلا گیا ہے، یا معلوم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اس کے مال میں تصرف اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک گواہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے، گواہوں کا حاکم کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے کہ یہ مفقود مر چکا ہے اور حاکم کا ان کی گواہی قبول کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ ان کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اگر حاکم ان کی گواہی قبول کرے تو مفقود کی وفات کا حکم لگایا جائے گا اور اس کی وراثت وارثین میں تقسیم کی جائے گی، یا اتنی مدت انتظار کا حکم صادر کیا جائے گا جس مدت میں عام طور پر مفقود کے نہ آنے کا غالب گمان ہو جاتا ہے۔ اس مدت کی کوئی تعین نہیں ہے، حاکم کو اس کی تعین میں اجتہاد کرنا چاہیے جس سے غالب گمان ہو جائے کہ اس مدت کے بعد مفقود مر چکا ہے۔ اگر یہ حکم صادر ہو جائے تو مفقود کی وفات کا حکم صادر ہونے کے دن موجود زندہ وارثین میں وراثت کی تقسیم ضروری ہو جاتی ہے۔ (مدت کا اعتبار مفقود کی ولادت سے ہوگا، اس کے مفقود ہونے کے وقت سے نہیں۔ امام غزالی نے یہ بات ''الوسیط'' میں کہی ہے ۴/۳۶۷، شوافع میں سے ابو منصور سمعانی کی رائے یہ ہے کہ اس کا مال اس کی حالت کے محقق ہونے سے پہلے تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ نووی نے ''روضۃ الطالبین'' میں یہ بات کہی ہے ۵/۱۱۷)

مفقود وارث نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کا حصہ میراث میں روک دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی حالت کا یقین ہو جائے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے پسماندگان میں دو حقیقی بھائی ہوں اور ان میں سے ایک مفقود ہو تو پہلا بھائی نصف کا وارث ہوگا، دوسرے مفقود بھائی کی وراثت میں تصرف موقوف رکھا جائے گا، یہاں تک کہ مفقود کی

وفات کا حکم صادر نہ کیا جائے، اگر یہ ثابت نہ ہو کہ مفقود انتظار کی پوری مدت زندہ ہے تو اس کی وراثت اس احتمال کے ساتھ اس کے بھائی کو دی جائے گی کہ اس کے مورث سے پہلے ہی اسکا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے حصہ میں سے کوئی بھی چیز اس کے وارثین کو نہیں ملے گی، کیوں کہ وراثت شک کی بنیاد پر منتقل نہیں ہوتی ہے۔

جس کے حصہ میں مفقود کا دخل ہو تو وراثت میں اسے اس کا حصہ نہیں دیا جائے گا۔ مثلاً جب باپ مفقود ہو تو دادا کو وراثت میں اس کا حصہ نہیں دیا جائے گا جب تک کہ باپ کی حالت معلوم نہ ہو۔

متوفی کا دادا ہو اور ایک حقیقی بھائی اور ایک مفقود علاتی بھائی ہو تو اس مفقود بھائی کے واپس ہونے کی صورت میں دادا کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ دو بھائیوں کے ساتھ برابر برابر وراثت تقسیم کر لے یا اپنے مخصوص ایک تہائی لے۔ اگر مفقود علاتی بھائی کی وفات ہو جائے تو وارثین کے ضمن میں اس کا شمار نہیں ہوگا اور دادا اور حقیقی بھائی دونوں وراثت کو نصف نصف تقسیم کر لیں گے۔

اگر مفقود کی زندگی اور موت سے کوئی اثر نہ ہوتا ہو تو اس کو وراثت میں سے اس کا حصہ ملتا ہے، مثلاً مسئلہ میں شوہر، حقیقی چچا اور مفقود علاتی بھائی ہو تو اس مفقود بھائی کی زندگی یا وفات سے شوہر متاثر نہیں ہوتا ہے، لیکن چچا کو وراثت میں سے کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ مفقود علاتی بھائی زندہ رہنے کی صورت میں چچا کو محجوب کر دیتا ہے اور چچا کو اس وراثت میں کچھ بھی نہیں ملتا ہے، اگر یہ علاتی بھائی مر چکا ہو تو چچا وارث بنتا ہے، اسی وجہ سے چچا کے حصہ میں تصرف کو موقوف رکھا جائے گا یہاں تک کہ مفقود کی زندگی یا موت کا فیصلہ ہو جائے۔

مسئلہ میں دادا، حقیقی بھائی اور ایک مفقود علاتی بھائی ہو تو مفقود بھائی کو زندہ مان کر دادا کے حصہ میں تصرف کیا جائے گا اور دادا کو وراثت میں سے صرف ایک تہائی ملے گا اور حقیقی بھائی کو اس بنیاد پر صرف نصف دیا جائے گا کہ مفقود بھائی مر چکا ہے، اس مسئلہ کی اصل ۶ سے ہوگی جس میں دادا کو ایک تہائی یعنی دو ملے گا اور حقیقی بھائی کو نصف یعنی ۳ حصے ملیں گے، ایک حصہ باقی بچتا ہے جس میں تصرف موقوف رکھا جائے گا، جب یہ ثابت ہو جائے کہ مفقود زندہ ہے تو

حقیقی بھائی کے حصہ میں یہ حصہ آئے گا اور دادا کے خلاف اس کا حساب لیا جائے گا پھر بھائی علاتی بھائی کو محجوب کردے گا۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مفقود مر چکا ہے تو یہ حصہ دادا کو ملے گا۔

حمل کی وراثت موقوف رہے گی یعنی جو ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، کیوں کہ وہ بھی رہ سکتا ہے، عورت بھی، ایک بھی رہ سکتا ہے اور متعدد بھی، دوسرے کو وراثت اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک کہ اس کے وارث ہونے کا یقین نہ ہو، مثلاً متوفی کا باپ، دادا، بیوی اور شوہر ہو تو یہ وارث ہوتے ہیں چاہے حمل بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اگر حمل پائے جانے یا نہ پائے جانے پر کسی وارث کا وارثین میں داخل ہونا موقوف ہو مثلاً ایک صورت میں وہ وارثین میں شامل ہوتا ہو اور دوسری صورت میں داخل نہ ہوتا ہو، مثلاً متوفی کے علاتی بھائی کی بیوی کا حمل۔ اگر اس کا حمل بیٹا ہے تو علاتی بھتیجا وارث بنتا ہے، اگر یہ حمل بیٹی ہو تو بھتیجی وارث نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ بھتیجی وارثین میں شامل نہیں ہے، بلکہ اس کا شمار ذوی الارحام میں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک کہ حمل بچہ کی شکل میں باہر نہ آجائے اس وقت تک حمل کی موجودگی یا غیر موجودگی کے لیے سب سے قریبی احتمال کے مطابق حمل کے ساتھ تصرف کیا جائے گا، جب حمل اپنی ماں کے مادر رحم سے زندہ باہر نکل آئے تو یہ بات یقینی ہوجائے گی کہ یہ حمل مورث کی وفات کے وقت اپنی ماں کے رحم میں جنین تھا، یہ بات معلوم ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ مہینے اور زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے۔ (اگر ان دو مدتوں کے درمیان ہو تو وہ وارث ہوگا کیوں کہ نسب ثابت ہوتا ہے اور وراثت نسب کے تابع ہے) یا وارثین اس بات کی گواہی دیں کہ حمل مورث کی وفات کے وقت موجود تھا۔

اسی بنیاد پر وارث ہونے والا حمل وہ ہے جو مورث کی وفات کے وقت اپنی ماں کے پیٹ میں موجود ہو، اس کے علاوہ حالت میں وہ وارث نہیں بنتا ہے۔

اگر اس حمل کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو یا وارثین میں سے کوئی ایسا ہو جو حمل کو محجوب کردیتا ہو تو وراثت میں تصرف حمل نکلنے پر موقوف نہیں رہے گا۔

اگر حصے دار بننے والے وارثین ہوں جن کو حمل محجوب نہ کرتا ہو تو ان کو ان کے حصے دینا واجب ہے مثلاً باپ، دادا، میاں بیوی۔ چاہے مسئلہ کی اصل میں عول کی ضرورت پڑتی ہو مثلاً متوفی کے پسماندگان میں حاملہ بیوی، باپ اور ماں ہو تو اس میں ۲۴ کے بجائے ۲۷ سے عول ہوتا ہے، کیوں کہ حمل میں دو بیٹیاں ہونے کا احتمال ہے، اس مسئلہ میں بیوی کو عول کے ساتھ آٹھواں حصہ ہے، اسی طرح باپ کو عول کے ساتھ چھٹا حصہ اور ماں کو عول کے ساتھ چھٹا حصہ ملے گا، کیوں کہ باپ، ماں، بیوی اور دو بیٹیوں کے مسئلہ کی اصل ۲۴ ہے جس میں ۲۷ عول ہوتا ہے، اس میں بیوی کو اپنا حصہ یعنی ثمن یعنی ۳ ملتا ہے، کیوں کہ یہ ۲۴، اصل سے ہے، دو بیٹیوں کو دو تہائی یعنی ۱۶ حصے ملتے ہیں، باپ کا حصہ سدس ہے یعنی ۴ حصے، ماں کا حصہ بھی سدس ہے یعنی ۴ حصے، ان حصوں کا مجموعہ ۲۴ ہے، پھر بیوی کا حصہ کہاں چلا گیا یعنی آٹھواں یعنی ۳ حصے؟ اسی وجہ سے مسئلہ میں عول ۲۷ ہوتا ہے اور اس نئے اصل کے مطابق دوبارہ تقسیم کی جائے گی اور اس میں سے بیوی کو تین حصے، بیٹیوں کو ۲۷ میں سے ۱۶ حصے، باپ کو چار حصے، ماں کو ۴ حصے ملیں گے، اس طرح ۲۷ سے عول ہوتا ہے۔

اگر وارثین میں ایسے افراد ہوں جن کے متعین حصے ہوں مثلاً بیٹا اور بیٹی تو ان کو بچہ ہونے تک کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ ایک ہی حمل میں متعدد جنین ہونے کا کوئی اصول نہیں ہے، کبھی پانچ بیٹے یا بیٹیاں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوسکتے ہیں۔ علامہ ابن الرفعہ (اپنے زمانے میں شوافع کے سب سے بڑے عالم، امام وفقیہ اور ہر فن مولا ابو العباس نجم الدین احمد بن محمد بن علی بن مرتفع انصاری نجاری متوفی ۷۱۰ ہجری۔ آپ کا لقب فقیہ تھا کیوں کہ آپ پر فقہ کا غلبہ تھا، آپ کی ''الکفایۃ فی شرح التنبیہ'' اور ''المطلب فی شرح الوسیط'' وغیرہ مشہور تصنیفات ہیں، سبکی کبیر آپ کو رویانی پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ کا تعارف ''طبقات ابن قاضی شھبۃ''] میں ہے ۲/۲۱۱) نے بیان کیا ہے کہ بغداد میں ایک بادشاہ کی بیوی نے ایک ساتھ چالیس بچے جنم دیے، ہر ایک کا حجم ایک انگلی کے برابر تھا، وہ سب زندہ رہے، یہاں تک کہ اپنے والد کی معیت میں گھوڑے پر سوار بھی ہوئے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

یہ کتاب المکتبة الشافعیة ادارہ رضیة الابرار بھٹکل میں شامل کیا جارہا ہے،

https://telegram.me/shafayibooks